شہیدِ جستجو

——— ڈاکٹر ذاکر حسین

ضیاء الحسن فاروقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

خوشنویس: ایس۔ ایم۔ مظہر

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006

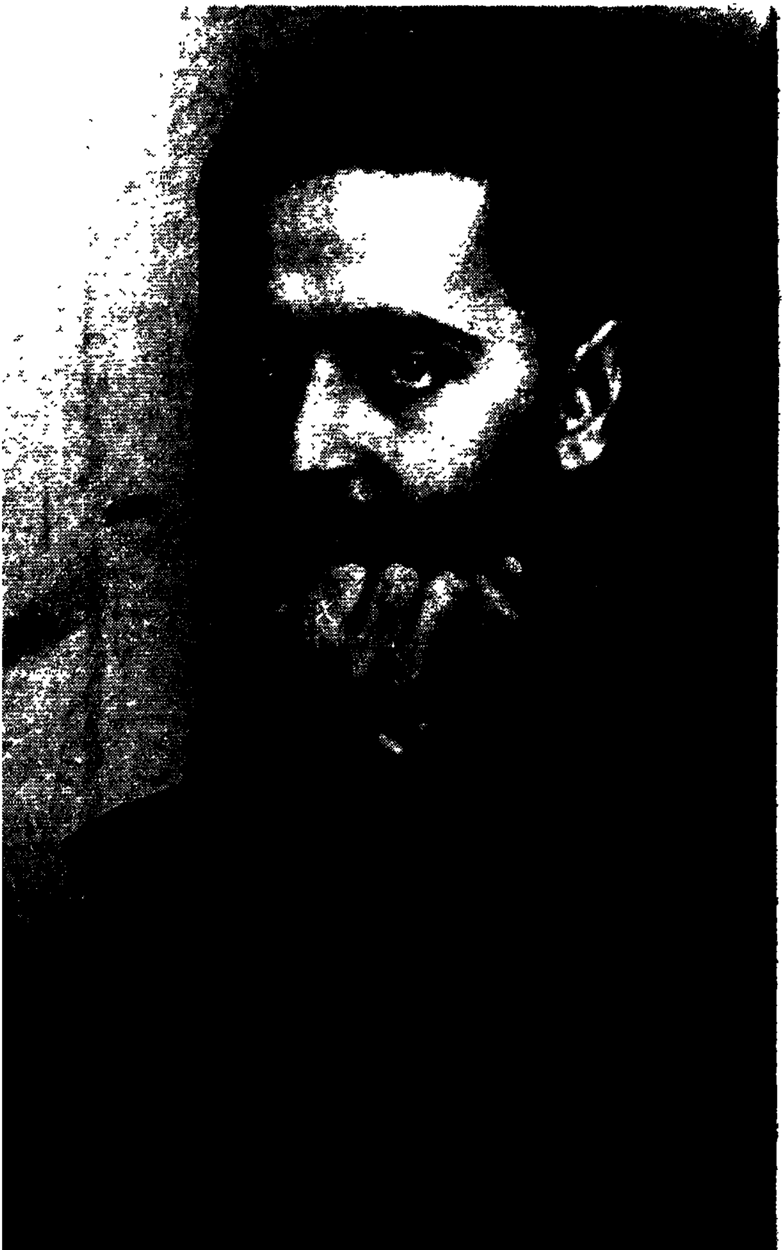
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

قیمت: -/75

پہلی بار: اگست ۱۹۸۸ء

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔



جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام

خزاں کے دور میں کیا کیا ستم نہیں گزرے　　　مگر نہ ہاتھ سے دامانِ رنگ و بو چھوٹا
شبِ درازِ تمنا دراز ہوتی رہی　　　نہ شوقِ گیسوئے لیلائے جستجو چھوٹا

ترتیب

فہرست تصاویر

۱۰ ـــ ذاکر صاحب رؤف بے اور جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ (۱۹۳۲ء)

۱۱ ـــ (دائیں سے) مجیب صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خالدہ ادیب خانم اور ذاکر صاحب

۱۲ ـــ اُستادوں کا مدرسہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۳۹-۱۹۳۸ ـــ جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ، دہلی کی ایک عمارت کے سامنے ذاکر صاحب، ان کے دائیں جانب سعید انصاری صاحب، اور بائیں جانب آپا جان مس گرڈا فلپس بورن

۱۳ ـــ جامعہ ملیہ اسلامیہ، اوکھلا کا ایک منظر

۱۴ ـــ (دائیں سے) خواجہ عبدالحمید، شفیق الرحمٰن قدوائی، معین الدین حارث اور ذاکر صاحب

۱۵ ـــ سیدنا مُلّا محمد طاہر سیف الدین، پنڈت جواہر لال نہرو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے ساتھ (۱۹۵۵ء)

۱۶ ـــ ذاکر صاحب (گورنر بہار)، بہار ودھان منڈل کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے۔

۱۷ ـــ ذاکر صاحب اپنی اہلیہ محترمہ اور بڑی بیٹی سعیدؔ خورشید عالم کے ساتھ

۱۸ ـــ (دائیں سے) مسز اندرا گاندھی، ذاکر صاحب، پنڈت جواہر لال نہرو ... اور مسز وجے لکشمی پنڈت

۱۹ ـــ شوق ہر رنگ ... (ذاکر صاحب خرطوم (سوڈان) میں سفارت خانۂ ہند کے اسکول کے بچوں کے ساتھ، ۱۹۶۳ء)

۲۰ ـــ ذاکر صاحب عصمت انونو کے ساتھ انقرہ میں (۱۹۶۵ء)

۲۱ ــ ذاکر صاحب احرام میں (۱۹۶۵ء)
۲۲ ــ ذاکر صاحب خان عبدالغفار خاں کے ساتھ کابل کے مضافات میں (۱۹۶۶ء
۲۳ ــ جمہوریۂ ہند کی صدارت کے انتخاب میں ذاکر صاحب کی کامیابی پر مسز اندرا گاندھی مبارک باد دیتے ہوئے
۲۴ ــ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین حلف لینے کے بعد۔ (دائیں سے) سنجیوا ریڈی، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ذاکر صاحب، وی۔ وی۔ گری اور کے۔ این۔ وانچو
۲۵ ــ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی کی جامع مسجد سے عید کی نماز کے بعد باہر آتے ہوئے
۲۶ ــ ذاکر صاحب راج گوپال چاری کے ساتھ
۲۷ ــ سفر آخرت
۲۸-۲۹۔ ذاکر صاحب کے اُردو خط کا عکس
۳۰ ــ ذاکر صاحب کے انگریزی خط کا عکس
۳۱ ــ ذاکر صاحب کے جرمن خط کا عکس

ابتدائیہ

خواجہ غلام السیدین نے ذاکر صاحب پر اپنے ایک مضمون کی ابتداء یوں کی ہے: "جب مہاتما گاندھی نے شہادت پائی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد لوگوں کو یقین نہیں آئے گا کہ ان جیسا انسان درحقیقت اس زمانے میں ہماری دھرتی پر پیدا ہوا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے اپنی شاندار زندگی بسر کی تھی۔ جس روز سے ڈاکٹر ذاکر حسین خدا کو پیارے ہوئے، کچھ اسی قسم کا خیال برابر میرے دل میں گھوم رہا ہے۔ ان کو قریب سے جاننے والوں کے لیے تو ان کی بھرپور زندگی پہلے ہی ایک افسانہ بن چکی ہے اور اگر کوئی ... ان کی مکمل سوانح حیات تصنیف کر سکے تو دوسرے لوگوں کے لیے بھی افسانہ بن جائے گی۔"

میں یہ دعوا تو نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب ذاکر صاحب کی ایک مکمل داستانِ حیات ہے، اس لیے کہ کسی شخصیت کو سمجھنا یوں بھی ایک خاصا مشکل کام ہے، نہ کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کو جو ہر لحاظ سے ایک پہلودار شخصیت ہے، یا ایک ایسے تہ دار حسین شعر کی دنیائے معنی جو اُن کی زندگی کی صورت میں ڈھل گیا ہو اور جس کی تشریح لوگ اپنے اپنے رنگ میں کرتے رہیں۔ مجیب صاحب جیسے باریک بیں مصنف اور بڑے ادیب نے، جن کا ساتھ ذاکر صاحب سے کوئی سینتالیس برس رہا جن میں وہ پندرہ برس بھی شامل ہیں جب وہ جامعہ ملیہ کے انتظامی معاملات میں شریک رہنے کی وجہ سے اُن سے بہت قریب تھے، اُن کی زندگی سے بھرپور، تہ دار اور اعمال و اقدار کے حسین امتزاج کی ترجمان شخصیت کی ایک بھی تصویر پیش کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا تھا۔

خود اپنا یہ حال ہے کہ ذاکر صاحب کی اس بایوگرافی کے تیار کرنے میں نہ معلوم کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے۔ کتابیں، مضامین، ریکارڈ کیے ہوئے انٹرویوز، ذاکر صاحب اور دوسروں کے خطوط، پرائیویٹ

پیچیدہ اور خود ذاکر صاحب کی وہ تمام تحریریں جن تک میری رسائی ہو سکی، بیسیوں اشخاص سے ملاقاتیں اور نہ جانے کیا کیا۔ اور ذاکر صاحب کے ساتھ اس ذہنی سفر میں میری نگاہِ تصور، اپنی حد بندیوں کے ساتھ انھیں جیسا دیکھ سکی اور جلال و جمال، اعمال و اقدار کے جس جس رنگ میں دیکھ سکی، اور دل نے جو کچھ محسوس کیا اور عقل ان سب کا جیسا کچھ تجزیہ کر سکی وہ سب بھی شاید اس شخصیت کا مکمل ادراک نہیں کہی جا سکتی۔ ذاکر صاحب ایک مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب میں عرب کا سوزِ دروں اور عجم کا حسنِ طبیعت تھا۔ ذاکر صاحب دمِ گفتگو نرم تھے اور دمِ جستجو گرم، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے اور وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں، ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جس کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب تیز آندھی میں بھی اپنا چراغ جلائے رکھتے تھے۔ ذاکر صاحب تہذیب کا اعلا نمونہ تھے، انھیں پھولوں سے بھی عشق تھا اور پتھروں سے بھی کہ وہ ایک سچے صوفی کی طرح ہر شے میں ایک ہی حقیقت کا جلوہ دیکھتے تھے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں اور واقعات و حقائق کی شہادت کے ساتھ ذاکر صاحب کی شخصیت کی بظاہر ایک جیتی جاگتی تصویر دکھائی جا سکتی ہے، لیکن ذاکر صاحب واقعی کیا تھے، اس کی دریافت کا کام جاری رہے گا۔

مجیب صاحب نے اپنے مضمون "ذاکر صاحب اور تعمیرِ جامعہ" کے آخری پیراگراف میں اُن چند خطروں کا ذکر کیا ہے جن سے "جامعہ کو ذاکر صاحب کی طبیعت نے بچایا جو صرف آزاد ہی نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے کسی کی گرفت میں نہیں آتی تھی۔" اور پھر کہا ہے کہ "انھوں نے نصیحت نہیں کی، براہِ راست رہنمائی نہیں کی، بس، عقدہ کُشِ عقل کا امتحان لیتے رہے۔ اخلاق اور علم کی ایک مثال بنے رہے جس کا حسن ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا اور جو ہر دیکھنے والے کو اس سوچ میں ڈال دیتی تھی کہ سراب کا جلوہ حقیقت ہے یا حقیقت سراب کا جلوہ۔" — اب کوئی بتائے کہ کسی کی گرفت میں نہ آنے والی اس طبیعت، علم و اخلاق اور عقل و عشق کی اس مثال کا طلسم کھلے تو کیونکر کھلے!

ذاکر صاحب نے اپنی خود نوشت نہیں لکھی۔ سوچتا ہوں کہ لکھتے تو وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کی داستان اور اس صنفِ ادب میں بے نظیر ہوتی۔ رشید صاحب نے بارہا اُن سے فرمائش

کی کہ وہ اپنی زندگی اور ہم عصروں اور ہم سفروں کے بارے میں کچھ لکھ ڈالیں۔ لیکن وہ تھوڑی دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے اور پھر رشید صاحب کا بے اختیارانہ اصرار جب اور بڑھتا تو مسکرا دیتے۔ اور بقول رشید صاحب "یہ مسکرانا اس طرح کا ہوتا جیسے میرا کہنا بھی درست تھا اور اس کا نہ مانا جانا بھی درست نہ تھا۔"

اب کوئی مجھ سے بجا طور پر یہ پوچھ سکتا ہے کہ 'آخر تم نے ذاکر صاحب کی بایوگرافی کیوں لکھی ؟' اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ امیر جامعہ جناب خورشید عالم خاں صاحب کا خیال تھا کہ مجھے لکھنا چاہیے' اور یہ صحیح ہے کہ اس طرف انھوں نے ہی توجہ دلائی۔ لیکن محض توجہ دلانے سے کچھ نہ ہوتا' اگر میں خود یہ محسوس نہ کرتا کہ یہ ایک موقع ہوگا ذاکر صاحب کی زندگی کے حالات اور ان کے افکار و خیالات کے سہارے نئی نسل کو' خاص طور پر مسلمانوں کی نئی نسل کو' ان اعلا اخلاقی و روحانی قدروں سے روشناس کرانے کا جو ان کی سیرت و شخصیت کے ریشے ریشے میں سما گئی تھیں اور جن کی ترجمانی اور خدمت گزاری سے خود اُن کی خوبصورت زندگی میں ایک نورانیت اور ایک مردِ حق شناس کی زندگی کی سی گہری معنویت پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ کہنے والے کے قول کے ساتھ اس کے عمل کو بھی دیکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب کہنے سے پہلے کر کے دکھاتے تھے' میں نے سوچا کہ خلوص و خدمت اور علم و عمل کے اس پیکرِ مجسم کی زندگانی سے شاید نئی نسل کو "نئی نگاہ" مل جائے کہ اس کی آج کے حالات کے اندھیروں میں سخت ضرورت ہے۔

یوں سمجھیے کہ ایک خوش نما باغ ہے۔ اس میں خوبصورت روشیں ہیں جن کے دونوں طرف رنگ برنگ پھولوں کے تختے ہیں' اور پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ان روشوں پر کوئی شخص بھی سرخوشی کے عالم میں اس بات سے بے خبر رہ کر گھوم پھر سکتا ہے کہ اس باغ میں ایک زیارت گاہ بھی ہے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کچھ ایسے ہی ایک باغ کے مانند تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس زیارت گاہ کو اس باغ میں تلاش کروں اور اُن لوگوں کو جو اس باغ کی سیر کرنا چاہتے ہیں' بتاؤں کہ یہاں اصل جگہ یہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اپنی اس کوشش میں کتنی کامیابی ہوئی ہے اکوشش اگر ناتمام ہے تو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی آرزو کہیں نہ کہیں زندہ رہے گی' اور اس طرح ایک اچھی اور پاک صاف زندگی

کی کہانی سُنی اور سُنائی جاتی رہے گی کہ اس سے بھی نیک خیال اور نیک عمل کی توفیق ملتی ہے۔

ایک خیال یہ بھی دامن گیر رہا ہے کہ مسلمان اپنی بے توفیقی کے سبب کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے جیسے محروم ہو گئے ہوں۔ وہ جب خاصا نقصان بھگت لیتے ہیں اور اُن کی ناسمجھی اور غلط روی کے خوفناک نتائج جب ان کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں، تو پھر رفتہ رفتہ انھیں اپنی زبوں کاریوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میرے اس خیال کی وضاحت عابد صاحب کے مضمون "ذاکر صاحب" کے اس اقتباس سے ہو جائے گی (عابد صاحب کا یہ مضمون ذاکر صاحب کی زندگی میں شائع ہوا تھا)۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جن مسلمانوں کو لوح تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ملمع کا مال کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا، اس لیے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں، زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے، لیکن ملمع کی عارضی چمک ماند پڑنی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی پایدار دمک بدستور موجود ہے۔ ممکن ہے کہ اب ہندستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔"

ذاکر صاحب کی اس سوانح کا اصل ماخذ یوں تو ذاکر صاحب کی تحریریں ہیں، لیکن ان کے قریبی اور ممتاز ساتھیوں اور معتبر معاصرین کی تحریروں سے بھی خاصا استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں اگر کہیں صاحب سوانح کی اپنی کہی باتوں سے کوئی اختلاف پایا گیا تو ظاہر ہے کہ ترجیح آخر الذکر ہی کو دی گئی ہے۔ ایسے ماخذ جو اصل اور ثانوی معاصر ماخذوں سے مطابقت رکھتے

ہیں قبول کر لیے گئے ہیں، عدم مطابقت کی صورت میں اُن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تاثراتی تحریروں سے زیادہ سے زیادہ بچنے کی کوشش کی گئی ہے، اور سنی سنائی باتوں کو نقل کرنے کے بجائے اصل واقعہ کی چھان بین کرنے پر وقت صرف کیا گیا ہے۔ قیاس اور تعبیر کو وہیں جگہ دی گئی ہے جہاں اپنے مطالعے اور تحقیق کے نتیجے بیان کرنے کے سلسلے میں وضاحت یا کسی واقعے سے متعلق معقول امکانات کی نشاندہی کی ضرورت سمجھی گئی ہے، لیکن اس سلسلے میں مبالغہ آرائی سے بچنے کی شعوری کوشش بھی کی گئی ہے۔ ایک بات یہ بھی کہ صاحب سوانح کے ذہن و فکر کا تشکیلی دور خاص طور پر مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر کا موضوع رہا ہے کہ ان کی سیرت و کردار کی نشو و نما کے مختلف مرحلوں کو سمجھنے میں اسی طرح کچھ مدد مل سکتی ہے۔ پھر توجہ اس پر بھی رہی ہے کہ ان کے افکار و خیالات اور طبیعت و محسوسات کے آئینے میں اُن کے عمل و ردِ عمل کو دیکھا جائے کہ درحقیقت اسی نہج پر ہم اُن کی زندگی کی نہایت و غایت کا کچھ سُراغ لگا سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذاکر صاحب کی زندگی سے متعلق سارا مواد ہمیں دستیاب تھا۔ ابھی بہت کچھ مل نہیں سکا ہوگا، اور رفتہ رفتہ ایسی چیزیں سامنے آتی رہیں گی جن سے معلومات میں اضافہ ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ کئی نتائج جو یہاں اخذ کیے گئے ہیں، ان سے متاثر بھی ہوں۔ بہرحال کوشش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ذاکر صاحب کی ایک وقیع بایوگرافی تیار ہو جائے جسے بنیاد بنا کر کوئی قابل اور باخبر شخص آیندہ ان کی ایک مفصل اور جامع سوانح حیات مرتب کر سکے۔ ذاکر صاحب کی زندگی کے بہاؤ اور اُن کی شخصیت کے رچاؤ کو جیسا کچھ کہ میں نے دیکھا اور سمجھا ہے، اسے دیانت داری سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی کوشش حرفِ آخر قرار نہیں دی جا سکتی۔ تشریحات و تعبیرات میں تو ہمیشہ اختلافِ رائے کی گنجایش رہتی ہے، اور یہاں تو معاملہ ذاکر صاحب کی تہ دار شخصیت کے اعمال و افکار سے متعلق ہے جن کی زندگی شعلہ و شبنم اور شیشہ و سنگ کے کھیل کی ایک دلآویز اور ولولہ انگیز داستان ہے۔

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا اگر امیرِ جامعہ جناب خورشید عالم خاں صاحب نے تقدس مآب سیدنا طاہر محمد برہان الدین صاحب بالقابہ کی امداد سے ضروری سہولتیں نہ فراہم کی ہوتیں۔ ہم محترم سیدنا بالقابہ کے تہِ دل سے منت گزار ہیں۔ امیرِ جامعہ کے توسط سے ہمیں بعض

نہایت ضروری کاغذات اور فائلیں دیکھنے کو ملیں، اور انھیں کی توجہ سے مغربی جرمنی کے سفارت خانے نے برلن یونی ورسٹی سے صاحب سوانح کے تعلیمی ریکارڈ سے متعلق اہم کاغذات کی فوٹو نقلیں منگوا کر دیں، جس کے لیے مذکورہ سفارت خانہ ہم سب کے شکریے کا مستحق ہے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر علی اشرف صاحب نے کہ وہ علمی کاموں کے صبر آزما تقاضوں سے خوب واقف ہیں، ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ میں ان دونوں حضرات کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ذاکر صاحب سے متعلق وہ تمام مواد جو انھوں نے بڑی محنت اور عقیدت سے جمع کیا ہے، دیکھنے کا موقع دیا اور لائبریری کے مہمان خانے میں آرام سے رکھا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، کی مولانا آزاد لائبریری کے سابق لائبریرین پروفیسر ایم۔ ایچ۔ رضوی اور اُن کے ساتھیوں کی اعانت کا شکر گزار ہوں، خصوصاً اپنے دوست ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کا جنھوں نے مولانا آزاد لائبریری سے استفادہ کرنے میں مدد اور ذاتی طور پر بھی مطلوبہ چیزوں کی فراہمی میں جدوجہد کی۔ نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی، کے دوستوں کا بھی ممنونِ احسان ہوں، ان کی کرم فرمائی سے مجھے اس لائبریری کے بیش بہا ذخیرے سے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی مدد ملی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے مخلصین کا شکریہ بھی واجب ہے کہ اس کے لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری کو میں نے موقع بے موقع اتنی زحمت دی کہ ان کے لیے وہ یقیناً پریشانی کا باعث ہوتی ہوگی، لیکن میں نے انھیں ہمیشہ خندہ پیشانی سے اپنا استقبال کرتے ہوئے پایا، اور پھر میں نے دیکھا کہ اس زحمت میں پوری لائبریری شریک ہے۔ انصاری صاحب سے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال سے بھی بہت فائدہ ہوا۔ میں انصاری صاحب اور لائبریری کے اُن کے سب ساتھیوں کا شکر گزار ہوں، خصوصاً نادر کتابوں اور رسالوں کے سیکشن کی انچارج محترمہ نگار نعمانی کا جنھیں انصاری صاحب سے خندہ جبینی کی اچھی تربیت ملی ہے۔ لائبریری کے آرکائول سیل کے محمد عارف صاحب اور زہرہ رشید صاحبہ نے بھی خاصی مدد کی ہے، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جن بزرگوں اور دوستوں نے ذاکر صاحب کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور جن سے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال ہوتا رہا، ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ میں ان تمام حضرات کا منت گزار

ہوں، اور ان میں الحاج جناب عبید الرحمٰن خاں شروانی، جناب کرنل سید بشیر حسین زیدی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی اور ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا خصوصیت کے ساتھ کہ ذاکر صاحب سے متعلق بعض معلومات انہیں سے حاصل ہو سکی تھیں۔ سید بشیر حسین زیدی صاحب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، سید شہاب الدین دیسنوی صاحب، نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی صاحب، پروفیسر مل پرشاد صاحب، جنین سید صاحب، اسرار جامعی صاحب اور ڈاکٹر صغرا مہدی صاحبہ نے ذاکر صاحب کے خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔ میں ان سب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عزیزی محمد اسحٰق صاحب ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں میرے رفیق اور اڈیٹوریل اسسٹنٹ ہیں۔ کاپیوں کے پڑھنے اور اشاریہ کے ترتیب دینے میں انھوں نے میری بہت مدد کی، اور لائبریری میں بھی حوالوں اور تصویروں وغیرہ کی تلاش میں وہ میرے اور شہاب الدین انصاری صاحب کے معاون و مددگار رہے۔ ایس، ایم، مظہر صاحب نے پیری کی تکلیف کے باوجود کمر ہمت باندھی اور پوری کتاب کی کتابت کرکے اپنے خوشنویس قلم سے اسے زینت بخشی۔ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں شروع ہی سے مشوروں میں شریک رہے، تصویروں کے انتخاب میں خالص تکنیکی نقطۂ نظر سے ان کا مشورہ بڑا قابل قدر ہوتا ہے اور طباعت کی سب نزاکتوں کو وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اس میدان میں اُن کا تجربہ بڑا وسیع ہے، انھوں نے زیورِ طباعت سے اس ضخیم کتاب کو آراستہ کرکے ایک بڑا کام انجام دیا! جامعہ کے میرے آرٹسٹ دوستوں جناب ظہور احمد زرگر اور جناب راجیو لوچن نے ٹائٹل کور کا ڈیزائن بنانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ میں ان عزیز دوستوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس سلسلے میں، میں اپنی اہلیہ کے پُرخلوص تقاضوں کا بھی ممنون ہوں اور انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو اس کام کو جلد از جلد ختم کر دینے سے متعلق اُن کی طرف سے ہوتے رہے ہیں، اور وہ غالباً اس لیے کہ اب ہم دونوں کی زندگی کا قافلہ ذرا اور تیز رفتار ہو گیا ہے، اور آخری منزل زیادہ دور نہیں رہ گئی ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

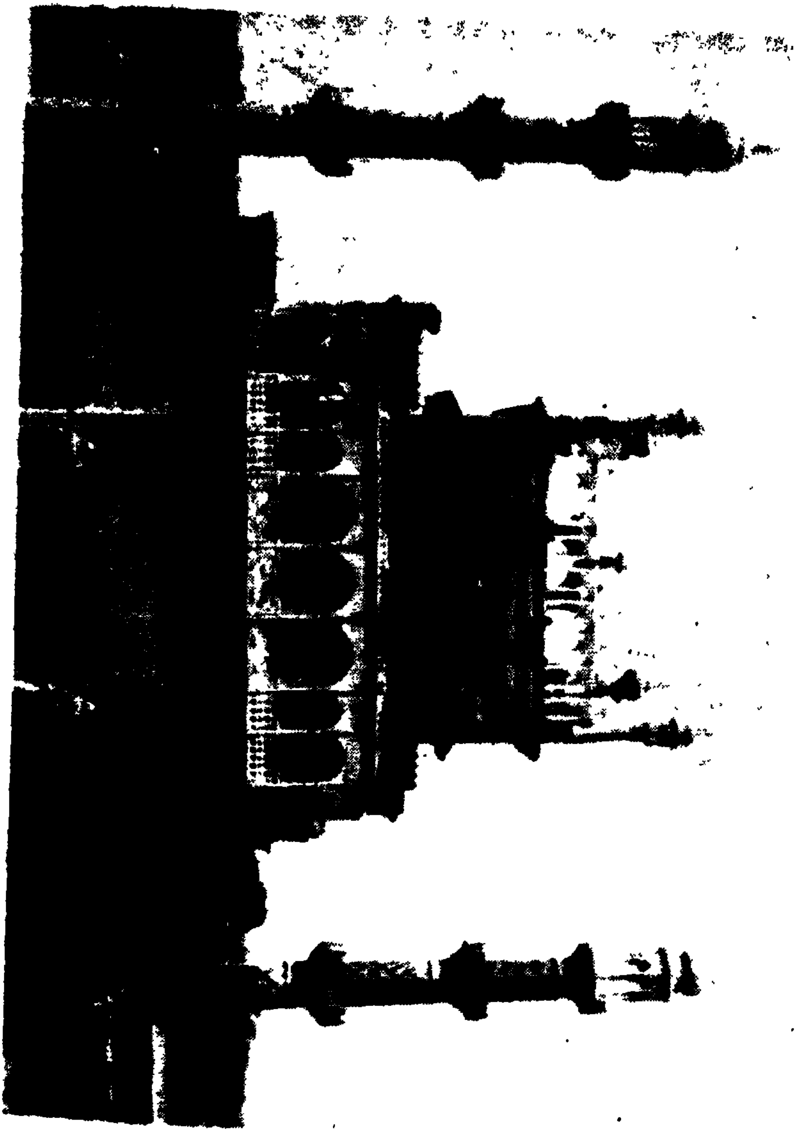
جامعہ ملیہ اسلامیہ
۷ر جولائی ۱۹۸۸ء

ہمہ سوز ناتمامم، ہمہ درد آرزویم
بہ گماں وہم یقیں را کہ شہید جستجویم

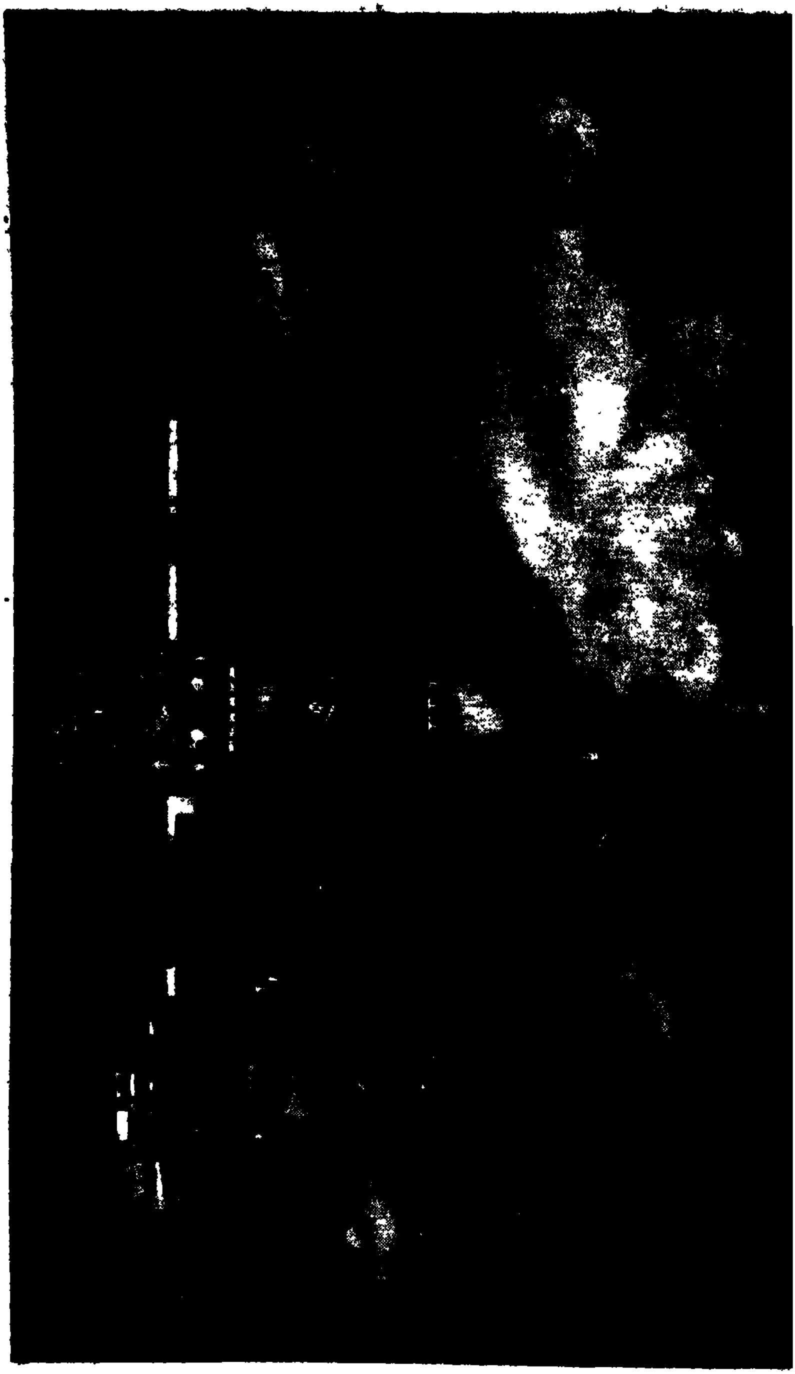


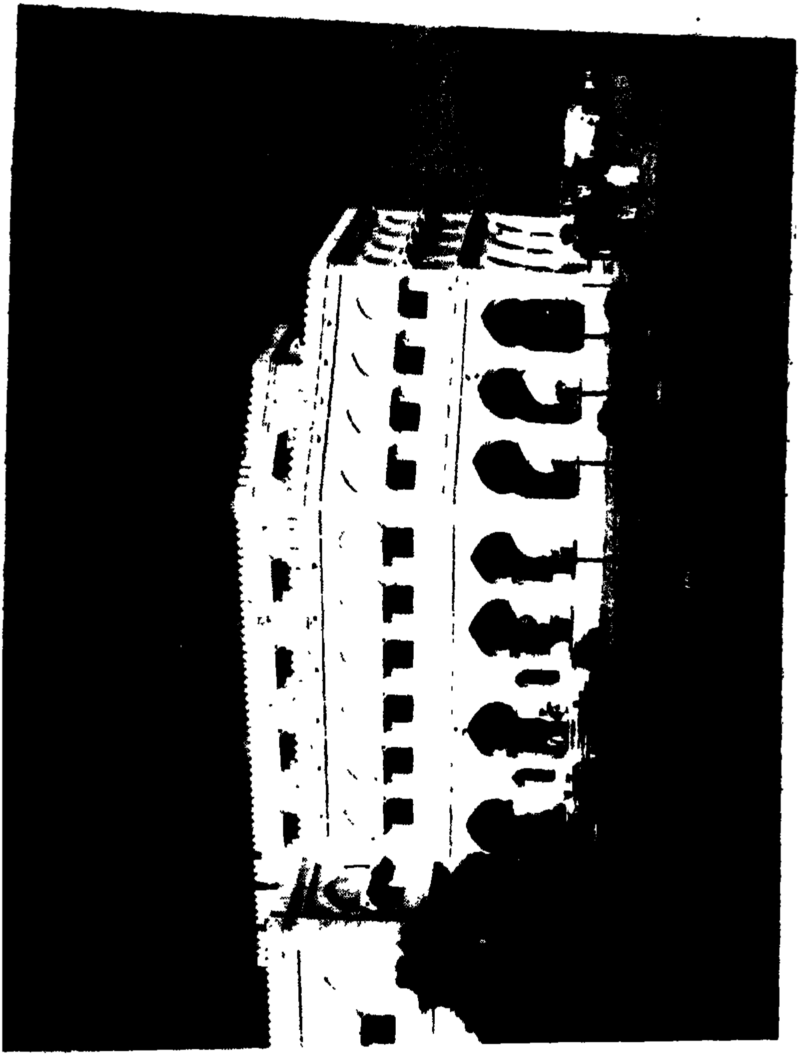


5





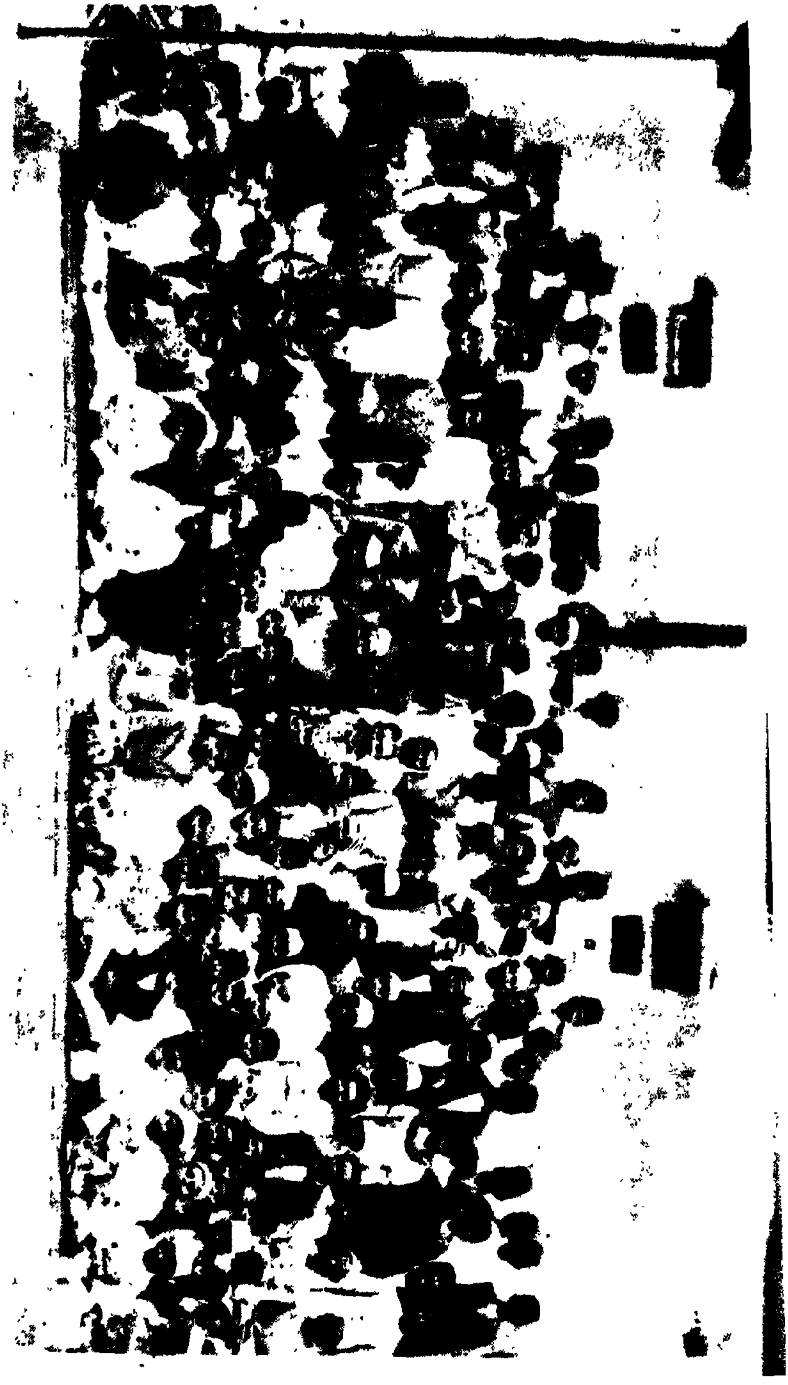




9



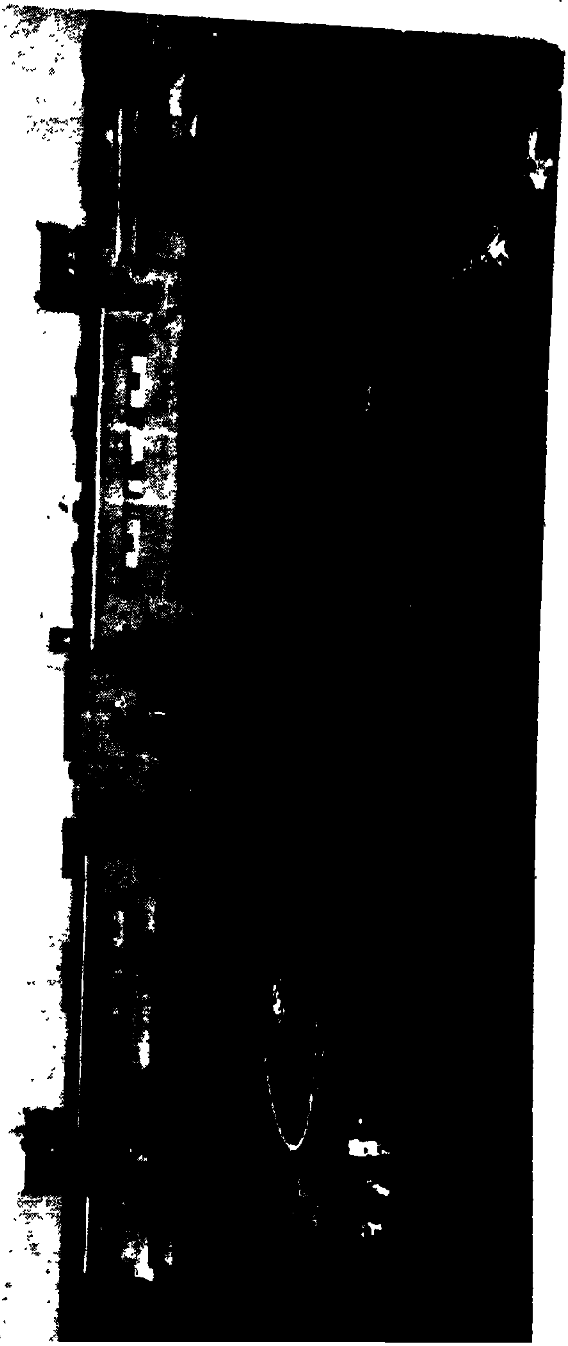






13





15















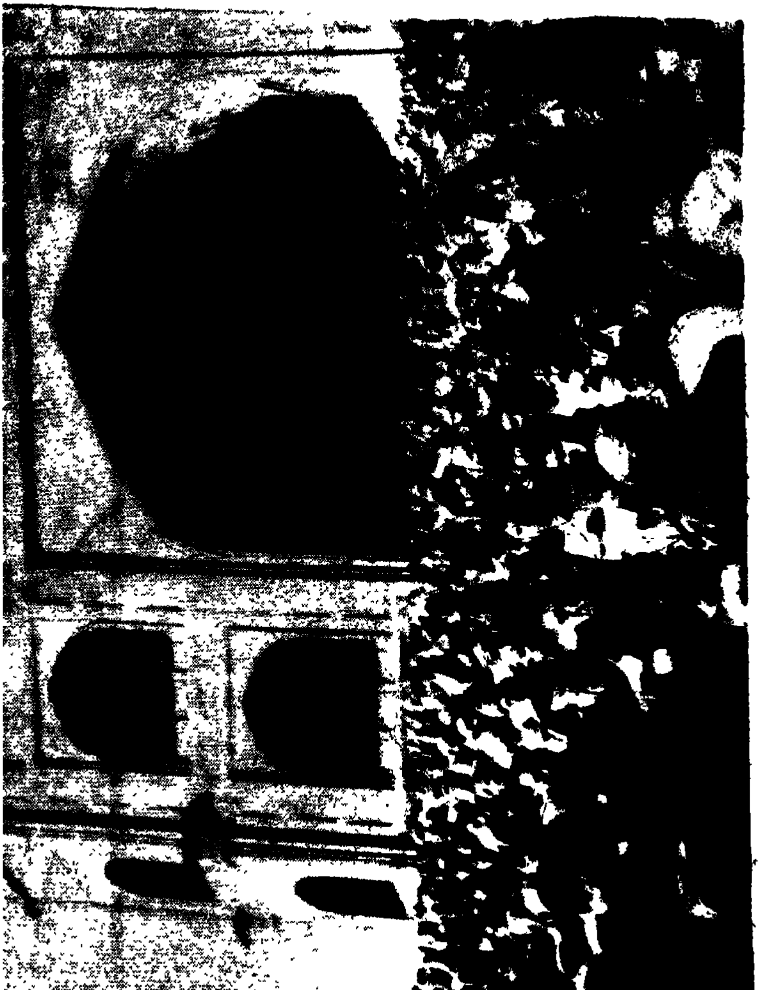






25









۷۸۶

یونیورسٹی ... اسعد

۳۶۰

تلگرافیه «جامعه» دهلی

تیلیفون ـــ ۲۲۱۹

نمبر ـــ [illegible]

جامعه ملیه اسلامیه دهلی

مورخه ـــ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Vice-Chancellor

MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

My dear Nawab Sahib,

It might come to you as a surprise and I think I must share with you a decision which I have come after long, prayerful and prayerful deliberation. I have decided to sever my connection with the University and to resign the Office of the Vice-Chancellor. The state of my health is the chief reason for this decision and the other considerations, almost all of them, flow out of it. I feel the direction of the policy of the University slipping out of my hands and I have not the necessary strength or energy to stop it. The best thing I can do in the circumstances is to make room for some one else who will be able to discharge the responsibilities of the Office more effectively and adequately. I do not wish to cause unnecessary & avoidable embarrassment to the University by making a sudden announcement. I am anxious to avoid [illegible] till the University is getting [illegible] Students back can be resumed in

Cromwell – (Carlyle; · Ranke; – Wolfgang Michael 1907

Kapitel: Das Kolonialreich des 17. Jahr. – Kampf mit Holland! — 1 Besiedlung N. Amerikas 2. Kampf gegen Holland 3. Kampf um Westindien – [illegible] des 17. Jahrhs. und tief von Puritanismus beeinflußt

Barnstädter – 1 Die Besiedlung N. Amerikas
Luckwaldt.

Anfangs Virginien und Neu England erst besiedelt – Menschenmaterial Puritaner – Virginien direkt von der Regierung verwaltet – Großgrundbesitz und Plantagen in Virginia weiße Herrn, schwarze Sklaven; aristokratisch Siedler = Planters = Ausfuhr von Tabak, Mais etc keine selbständige Kultur.

Selbständige Kultur entwickelt sich im Norden Farmers – Handwerker – keine Aristokratie Klein Besitz – niederer Mittelstand – Townships Das ganze Leben demokratisch, puritanisch – kein Toleranz: Hier fanden Sie ihre Zuflucht: Hier wollten sie auch allmächtig sein – kalvinistische Energie und kalvinistische Ausschließlichkeit.

پہلا باب

پس منظر اور خاندان

پٹھانوں نے جنھیں افغان بھی کہتے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ جب وہ شمال مغربی سرحدی علاقے سے آکر ہمالیہ کی ترائی، دوآبے، بہار و بنگال و اڑیسہ اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں میں بس گئے تو ملکی زندگی کے مختلف گوشوں میں ان کا اثر محسوس کیا گیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں انھوں نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، وہ نہ ہوتے تو یہ کام بھلا یا بُرا کوئی اور کرتا، اور ان کے ہوتے ہوئے دوسروں نے کیا بھی، لیکن ان کی مہم جویانہ خصوصیات کے اعتراف کے ساتھ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے عہدِ وسطیٰ کی صدیوں میں ہندستان میں سیاسی استحکام لانے میں ترک سلاطین کی بہت مدد کی اور سماجی سطح پر مقامی حالات سے مناسب طور پر توافق کرکے ہند اسلامی تہذیب کے ارتقاء کے عمل میں اہم رول ادا کیا۔

ہندستان اور افغانستان کے سرحدی علاقے سے قبائلیوں کی ہجرت کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس نقل و حرکت کی وجہ کبھی کبھی مہم جوئی کے جذبے کی تسکین کے موقعوں کی تلاش، لیکن زیادہ تر اصل محرک اس کی معاشی ہوتی تھی اور ہندستان کی وسعت، زرخیزی اور خوشحالی میں سرحد کے رہنے والوں کے لئے یوں بھی ایک خاص کشش تھی۔ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ اس لئے بارہویں صدی عیسوی

کے ختم ہوتے پنجاب میں جب ترکوں نے اپنا اقتدار جمایا اور تیرہویں صدی کے آغاز سے جب دہلی پر ترکوں کا تسلط قائم ہوا، اور انھیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ سرحدی راستے نہ صرف دشمنوں سے محفوظ بلکہ تجارت و ثقافت اور ایران و خراسان اور وسط ایشیا سے منگولوں کی تاخت و تاراج سے اُجڑ کر آنے والے انسانوں کے قافلوں کے لیے کُھلے بھی رکھنے ہیں، تو ترک سلاطین نے سرحدی پٹھانوں کی شجاعت اور جوانمردی کا فائدہ اُٹھایا اور منگولوں کے پے بہ پے حملوں سے ہندستان اور سلطنت دہلی کو بچانے کے لیے سرحد اور پنجاب کے علاقے میں جو قلعے تعمیر ہوئے، ان کے تحفظ و مدافعت میں پٹھانوں کی قوت بہت کام آئی۔ لیکن منگولوں کے حملوں کے سبب سرحد کے پٹھان منتشر بھی ہوتے رہے۔ کچھ افغانستان کی طرف گئے اور کچھ ہندستان آئے۔ ہندستان میں ترکوں کو مقامی سرکش اور حریت پسند لوگوں کو بھی قابو میں رکھنا ہوتا تھا، اس وقت ترکوں کی نہ تو اتنی تعداد تھی اور نہ انھیں مقامی لوگوں کی اتنی تائید ہی حاصل تھی کہ وہ پٹھانوں کی مدد کے بغیر ملک میں امن و امان قائم کرسکتے اور سلطنت کو مستحکم بناسکتے۔ اس کے علاوہ سلطنت کی فوجوں کو غذا اور ضروری سامان فراہم کرنے اور ان کی آمد و رفت کے وقت سپلائی لائن کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی ایک معتمد طبقے کی موجودگی ضروری تھی۔ اس لیے التتمش اور بلبن کے زمانے ہی سے ہندستان کے خلاف علاقوں میں پٹھانوں کی بستیاں بسنے لگیں۔

بلبن نے دوآبے کے علاقے میں، خاص طور پر کمپل اور پٹیالی کے نواح میں پٹھانوں کو آباد کیا، پٹھانوں کے ساتھ کچھ ترک خاندان بھی تھے۔ بلبن خود وہاں تقریباً چھ مہینے مقیم رہا اور گڑھیاں تعمیر کرائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے میں دوآبے کے سب سے زیادہ سرکش لوگ آباد تھے اور انھیں قابو میں رکھنا امن و امان کے لیے ضروری تھا۔ کمپل گنگا کے کنارے ضلع فرخ آباد میں ہے۔ یہاں گنگا کے کنارے کنارے موجودہ رائے پورے لے کر پُرانی ڈانگ اور پہاڑی سے ہوتی ہوئی عطائی پور تک پٹھانوں کی بستیاں پھیل گئیں۔ آبادکاری کا یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا۔ خلجیوں اور لودیوں کے زمانے میں بھی اس علاقے میں افغان قبیلے وقتاً فوقتاً آآکر آباد ہوتے رہے جن

میں عظمی، بنگش اور بنگش خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

اس علاقے سے گنگا کے شمال میں روہیلکھنڈ کے علاقے میں پٹھانوں کی آبادکاری کا سلسلہ سلطان التتمش کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا اور وہاں پٹھان سردار مضبوط اور مستحکم تھے۔ اب بلبن کے عہد سے وسطی دوآبے میں آبادکاری کا یہ سلسلہ پھر شروع ہوا اور رفتہ رفتہ وسطی دوآبے کی پٹھان بستیاں شمالی ہند میں پٹھانوں کا دوسرا بڑا مرکز بن گئیں۔ گنگا کے شمال اور جنوب کی ان افغان قبائل کی بستیوں کے درمیان تجارت اور شادی بیاہ کے مراسم بھی قائم رہے' اور دوستی اور دشمنی کے تعلقات بھی دیکھنے میں آتے رہتے تھے۔ فرخ آباد کی ریاست قائم ہو جانے کے بعد دوستی کم رہی اور دشمنی زیادہ: روہیل کھنڈ اور پرگنہ کمپل کے نواح میں افغان قبائل تاریخ کے مختلف دوروں میں اتنی بڑی تعداد میں نقل وطن کر کے آباد ہوئے کہ ان میں بعض قبیلوں کے نام خود افغانستان اور سرحد پر باقی نہیں رہے لیکن ہندستان میں ان کے اخلاف کی بدولت ان کے ناموں کا پتا چلتا ہے اور ان میں سے بعض آج تک موجود ہیں[1]۔"

لودیوں کے بعد جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو گویا یہ پٹھانوں کی عمومی شکست کا اعلان تھا جسے ان کے منچلے اور مہم جو سرداروں نے آسانی سے قبول نہیں کیا اور پورے مغل دور میں وہ مغل حکومت کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان ہی میں ایک شیر شاہ سوری بھی تھا جس کی پیشانی پر بابر نے بادشاہی کے آثار دیکھ لیے تھے۔ شیر شاہ پٹھانوں کے بہترین اوصاف کی نمایندگی کرتا تھا۔ اس میں انصاف پسندی، شرافت اور مروّت تھی، شجاعت اور ہمت تھی، فراخ حوصلگی اور نظر کی وسعت تھی۔ وہ بڑا مدبّر اور اچھا منتظم تھا، ایک سچے مسلمان کی طرح عدل و انصاف اور عام انسانی سلوک میں وہ مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز نہیں کرتا تھا' وہ ہندستان کو اپنا وطن تصور کرتا تھا اور مغلوں کو بیرونی حملہ آور، اس نے اپنے

۱۔ یوسف حسین خاں' یادوں کی دنیا' معارف پریس' ۱۹۶۷ء' صفحات ۸-۷

دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ وہ ہندستان سے مغلوں کو نکال کر رہے گا' اور اپنے اس عزم میں وہ اپنی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس کی تعمیرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں جمالیاتی ذوق بھی تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ پٹھانوں نے ہندستان کو دو بڑے شریف النفس اور مدبّر سربراہ مملکت دیے ہیں' ایک عہد وسطیٰ میں' اُس عہد کی تمام محدودیت کے ساتھ' یعنی شیر شاہ سوری (م ۱۵۴۵ء) اور دوسرے اس عہد جدید میں ڈاکٹر ذاکر حسین (م ۱۹۶۹ء) جو 'جدید' ہوتے ہوئے بھی اُس ہند اسلامی تہذیب کے تسلسل کے بہترین ترجمان تھے جس کا خمیر عہد وسطیٰ میں تیار ہوا تھا اور جس کا نمایندہ ایک حد تک شیر شاہ سوری بھی تھا[1]۔

اکبر جیسا جلیل القدر حکمراں بھی پٹھانوں کی بغاوتوں سے کافی پریشان رہا' اسے بار بار ان کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں' سرحدی علاقے میں ایک بزرگ شیخ بایزید جلالہ نے ایک نئے فرقے کی جسے روشنائی فرقہ کہا جاتا ہے' بنیاد ڈالی اور آفریدیوں اور بنگشوں میں اپنا حلقۂ اثر قائم کیا۔ جہانگیر کے عہد میں شیخ بایزید جلالہ کے پوتے اللہ داد خاں نے جو بعد میں تاریخ میں نواب رشید خاں کے نام سے مشہور ہوئے مغلوں کے خلاف آفریدی اور بنگش پٹھانوں کو جن میں روشنائی فرقہ بہت مقبول تھا' منظم کر کے شورش برپا کی' مہابت خاں نے یہ دیکھ کر کہ مغلوں کی فوج ان کی شورشوں پر قابو نہیں حاصل کر پا رہی ہے' ان کے سرداروں کو انعام و اکرام سے رام کرنے کی تدبیریں کیں[2]۔ اس نے اللہ داد خاں کی بڑی خاطر

۱۔ شیر خاں سوری (جو بعد کو شیر شاہ ہوا) اپنے قیام بہار کے زمانے میں شیخ بڈھ دانا پوری کا جو اس عہد کے ایک مقبول طبیب، عالم اور بزرگ تھے، بڑا معتقد تھا اور ان کی جوتیاں سامنے لاکر رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ (مولوی رحمان علی' تذکرۂ علمائے ہند' اردو ترجمہ: محمد ایوب قادری' کراچی' ۱۹۶۱ء' صفحہ ۱۲۹)

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مآثر الامرا اور دوسری متعلقہ کتابیں۔

ملاقات کی اور انھیں سمجھا بجھا کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ شاہی منصب و جاگیر قبول کر لیں۔ اللہ داد خاں جہانگیر کے دربار میں پیش ہوئے۔ انھیں اختیار دیا گیا کہ شمالی ہندوستان میں جو افغان آبادیاں ہیں، ان میں جہاں بھی چاہیں سکونت اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے پرگنہ کٹھل میں پرانی ڈانگ کے علاقے کو پسند کیا۔ یہاں انھوں نے ایک گڑھی تعمیر کرائی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ بستی اس وقت سے مئو رشید آباد کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے زمانے میں بعض آفریدی اور بنگش قبائل ترک وطن کر کے مئو رشید آباد اور اس کے نواح میں آ کر آباد ہو گئے۔[1]

یہ شاہجہاں تھا جس نے اللہ داد خاں کو نواب رشید خاں کا خطاب عطا کیا اور انھیں تلنگانہ (دکن) کا ناظم مقرر کیا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی اور بیٹے کو بھی شاہجہاں نے منصب اور جاگیر سے نوازا، وہ دونوں دکن ہی میں رہے اور وہیں کی خاک میں دفن ہوئے، البتہ نواب رشید خاں کی میت ان کی وصیت کے مطابق ان کے بھائی الہام اللہ خاں مئو رشید آباد لائے تھے جہاں انھیں گنگا کے کنارے جس کی یاد نواب مرحوم کو دکن میں چین سے رہنے نہ دیتی تھی، انھیں کے تعمیر کردہ باغ میں دفن کیا گیا۔ آج بھی ان کا مزار اور مقبرہ موجود ہے اور محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔

سرحدی قبائل، خصوصاً بنگشوں کا شمالی ہندوستان آنے کا سلسلہ اورنگ زیب کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی جاری رہا۔ خصوصاً بنگش لوگ بڑی تعداد میں مئو رشید آباد میں آ کر بس گئے۔ انھیں میں ایک محمد خاں بنگش ہوئے جنھوں نے اٹھارویں صدی کے نصف اول میں بڑا نام کمایا اور اپنی دلیری، مہم جوئی، تنظیمی صلاحیت، اور مساوات و مروت کے اصولوں پر اپنے عمل کی زندہ جاوید داستانیں چھوڑ گئے۔

1۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحات ۱۱-۱۰

محمد خاں بنگش

محمد خاں بنگش میں نوجوانی ہی سے اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے، انھوں نے ان پٹھان جوانوں کی ایک جماعت تیار کی جن کا دل باغات اور کاشتکاری میں نہیں لگتا تھا، اور انھیں مہم جوئی کے لیے فوجی لحاظ سے منظم کیا، رفتہ رفتہ وسط ہند اور راجپوتانہ کے رجواڑوں میں جہاں شمالی ہند کے پٹھان سپاہیوں کی بڑی قدر اور مانگ تھی، ان کے سپاہیوں کی بہادری کی وجہ سے ان کا رسوخ بڑھا اور ان کی دھاک وسط ہند اور راجپوتانہ میں بیٹھ گئی۔ ہوتے ہوتے ان کی یہ شہرت دہلی تک پہنچی کہ محمد خاں بنگش جس کی حمایت پر ہوں اُسے ضرور کامیابی ہوتی ہے۔

۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کی تخت نشینی ہوئی، اس میں محمد خاں بنگش کا بڑا حصہ تھا۔ فرخ سیر نے انہیں نواب کے خطاب اور چار ہزاری منصب سے نوازا اور بندیل کھنڈ میں جاگیر عطا کی، اب محمد خاں بنگش کا شمار سلطنت کے اہم امیروں میں ہونے لگا۔ اسی سال (۱۷۱۳ء) نواب بنگش نے اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا۔ اور اس کے اگلے سال فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد بسایا اور اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ محمد شاہ کے عہد میں ان کے مراتب اور بڑھے۔ غضنفر جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب ملا، جاگیر دی گئی اور پہلے الٰہ آباد اور پھر مالوہ کے گورنر بنائے گئے، اسی زمانے میں انھوں نے نظام الملک آصف جاہ سے مل کر مرہٹوں کو قابو میں رکھنے کی تدبیریں کیں۔

محمد خاں بنگش نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔ وہ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھے اور مرتے دم تک اپنی سپاہیانہ وضع نہ چھوڑی، دہلی کے امیر امراء جن کے رکھ رکھاؤ میں عام طور پر تصنع ہوتا تھا، محمد خاں بنگش کی سادگی اور وضعداری کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ پٹھانوں کی حمیت، غیرت اور مساوات کے نہ صرف قدردان تھے بلکہ وہ خود بھی ان خصوصیات کے حامل تھے۔ ان سے متعلق یہ واقعہ بہت مشہور ہے: "نواب

ہوجانے کے بعد بھی محمد خاں بنگش اپنے وطن مئو رشید آباد آیا کرتے تھے، ایک دفعہ جب وہ ہاتھی پر سوار مئو کی گلیوں سے گزرے تو پٹھانوں کے لڑکوں نے غلیلوں سے ڈھیلے مارے۔ پٹھانوں کو اعتراض تھا کہ محمد خاں بنگش جب اپنے ہاتھی پر سوار گزرے تو ان کی عورتوں کی بے پردگی ہوئی۔ محمد خاں بنگش کو پٹھانوں کی یہ ادا پسند آئی، چنانچہ انھوں نے آیندہ سے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ مئو رشید آباد میں داخل ہونے سے قبل ہاتھی کو چھوڑ، گھوڑے پر سوار ہو، بستی میں داخل ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہم قوم پٹھانوں کے مساوات کے اصول کی قدر کرتے تھے۔ کوئی اور نو دولتیا ہوتا تو بُرا مانتا' اور اسے اپنی توہین سمجھتا۔[1]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ محمد خاں بنگش کے غلام چیلے کہلاتے تھے۔ انھیں کے نام پر دہلی میں کوچہ چیلان آج تک چلا آتا ہے۔ محمد خاں بنگش اور ان کے بیٹوں اور چیلوں کو نئے نئے گنج بسانے کا بہت شوق تھا جہاں مقررہ دنوں میں پینٹھ لگتے تھے۔ قائم گنج کے علاوہ کاس گنج، علی گنج، کوڑیا گنج، نبی گنج، کمال گنج، اسلام گنج اور دلیر گنج کی منڈیاں اسی زمانے میں قائم ہوئیں۔[2]

قائم گنج میں، جب وہ آباد ہوا تو سرحدی پٹھان آ آکر بستے رہے، خاص طور پر آفریدی اور ختک قبائل بلا کر بسائے گئے، ختک لوگ رائے پور میں آباد ہوئے جہاں پہلے سے ان کی برادری کے لوگ موجود تھے۔ آفریدیوں نے قائم گنج میں اپنے محلے بسائے جن کے نام یہ ہیں: چلولی، کوکی خیل، دمدمہ، کلاں خیل، کبیر پور، سرایاں، چلانگا، حسن خیل، گڑھی، شکل خیل، مول خیل، پتورہ، سبحان پور، غلامی اور یحییٰ پور۔ قائم خاں جن کے نام پر قائم گنج آباد ہوا تھا' روہیلوں کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ اس لیے ۱۷۴۲ء میں محمد خاں بنگش کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا بیٹا

۱۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۵

۲۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۵

احمد خاں بنگش ان کا جانشین ہوا، بعد میں فرخ آباد کے نوابین ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار ہو گئے تھے۔ لیکن عام پٹھانوں کی حریت پسندی اس سے مجروح نہیں ہوئی تھی، چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قائم گنج کے پٹھانوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور نتیجہ میں اس کی ناکامی کے بعد سیکڑوں پٹھانوں کو پھانسی کی سزا ملی۔ جو ہاتھ لگا، پکڑا گیا، نہ داد نہ فریاد۔ قائم گنج کے پٹھان اسے کبھی بھولے نہیں اور ان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ہمیشہ موجود رہا۔

ذاکر صاحب کے مورث اعلا

اسی قائم گنج میں ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ کوہاٹ کے علاقے سے آنے والے آفریدی پٹھانوں میں ذاکر صاحب کے مورث اعلا حسین خاں بھی تھے جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے مدآخون (بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے، ان کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حسن خاں بھی تھے جن کے نام پر حسن خیل محلہ ہے۔ قائم گنج آنے سے پہلے مدآخون کا مشغلہ درس و تدریس تھا، یہاں آنے کے بعد بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے بہت طویل عمر پائی، کہتے ہیں کہ وہ سو سال سے زیادہ زندہ رہے، یہی وجہ ہے کہ قائم گنج میں بھی اُن کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تھی اور انھوں نے مؤرشید آباد کے پٹھانوں کی کئی پشتوں کو تعلیم و تربیت دی تھی، اسی لیے وہ اپنے زمانے میں بڑے معزز اور محترم تھے اور عام طور پر مؤ اور قائم گنج کے پٹھان ان کے گرویدہ تھے۔ وہ ایک اچھے عالم اور صوفی باصفا تھے، بہت سے پٹھان ان کے مرید تھے اور بے شمار لوگ ان سے عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ ان کا مزار قائم گنج کے سب سے قدیم قبرستان نندو خاں میں ہے۔ آج بھی پٹھان وہاں عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مدآخون کی اولاد گڑھی، سرایاں اور شکل خیل میں خوب پھلی پھولی۔ انھیں محلوں میں ذاکر صاحب کی ددھیال کی عزیز داری تھی۔

مدآخون کے بیٹے احمد حسین خاں اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں تھے

جنھوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ رجواڑوں میں گزرا۔ وہاں سے واپسی پر کھیتی باڑی اور باغات لگانے کا مشغلہ تھا۔ محمد حسین خاں کے بیٹے ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین خاں تھے جو وطن میں جمعتی خاں کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے دکنی کنٹنجنٹ میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ وہ افسر الملک کے ساتھیوں میں تھے اور دونوں میں دانت کاٹی دوستی تھی۔ یہ افسر الملک وہی ہیں جنھوں نے میر محبوب علی خاں نظام دکن کی ملازمت میں بڑی ترقی کی اور نظام کا اعتماد حاصل کیا۔ افسر الملک چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین حیدرآباد میں رہیں، لیکن ان کی آزاد منش طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ قائم گنج کی آزاد فضا پر حیدرآباد کی درباری کی تصنع و تکلف سے بھری زندگی کو ترجیح دیں۔ ملازمت کے بعد وہ قائم گنج چلے آئے۔

غلام حسین خاں شکل و صورت سے بڑے وجیہ، بارعب اور باوقار تھے۔ "قد اونچا، جسم بھاری، فولاد کی طرح گٹھا ہوا اور مضبوط، رنگ سرخ و سپید، بھنویں اور داڑھی گھنی" اور آواز میں کرارہ پن جو آخر تک باقی رہا۔ حق پسندی، صاف گوئی اور دلیری طبیعت کا شعار تھا۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو ان کے نزدیک بس ایک آدمی تھا، ایسا انسان ملازمت بھی ایک وقار سے کر سکتا ہے۔ غلام حسین خاں فوج میں رہے تو "بڑی آن بان سے رہے۔ قائم گنج آئے تو کسی دولت مند کے سامنے اپنے کو ہیٹا نہیں سمجھا۔ اگرچہ خود دولت مند نہ تھے لیکن دولت مندوں سے اپنا احترام کرانا جانتے تھے۔" دوسری طرف یہ حال تھا کہ غریبوں، مسکینوں اور کمزوروں کے ساتھ انکساری تھی۔ ان کے دروازے سے کوئی مانگنے والا خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ محلے کی بیواؤں کا سودا سلف بازار سے لا دیا کرتے اور اس پر خاص توجہ رکھتے کہ ان کی روزمرہ کی ایسی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے ہوتے محلے میں کسی پر زور زبردستی اور ظلم کرے۔ غلام حسین خاں جس کے دوست ہوتے اس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ انھیں دشمن بنانے کی بہت کم لوگوں میں

ہمت تھی۔ مزاج میں سختی اور غصے کے ساتھ رحم تھا۔

ذاکر صاحب کے دادا کو قائم گنج کے ایک درویش کرم علی شاہ میاں سے بڑی عقیدت تھی، ان کی خدمت میں خاصا وقت گزارتے اور ان کی خواہشوں کو خوشی سے پورا کرتے۔ انھیں "بنس بہاری سے بھی عقیدت تھی جن کا مسلک کبیر داس کی طرح صلح کل تھا۔ وہ موحد تھے، بت پرستی اور ذات پات کو نہیں مانتے تھے، مسلمانوں کے ہاتھ کا کھاتے تھے اور ان کے ساتھ رہنے سہنے میں بھی انھیں عذر نہ تھا۔ اپنی رواداری اور وسیع مشربی کے باعث پٹھانوں میں مقبول تھے۔ ان کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ دل میں مسلمان ہیں۔ آج تک قائم گنج میں یہ مشہور ہے کہ (ذاکر صاحب کے) والد کو آیندہ حیدرآباد میں جو دنیاوی کامیابی ہوئی وہ انھیں دونوں بزرگوں کی دعا کا اثر تھا۔ (ذاکر صاحب کے) دادا کو تو اس بات کا پورا یقین تھا، اس لیے کہ وہ درویشوں کی دعا کو مانتے تھے اور اس کے ہمیشہ طالب رہتے تھے۔[1]

غلام حسین خاں کی شادی محلہ مول خیل میں ہوئی تھی۔ وہ شکل خیل سے مول خیل اپنی سسرال آگئے، اور یہیں رہے۔ جس خاندان میں ان کی شادی ہوئی تھی اس کے جد امجد تور کاکا تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مدآخون کے ہمعصر تھے۔ ان کی قبر مول خیل کی قدیم مسجد کے متصل ہے۔ وہ مول خیل کے محافظ ولی سمجھے جاتے تھے اور ان کے نام کی فاتحہ ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب کی والدہ ہر جمعرات کو تور کاکا کی قبر کے سرہانے چراغ رکھواتی تھیں اور فاتحہ کا کھانا غریب غربا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

ذاکر صاحب کے والد

غلام حسین خاں کے دو بیٹے تھے فدا حسین اور عطا حسین اور ایک بیٹی۔ فدا حسین ذاکر صاحب کے والد تھے۔ انھوں نے قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور تلوار کے بجائے

۱۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحہ ۲۵

ختم ہو گیا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ غلام حسین خاں کو افسر الملک نے حیدر آباد میں روکنا چاہا تھا لیکن وہ نہیں رُکے اور قائم گنج واپس آ گئے تھے اور اب ان کا بیٹا (فدا حسین) فوجی ملازمت کے لیے نہیں بلکہ کاروبار کرنے کے ارادے سے گھر سے ہزار بارہ سو روپے لے کر حیدر آباد جاتا ہے کہ وہاں قائم گنج کے کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے اور بیگم بازار میں مرادآبادی برتنوں کا کاروبار شروع کرتا ہے' لیکن چونکہ شوق پڑھنے لکھنے کا ہے اس لیے وہ ایک دن قریب ہی کے اپنے ایک دوست کے یہاں سے جو وکیل تھے چند کتابیں مطالعے کے لیے لاتا ہے۔ یہ کتابیں قانون کی ہیں' انھیں پڑھنے کے بعد وہ اور کتابیں قانون کی لاتا ہے اور انھیں بھی پڑھ ڈالتا ہے' ان کتابوں میں اس کا جی لگتا ہے اور مطالعہ آگے بڑھتا ہے' اور پھر بعض دوستوں کے مشورے سے وہ وکالت کے امتحان میں شریک ہوتا اور اول درجے میں کامیاب ہوتا ہے' اور تجارت چھوڑ وکالت کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور بڑا کامیاب وکیل ثابت ہوتا ہے ـــــ اس طرح اب گویا فدا حسین خاں اور ان کے خاندان کے لوگ کوئی سوڈیڑھ سو برس بعد ایک لحاظ سے اپنے مورث اعلا مدآخون کی پڑھنے پڑھانے کی روایت کو زندہ کرتے ہیں۔ فدا حسین نے وکالت ہی نہیں کی بلکہ جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے' تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا' یعنی پرورشِ لوح و قلم کی روایت قائم کی' ان کے لائق بیٹوں اور پوتوں نے درس و تدریس کی محفل آراستہ کی اور معلّمی کے پیشے کو رونق بخشی۔

حیدر آباد بڑا شہر تھا' فدا حسین خاں نے سوچا کہ یہاں وکالت میں اپنی ساکھ قائم کرنے کے لیے خاصا وقت لگے گا' اور خیال آیا کہ محنت و یکسوئی سے وکالت کا کام کرنے کے لیے کوئی چھوٹا شہر مناسب ہوگا' چنانچہ وہ اورنگ آباد چلے گئے' یہاں قائم گنج کے کچھ لوگوں کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ وہاں انھوں نے بڑی محنت اور دیانت داری سے کام کیا اور جلد ہی ان کی وکالت چل نکلی اور دو تین سال

ہی میں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ وہیں اورنگ آباد میں انھوں نے آئین دکن کے نام سے حیدرآباد ہائی کورٹ کے فیصلے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس سے ریاست حیدرآباد کے وکیلوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی اور انھیں بھی مالی فائدہ ہوا۔ آئین دکن اب سے اسّی نوّے سال پہلے ریاست حیدرآباد کے آئین و قوانین کا اہم ماخذ خیال کیا جاتا تھا۔ بعد میں بھی وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی جلدیں اپنے ذاتی کتب خانوں میں رکھتے تھے۔"

فدا حسین خاں ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے اپنی شہرت کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں اورنگ آباد سے حیدرآباد آگئے اور بیگم بازار میں اپنا دفتر قائم کیا۔ یہاں ان کی وکالت خوب چمکی اور انھوں نے بڑی ترقی کی۔ بیگم بازار کے علاقے میں انھوں نے زمین کا ایک قطعہ خریدا اور اپنا دو منزلہ مکان بنوایا جس کی پہلی منزل میں پریس، آفس اور لائبریری تھی اور دوسری منزل پر وہ اور ان کے خاندان کے سب لوگ رہتے تھے۔ پریس میں آئین دکن کے ساتھ قانون کی کتابیں بھی چھپتی تھیں اور اس سے متعلق اشاعت گھر سے فروخت ہوتی تھیں۔ ریاست حیدرآباد میں قانونی لٹریچر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ انھوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ پریس (مطبع آئین دکن) کے منیجر مولوی عبدالغنی خاں شاہجہاں پوری تھے۔ ایک انگریز نومسلم جن کا نام بھی عبدالغنی تھا انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے پر مامور تھے۔ اس کے علاوہ، وہ ذاکر صاحب اور ان کے بڑے بھائیوں کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ غرض، فدا حسین خاں کی محنت مشقت، دوربینی و معاملہ فہمی اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کی دیانت اور راست بازی کی بدولت حیدرآباد میں اُن کا خاندان ایک بھرا پُرا اور خوش حال خاندان بن گیا اور یہ سب کچھ کیا انھوں نے پندرہ سولہ سال کی مدت میں، قائم گنج میں بھی انھوں نے اپنا ایک مکان تعمیر کرایا (۱۹۰۰ء میں)۔ اس وقت تک ان کے والد غلام حسین خاں زندہ تھے۔

نور حسین خاں نے بڑی محنت مشقت کی زندگی گزاری اور بہت کچھ کمایا لیکن انھوں نے اپنی صحت کی کبھی پروا نہیں کی، چنانچہ انھیں دق کا مرض لاحق ہوگیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ بیمار ہو کر حیدر آباد سے قائم گنج آگئے، جہاں ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے مکان کے سامنے اپنے والد مرحوم کی قبر سے متصل دفن ہیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۹ سال تھی۔

ذاکر صاحب کی والدہ اور بھائی

فدا حسین خاں کے ایک بھائی اور تھے عطا حسین خاں، ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ادھر ذاکر صاحب کے چھوٹے بڑے سات بھائی تھے۔ والدہ ذاکر صاحب کی نازنین بیگم تھیں جنھیں یہ آرزو رہی کہ کاش ان کے کوئی بیٹی بھی ہوتی۔ وہ محلہ کلاں خیل کے نبی داد خاں کی بیٹی تھیں۔ وہ بھی فوج میں ملازم رہ چکے تھے اور پنشن ملتی تھی۔ طبیعت میں ٹھہراؤ اور حلیمی تھی۔ ذاکر صاحب کی نانی کہا کرتیں کہ انھوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا، نہ کبھی کوئی ان کا دشمن ہوا، کبھی کسی نے انھیں غصہ ہوتے نہیں دیکھا، اپنے شریفانہ اوصاف کی بنا پر وہ لوگوں میں مقبول تھے۔

ذاکر صاحب کے کوئی ماموں نہ تھے۔ ان کی ماں تین بہنیں تھیں جن میں سب سے چھوٹی ان کی والدہ نازنین بیگم عرف دجّو بیگم تھیں۔ اُن کی نانی کہا کرتی تھیں کہ "دجّو صورت اور سیرت دونوں میں اپنے والد سے مشابہت رکھتی ہے"۔ نازنین بیگم بھی بڑی سادگی تھی، صبر و تحمل اور بُردباری تھی۔ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتی تھیں، بڑی نیک دل تھیں، ان کی سخاوت اور خداترسی کا ذکر قائم گنج کی خواتین میں ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو دیتی لیتی رہتی تھیں۔ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ جس سے ملتیں تواضع اور انکسار سے ملتیں، نوکروں سے برابر کا سلوک کرتیں اور سب کی طرح ان کے آرام کا خیال بھی رکھتیں۔ رکھ رکھاؤ ان کا ایسا تھا کہ سب ان کا دم بھرتے تھے۔ ماں کے ان اوصاف کا اثر بچوں پر کتنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ تو ویسے تو مشکل ہے

لیکن کچھ کیا جاسکتا ہے' اس لیے کہ ماں کی گود ہی بچے کا سب سے پہلا مکتب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ۱۹۶۸ء میں اپنی اکہترویں سالگرہ کے موقع پر جب انھیں اہلِ ملک کی طرف سے دو کتابیں — اُردو میں نذرِ ذاکر اور انگریزی میں PRESENTATION VOLUME — نذرانۂ عقیدت و محبت کے طور پر پیش کی گئی تھیں، تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: آج سب سے پہلے یاد آتی ہے اپنی ماں کی کہ ان سے جو پایا اُس کا حساب کرنا ممکن نہیں۔"

ذاکر صاحب کی والدہ کو، سبھی ماؤں کی طرح، اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی، جیسا کہ ذکر کیا گیا، ان کے سات بیٹے تھے۔ کوئی پوچھتا کہ ان کے کتنے بیٹے ہیں تو ٹال جاتیں کہ کہیں ان کے بچوں کو نظر نہ لگ جائے۔ لیکن ان کی محبت نادان عورتوں کی طرح اندھی نہ تھی، وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتی تھیں اور جب انھیں اندازہ ہوا کہ قائم گنج میں ان کی تعلیم کا اچھا انتظام ممکن نہیں تو انھوں نے اپنے جگر گوشوں کو اپنے سے دور بھیجنا گوارا کیا، اور جب ان پر طاعون کا حملہ ہوا تو بچوں کی پریشانی اور ان کی تعلیم میں رکاوٹ کے خیال سے اپنی بیماری کی اطلاع تک نہ دی اور بچوں کو آخری بار دیکھنے کا ارمان دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔[1]

ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں تھے جو ۱۸۹۳ء میں قائم گنج میں پیدا ہوئے تھے، ان کی والدہ ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد گئیں مظفر حسین خاں

۱۔ سعیدہ خورشید عالم، ذاکر صاحب کی کہانی، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۰ — "۱۹۱۱ء میں قائم گنج میں طاعون کی ایسی وبا پھیلی کہ بستیوں کی بستیاں تباہ ہوگئیں ... وبا کا زور ایسا تھا کہ جنازہ اُٹھانے والا نہ ملتا تھا۔ گھر میں سب سے پہلے میاں کے (ذاکر صاحب کے) چھوٹے بھائی جعفر حسین خاں جن کی عمر چھ سال تھی، اس کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد نانی، والدہ اور ملازمین سب ختم ہوگئے، اور گھر میں تالا پڑ گیا۔ صرف سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں بچے تھے جن کو ان کی چچی اپنے گھر لے گئیں۔" (صفحہ ۸)

اور سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں کے علاوہ، ذاکر صاحب اور ان کے باقی دوسرے بھائی سب حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ذاکر صاحب کے والد کے انتقال کے بعد مظفر حسین خاں کی تعلیم اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں اور پھر ایم اے او کالج علی گڑھ میں ہوئی، تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے اور وہاں انھوں نے اپنا کیریر شروع ہی کیا تھا کہ وہ بھی دق کے مہلک مرض کا شکار ہوگئے اور اپنے پیچھے تین بچے چھوڑ گئے، دو بیٹے اور ایک بیٹی، بڑے بیٹے امتیاز حسین خاں تھے۔ وہ ایک عرصے تک عثمانیہ یونی ورسٹی میں کامرس کے استاد رہے۔ پھر سکندر آباد کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ افسوس کہ ۱۹۶۶ء میں یکایک حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر مسعود حسین خاں ہیں جو بحمد اللہ حیات ہیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اُردو اور لسانیات کے پروفیسر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ رہ چکے ہیں۔ اب اپنے مکان جاوید منزل (جامعہ اُردو روڈ، دودھ پور، علی گڑھ) میں رہتے ہیں اور علمی و ادبی کاموں میں اپنا وقت گزارتے ہیں، ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی کا ایک پروجیکٹ اُردو لغت کی تدوین بھی ان کے سپرد ہے۔ تحقیق و تنقید دونوں میں ان کا کام اور نام معتبر ہے۔

مظفر حسین خاں سے چھوٹے عابد حسین خاں تھے جو بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں "بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے۔" اُن کی تعلیم بھی اٹاوہ ہائی اسکول اور ایم اے او کالج میں ہوئی۔ ابھی زیرِ تعلیم ہی تھے کہ وہ بھی دق میں مبتلا ہوکر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ذاکر صاحب عابد حسین خاں سے چھوٹے تھے جنھوں نے ۷۲ برس کی عمر پائی اور نہ صرف فخرِ خاندان بلکہ فخرِ قوم و ملت ہوئے۔ زاہد حسین خاں ذاکر صاحب سے چھوٹے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سیرت اور صورت میں اپنے دادا غلام حسین خاں سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے سب بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین، صحت مند

اور قوی جسم عطا کیا تھا۔ طبیعت میں حکمانہ شان تھی۔ جو چاہیں وہ ہو جائے تو خوش ہیں ورنہ نہیں، ذاکر صاحب سے تقریباً ڈیڑھ سال چھوٹے تھے، گویا وہ ان کی پیٹھ کے بھائی تھے، اس لیے معمولی معمولی باتوں پر بھی من مُٹاؤ ہو جاتا تھا۔ جسمانی قوت کے لحاظ سے زاہد حسین خاں ذاکر صاحب پر غالب رہتے تھے لیکن وہ اپنی ذہانت اور حکمتِ عملی سے انھیں قابو میں رکھتے تھے جس میں ذاکر صاحب کے خُلقی صبر و تحمل کو بھی بڑا دخل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں "انھیں بردباری اور تحمل کی جو ٹریننگ بچپن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں ملی وہ آیندہ ان کی سیرت کا جوہر بن کر نکھری اور چمکی اور اس سے انھوں نے قوم و ملّت کے لیے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔" افسوس، کہ زاہد حسین خاں کو بھی جو اس قدر صحت مند اور کڑیل جوان تھے، دِق کا مرض لاحق ہوا۔ وہ اس وقت ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر میں پڑھتے تھے جب ان پر اس بیماری کا حملہ ہوا۔ قائم گنج میں انتقال ہوا اور وہیں آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ عمر ان کی اس وقت لگ بھگ اٹھارہ سال تھی۔

زاہد حسین خاں سے چھوٹے ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے جنھوں نے اناوہ اسلامیہ اسکول، جامعہ ملیہ اور پھر سوربون یونی ورسٹی پیرس میں تعلیم پائی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پرووائس چانسلر تھے۔ تاریخ اور ادب ان کی دلچسپی کے موضوع تھے، انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جو اہل علم میں مقبول ہوئیں۔ انھوں نے یادوں کی دنیا کے عنوان سے اپنے سوانح بھی قلمبند کیے جو ذاکر صاحب کے خاندانی حالات سے متعلق ہمارا اصل ماخذ ہے اور شاید اس کے علاوہ اور کوئی ماخذ ہے بھی نہیں، کیونکہ اس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "خاندانی حالات کے لکھنے میں برادرِ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صلاح و مشورے کو بھی دخل رہا ہے۔ انھوں نے ان ابواب کے مسودے پر صاد کیا اور ان کے فرمانے کے بموجب بعض جگہ میں نے ترمیم بھی کی۔"

یوسف حسین خاں سے چھوٹے جعفر حسین خاں تھے جن کا ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی زندگی ہی میں طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں تھے جو جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہائیڈل برگ (جرمنی) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لائے۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر اور پاکستان کے وزیر تعلیم ہوئے۔ انھوں نے کراچی میں ملیر کے علاقے میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی کے بعض پرانے اساتذہ کارکنوں اور طلبا کے ساتھ مل کر جامعہ کے طرز کی ایک درسگاہ قائم کی تھی۔ ان کے عادات واطوار اور اخلاق میں ذاکر صاحب کی بڑی جھلک نظر آتی تھی، کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

یوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرد کو جو جسمانی اور نفسی خصوصیات ورثہ میں ملتی ہیں، بس وہی اس کی شخصیت کے ارتقا میں اہمیت رکھتی ہیں، لیکن خاندانی اثرات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی ذاکر صاحب کے دادا (غلام حسین خاں) اور نانا (نبی داد خاں) کی شخصیت اور کردار کا مختصر سا ذکر کیا گیا ہے جو یادوں کی دنیا سے ماخوذ ہے۔ اپنی اسی خود نوشت سوانح میں ڈاکٹر یوسف خاں لکھتے ہیں: "ہمارے دادا اور نانا کے کیریکٹر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ دادا اگر جلال کا نمونہ تھے تو نانا جمال کا۔ دادا کا لوگ احترام کرتے تھے اور نانا سے محبت کرتے تھے۔ والد اور والدہ دونوں کی طبیعت میں انکسار اور بردباری تھی، جس کا اثر کم وبیش ہم سب بھائیوں میں نظر آتا ہے لیکن بعض اوقات دادا اور نانا کے کیریکٹر کی جھلک بھی خلقی طبائع کے جو کھٹے میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہماری نانی جس طرح ہماری والدہ کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ وہ ہمارے نانا سے مشابہت رکھتی ہیں، صورت اور سیرت دونوں میں۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں میں ذاکر میاں سے متعلق یہی بات دہراتی تھیں، کہتی تھیں کہ اور سب بھائی تو دادا پر گئے ہیں لیکن ذاکر نانا پر گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب بھائیوں میں ددھیال اور ننھیال کی خصوصیات کا امتزاج ملتا ہے، کسی میں ددھیال کا پلّہ ذرا بھاری ہے اور کسی میں ننھیال کا۔"

دوسرا باب

اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ

(۱۹۰۷ــــ۱۹۱۳)

ذاکر صاحب حیدرآباد میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پہ ہوئی۔ ۱۹۰۰ء کے اوائل میں جب اُن کے والد کا انتقال ہوگیا تو پھر پورا گھر قائم گنج آگیا، اور اُن کا داخلہ اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ میں کرادیا گیا۔ ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے جب مرحوم کی بایو گرافی لکھنے کا کام مجیب صاحب کے سپرد کیا، تو انھوں نے اپنے پرسنل اسسٹنٹ عبداللطیف اعظمی صاحب کو ذاکر صاحب کی تاریخ پیدائش کا سراغ لگانے اور اسکول کے زمانے کے متعلق دیگر معلومات حاصل کرنے کے لیے اٹاوہ بھیجا، اس لیے کہ خاندان میں اُن کی تاریخ پیدائش کا کہیں بھی کوئی اندراج نہیں ملا تھا، ذاکر صاحب نے ایک بار فرمایا تھا کہ ان کی پیدائش کی صحیح تاریخ اسکول کے داخلہ فارم سے معلوم کی جاسکتی ہے، چنانچہ داخلہ فارم جو اتفاق سے دستیاب ہوگیا، دیکھا گیا۔ داخلہ فارم میں تاریخ ولادت کا خانہ نہیں تھا، عمر کا تھا۔ اس میں ذاکر صاحب کی عمر ۱۰ سال ایک ماہ لکھوائی گئی تھی، رجسٹر داخلہ کے مطابق ان کا داخلہ ۸ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو ہوا تھا، اس طرح گویا ان کی تاریخ ولادت ۸ر نومبر ۱۸۹۷ء ہوئی۔ چار سال بعد انسپکٹر آف اسکولس ایف، جے، مورس نے اس اندراج کو رد کردیا اور نیا اندراج کیا گیا جس کی رو سے ان کی عمر میں ۹ ماہ کا اضافہ ہوگیا یعنی عمر کے خانے میں دس سال دس ماہ لکھ دیا گیا جس کے مطابق ذاکر صاحب کی تاریخِ ولادت ۸ر فروری ۱۸۹۷ء ہوتی ہے۔ عمر میں اس اضافے کی

کوئی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ میٹرکولیشن کے امتحان کے لیے جو عمر مقرر کی گئی تھی اس میں ۹ مہینے کی کمی رہتی ہو اور اس طرح اسے پورا کیا گیا ہو یا شروع میں جو عمر لکھائی گئی تھی اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ ۱۹۲۲ء میں جب ذاکر صاحب نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تو اسکول کا ریکارڈ دیکھنے میں بڑی طوالت معلوم ہوئی اور انھوں نے اندازے سے اپنی تاریخ پیدائش ۱۴؍ فروری ۱۸۹۷ء قرار دے لی۔" بعد میں جب کبھی ان سے ان کی سالگرہ کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ چڑکر کہتے: 'آپ مجھے دیکھتے ہیں۔ میں ضرور پیدا ہوا ہوں گا اور یہی جان لینا بہت کافی ہے!' لیکن اب، بہرحال، ان کی تاریخ پیدائش وہی ہے جو اسکول کے رجسٹر میں مدرس کی ہدایت کے مطابق لکھی ہوئی ہے۔"[1]

ذاکر صاحب کے والد کی وفات کے وقت اُن کی عمر دس سال تھی، والدہ کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ اس طرح اس کا قوی امکان ہے کہ انھیں اپنے بچپن کی بہت سی باتیں یاد نہ رہی ہوں گی، لیکن انھوں نے ایک بار مجیب صاحب سے بتایا تھا کہ حیدرآباد میں اُس وقت عزت اور رکھ رکھاؤ کا جو معیار قائم تھا اس کی وجہ سے جب کبھی انھیں سڑک پار کر کے اپنے عزیزوں کے ہاں جانا ہوتا تو ہمیشہ گاڑی بھیجی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ بعد میں قائم گنج میں خاندان کا وہ معیار قائم نہ رکھا جا سکا ہوگا، لیکن ایک تو کم عمری کی وجہ سے اور دوسرے اس سے کہیں زیادہ ان کی والدہ کی فراست اور پُروقار شخصیت کی وجہ سے انھیں اور ان کے بھائیوں کو اس بات کا زیادہ احساس نہیں ہو سکا۔ یوسف صاحب نے

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، اے بایوگرافی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۷۲ء، صفحہ،
عبداللطیف اعظمی کے مضمون "ذاکر صاحب کے ابتدائی حالات زندگی" میں پاسپورٹ میں درج تاریخ ولادت ۱۴؍ فروری ۱۸۹۷ء دی ہوئی ہے (ماہنامہ جامعہ، مارچ ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۳۱)۔ بہرحال یہ دونوں تاریخیں اندازاً ہیں اور صحیح نہیں ہیں۔ خود مجھے پاسپورٹ دیکھنے کو نہ مل سکا۔

یادوں کی دنیا میں قائم گنج کے قیام کے زمانے کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوائے اس ایک غم کے کہ (۱۹۱۱ء میں) ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، کوئی ایسی اور پریشانی بھی جو قابل ذکر ہو۔ مکان ان کا بڑا عالیشان تھا اور جمن خاں کا محل کہلاتا تھا۔ کچھ جائداد بھی تھی اور اس سے اتنی آمدنی ہوجاتی ہوگی کہ اطمینان سے گزر بسر ہوجائے۔

اسکول کی تعلیم و تربیت

ذاکر صاحب نے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ۸ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو پانچویں جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ اس سے پہلے ان کی جو تعلیم گھر پر ہوئی تھی وہ وہی تھی جو اس وقت تک مسلمانوں کے اعلا خاندانوں میں رائج تھی۔ یعنی قرآن شریف، فارسی کی کچھ کتابیں اور پھر اُردو، ذاکر صاحب کو حیدر آباد میں ایک انگریز نومسلم نے انگریزی بھی پڑھائی تھی جن کا نام عبدالغنی تھا۔ اٹاوہ کے رجسٹر سے ــــ جو اب انٹر کالج ہے ــــ معلوم ہوا کہ شروع میں کوئی دو تین سال کلاس کی حاضری بہت اچھی نہیں تھی، بعد میں بہتر ہوئی اور ساتویں، آٹھویں، نویں کا نتیجہ بھی بہت اچھا رہا، یعنی وہ اوّل درجے میں کامیاب ہوئے تھے۔ دسویں کلاس میں صرف یہ لکھا ہوا ملا کہ "Passed S.L.C."۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ میٹریکولیشن میں بھی انھوں نے ضرور اول درجہ میں کامیابی حاصل کی ہوگی۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ ایک اقامتی درسگاہ تھی جسے سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ایک پُرجوش حامی مولوی بشیرالدین صاحب نے ۱۸۸۸ء میں اس مقصد سے قائم کیا تھا کہ مسلمان بچوں کو انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی معاشرت کی تربیت بھی دی جائے۔ اس درس گاہ کے ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبہ کو نماز باجماعت پابندی سے پڑھنی ہوتی تھی، اور رہن سہن، بستر، کپڑا، کھانا ایسا سادہ کہ سخت زندگی گزارنے کی عادت پڑے۔ ڈسپلن کا بڑا اہتمام تھا اور طالب علموں کی تعلیمی و

تربیتی ترقی پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔ اسکول اور بورڈنگ میں قاعدوں کی دیانتدارانہ پابندی کے سبب ذاکر صاحب نے اپنے آپ کو اپنے اُستادوں کی نگاہ میں نمایاں کر لیا تھا، وہ خاموش زندگی گزارتے تھے اور شریر اور لڑاکو لڑکوں سے زیادہ خلا ملا نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ایک اُستاد تھے مولوی محمد فیاض خاں جو ٹونک کے پٹھان اور اسکول کے اچھے اُستادوں میں تھے۔ وہ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

" میں جولائی ۱۹۱۰ء کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں بحیثیت مدرس عربی کے مقرر کیا گیا، نیز بڑے وارڈ کا سب پراکٹر بھی بنایا گیا جہاں ذاکر حسین خاں مرحوم مع اپنے بھائی یوسف حسین خاں کے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی اور تھے، زاہد حسین خاں ان کا نام تھا۔ وہ ان سے علاحدہ رہتے تھے۔ ذاکر صاحب اس وقت آٹھویں درجے کے متعلم تھے اور اپنے درجے میں سب سے چھوٹے بھی تھے اور تعجب یہ ہے کہ بورڈنگ کے ہر شعبے میں یہ مانیٹر تھے، حالانکہ اس بورڈنگ میں تقریباً سب ہی لڑکے ان سے بڑے تھے۔ سید الطاف حسین مرحوم جو بورڈنگ کے پراکٹر تھے، ان کے انتظام سے بہت مطمئن تھے۔ میں بھی ہر اُلجھے ہوئے معاملے میں ان سے مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ صرف ایک مشورہ میں میں نے ان سے مخالفت کی۔ وہ یہ تھا کہ بورڈنگ کے قواعد وضوابط میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اگر کوئی لڑکا نماز باجماعت میں غیر حاضر ہو تو اس کی گوشت کی تشتری، اگر پلاؤ یا زردہ کی باری ہو تو اس کی تشتری بھی، بند کر دی جائے۔ ذاکر صاحب کی یہ پہلی اصلاح تھی، وہ کہتے تھے کہ یہ ظلم ہے، کوئی اور سزا تجویز کی جائے۔ طلبہ کھانے کے دام دیتے ہیں، اس میں دست اندازی درست نہیں۔ اصولاً میں ٹھیک سمجھتا تھا مگر قواعد کی پابندی لازم سمجھتا تھا۔ اس قصے نے یہاں تک طول پکڑا کہ تمام طلبہ نے اسٹرائک کر دی۔ پراکٹر صاحب نے دس بڑے طالب علموں کو جو اسٹرائک کے لیڈر تھے بورڈنگ

چھوڑ دینے کا حکم دے دیا' یہ سب کچھ ذاکر صاحب کے خفیہ مشورے سے طلبہ نے کیا تھا جس کا پتا کئی مہینے بعد لگا۔ آخر کار ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کسی طرح ان طلبہ کا قصور معاف کرا دیجیے۔ بہت کوشش کے بعد ان کا قصور معاف کرا دیا گیا — یہ تھی پہلی اصلاح۔ جو اس وقت تو کامیاب نہ ہوئی مگر کچھ عرصے بعد بار آور ہوئی اور قواعد و ضوابط سے یہ قاعدہ خارج کر دیا گیا۔

"اتفاق کی بات ہے کہ خوش ہو کر میں نے ذاکر صاحب کو (انگریزوں کا نکالنے والا) کا خطاب دیا تھا' اور وہ حرف بہ حرف صادق آیا۔ اکثر میں ذاکر صاحب کو اس ہی خطاب سے مخاطب کیا کرتا تھا' جب وہ مسلم یونی ورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آئے تو میں نے ان کو یہ قصہ یاد دلایا' وہ خوب مسکرائے' میری بہت عزت کرتے تھے' اوروں کی ملاقات کے لیے وقت مقرر کیا جاتا تھا میرے واسطے کچھ نہ تھا' جب چاہوں جاؤں...

"ذاکر صاحب جب آٹھویں درجے میں تھے ڈبیٹ میں انگریزی میں تقریر کرتے تھے۔ حمایت اسلام کا جلسہ سال میں ایک دفعہ ہوتا تھا' باہر کے لوگ بلائے جاتے تھے۔ شہر کی جانب سے یہ بچہ جس کی عمر مشکل سے دس گیارہ سال [تیرہ چودہ سال] تھی' تقریر کرتا تھا اور خوب داد لیتا تھا۔

"مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں جب ان کے اعزا اور ہم وطنوں کو لے کر تفریح کو جاتا تو یہ ساتھ نہیں دیتے تھے اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگ لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قائم گنجی لڑاکو ہیں۔ ڈنڈ مچانے والے ہیں' اور یہ خاموش زندگی بسر کرنے والے تھے...

"یہ [ذاکر صاحب] اپنے کورس کی کتابیں بہت کم دیکھتے تھے۔ غیر درسی کتب کا مطالعہ بہت کیا کرتے تھے... خود تو شاعر نہ تھے مگر شعرا کے دیوان اکثر ان کے [زیر نظر] رہتے تھے... علاوہ ادبیات کے حساب میں بھی نہایت قابل تھے...

"بچپن سے ہی ذاکر صاحب میں یہ مادّہ تھا کہ اپنے سخت دشمن کو بھی رام کر لیتے تھے۔ بعض اصحاب جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے مخالف تھے' آئے اور سخت گندی

تقریریں کیں مگر ذاکر صاحب سے مل کر وہ نرم پڑ گئے"[1]

ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین تھے، ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے جن طالب علموں میں ذہانت اور حصولِ علم کا شوق دیکھتے، اُن کی بڑی ہمت افزائی کرتے، کسی میں اگر تقریر و تحریر کا جوہر دیکھتے تو اُسے نظر میں رکھتے اور اس کے لیے اظہارِ خیال کے مواقع فراہم کرتے۔ ذاکر صاحب اپنے انھیں اوصاف کی بنا پر اُنھیں بہت عزیز تھے، جب کبھی شہر کے کسی جلسے میں اسکول کے طلبہ کی نمایندگی کا موقع ہوتا تو عام طور پر ذاکر صاحب ہی یہ اہم کام انجام دیتے، جب کبھی کوئی نمایاں شخصیت اسکول دیکھنے آتی تو ذاکر صاحب ہی اس کا استقبال اور ایڈریس پیش کرنے کے لیے منتخب کیے جاتے۔ سید الطاف حسین نے اپنی پوری زندگی اسکول اور اسکول کے طالب علموں کے لیے وقف کر دی تھی، اور ایثار و قربانی کی ایک مثال قائم کر رکھی تھی، اور بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں جو خود ان کے زیرِ تربیت رہ چکے تھے "وہ ایک غیر معمولی شخص تھے... ہم سب ان کی قابلیت اور معلومات سے مرعوب تھے۔ وہ چھوٹے لڑکوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ سید الطاف حسین ایک نیک سرشت انسان تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی شخصیت کے اندر سے نیکی کی شعاعیں باہر نکل رہی ہوں اور ان سبھوں کے دل و دماغ کو روشن کر رہی ہوں جو کسی حیثیت سے ان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت ان کے سب شاگردوں کو یاد ہے"[2]

۱۔ "ذاکر صاحب اپنے استاد کی نظر میں"، ماہنامہ جامعہ، جون ۱۹۷۰ء، صفحات ۳۷-۳۴

۲۔ یوسف حسین خاں، حوالا سابق، صفحہ ۶۲

۳۰ر جولائی ۱۹۴۷ء کو "اسکول براڈکاسٹس" پروگرام کے تحت آل انڈیا ریڈیو سے ذاکر صاحب کی ایک تقریر "کالج میں میرا پہلا دن" نشر ہوئی تھی۔ یہاں ذیل میں اس کے وہ اقتباسات دیے جاتے ہیں جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور اس کے ہیڈ ماسٹر سے متعلق ہیں۔ ان سے ذاکر صاحب کی شخصیت و سیرت کے ایک خاص تشکیلی دور کا حال خود انھیں کے الفاظ میں مل جاتا ہے:

"کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ کالج میں اپنے پہلے دن پر ریڈیو سے تقریر کروں گا مگر سوچتا ہوں کہ ہے یہ مشکل کام۔ بہتے دریا میں کوئی چاہے کہ کسی ایک قطرے کو تھام لے تو یہ کیسے ہو؟ اسی طرح زندگی کے رواں دواں دھارے میں کسی لمحے کو اس سے پہلے اور اس سے بعد کے لمحوں سے الگ کرنا محال سا کام ہے۔ ہر لمحہ اس سے جو گزر چکا اور اس سے جو بعد کو آیا متاثر ہوتا ہے اور اگلے پچھلے لمحوں کا رنگ اس پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ آج اس دن کا دھیان کرتا ہوں جب میں پہلی بار کالج میں پہنچا تھا جسے اب کوئی ۳۴ برس ہونے کو آئے، تو جو کچھ اس دن سے پہلے گزرا تھا اور جو ان ۳۴ برسوں میں گزرا وہ سب اس خیال میں گڈمڈ سا دکھائی دیتا ہے۔

"میں نے ۱۹۱۳ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول سے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ حاصل کیا، اور اس کے بعد علی گڑھ کالج میں داخل ہونے کے لیے گیا۔ اس زمانے میں یہ کالج کالج ہی تھا ابھی یونی ورسٹی نہ بنا تھا اور ملک کے کالجوں میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ میں جس مدرسے سے یہاں پہنچا تھا وہ بھی اقامتی مدرسہ تھا، اور آج کہ ۳۴ سال اس مدرسے کو چھوڑے ہو گئے، جب کبھی اس زمانے کی یاد آتی ہے تو کوئی اچھی ہی یاد آتی ہے۔ اب بہت دنوں سے اس مدرسے کو دیکھا نہیں ہے۔ اب تو وہاں سب کچھ ہوگا، جس وقت میں وہاں پڑھتا تھا تو وہاں ساز و سامان بہت نہ تھا۔ ہوسٹل بھی اکثر کرایے کے مکانوں میں تھے۔ تعلیمی سامان بھی کچھ

یوں ہی سا تھا۔ مدرسہ کی عمارت بھی میری طالب علمی کے زمانے میں برابر بنتی ہی رہی۔ مجھے اس کی اینٹ اینٹ یاد ہے۔ اس چونتیس سال میں بہتیرے مدرسے دیکھے، بہت سے مدرسوں کے انتظام سے واسطہ رہا، خود بھی مدرسہ چلاتا ہوں، لیکن کبھی بھولوں بھی یہ خیال میرے دل میں نہ آیا کہ کاش میں نے اپنے مدرسے کی جگہ کسی اور مدرسے میں تعلیم پائی ہوتی۔ آخر وہ بے سروسامان مدرسہ مجھے اتنا عزیز کیوں ہے! سوچتا ہوں تو وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں ایک اچھے استاد کی شاگردی نصیب ہوئی تھی۔ اچھا استاد دنیا کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ہے، وہ ہزار ساز و سامان پر بھاری ہوتا ہے۔ میں نے ساری زندگی میں سیّد الطاف حسین صاحب جیسا استاد نہیں دیکھا۔ کوئی نہ دیکھا جو اتنی شفقت اپنے شاگردوں سے کرتا ہو، اور پھر شاگرد اس کا اتنا ادب کرتے ہوں۔ محبت سے جو ادب پیدا ہوتا ہے اس کی ایسی مثالیں میں نے کم دیکھی ہیں۔ میں نے ان ۳۴ سال میں بہتیرے مُدرّسوں کو مَدرسوں میں اپنی مَوت مرتے دیکھا ہے، مگر ہیڈ ماسٹر صاحب ہی کو دیکھا کہ ایک گانو کے مدرسے میں رہ کر ان کو اپنی علمی نشو و نما میں ایک منٹ کو ذرا روک نہیں ہوئی۔ مدرسہ چھوڑنے کے کوئی ۲۵ سال بعد جب لوگوں کے خیال میں، اور اپنے زعم میں بھی، بہت لکھ پڑھ اور سوچ سمجھ لیا تھا، ان سے ایک علمی گفتگو ہوئی تو سچ مانیے، اس میں ذرا بھی انکسار نہیں ہے، کہ اپنے علم اور ان کے علم میں اس وقت بھی وہی تفاوت پایا جو اُس وقت تھا جب میں مدرسے میں ان سے پڑھتا تھا۔

"اس مدرسے میں ایک اور شخصیت منیجر صاحب یعنی مولوی بشیرالدین صاحب کی بھی تھی جن سے اکثر طالب علم متاثر ہوتے تھے، مگر ان دونوں آدمیوں کا رنگ الگ الگ تھا اور ان کی تاثیر کا انداز جدا جدا۔ یہ بات تو دونوں میں مشترک تھی کہ کرتے پہلے تھے کہتے بعد میں تھے۔ مگر الطاف حسین صاحب نہ جانے کس طرح بے کہے سب کچھ کہہ لیتے تھے اور بشیرالدین صاحب کہتے تھے، سختی سے کہتے تھے اور اصرار سے کہتے تھے۔ الطاف صاحب کی نیکی اس انداز سے ان کے شاگردوں میں جگہ پاتی تھی

"شاخ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم"۔ بشیر الدین صاحب تلقین کرتے تھے، دھمکاتے تھے، ڈراتے تھے، خفا ہوتے تھے، مگر اس سب تکلیف کو اپنے دل پر بھی سہتے تھے، میں نے طالب علمی کے بعد اثاوہ کے بہت سے طالب علموں کو مولوی صاحب کا شاکی بھی پایا، انھیں بھی جن کو ان سے فائدہ پہنچا تھا۔ الطاف حسین صاحب کا سب کو دلدادہ پایا، ان کو بھی جنھیں انھوں نے مدرسے سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا۔ غرض میں ایک ایسے مدرسے کے ماحول سے کالج کو چلا تھا جو بڑی محبت اور شفقت کا ماحول تھا۔ یہ میرے لیے اچھے گھر کا ماحول تھا جو بچپن ہی میں اُجڑ گیا تھا، اس لیے کہ ایک طاعون میں میرے گھر میں ۸ عورتیں جن سے گھر چلتا تھا ایک مہینے میں ختم ہو گئی تھیں۔ اس ماحول میں ہر ایک ہی مدرسے کو جانتا تھا۔ اس میں خاص خاص قدریں واضح طور پر کارفرما تھیں اور ہم سب کے سر پر ہیڈ ماسٹر صاحب اور منیجر صاحب کی شخصیت کا سایہ تھا۔ سارے ماحول میں مادی زندگی کو سادگی اور خیالات کی اونچائی پر ہر ڈھب سے پہنچانے کا اصرار تھا، یا فرض خدمت کا ایک نمونہ سامنے تھا، اور عمر وہ تھی کہ یہ چیزیں دل پر چھائی سی جاتی تھیں۔ اس ماحول سے ہم علی گڑھ کالج پہنچے۔ سفر ہی میں یہ محسوس ہوا کہ دُنیا بدل رہی ہے۔"

صوفی بُزرگ حسن شاہؒ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اسی موقع پر اُن صوفی بُزرگ کا بھی ذکر کر دیا جائے جن کے فیض صحبت سے ذاکر صاحب میں اُن درویشانہ اوصاف کا رنگ نکھرا جو اُن کی زندگی میں مرحلہ بہ مرحلہ برابر تیز اور چوکھا ہوتا گیا، علی گڑھ ہو یا جامعہ ملیہ، جرمنی ہو یا ہندستان، جامعہ نگر کا ان کا اپنا مکان ہو یا راج بھون اور راشٹرپتی بھون، ہر جگہ ان کا یہ رنگ قائم رہا، راج بھون میں رہ کر ایک مرد درویش ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ "دعا کیجیے کہ راج بھون میں فقیر درویش کی طرح دن کاٹ دوں، غفلت

مسلّط نہ ہوجائے، دیدہ بیداری اور خدا اندیشی نصیب ہو... راج بھون میں فقیروں ہی کو رہنا چاہیے" اور یہ کہ "فقر و غنا تو اعتباری کیفیات ہیں، اصلی چیز تعلق باللہ ہے، جسے نصیب ہوجائے"[۱] بلاشبہہ، ذاکر صاحب کی زندگی میں سعدی شیرازی کی اس تلقین کی عملی صورت جلوہ گر تھی : درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار۔

ذاکر صاحب نے اپنی مذکورہ ۱۹۶۸ء والی تقریر میں ان صوفی بزرگ کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

> "الطاف حسین صاحب کی نگرانی میں تھا کہ ایک صوفی بزرگ حسن شاہ صاحب نے توجہ فرمائی اور لمبی تعطیلوں میں میری تربیت کا کام خود اپنے ذمے لے لیا، اور زندگی کے اس موڑ پر جب زندگی ایک پکے سانچے میں ڈھلنا شروع ہوتی ہے ایسی شفقت سے جو ماں کی شفقت سے کم نہ تھی مجھے راستہ دکھایا۔ افسوس کہ مجھے مجموعی طور پر تین سال میں کوئی ۸-۹ مہینے ان کی خدمت میں گزارنے نصیب ہوئے۔ اس کے بعد وہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اگر مجھے یہ صحبت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو شاید میری زندگی کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ ان کی یاد آج تک میرے لیے سرمایۂ راحت و وجہِ حوصلہ افزائی ہے۔"

یہ صوفی بزرگ حسن شاہ ذاکر صاحب کے "دادا کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیل میں ہم سب بھائی قائم گنج آتے تو حسن شاہ دن بھر ہمارے یہاں رہتے تھے۔ صبح آتے اور شام کو جاتے لیکن کھانا ہمارے یہاں نہیں کھاتے تھے۔ یحییٰ پور میں

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ذاکر صاحب کے خطوط مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۵۸ء اور ۱۶ر جون ۱۹۶۲ء؛ دیکھیے ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں، مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، صفحات ۳۹-۴۰ اور ۴۴

ان کا قیام رہتا تھا۔ صبح نو دس بجے وہاں سے کچھ کھا کر آتے اور شام کو واپسی پر وہیں جا کر کھاتے۔ ہمارے یہاں دن میں چائے ضرور پی لیتے تھے اور پان شوق سے کھاتے تھے۔ وہ فرخ آباد کے شاہ طالب حسین مجیب کے ارشد خلفا میں سے تھے اور اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اور وارفتگی بدرجۂ کمال رکھتے تھے، مزاج میں جذب غالب تھا۔[۱]

شاہ طالب حسین مجیب شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی کے مشہور خلیفہ شاہ حسین بخش کے مُرید اور مجاز تھے۔ شاہ عبدالرحمٰنؒ وحدت الوجودی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے "اور مشائخ متقدمین کی عام روش کے خلاف وحدت الوجود پر برسرِ عام گفتگو کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا۔ لیکن ان کے انداز میں فرق نہیں آیا۔ انھوں نے کاسرۃ الانسان، کلمۃ الحق، مفتاح التوحید وغیرہ کتابیں لکھ کر اپنے علمی مرتبے کا لوہا منوایا تھا۔ گنج مرادآباد کے مشہور بزرگ شاہ فضل رحمٰن کے والد ماجد شاہ اہل اللہ بھی ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھے۔ خالص مذہبی و روحانی امکانات سے قطع نظر، تصور وحدت الوجود ایک ایسے انسانی ضمیر کی تشکیل پر زور دیتا ہے جو عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل ہو اور انسانیت کی سطح پر سارے انسان اس کو ایک نظر آئیں۔"[۲]

شاہ طالب حسین نومسلم تھے۔ ان کے اکثر و بیشتر عزیز جو اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے، ان کی خدمت میں آتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے عقیدت مندوں میں بہت سے ہندو بھی تھے۔ ایک دفعہ حسن شاہ نے ایک ہندو عقیدت مند کے ماتھے پر قشقہ دیکھ کر بھری محفل میں اعتراض کر دیا۔ یہ بات شاہ طالب حسین کے صلح کل کے مشرب کے منافی تھی، چنانچہ تادیب و تربیت کے خیال سے اسی محفل میں حسن شاہ کو حکم ہوا کہ قشقہ لگاؤ اور پہلے یہاں سے کشمیر اور پھر وہاں سے جنوبی ہند میں رامیشورم پیدل جاؤ اور وہاں سے بڑے پروہتوں کی چٹھیاں لا کر دو جن میں تمھاری وہاں کی حاضری کی تصدیق

۱۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحات ۱۳۳ - ۱۳۲

۲۔ خلیق احمد نظامی، "ذاکر صاحب کا تصورِ مذہب"، اسلام اور عصرِ جدید: جولائی ۱۹۷۰ء، صفحات ۳۰ - ۲۹

ہو۔ حسن شاہ نے بلا تامل اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل کی اور سفر کی تکمیل کرکے تین سال کے بعد فرخ آباد واپس آ گئے۔[۱]

حسن شاہ کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ جہاں جاتے کتابوں کا ڈھیر ساتھ ہوتا۔ یہ کتابیں زیادہ تر تصوف پر ہوتیں، اور اس کے علاوہ علم کیمیا اور دوسرے فنون کی کتابیں بھی رہتیں۔ وہ ذاکر صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے، اُن سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر ہوتی تھیں نقل کرواتے۔ ذاکر صاحب کہا کرتے تھے کہ اس کتابت کے سبب میرا اُردو کا خط اچھا اور پختہ ہوگیا۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب بیمار پڑ گئے تو روزانہ صبح آکر خود اپنے ہاتھ سے ان کا قارورہ حکیم احمد شیر خاں کے یہاں لے جاتے تھے جو سبحان پور میں ان کے مکان سے کوئی پون میل پر رہتے تھے۔ کبھی انھیں روپے دیتے تھے کہ قریب کے محلے میں فلاں غریب آدمی کو دے آؤ۔ کبھی کسی بیوہ کے یہاں روپے بھجواتے۔ کتابیں نقل کروانے کے علاوہ ان کو ان کے مطالب و معانی بھی سمجھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ذاکر صاحب کی روحانی و اخلاقی تربیت کی اور انھیں تصوف کی اعلا قدروں سے روشناس کیا، اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب کی طبیعت کی زمین میں اخلاقی اقدار اور درویشانہ اوصاف کا بیج اول اول ان ہی وحدت الوجودی صوفی اور درویش حسن شاہ نے بویا تھا۔

دُنیائے اسلام کا بحران اور ذاکر صاحب

ذاکر صاحب ابھی اسکول ہی میں تھے کہ کلکتہ سے مولانا محمد علی نے کامریڈ (۱۹۱۱ء) اور ہمدرد (۱۹۱۲ء) اور مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال (۱۹۱۲ء) نکالا۔ یہ اخبارات جلد ہی ملک کے طول و عرض میں معروف اور مقبول ہوگئے۔ ذاکر صاحب بھی ان اخبارات کو پڑھتے، پڑھ کر دوسروں کو سناتے اور اپنے قلب میں

۱۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۲۳

گرمی اور ذہن میں روشنی محسوس کرتے، اور کچھ کر جانے کی امنگ اور پُرجوش ہو جاتی۔[1]
یہ زمانہ دنیائے اسلام میں بڑے بحران کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر اٹلی کا حملہ ہوا اور ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوئی اور ترکوں کو سخت مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ واقعات سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور یورپ سے ترکوں کو نکال دینے کی بین الاقوامی سازش کے ابتدائی اقدام تھے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا حساس اور باشعور طبقہ ان واقعات کی وجہ سے سخت بے چین اور پریشان تھا۔ اس زمانے میں پُرجوش نظمیں لکھی گئیں، دلوں کو مضطرب کرنے اور تڑپا دینے والے مضامین لکھے گئے جو اخباروں میں چھپے۔ ترکوں کی امداد کے لیے چندے کی مہم شروع کی گئی اور ملک میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کانپور کی مسجد کا واقعہ (۱۹۱۳ء) تو اپنے ہی دیس میں ہوا جس نے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی ایک فضا پیدا کر دی۔ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا گیا۔ پورے ملک میں اس کے لیے چندے ہوئے اور اس میں مسلمانوں

۱۔ ذاکر صاحب نے مولانا آزاد کی وفات پر ۲۳ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی کے تعزیتی جلسے میں جس کی صدارت صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی تھی، تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: "میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں۔ میں ان کے ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی کو بنانے کے لیے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیے کو سُلگانا چاہتا تھا، اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتّیاں بنائی تھیں اور اپنی زندگی کے تیل میں اُن کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا الہلال پڑھتا تھا، اور جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا اس وقت اس بتی میں آگ لگی تھی۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی، لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انھیں سے لی تھی۔" (ماہنامہ آجکل، ابوالکلام نمبر، اگست ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۱)

نے گہرے اور شدید مذہبی جذبے کے ساتھ حصّہ لیا۔ ناممکن تھا کہ ذاکر صاحب جیسا حسّاس اور ذہین طالب علم اِن حالات و واقعات سے متاثر نہ ہوتا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن جو برسوں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ٹیچرز کالج کے پرنسپل رہے' ان کے اسکول کے ساتھی تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: "جس زمانے میں ذاکر صاحب اور میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے ترکی اور اٹلی میں جنگ ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب کی تحریک پر ہم لوگوں نے گوشت کھانا بند کر دیا تاکہ جو روپیا بچے وہ ترکوں کی مدد کے لیے بھیجا جائے۔ مرشد[1] کو انگریزی اخبار پڑھنے کا اس زمانے میں بھی بہت شوق تھا۔ پائنیر اخبار معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا۔ انھیں خبریں جلد سے جلد معلوم کرنے کی اتنی شدید خواہش رہتی تھی کہ وہ روز اٹاوہ کے اسٹیشن پر پائنیر اخبار خریدنے کے لیے جاتے تھے۔ آگے وہ اور پیچھے میں۔ اسٹیشن پر اخبار اترتے ہی ذاکر صاحب اسے حاصل کرتے تھے اور پھر وہ اور میں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول کے بورڈنگ میں واپس آتے۔ وہاں طالب علم ذاکر صاحب کے منتظر ہوتے اور ان کے واپس ہوتے ہی چاروں طرف حلقہ بنا لیتے۔ ذاکر صاحب انھیں خبروں کا نہ صرف ترجمہ کرکے سُناتے بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے۔"[2] اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین کو ہمیشہ اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کے طالب علموں میں جو ذہین اور ہونہار ہیں' وہ اُن سے اسکول کے بعد خارجِ اوقات میں ملیں اور تبادلۂ خیال کریں' ذاکر صاحب ایسے طالب علموں میں نمایاں تھے' وہ اور کچھ اور اچھے طالب علم ان کے مکان پر کافی وقت صرف کرتے' وہاں الطاف حسین صاحب بین الاقوامی مسائل پر گفتگو کرتے اور حالاتِ حاضرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے تھے۔ ذاکر صاحب چونکہ بہت ذہین تھے اس لیے انھوں نے اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ" ذاکر صاحب

۱۔ یعنی ذاکر صاحب

۲۔ حبیب الرحمٰن، "تعلیمی دور" مطبوعہ مسلم یونی ورسٹی گزٹ علی گڑھ، ذاکر نمبر، ۲۴ر فروری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۱

کی عام واقفیت سیاسی مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہو گئی کہ بیشتر اعلا تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ جو ان کی دوگنی عمر کے تھے، ان مسائل کے متعلق ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے۔ اس بصیرت کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ ان میں بین الاقوامی اور قومی معاملات کے متعلق صحیح جذبات اور رجحانات بھی پیدا ہو گئے اور ہندستان سے باہر جو مسلم ریاستیں ہیں، ان سے گہری ہمدردی بھی پیدا ہو گئی۔[1]

ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر کی صلاحیت کچھ وہبی سی تھی، اسکول کے زمانے میں وہ اس لحاظ سے بھی طالب علموں میں ممتاز تھے۔ خیالات اعلا رکھتے تھے اور انھیں بڑے سلیقے سے پیش کرتے تھے جس سے سننے اور پڑھنے والے متاثر ہوتے تھے۔ بعد میں ان کی اس صلاحیت کی ایسی جلا ہوئی کہ ایم اے او کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کی نائب صدارت سے لے کر جمہوریۂ ہند کی صدارت کے زمانے تک ان کی تحریر و تقریر کی یہ خصوصیت منفرد اور نمایاں رہی۔ تحریر و تصنیف میں وہ صاحب طرز کہلائے اور گفتگو و تقریر میں عام طور پر ان کی جادو اثری کا اعتراف کیا گیا۔

جس زمانے میں ترکی اور اٹلی کی لڑائی اور بلقان کی جنگ ہو رہی تھی ذاکر صاحب مظلوم ترکوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں جگہ جگہ تقریریں بھی کرتے تھے اور اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ ٹرکش ریلیف فنڈ کے لیے زیادہ سے زیادہ چندہ دیں۔ ایک بار ذاکر صاحب نے نماز جمعہ کے بعد اٹاوہ کی ایک مسجد میں موثر تقریر فرمائی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بے پھندنے کی ترکی ٹوپی اُلٹا کر کے نمازیوں کے سامنے پیش کی۔ پیش کرتے وقت انھوں نے فرمایا: 'لائیے لائیے، حضرات، جوتا نبے کے پیسے آپ اس ٹوپی میں ڈالیں گے وہ سیسے کی گولیوں میں منتقل ہو کر دشمن کے سینے

۱۔ ایضاً۔

کے پار ہوں گے۔" ایک سفید ریش بزرگ پر اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور اپنا پورا بٹوہ ذاکر صاحب کی ٹوپی میں اُلٹ دیا۔ اچھی خاصی رقم ہر مرتبہ جمع ہو جاتی اور پھر ذاکر صاحب ڈاک خانے کا رُخ کرتے اور اس رقم کو منی آرڈر کے ذریعے ترکوں کی مدد کے لیے بھیج دیتے۔"[1]

ذاکر صاحبؒ کی شادی

ذاکر صاحب کی بڑی صاحبزادی سعیدہ خورشید عالم نے اپنی کتاب ذاکر صاحب کی کہانی میں لکھا ہے (صفحات ۱۳-۱۲) : "ان کی ایسی ہی ایک تقریر ان کی شادی کا باعث بنی۔ اسی زمانے میں چندہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے قائم گنج میں بھی ایک تقریر کی جس میں ہماری والدہ کے دادا بھی شریک تھے۔ ان پر تقریر کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے بھی حبیب الرحمٰن کے بتائے ہوئے بزرگ کی طرح اپنا بٹوہ میاں کی ٹوپی میں اُلٹ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی دل میں طے کر لیا کہ اپنی لاڈلی پوتی کی شادی اسی لڑکے سے کریں گے۔ ہماری والدہ کی دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا کی یہ اکلوتی پوتی تھیں۔ ان کے اور سب بچے وفات پا چکے تھے اس لیے دادا انھیں بہت چاہتے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھیں اور وہ انھیں پیار میں پتلی کہا کرتے تھے۔ یوں ہماری والدہ کا نام شاہجہاں بیگم ہے۔ میاں ہماری والدہ کے دادا کے سگے بھائی کے نواسے تھے۔ تقریر سُن کر گھر آئے تو انھوں نے میاں کی والدہ یعنی اپنی بھتیجی کو بلایا اور کہا کہ میں ذاکر سے اپنی پوتی بیاہنا چاہتا ہوں۔ ہماری دادی یعنی میاں کی والدہ یہ تجویز سُن کر بہت خوش ہوئیں... بات طے ہو گئی لیکن دونوں کی تقدیر میں یہ خوشی دیکھنا نہ لکھی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد دونوں کا انتقال ہو گیا اور یہ شادی میاں کے بڑے بھائی

۱۔ ایضاً، صفحات ۱۵-۱۴

اور اماں کی والدہ نے کی۔[1]

ذاکر صاحب کا ایک مضمون

۱۹۱۱ء میں ذاکر صاحب آٹھویں جماعت میں تھے، اس وقت ان کا ایک مضمون اسکول کے کاغذات میں دستیاب ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان ہے "طالب علم کی زندگی"۔ یہ مضمون درج ذیل ہے اور اسے انھوں نے اسکول کے طلبہ کی انجمن کے کسی جلسے میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر یہی مضمون ان کی کتاب زندگی کا عنوان بن جائے گا:

"جناب صدر انجمن صاحب اور دیگر حضرات

"آج میرا مضمون طالب علم کی زندگی پر ہے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس سے آپ میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کیا اچھی خاصی واقفیت ہونا چاہیے، کیونکہ ہم طالب علم ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ایک شخص کا تعلیم پانے سے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ ایک شخص وکالت کے لیے تعلیم پاتا ہے، دوسرا ڈاکٹری کے لیے، تیسرا عام سرکاری نوکری کے لیے، اور عام خیال یہ ہے کہ طالب علم کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ دولت پیدا کرے۔ یہ مقصد ابتدا ہی سے طالب علم کے اس قدر پیش نہیں رہتا جس قدر اس کے والدین کے۔ ہر طالب کا یہ فرض ہے کہ اگر اپنے خاندان کی پرورش اس پر منحصر ہو تو اس کو اپنے اور والدین کے گزارے کے لیے پڑھنا چاہیے اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ہر شخص کی مالی ترقی سے قوم کی مجموعی ترقی ہوتی ہے۔ مگر طالب علم ہونے کی وجہ سے صرف دولت پیدا کرنے اور اپنے پیٹ بھرنے کو اپنا مقصد قرار دینا صرف طالب علم ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کی بھی

۱۔ ذاکر صاحب کی شادی ۱۹۱۵ء میں ہوئی جب وہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ (ذاکر صاحب کی کہانی صفحہ ۱۶) /

ذلت ہے۔ اگر طالب علم کا پڑھنے سے یہ مقصد ہو کہ میں اچھے اچھے کوٹ پہنوں گا، گاڑی پر بیٹھوں گا، حکام سے ہاتھ ملاؤں گا تو وہ طالب علم کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ الغرض دولت پیدا کرنا طالب علم کی زندگی کا بدترین مقصد ہے جو ہو سکتا ہے۔

"جس طرح دولت طالب علم کی زندگی کا مقصد نہیں اسی طرح آرام طلبی سے بھی اس کو کنارہ کشی کرنی ضروری ہے، کیونکہ آرام طلبی ایک ایسی چیز ہے جو سب آدمیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ اب تک میں نے مختصر طور پر ان چیزوں کا بیان کیا ہے جو طالب علم کی زندگی کا مقصد نہیں ہونی چاہییں۔ اب میں ان چیزوں کا بیان کروں گا جو طالب علم کو کرنی چاہییں اور جو اس پر فرض ہے۔ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بیجا نہ ہوگا کہ اگر میں طالب علم کی مختصر تعریف کر دوں۔

"طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت کو موجودہ حالت سے بہتر کرنا چاہتا ہے، جو اپنی قوتوں کو جہاں تک بڑھنے کی ان میں طاقت ہے وہاں تک ان کو بڑھانا چاہتا ہے، جو علم اور خیالات کے ان خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سیکڑوں نسلیں اپنے آیندہ آنے والے وارثوں کے لیے چھوڑ گئی تھیں فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے، جو اس بات کا خواہش مند ہو کہ جہاں سے عقل کا سبق اس کو ملے، جہاں سے عمدہ عمدہ باتیں اسے معلوم ہوں، جہاں سے دانش اور اعلا خیالات اُس کو میسر آ سکیں، جہاں سے اس دنیا کی بابت ایسی باتیں معلوم ہوں جو اسے نہیں معلوم اور جن کے معلوم کرنے سے اس کو دنیا میں مدد ملے گی وہاں سے ان سب کو حاصل کرے۔ طالب علم ہونے کے لیے کم سے کم اتنی عقل ضرور ہونی چاہیے کہ وہ نیک و بد میں، مفید و مضر میں، قابل پسند اور قابل نفرت باتوں میں تمیز کر سکے۔ اس کو چاہیے کہ محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرے، اس کو چاہیے کہ تعلیم سے اپنے دل میں غور و فکر کا مادّہ پیدا کرے، اس کو چاہیے کہ غور و فکر کے [illegible] کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جو انسان کے لیے ممکن

ہیں. لیکن وہ اس دنیا میں کچھ ترقی نہیں کرسکتا، وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی مشکلوں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالب علم کہلائے جانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اگر ایسا خیال رکھے گا تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکے گا، بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کیے جانا چاہیے کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا:

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

"طالب علم کی زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جو اوہام و تعصبات اس میں ہوں ان پر غالب آجائے اور اس کو چاہیے کہ ذلیل عادتوں کو چھوڑ دے۔ اس کو چاہیے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے جاہل بھائیوں میں تعلیم کی اشاعت کرے اور اشاعت تعلیم کو بھی اپنی تعلیم کا جزو سمجھے۔ اس کو علم کو علم کے لیے پڑھنا چاہیے اور ساتھ ہی اس کو زندگی کی ضرورت سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ دنیاوی ضروریات سے غافل ہوگا تو وہ اپنے خاندان کو سنبھال نہیں سکتا اور وہ بنی نوع انسان کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ اور اگر وہ پڑھا ہوا نہ ہو تو وہ کوئی آدمی نہیں اور وہ اس دنیا میں کچھ اچھے کام نہیں کرسکتا۔

خاکسار
ذاکر عفی عنہ
درجہ ہشتم، مدرسہ اسلامیہ اٹاوہ"

تیسرا باب

ایم۔اے۔او۔کالج، علی گڑھ

(۱۹۱۳—۱۹۲۰)

ذاکر صاحب نے ۱۹۱۳ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا اور محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج، علی گڑھ (ایم۔اے۔او۔کالج) میں انٹرمیڈیٹ سائنس میں داخلہ لیا، ان کے بھائی چاہتے تھے کہ وہ ڈاکٹر بنیں۔ اس لیے ۱۹۱۵ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ لکھنؤ گئے اور ڈاکٹری کی تعلیم کی غرض سے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخلہ لیا، لیکن وہاں جا کر سخت بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اگلے سال (۱۹۱۶ء میں) علی گڑھ واپس آ کر 'بی' اے' میں داخل ہو گئے۔ 'بی' اے' میں ان کے مضامین انگریزی ادب، فلسفہ اور معاشیات تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے اول درجے میں 'بی' اے' پاس کیا۔ ان کے دوست پروفیسر حبیب الرحمٰن بھی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، 'بی' اے' میں ان کے ساتھ تھے اور ان کے مضامین بھی وہی تھے جو ذاکر صاحب کے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "میں ان تین مضامین کے علاوہ اور کسی مضمون کی کوئی کتاب نہ پڑھتا۔ امتحان میں کامیابی حاصل کرنا میرا مقصد ہوتا۔ ذاکر صاحب درسی کتابوں کو مطلق اہمیت نہ دیتے لیکن ان کے علاوہ مختلف مضامین کی کتابیں، خوب پڑھتے۔ امتحان سے چند روز قبل مجھ سے مطالبہ کرتے کہ جو درسی کتابوں کے خلاصے میں نے تیار کیے ہیں وہ ان کے حوالے کر دوں۔ کسی اور طالب علم کو میں یہ خلاصے ہرگز نہ دیتا لیکن ذاکر صاحب کو بخوشی دے دیتا۔

ہفتے دو ہفتے میں ان خلاصوں میں سے بنیادی اور اہم نکات وہ فوراً غیر ضروری مواد سے نکال لیتے اور ان کی اتنی عمدہ تنظیم اپنے ذہن میں کر لیتے کہ میرے دماغ میں تو مواد کی زیادتی کی وجہ سے بعض مسائل اُلجھ جاتے لیکن ان کے ذہن میں صرف ضروری چیزیں نہایت منظم شکل میں محفوظ ہو جاتیں... الٰہ آباد یونیورسٹی کے بی، اے کے امتحان میں وہ اور میں اوپر کے ان پانچ طلبہ میں تھے جنھیں یونی ورسٹی کا ایم اے کا وظیفہ ملا لیکن وہ مجھ سے اوپر تھے۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی کا اقبال میڈل انھیں ملا اور ہر چند کہ میری امتحان کی تیاری ان سے بہت زیادہ تھی، میں دیکھتا رہ گیا۔"[1]

ذاکر صاحب نے ایم، اے، میں معاشیات لی، اور ساتھ ہی ایل ایل، بی میں بھی داخلہ لیا۔ اور ابھی وہ ایم، اے، فائنل کے طالب علم ہی تھے کہ انھیں کالج میں ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔

کالج میں پہلا دن

ایم، اے، او، کالج علی گڑھ میں اپنے پہلے دن کے تجربے کو ذاکر صاحب نے اپنی ریڈیائی تقریر "کالج میں میرا پہلا دن" (۳۰ر جولائی ۱۹۴۷ء)[2] میں اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبہ (۲۸ر جنوری ۱۹۵۵ء) میں اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم اُن کی اس ریڈیائی تقریر کے اقتباسات درج کرتے ہیں، وہ اسکول کے ماحول کا حوالہ دیتے ہوئے کالج کی زندگی کی طرف اپنے پہلے سفر اور کالج میں اپنے پہلے دن کے تجربے کو یوں بیان کرتے ہیں:

"..... اس شفقت و محبت کے پُرانے ماحول (اسکول) نے زندگی کو سختی سے

۱۔ حبیب الرحمٰن، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۵

۲۔ اس کے چند اقتباسات پہلے دیے جا چکے ہیں جو اٹاوہ اسکول کے ماحول سے متعلق ہیں۔

آشنا نہ کیا تھا۔ دوسروں پر سہارے کی عادت ہوگئی تھی۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ کالج کے اس سفر سے پہلے میں نے کبھی خود ریل کا ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ گھر سے اٹاوہ کا ٹکٹ کوئی عزیز لیتا' اٹاوہ سے گھر کا کوئی ماسٹر صاحب' اور ہم ایک جگہ کے کئی طالب علم اٹاوہ میں تھے' ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے اور ان میں کوئی نہ کوئی لیڈر صفت لڑکا سب انتظام راستے میں کرتا' اور مجھے کبھی اس لیڈری کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس دفعہ بھی گھر سے کسی نے ٹکٹ خرید کر ریل گاڑی میں بٹھا دیا۔ مگر ٹکٹ علی گڑھ کا نہ مل سکا تھا' ہاتھرس کا ٹکٹ ملا تھا۔ وہاں گاڑی بدلنی تھی اور نیا ٹکٹ لینا تھا۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ ریل پیل تھی کہ الاماں' سامان کہاں چھوڑوں؟ قلی پر اعتماد کروں کہ نہ کروں؟ کئی بار اس ریلے میں گھسنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ہار مان کر اس ہنگامۂ بے تمیزی سے باہر نکل آیا۔ ادھر گاڑی کے (وقت کے) قریب آنے سے ذہن کی دھڑکن اور دل کی دھڑکن میں کچھ مطابقت سی پیدا ہونے لگی... مگر ٹکٹ۔ اور بے ٹکٹ سفر! یکایک ایک پولیس والے پر نظر پڑی جو اس سارے ہنگامے کو فلسفیانہ نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس بے ہنگام انتشار میں کچھ نظم پیدا کرنے کا خیال اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خدا کی مرضی میں بے جا' اور ظاہر ہے' بے اثر مداخلت۔ مگر میں کہ اس وقت فلسفے سے اس قدر دور تھا جتنا یہ پولیس والا فرض شناسی سے' اس کی طرف بڑھا اور عمر میں پہلی بار اس چیز سے جو 'پولیس والا' کہلاتی ہے شرفِ خطاب حاصل کیا۔ 'حولدار صاحب' میں نے کہا' حالانکہ تھے یہ محض کانسٹبل' لیکن غرض مند سے بسا اوقات اس قسم کے تعظیمی جھوٹ بے تکلف سرزد ہوجاتے ہیں۔ حولدار صاحب! مجھے علی گڑھ کا ٹکٹ چاہیے۔ انھیں شاید میری بے بسی پر ترس آیا کہ پولیس والے بھی تو آدمی ہوتے ہیں' ان کو بھی ترس آتا ہی ہوگا۔ پھر شاید اس روز بونی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ غرض وہ جلد ہی' ایک لمحے کے تامل کے بعد' اپنی فلسفیانہ بے تعلقی کی بلندی سے عملی دُنیا کی پستی پر اتر آئے اور بولے 'آٹھ آنے دو گے؟' میں نے کرایے

سے دس آنے یا بارہ آنے زیادہ ان کے ہاتھ پر رکھے اور انھوں نے دفتر کے اندر جا کر ٹکٹ لادیا۔ غرض اس ٹکٹ کے سہارے ہم علی گڑھ پہنچے۔

اب سوچتا ہوں کہ پہلے ہی دن مجھ پر کیا خاص اثر ہوا تو یاد آتا ہے کہ پہلا احساس یہ تھا کہ (علی گڑھ) بہت بُری جگہ ہے۔ میرا چھوٹا سا مدرسہ گھر تھا، یہ تو ایک دُنیا ہے۔ اس میں مجھے معلوم تھا کہ میرے سر پر غالباً باپ سے زیادہ شفقت اور یقیناً باپ سے زیادہ حکمت والے استاذ کا سایہ ہے۔ یہاں کی چہل پہل میں سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ وہاں مجھے اپنی جگہ اور دوسروں کی جگہ معلوم تھی، یہاں تو کھو جانے کا ڈر تھا۔ وہاں تو سب ہی ساتھی تھے، یہاں یہ ڈر تھا کہ اکثر ہمیشہ اجنبی رہیں گے۔ دوسرا اثر یہ تھا کہ میں سادگی اور محنت کی جس فضا سے آیا ہوں وہ کچھ اور چیز تھی، یہاں رنگ کچھ اور ہے۔ وہاں یہ فضا اوپر سے کسی نے بنادی تھی۔ ہم بے جانے بوجھے اس میں شریک تھے۔ یہاں اوپر سے بہت کم ہوتا ہے۔ آزادی ہے اور آزادی کی دُشواریاں۔ قومی انحطاط کے زمانے میں ایسی آزادی میں بُرائیاں، نقالیاں، کم ظرفیاں اُبھرتی ہیں۔ خوبیاں، عالی حوصلگیاں، خودداریاں چھپی چھپی، دبی دبی سی رہتی ہیں، لیکن ہوتی ہیں اور کوئی ڈھونڈے تو نوجوانوں کی ہر جماعت میں ان کے ساتھ مل ہی جاتی ہیں اور ترقی پاکر کسی دن رنگ بدل دیتی ہیں۔

"پہلے ہی دن یہ محسوس ہوا کہ مدرسہ کی پابندی سے کالج کی آزادی میں قدم رکھنا طرح طرح کی دشواریوں کا مول لینا ہے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ کیا پڑھیں، کیسے فیصلہ کریں؟ کوئی نہیں کہتا کیا کریں، کوئی نہیں کہتا کہاں جائیں، کب سوئیں، کب جاگیں؟ پابندیوں کا عادی اس آزادی سے گھبرا جاتا ہے۔ جسے اپنے فیصلے آپ کرنے کے موقع نہ ملے ہوں وہ صحیح فیصلے کیسے کرے! آدمی سہارا ڈھونڈتا ہے، اور سہارا بسا اوقات نہیں ملتا۔ اُستادوں میں تو اکثر نہیں ملتا، اس لیے کہ وہ آزادی دینے کی آڑ میں کام سے بچ جاتے ہیں۔ ہاں، ساتھیوں میں ملتا ہے، اور نوجوانوں کے اس بڑے مجمع میں جو میرے کالج میں ایک ساتھ رہتا سہتا، کھاتا پیتا تھا، ہر طبیعت کے

نوجوان کے لیے ان کے ساتھی اور ان کے سہارے موجود تھے۔ اور ان طالب علموں ہی میں نہیں بلکہ ان سے وابستہ نوکروں اور کاروباری لوگوں میں کچھ ایسے لوگ یکجا ہو گئے تھے جن کی شخصیت واقعی ایک تربیتی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ کو ان تاثرات کی کچھ مثالیں بتاؤں اس کالج کے ایک بڑی دنیا ہونے کے متعلق جس میں آدمی کھو سکتا ہے۔

"میں جب کالج پہنچا تو میرے بڑے بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دوپہر کے کھانے پر وہ مجھے اپنے ساتھ کھانے کے کمرے تک لے گئے۔ اتنے آدمیوں کو ایک کمرے میں بیک وقت میں نے کھانا کھاتے کبھی نہ دیکھا تھا، نہ اتنی جلدی کھانا ختم کرتے۔ یہاں کوئی چند منٹ بھی دیر سے پہنچے تو شبہہ ہوتا تھا کہ کہیں وقت سے پہلے تو نہیں آگیا[1]۔ اس روز شام کو میرے دونوں بھائی مغرب کی نماز کے بعد اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے اور مجھ سے کہہ گئے کہ گھنٹی بجے تو تم کھانا کھانے چلے جانا۔ بھائی صاحب نے صبح ہی مجھے اپنا کالا ٹرکش کوٹ[2] دے دیا تھا کہ اسے پہن کر کھانا کھایا جائے گا۔ یہ یونیفارم ہے۔ میرا ہندستانی لدھیانوی[3] جوتا بھی جس پر بہت سے پرانے لڑکوں کی نظریں کچھ حقارت اور کچھ تعجب کے ساتھ پڑ چکی تھیں، بدلوایا جا چکا تھا اور ایک نیا شو جو پیچے کو خوب دباتا تھا، خرید دیا گیا تھا۔ خریدتے وقت مجھے اس شو کی شان میں یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ یہ دباتا ہے۔ گھنٹی میری توقع سے پہلے بج گئی۔

۱۔ اسی بات کو ذاکر صاحب نے اپنے ۲۴ر جنوری ۱۹۵۵ء کے خطبہ میں اس طرح کہا ہے: "یعنی جانا، کھانا، آنا، سب ۹-۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں، البتہ کھانے میں بہت ہی نوجی شان تھی۔ اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔" (تعلیمی خطبات، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۴۳)

۲۔ جنوری ۱۹۵۷ء کے خطبہ میں ٹرکش کوٹ کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ لدھیانوی جوتے کا ذکر بھی جنوری ۱۹۵۷ء کے خطبہ میں نہیں ہے۔

جوتے کے لیس باندھنے میں بے مشقی کی وجہ سے کچھ دیر لگ گئی۔[1] بھائی صاحب کے ترکش کوٹ کے گلے میں ایک سفید کالر بٹنوں سے چسپاں تھا۔ اس کے بٹن ٹوٹے پاکر انھیں درست کرنے میں اور پھر کالر کو نوچ پھینکنے کے فیصلہ کرنے میں کچھ دیر ہوئی۔ غرض جب تک میں تیار ہوں سب لڑکے جا چکے تھے اور میں تنہا ڈائننگ ہال کی تلاش میں نکلا۔ آدھ گھنٹے تک نہ جانے کہاں کہاں گھوما کیا اور ڈائننگ ہال تک نہ پہنچ سکا۔ تحت شعور تو تِوں کا خدا بھلا کرے کہ انھوں نے اس ناکام سفر کے بعد مجھے پھر اپنے کمرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔[2] ایک بڑی اجنبی دُنیا میں اپنی راہ تلاش کرنا واقعی کٹھن کام ہے۔"

حریت پسندی، حمیت قومی اور غیروں کی نقالی سے احتراز و بیزاری کا جو بیج اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ذاکر صاحب کی طبیعت کی زمین میں ڈالا گیا تھا، وہ اب پروان چڑھ

۱۔ ۱۹۵۶ء کے خطبہ میں یہ "روداد غم" یوں ہے: "سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں، اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خریدوا دی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، اُدھر سے آئے تھے اکّے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اُٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا... گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کرتر کی ٹوپی، ترکی کوٹ، جراب اور انگریزی جوتے پہنے۔ بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرادی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا، اور کئی بار کے بہت دکشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے،

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد"

۲۔ جنوری ۱۹۵۷ء کے خطبے میں یہ کیفیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: "... کمرہ بند تھا۔ دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں اور اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی" (باقی اگلے صفحے پر)

رہا تھا، اسکول کے دنوں میں ان صفحات کے نقش ہم نے پچھلے صفحات میں دیکھے ہیں،
ب طنز و مزاح کے آئینے میں ایک نقش جو ان کے کالج میں پہلے دن کی یاد کا نقش
ہے، اور دیکھیے، اور ۱۶ سال کے اس بچّے میں نشو و نما پاتے ہوئے وطن دوستی کے
جذبے کو محسوس کیجیے۔ اپنی مذکورہ ریڈیائی تقریر کے اختتامی ٹکڑوں میں ذاکر صاحب
بیان کرتے ہیں[1]:

"... اس ڈائننگ ہال میں پہلے ہی دن میں نے دیکھا کہ ہماری اعلا تعلیم گاہوں
میں اس زمانے میں نوجوانوں کا کیا ناپ آگے آگے تھا اور عزّت کی نظر سے دیکھا
جاتا تھا۔ دوپہر کو جو کھانا کھانے کے بڑے کمرے میں گیا تو ہال کے بیچ میں ایک صاحب
کو کھڑا دیکھا جو اپنے ڈیل ڈول سے اور اپنی مونچھوں کی نشو و نما لیے کہ داڑھی تو کسی
ترکیب سے خارت کردی گئی تھی، کافی سن رسیدہ معلوم ہوتے تھے۔ نہایت قیمتی
انگریزی لباس زیب تن تھا، پتلون کی کریز میں کہیں نام کو شکن نہ تھی، سوٹ اور
نکٹائی اور قمیص اور موزوں میں رنگ کی ہم آہنگی کا خاص اہتمام تھا، پتلون کی ایک
جیب میں ہاتھ، نظر سامنے، بت کی طرح کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ گڈا قدم قدم
چلنے لگا۔ ایڑی کی ضرب سے آواز نکلتی تھی کھٹ کھٹ۔ پورے ہال میں کھٹ کھٹ

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) بازیافت، تلاش منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیِ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے...
سچ ہے وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی ایک
پیمانہ ہے؛ کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ، پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی کشف حقیقت، قصد
نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں۔ کبھی
بے مقصودی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس
پر حقارت سے ہنستا ہے۔" (تعلیمی خطبات، ۱۹۸۲ء، صفحات ۲۷۳-۲۷۲)

۱۔ ذیل کا واقعہ ۱۹۵۷ء کے خطبہ میں نہیں ہے۔

چلنے کے بعد پھر یہ مجسمہ کھڑا ہوگیا، پھر چلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نوسکھ سنگ تراش نے خودبینی و نخوت، تہی دماغی اور غلامانہ نقالی کے آمیزہ سے ایک مجسمہ بنایا ہے جسے کسی بڑے انگریز درزی نے سیتے داموں خرید کر اس میں لکڑی کی ٹانگیں لگادی ہیں اور اس میں ایک چرخی لگاکر کوک دے دی ہے جس سے یہ مجسمہ چلتا ہے کھٹ کھٹ۔

"یہ صاحب کالج کے ممتاز عہدۂ سینیر نوڈ مانیٹری پر مامور تھے اور اپنی قسم کے اکیلے نمونہ نہ تھے۔ ان سے ملتے جلتے نمونے کالج میں پہلے ہی مجھے جگہ جگہ دکھائی دیے تھے۔ یہ مجھے خاص طور پر اس لیے یاد ہیں کہ بعد کو ان لوگوں کا خاصا ساتھ رہا، ٹکریں بھی رہیں، اور کالج چھوڑنے سے پہلے اس جنس کو ختم ہوتے بھی میں نے دیکھ لیا۔ بعد کو کیا ہوا وہ مجھے معلوم نہیں، لیکن جہاں یہ گڈے دیکھے وہاں بہت سے آدمی بھی دیکھے جن کی دوستی زندگی کا سرمایہ ہے..."

کالج کی زندگی

ذاکر صاحب ایک ذہین طالب علم تھے۔ اسکول میں تین بار وہ سالانہ امتحانوں میں اوّل آئے تھے۔ تقریر و تحریر کی بھی اچھی مشق اسکول میں ہوگئی تھی۔ شفیق اساتذہ اور خاص طور پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی توجہ، تربیت اور ہمت افزائی سے ان میں ایسے اخلاقی اوصاف بھی پیدا ہوگئے تھے جو آیندہ کالج کی زندگی میں امتیاز حاصل کرنے میں ان کے بہت کام آئے۔ اسکول کی اقامتی زندگی میں انھوں نے مختلف النوع حالات اور مختلف المزاج طالب علموں اور لوگوں سے توافق پیدا کرنے کا جو سلیقہ سیکھا تھا، اور اس سلسلے میں جس مثالی صلاحیت کا بیج ان کی سیرت میں نمو پذیر ہوچکا تھا اس کی نشوونما ایم اے او کالج میں خوب خوب ہوئی۔ اور بعد میں تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر میں ان کی شخصیت کی دوسری خوبیوں کے

علاوہ اس صلاحیت نے ایک معجزہ کی سی کارکشائی کا نمونہ پیش کیا۔

کالج کے میگزین کے بعض شماروں سے جو اس دور میں علی گڑھ منتھلی کے نام سے موسوم تھا، پتا چلتا ہے کہ وہ سائنس کے اچھے طالب علموں میں تھے مثلاً مارچ ۱۹۱۵ء کے شمارے میں درج ہے کہ انھیں سائنس میں کالج کا اسکالرشپ ملا تھا اور انھیں سائنس کا جونیر پرائز اسکالر کا امتیاز دیا گیا تھا۔ اسی طرح اس شمارے میں تعلیمی سال ۱۴-۱۹۱۳ء کے انعام جیتنے والوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں فرسٹ ایر سائنس کے ذیلی عنوان کے تحت درج ہے:

First All-round	——	Zakir Husain Khan
First in English	——	Zakir Husain Khan
First in Physics	——	Zakir Husain Khan
First in Biology	——	Zakir Husain Khan

اسی طرح بی، اے، میں آرٹس کے طالب علم کی حیثیت سے بھی وہ ممتاز تھے، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معاشیات سے انھیں اسی وقت سے گہری دلچسپی تھی۔ علی گڑھ منتھلی کے جنوری۔ فروری ۱۹۱۸ء کے شمارے میں اس بات کا اندراج ملتا ہے کہ ۱۹۱۷ء میں جن طلبہ کو انعامات ملے تھے ان میں ذاکر صاحب بھی ہیں۔ انھیں معاشیات کا ممتاز طالب علم قرار دیا گیا تھا اور ۱۹۱۸ء میں بی، اے، فائنل کے یونی ورسٹی امتحان میں انھیں اقبال میڈل ملا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ ہوسٹل کے انتظام و انصرام سے بھی کسی حد تک منسلک رہتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ ایس۔ ایس۔ ایسٹ (ہوسٹل) کے مقیم طالب علم کی حیثیت سے سینیر پراکٹوریل مانیٹر تھے۔ نماز باجماعت پابندی سے پڑھتے تھے اور نماز میں اچھی حاضری کے لیے انھیں سُنّی دینیات کا انعام بھی ملا تھا۔

ذاکر صاحب بحیثیت مقرر

ذاکر صاحب بڑے اچھے مقرر تھے۔ وہ ریڈنس اسٹوڈنٹس یونین کے بیشتر مباحثوں اور جلسوں میں شریک ہوتے اور تقریریں کرتے۔ وہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے، اور دونوں زبانوں کے بہترین مقرر مانے جاتے تھے۔ اور اُن کی طبیعت میں مزاح کی جو تیز حِس تھی، اُس سے وہ مباحثوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ علی گڑھ منتھلی کی مختلف اشاعتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے انعامات بھی جیتے، دادوتحسین اور شہرت بھی حاصل کی اور تقریر و مباحثے کے میدان میں قابل تقلید مثال بھی قائم کی۔

مباحثوں میں ذاکر صاحب کی ذہانت کے دھاروارپن اور "دودستی" کا منظر اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا جب انھیں مخالف سائڈ کے مقررین کا جواب دینا ہوتا۔ وہ ان کی دلیلوں کی کمزوریوں کو بڑی تیزی سے پکڑ لیتے، اور اپنی تقریر میں انھیں طنز و مزاح کے نشتروں کی نوک پر لے کر بڑے ڈرامائی انداز میں اس طرح اُچھالتے کہ کبھی سامعین دم بخود رہ جاتے اور کبھی مجمع قہقہوں سے زعفران زار بن جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی انھوں نے تقریر شروع کی، ان کی ذہانت، ذکاوت اور جرأت پورے طور پر بروئے کار آجاتی تھی۔ ان کے معتقدین اور دوست سامنے ہوں تو ان کی تقریر کی روانی کا کچھ اور ہی عالم ہوتا تھا، اسی طرح مخالفوں کو بھی دیکھ کر اُن کے ذہن کی دَرّاکی اور بھی تیز اور ان کے دلائل اور بھی دھاردار اور "صف شکن" ہوجاتے تھے۔ مباحثوں میں اُن کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہوتا تھا کہ وہ اپنے موقف اور اپنے طرزِ استدلال کی برتری کو عجیب عجیب انداز سے ثابت کرتے تھے، اور اس سلسلے میں وہ اپنے دوستوں اور مخالفوں کو کافی

۱۔ مثلاً ہیر الڈ کوکس اور کیمبرج اسپیکر انعامات

دیر تک ایک سسپنس (SUSPENSE) کی کیفیت میں رکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جہاں ان کے قدر دانوں کی تعداد خاصی ہوگی وہاں حسد اور مخالفت کرنے والے بھی ضرور رہے ہوں گے۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے مضمون "ذاکر صاحب" میں ۱۸-۱۹۱۷ء کے یونین کے انتخابات سے متعلق ایک واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اس سال ذاکر صاحب وائس پریسیڈنٹ کے عہدے کے لیے امیدوار تھے اور وہ منتخب بھی ہوئے تھے۔ ایم اے او کالج کے اس عہد کی اسٹوڈنٹس یونین کا الیکشن کوئی معمولی الیکشن نہیں ہوتا تھا۔ اس میں عام طور پر کسی قسم کی اخلاقی بدعنوانی گوارا نہیں کی جا سکتی تھی، اور جیسا کہ اس زمانے کے بعض طلبہ نے جو بعد میں معتبر مصنف بنے، لکھا ہے کہ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی شخص اپنی ذاتی قابلیت یا اچھی سیرت کے سوا کسی اور چیز کو اپنا سہارا بنائے اور یونین کے انتخاب میں کامیاب ہو جائے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے علی گڑھ میں طلبہ کی سیرت و شخصیت کا اثر یونین پر اور یونین کا طلبہ پر کتنا گہرا رہا ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں رشید صاحب کی عبارت جوں کی توں نقل کر دی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے لیے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ سارے طلبہ خواص و عوام کے نام سے دو گروہ میں تقسیم ہو گئے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت اور اہمیت جتانے کے لیے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لیے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لیے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی ہے اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا تو یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونجا جیسے ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار۔ ذاکر صاحب دائیں طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے 'میں نہایت ادب

کے ساتھ لیکن ضابطہ سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔ یہ کہہ کر اپنی جگہ لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی اُدھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں اور شور مچایا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے الیکشن کے نتیجے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حمایتیوں کا یہ حال کہ کوئی غصے میں، کوئی مایوس ہو کر، کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا ہوا مجمع سے باہر جانے لگا۔ کچھ اس طور پر جم کر بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی۔ اس دن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل میں جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے حمایتیوں کو سنا ڈالا۔

"جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے۔ ان کے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ پھرے ہوئے دروازے سے لگے کھڑے تھے، رفتہ رفتہ واپس آئے۔ ذاکر صاحب پر کچھ ایسا عالم طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا۔ صرف مخالف تقریروں کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کیے اور جہاں تہاں ان کے آدابِ محفل، انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونا شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی، رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انھوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔

یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر کا اور ان کے چنچے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔[1]

اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر

یونین کے اس الیکشن میں ذاکر صاحب نائب صدر منتخب ہوئے۔ مسند نشینی کا جلسہ ہوا تو ان کے سینیر دوست مولانا اقبال سہیل مرحوم نے فارسی کا ایک ترکیب بند پڑھا جس کے کئی اشعار عرصے تک طلبہ کی زبانوں پر رہے۔ یہاں چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ذاکر صاحب اٹاوہ اسکول کی طرح ایم اے او کالج میں بھی قبیلے کی آنکھ کا تارا تھے۔ مولانا سہیل مرحوم نے دراصل اس وقت کے علی گڑھ کے تقریباً سبھی طلبہ کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا:

مرا زیبد اگر صد نغمہ بر لب چوں ہزار آمد
کہ در گلزارِ دانش باز فصل نوبہار آمد

....

چہ شمع بزم فن امشب دریں تالار می آید
کہ شور مرحبا از ہر در و دیوار می آید

....

نسیم اندر چمن رقصد، شمیم اندر سمن رقصد
مگر شاہنشہ گل جانب گلزار می آید
ندانم کیست یارب ایں ہمایوں فر کہ چوں چاکر
بفرقش سایہ گستر دولت بیدار می آید

۱۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء، صفحات ۲۱-۲۰

پے چشم افروز دلہا ہست یارب این کہ از ہر سو
صد انبوہ نگاہش تشنۂ دیدار می آید
بیا اے ذاکر فرخندہ طالع با ہواداراں
کہ با خیل عزیزاں کارواں سالاری آیدا
نگار یومین را ساعت سعد زیب و زین آمد کہ اکنوں سرو گلزار ہنر ذاکر حسین آمد

ذاکر صاحب بحیثیت مضمون نگار اور مترجم

انیسویں صدی میں یورپ و انگلستان میں لبرل ایجوکیشن کا جو نظام قائم تھا اور جسے علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں جوں کا توں اپنا لیا گیا تھا، اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس تعلیمی نظام کے تربیت یافتہ طالب علموں کو جنرل ایجوکیشن کی ایسی تعلیم مل جاتی تھی جس کی بنا پر ان میں اپنی تہذیبی و ادبی میراث اور اپنے سماج کے تمدنی سرمایے کا بڑا گہرا شعور پیدا ہو جاتا تھا، اور پھر یہ شعور درسی نصاب کا پابند نہ رہ کر ذہین، محنتی اور شوقین طالب علموں کو مختلف موضوعات کی کتابوں کے مطالعے پر اکساتا تھا اور طالب علموں میں جنھیں اظہار خیال پر قدرت ہوتی، وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے تلخیص و ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا آغاز کر دیتے۔

ذاکر صاحب میں یہ صلاحیت اسکول کے زمانے ہی سے ہویدا تھی۔ کالج میں داخلہ لیا تو اس کے اظہار کے لیے ایک وسیع میدان ملا، چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۹۱۵ء میں وہ انٹرمیڈیٹ سائنس کے طالب علم تھے، انھوں نے "بابی مذہب" کے عنوان سے پروفیسر براؤن کے ایک انگریزی مضمون کی تلخیص و ترجمہ کیا جو الناظر (لکھنؤ) کے

۱۔ اس شعر میں ذاکر صاحب کی فرخندہ طالعی اور کارواں سالاری کی طرف اشارہ ہے۔ بعد کی زندگی میں ذاکر صاحب کی خوش بختی اور سرداری، معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے، کیسی کیسی جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھنے میں آئی۔

اپریل ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام مقالہ نگاری کے مقابلے میں "ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم" کے موضوع پر مقالہ لکھا اور سَو روپے کا پہلا انعام حاصل کیا[1]۔ قریب قریب اسی زمانے میں انھوں نے افلاطون کی کتاب ریپبلک کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جنوری و فروری ۱۹۲۰ء کے علی گڑھ منتھلی میں (صفحات ۳۲ - ۲۸) "جمہوریۂ افلاطون کا ایک ورق" کے عنوان سے اس ترجمے کے چند ٹکڑے مدیر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے تھے:

"عرصہ ہوا ذاکر صاحب (ذاکر حسین خاں بی اے، علیگ) نے جمہوریۂ افلاطون کا اُردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس خیال کو ایسا ترک کیا کہ آج تک باوجود مزید یاد دہانی اور اصرار کے اس کی طرف توجہ نہ کی (یہ بھی ممدوح کی خصوصیات میں سے ہے جن سے ہم بخوبی واقف ہیں) جس انہماک اور سرگرمی سے اس کی ابتدا ہوئی تھی اس کا اندازہ محض اس سے ہو سکتا ہے کہ کم و بیش ایک ماہ میں جمہوریہ کے چار مقالات کا ترجمہ ہو گیا۔

"خود اُردو کی جامہ زیبی تصور فرمایئے یا فاضل مترجم کی طلسم نگاری، ہم آج عہد عتیق کا وہ باصرہ نواز پیکر ادبی ناظرین کے سامنے پیش کر رہے ہیں جو ہماری سونی محفل کا چشم و چراغ بن سکتا ہے...

"اس امر کے ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ ترجمہ بالکل قلم برداشتہ ہوا ہے[2]۔ حتیٰ کہ نظر ثانی بھی نہیں کی گئی ہے، لیکن لطف و کمال یہ ہے کہ لفظی ترجمہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شروع سے آخر تک قائم ہے

۱۔ علی گڑھ منتھلی، جنوری، فروری ۱۹۱۸ء

۲۔ قلم برداشتہ ترجمے کی ایک مثال اور ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

تو ہم اس پابندی کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم مترجم ممدوح سے اصرار کرتے تھے کہ وہ ترجمہ پر نظرِ ثانی فرمالیں لیکن حُسنِ عقیدت بھی تو کوئی چیز ہے، ہمیں یہ یقین نہیں تھا کہ ہماری استدعا قبول ہوگی۔"[1]

رپ اور بوہیمین

طالب علمی کے زمانے میں کالج میگزین میں رشید صاحب 'بوہیمین' کے نام سے اور ذاکر صاحب رپ (RIP) کے نام سے کالج کی زندگی اور سرگرمیوں سے متعلق بڑے پُرلطف مضامین لکھا کرتے تھے، دونوں میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ لوگوں کو ان کے مضامین کا انتظار رہتا تھا۔ خاص طور پر ذاکر صاحب کے مضامین مہذب طنز و مزاح اور لطیف حاضر جوابی کا اعلا نمونہ ہوتے تھے۔ رپ کے مستقل کالم کا عنوان تھا: From the Sleepy Hollow ۔۔۔ انگریزی تقریر و تحریر

۱۔ رشید صاحب مرحوم اپنے مضمون "ذاکر صاحب" میں لکھتے ہیں: "طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ میں ذاکر صاحب اور مولانا سہیل ساتھ تھے۔ مولانا شاعری کرتے تھے اور میں گلی منزل پر مضامین لکھتا تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ بھی کچھ لکھنا شروع کریں گے۔ بشرطیکہ ان کو مضمون کے دو چار عنوان بتادیے جائیں۔ کئی دن تک عنوان کے چکر میں رہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لائبریری سے Plato's Republic لیے آرہے ہیں۔ فرمایا، 'عنوان نہ بتایئے' آپ لوگوں کی ضد میں ترجمہ کروں گا' چند ہی دنوں میں کافی ترجمہ کر ڈالا۔۔۔ ایک دن ذاکر صاحب نے مولانا (سہیل) کو یا مولانا نے ذاکر صاحب کو دھر لیا۔ ترجمہ سُنانے کا اہتمام ہوا۔۔۔ میں انگریزی پڑھتا جاتا۔ ذاکر صاحب اس کا اُردو ترجمہ سُناتے جاتے ۔۔۔ (مولانا نے) فرمایا: 'ذاکر، شاد باش و شاد زی'۔ ظالم غضب کرتا ہے، افلاطون کو اُردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ کمبخت بیماری نے کہیں کا نہ رکھا، ورنہ میں بھی ایسا ہی ترجمہ کرتا۔" (رشید احمد صدیقی، حوالۂ سابق، صفحات ۵۳-۵۲)

میں بھی ذاکر صاحب کا اپنا اسلوب تھا جس کا اعتراف ذاکر صاحب کے اساتذہ بھی کرتے تھے مسلم یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریمز باتھم بھی اس سلسلے میں ان کے قدرداں تھے[1]۔ زیادہ تفصیل کا تو موقع نہیں لیکن رپ کے ایک مضمون کے دو دلچسپ ٹکڑوں کا ترجمہ درج ذیل ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان مضامین کا اسلوب کیا رہا ہوگا:

"آپ کے میگزین کا گذشتہ شمارہ (اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۹ء) جب سے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا ہے، رپ (RIP) کی شخصیت سے متعلق قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں جو پُرسکون بھی ہیں اور مضطربانہ بھی' اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی دوسرے نام سے لکھنا بُزدلی ہے۔ اس کے جواز میں میری دلیل یہ ہے کہ اس سے میرا مقصد وہ اقتدار حاصل کرنا ہے جو صرف ریاکاری ہی دے سکتی ہے، اور یہ کہ اپنی حفاظت کا سامان کرنا ہے جو محض گمنامی ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے اونگھتے ہوئے غار کا باسی رپ (Hence Rip from tne Sleepy Hollow)'— خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو بُزدل ہیں کہ وہ ہر خطرے سے محفوظ رہیں گے۔"

"یہاں، وہاں اور ہر جگہ؟ یہ رپ آخر ہے کون؟ وہ کیسے سب کچھ دیکھ سکتا ہے؟ وہ کس طرح ایسی باتیں بھی سُن لیتا ہے جنھیں لوگ صرف اپنے آپ سے کہتے ہیں؟ آدمی خطرناک معلوم ہوتا ہے..."

"بیچارہ مسکین رپ جیسا کہ وہ ہے، ہر جگہ موجود ہے اس لیے کہ وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ وہ کہیں نہیں ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے کیونکہ ہفتے میں ایک بار اونگھتا ہوا غار عقاب کا گھونسلا بن جاتا ہے جہاں سے وہ بڑی

۱۔ رشید احمد صدیقی، حوالۂ سابق، صفحہ ۲۷

منعدتی سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے تاکہ اس کا کوئی شکار اس سے بچ کر نہ جائے کہیں گاہ ہی کی جو کسی بزدلوں کی بہادری ہے۔"

نومبر اور دسمبر ۱۹۱۹ء کے علی گڑھ منتھلی میں رپ کی لکھی ہوئی وہ رپورٹ بھی درج ہے جس کا عنوان ہے: "ایم اے او کالج میں ہز آنر ہر کورٹ بٹلر کی آمد" پوری کی پوری رپورٹ ایک بھرپور طنز ہے اس سامراج دوست ماحول اور اُن انگریز پرست عناصر پر جنھوں نے علی گڑھ میں ہر کورٹ بٹلر کے استقبال کی مہینوں سے تیاریاں کر رکھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ عظیم کے دوران ایک طویل خاموشی کے بعد ایم اے او کالج کو مسلم یونی ورسٹی بنانے کی تحریک کا چرچا ایک بار پھر زوروں پر تھا' خیال ہے کہ جنگ طرابلس' جنگ بلقان مسجد کانپور اور پھر جنگ عظیم میں ترکوں کی حمایت کے سبب مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف جب غم و غصہ کی ایک فضا قائم تھی اور مسلمان انگریزوں کے خلاف متحد ہو رہے تھے' تو اس وقت بڑی ہوشیاری سے انگریز حکومت نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے اپنے مسلمان حاشیوں اور خوشامدیوں کے ذریعے مسلم یونی ورسٹی کی تحریک کا شاخسانہ دوبارہ کھڑا کیا تھا اور انگریز اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ چکا تھا؛ ان کا حریت پسند طبقہ ایک آزاد قومی یونی ورسٹی چاہتا تھا جبکہ انگریزی حکومت کے اشارے پر ان کا قدامت پسند اور مفاد پرست طبقہ حکومت وقت کی سرپرستی میں ایک ایسی مسلم یونی ورسٹی کے حق میں تھا۔ جو برطانوی سامراج کی خدمت کا فرض ادا کرتی رہے۔

ذاکر صاحب اُن نوجوانوں میں تھے جو آزاد یونی ورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے' اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین وغیرہ اُن لوگوں میں تھے جو انگریزی حکومت کے دوست اور معتمد تھے اور جنھیں ملک کے نوابوں' راجاؤں' زمینداروں اور ملازمت پیشہ مسلم گھرانوں کی تائید حاصل تھی' یہ لوگ انگریزوں کی سرپرستی سے محروم ہونے کے لیے کسی صورت میں

بھی آمادہ نہ تھے۔ اس پس منظر میں ۱۹۱۹ء میں ایم اے او کالج میں سرہر کورٹ بٹلر کی آمد سے متعلق رپ کی رپورٹ کو پڑھیے تو بصیرت کے ساتھ ساتھ ایک خاص لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ قائم ہوئی اور ذاکر صاحب انقلابیوں کے کیمپ میں چلے گئے اور کالج میگزین جس کا نام اب علی گڑھ منتھلی کے بجائے علی گڑھ میگزین ہو گیا تھا، رپ کی پُرلطف نگارشات سے محروم ہو گیا، نومبر و دسمبر ۱۹۲۰ء کے علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر کے نام بوہمین نے لکھا:[1]

"اونگھتے ہوئے غار کی آواز بازگشت

"جناب من، بے اعتدالی سے زیادہ کوئی اور چیز اعتدال کی حدوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور اس ضرب المثل کی صداقت کی اہمیت کی تصدیق (اگر واقعی یہ ایک ضرب المثل ہے) جس طور پر مادر علمی کی حالیہ شدید اور دردناک تبدیلیوں[2] کے سلسلے میں ہوئی ہے، ویسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"اب آپ کے قارئین آیندہ کبھی اونگھتے ہوئے غار کی روح (رواں) —رپ— کے چبھتے ہوئے فقرے اور تیکھی ہوئی باتیں نہ سن سکیں گے۔ میں اس کے ساتھ رہتا تھا، اس کے ساتھ سوچتا تھا اور اس کے ساتھ مل کر محسوس کرتا تھا، اور اب جبکہ میرا اور اس کا ساتھ نہیں رہا، میں رنج و غم کے گہرے احساس کے ساتھ سوچتا ہوں کہ آخر کوئی کیسے زندگی کی اداس راہوں میں اپنے تھکے ہوئے وجود کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے چل سکتا ہے جب تک کہ اسے اس خیال سے توانائی نہ حاصل ہو کہ زندگی اس کے لیے

۱۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اس وقت میگزین کے اڈیٹر رشید احمد صدیقی تھے، اور وہی "بوہمین" بھی تھے۔

۲۔ اشارہ ہے ترک موالات و خلافت کی تحریکوں اور جامعہ ملیہ کے قیام کے سلسلے میں ایم اے او کالج کے احاطہ میں سیاسی ہنگاموں کی طرف۔

بھی کبھی حسین اور پُر لطف تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ رپ اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہو، اسے کوئی نہ کوئی "اونگھتا ہوا غار" مل ہی جائے گا، یہاں، وہاں، ہر جگہ — وہ اس کے بغیر کہیں رہ بھی نہیں سکتا — لیکن وہ جس نے اس کے عہدِ طفولیت میں اسے پروان چڑھایا، ہمیشہ کے لیے اس سے چھوٹ گیا اور اب آپ کی میگزین کے صفحات ان آنکھوں کو خالی خالی ملیں گے جنھیں اُس کی سحر اندازی، حاضر جوابی اور سخن طرازی کی تلاش ہوگی۔"

ذاکر صاحب رشید صاحب کی تحریروں میں

جیسا کہ معلوم ہے، رشید احمد صدیقی مرحوم ذاکر صاحب کے نہایت گہرے دوست تھے۔ انھوں نے ذاکر صاحب پر مختلف وقتوں میں کئی مضامین لکھے ہیں اور آشفتہ بیانی میری میں کئی موقعوں پر اُن کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، مجموعی اعتبار سے رشید صاحب کی ان تحریروں سے ذاکر صاحب کی جو شکل اُبھرتی ہے اس کے کئی پہلو ہیں، ان میں سے ایک تو کچھ اس طرح ہے: ذاکر صاحب علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک کھلنڈرے نوجوان تھے، ذہین بلا کے تھے اس لیے فقرے بازی اور نوک جھونک میں ان سے کوئی بازی نہیں لے جا سکتا تھا، موقع ہوا تو دھاچوکڑی بھی مچا لیتے تھے، نصاب کی کتابیں بس واجبی ہی پڑھتے تھے، زیادہ وقت غیر نصابی مطالعوں میں گزرتا تھا، یا اِدھر اُدھر کی خوش گپّی میں گزار دیا کرتے تھے "لیکن اس میں لٹن لائبریری اور یونین کے دار المطالعے کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا۔ رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہو جاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ، پرائیویٹ یا پبلک یا ادبیات کا کوئی اشتہار ایسا نہ تھا جس کی ان کو خبر نہ ہو، یا پھر اُردو فارسی اساتذہ کے دس پانچ

منتخب اشعار از بدر نہ ہو[۱]:

ذاکر صاحب کو کھانے کا شوق تھا اور بد پرہیزی کی حد تک کھا لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھی اس طرف سے ہوشیار رہتے تھے کہ کھانے کے وقت وہ ساتھ ہوں تو کھانا پہلے نہ شروع کرنے پائیں ورنہ اس کا خطرہ تھا کہ ان میں سے اکثر بھوکے رہ جائیں گے۔ کبھی کسی کے کمرے پر پہنچے، بھوک کی شدت تھی، کچھ نہ ملا تو معجون کے ایک مرتبان پر ہاتھ صاف کیا، اور یہ نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کبھی ایسا ہوا کہ طلبہ کا ایک ہجوم ان کے ہوسٹل پہنچا اور کسی مسئلے میں اپنی رہبری کے لیے ان کو ساتھ لیا، اور پھر وہ تین چار دن تک "قومی کام" میں منہمک رہے، کوئی امتحان کے قریب ہونے کی اطلاع دیتا تو کہتے کہ "پڑھ کے کیا کیجیے گا، کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے، احمقوں کو مرعوب کرنے کے لیے بی، اے، کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لیے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے، اس کے لیے دہلی کا سفر . . . اور شاہجہاں پوری والے کے یہاں ڈٹ کر کھانا[۱]" نہایت ضروری ہے۔

یہ اور اس طرح کے کچھ ایک پروا مجلسی نوجوان کی ایک شکل سامنے آتی ہے، لیکن دوسری طرف رشید صاحب کی انھیں تحریروں میں ذاکر صاحب کچھ اور بھی نظر آتے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں: "کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اُس وقت کے مثالی طلبہ میں تھا۔ ساتھی طلبہ بڑی عزت و محبت کرتے تھے اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت و سیرت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ اس زمانے کا یورپین اسٹاف ذاکر صاحب کے نمونے کے طلبہ سے کچھ زیادہ خوش گمان نہیں رہتا تھا . . ."

علی گڑھ میں ذاکر صاحب جیسے ذہین اور حسّاس نوجوان کو سر سیّد کے عظیم

۱۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۴۴

۲۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحات ۴۱-۴۰

مقاصد، جوشِ عمل، خلوص اور بے غرض قومی خدمات سے واقف ہونے کا موقع ملا،
یہیں وہ مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے جملہ نشیب و فراز اور اہم
شخصیتوں اور مکاتبِ فکر سے براہ راست آشنا ہوئے۔ انھیں کالج، یونین اور
ہوسٹل کی تمام اچھی اور صحت مند سرگرمیوں سے دلچسپی تھی، اسپورٹس اور گیمس میں
تو وہ ملاّ حصہ نہیں لیتے تھے لیکن ان سے لطف اٹھانے اور ان کے اسرار و رموز
یا لطائف و ظرائف پر دلچسپ گفتگو کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، کھلاڑیوں
کے قدردان اور کھیل کود کی تربیتی افادیت کے رمز شناس تھے، اور ہمیشہ رہے۔

ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد رشید صاحب نے ان کی زندگی اور شخصیت
سے متعلق جو تاثرات اپنے مضمون "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" میں
قلمبند کیے تھے، ان میں انھوں نے کہا تھا کہ "اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور
ایم، اے، او، کالج علی گڑھ کے ذاکر صاحب کے ساتھی ابھی کافی تعداد میں بقید
حیات ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جو ذاکر صاحب کو عزیز و محترم نہ رکھتے ہوں
گے، ایسے بھی مل جائیں گے جو ان سے بغض و کینہ رکھتے ہوں گے۔ وہ بھی نہیں
بتا سکتے کہ ذاکر صاحب سے کبھی کوئی لغزش ایسی ہوئی جو سن شعور سے فارغ التحصیل
ہونے تک ان کے اچھے سے اچھے طالب علم، اچھے سے اچھے رفیق اور اچھے سے اچھے
انسان ہونے کی حیثیت کو بے نور یا داغدار کرتی ہو"۔

رشید صاحب کی ایک اور بات اس موقع پر یاد آتی ہے جو بڑا وزن رکھتی
اور غور و فکر کا ایک گراں قدر لمحہ فراہم کرتی ہے، انھوں نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ
جامعہ ملیہ کا قیام خود فرزندگانِ علی گڑھ کا کارنامہ تھا اور یکسر بدلے ہوئے حالات
میں رفتہ رفتہ قومیت کے بے پناہ جذبے کو ایثار اور خدمت کی شاندار روایات کے
ساتھ مسلمانانِ ہند کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں ایک نیا اور تاریخی رول ادا کرنا،
علی گڑھ تحریک ہی کی ایک توسیع تھی اور خاص طور پر ذاکر صاحب نے یہ سب اتنے شوق، خلوص
اور قابلیت سے کیا جیسے ان کو اسی دن کا انتظار تھا۔۔ ان کے اس اقدام میں

علی گڑھ کے پیر دانا کے حسن خیال اور جوشِ عمل کی صداقت، عظمت اور قومی ہمدردی کی بڑی مبارک نشانیاں ملتی ہیں۔"
اس طرح ذاکر صاحب سے متعلق رشید احمد صدیقی کی تمام تحریروں پر نظر رکھیے تو ایم۔اے۔او۔کالج کے ذاکر صاحب کی جو تصویر بنتی ہے، وہ گوناگوں رنگوں کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں ایک ذہین، حساس اور سنجیدہ نوجوان کا رنگ غالب ہے۔ ذاکر صاحب پر رشید صاحب نے جتنا لکھا ہے، شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ انھوں نے ان کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بھی اس انداز سے لکھیں کہ ان سے بعض کچے ذہن کے لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی اور اسی بنا پر بعض بزرگوں نے رشید صاحب کی "چشم نمائی" بھی فرمائی۔ رشید صاحب لکھتے ہیں کہ اس پر "میں متنبہ ہوا لیکن اس پر ہنسی بھی آئی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا گیا، یہ نہیں دیکھتے کہ کون کس کے بارے میں لکھ رہا ہے! تکلف برطرف!!— میں ذاکر صاحب کو نہ ولی سمجھتا ہوں، نہ فرشتہ، نہ امام شریعت، نہ پیر طریقت، لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی وہ فرزندان علی گڑھ میں بہت اونچے درجے پر فائز ہیں، بہت اونچے درجے پر!"[۱]

ذاکر صاحب کا ایک معرکتہ الآرا مضمون

علی گڑھ میگزین کے مارچ۔ اگست ۱۹۲۰ء کے شمارے میں ذاکر صاحب کا ایک انگریزی مضمون ETERNITY OR TOY کے عنوان سے چھپا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم یونی ورسٹی کی تحریک زوروں پر تھی اور مسلمانوں میں ایک شعور اور جوش پیدا تھا، ادھر ملک کی سیاسی فضا میں بھی بڑا ہیجان تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ابھی قائم نہیں ہوئی تھی اور خدا ہی کو یہ بات معلوم تھی کہ چند ماہ بعد جامعہ کا وجود عمل میں

۱۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحہ ۲۔

آئے گا۔ یہ مضمون ذاکر صاحب نے اپنے صاحب باغ (ہوسٹل) کے کمرے میں بیٹھ کر ۸ر اپریل ۱۹۲۰ء کو لکھا تھا، اس مضمون میں سرسید مرحوم اور ان کے بعد تا دیر علی گڑھ کے فکر و عمل کے بعض پہلوؤں پر سخت تنقید ہے۔ ہر چند کہ یہ تنقید بڑھاپے کی مصلحت بینیوں پر جو زندگی کی حقیقتوں کے گہرے تجربے کے بعد پیدا ہوتی ہے، جوانی کی عینیت پرستانہ اُمنگوں کی تنقید ہے، لیکن اس سے جوانی ہی میں اجتماعی قومی تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب کے فکر میں جو گہرائی اور وسعت تھی اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ علی گڑھ کو، وہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علموں کی مذہبیت کو اور اس وقت کے علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کے تنگ نظر سیاسی اور تعلیمی موقف کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ اُس وقت ان کی عمر تیئیس سال کی تھی لیکن وہ اپنے بیشتر ہمعصر مسلم نوجوانوں کے برخلاف بڑی گہری غیرت و حمیت اسلامی کے حامل تھے اور ساتھ ہی ملت اسلامی کے انحطاط و زوال کا دردمندانہ احساس اور ہندستان میں اس کی شکست و ریخت کا حقیقت پسندانہ شعور بھی رکھتے تھے۔ یہ مضمون اس امر کا غماز بھی ہے کہ اُس وقت ذاکر صاحب کا قومی و ملی رجحان کیا تھا اور ان کے فکر کا دھارا کس طرف بہہ رہا تھا۔ اس میں ہمیں سرسید کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کے فکر و عمل کی بعض کمزوریوں اور علی گڑھ تحریک کی ادھوری کامیابی کی طرف بھی بڑے واضح اشارے ملتے ہیں۔ مضمون کا عنوان جس کا اُردو ترجمہ "ابدیت یا کھلونا" ہے، اپنی جگہ ایک اہم سوال ہے، اور مضمون کا آغاز جس پیراگراف سے ہوتا ہے اس میں خود ایک شکستِ طلسم کی طرف اشارہ ہے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"کسی طلسم کا ٹوٹنا بڑا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے، لیکن یہی عمل دانائی کا جوہر خاص بھی ہوتا ہے۔ اگلے مرحلوں کی ترقیاں اسی کی رہین منت ہوتی ہیں اور مستقبل کی ساری کوششوں میں کامیابی کا

دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ شکست طلسم کا اصلاحی اثر کس حد
تک عمل پیرا ہے۔ اس عمل کے جاری رہنے کا یقین اس سے زیادہ کسی اور
صورت میں نہیں ہو سکتا کہ واقعی اور مثالی کا موازنہ کیا جاتا رہے۔"

علی گڑھ تحریک کی ہمہ جہت کامیابی کی طرف سے اُس وقت ہر ذی شعور شخص مایوس ہو چکا تھا۔ اب لے دے کر صرف یہ مسئلہ تھا کہ ایم اے او کالج جلد از جلد ایک یونی ورسٹی بن جائے۔ یہ یونی ورسٹی کیسی ہو، اس کے چلانے والے فکر و عمل کے اعتبار سے کیسے 'ارباب نظر' ہوں، اس یونی ورسٹی کے بنیادی مقاصد کیا ہوں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے نصابی اور غیر نصابی کریکولم کیا ہو، ان امور کی طرف حقیقی توجہ بہت کم لوگوں کی تھی، زیادہ تر لوگ اندھیرے ہی میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار کھڑے تھے، اور ان کا مقصد بھی درحقیقت محض چھلانگ لگانا تھا اور بس۔ ذاکر صاحب اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور شدّت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہماری قوم کے سر برآوردہ لوگ جو ایم اے او کالج چلا رہے ہیں، بے حسی کی ایسی منزل میں ہیں کہ ابدیت تو بڑی چیز ہے، انھیں ایک عارضی مدت کے لیے بھی کسی ٹھوس اور نتیجہ خیز چیز کی خواہش نہیں ہے۔ انھیں تو فوراً یونی ورسٹی کے نام کی کوئی چیز چاہیے، خواہ اس سے باشعور اور حساس مسلمانوں کی "نشاۃ ثانیہ" کی آرزو جو ایک مدت سے ان کے سینوں میں دبی ہوئی ہے، پوری ہو یا نہ ہو۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر سرسیّد کے فکر سے متفق تھے۔ وہ جس نصب العین کو لے کر اُٹھے تھے اس کی عظمت اور ہمہ جہتی متوقع نتیجہ خیزی کے معترف بھی تھے، سرسیّد کا مقصد مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ تھا، یعنی اشاعت تعلیم کے وسیلے سے مسلمانانِ ہند کی مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاح و ترقی کا سامان کرنا تھا، شاید وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ آگے چل کر اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہوگی۔ ذاکر صاحب اس سطح پر سرسیّد کی دور اندیشی کو سراہتے تھے، ان کے

نزدیک یہ ایک بڑا کام تھا، اہم کام تھا اور ایسا کام تھا کہ اس کے لیے زندگیاں کھپا دی جائیں، لیکن ذاکر صاحب کو سرسید کی قیادت سے اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ انھوں نے اس عظیم نصب العین کا سودا بہت کم پر کرلیا اور ہاتھ آیا تو صرف ایک کالج جو غلام ہندستان میں انگریزوں کی حکومت کو چلانے کے لیے ماتحت اور دنیادار عہدہ دار پیدا کرتا رہے۔ اپنے اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"ایک ناقابل اصلاح قسم کا شکّی مزاج شخص ہی ان (سرسید کے) مقاصد کے معقول اور پسندیدہ ہونے پر شبہہ کرے گا، پھر بھی اس بات کی، بہر حال، گنجایش ہے کہ تحریک کی ابتدا کرنے والے اس ممتاز شخص سے نا انصافی کیے بغیر یہ سوال کیا جائے کہ انھوں نے اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جو راہ عمل تجویز کی، کیا وہ درست تھی؟ یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک قائد کی حیثیت سے اس عظیم شخص نے ایک ایسی سہل راہ کا انتخاب کرکے جس میں کم سے کم رکاوٹیں ہوں کیا مدبرانہ بصیرت کی افسوسناک کمی کا مظاہرہ نہیں کیا؟ اس نے اس نظام کی کھلی ہوئی ددعملی سے عملاً سمجھوتہ کرکے اور شاہ بلوط میں سیب کا پیوند لگاکر، اور مسلمانوں کی مخصوص ضرورتوں سے میل کھانے والے ایک خالص قومی نظام تعلیم کی شروعات نہ کرکے کیا اپنی کوتاہ بینی کا اظہار نہیں کیا؟ ... اس بات سے مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کے یہاں بحیثیت ایک قائد کے گہری بصیرت کی کمی تھی، بہر حال رعایتاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود ان کی قوم میں ان کے کام کی شدید مخالفت تھی، کچھ فوری ضرورتیں تھیں جنھیں پورا کرنا تھا۔ ۔ لیکن وقتی حالات سے اس قدر متاثر ہو جانا اگر کوتاہ بینی نہیں تو اور کیا ہے؟ ... قومی نشاۃ ثانیہ کی عظیم کوشش کو لائق ماتحت منتظمین کے پیدا کرنے کی مشین میں تبدیل کر دینا کتنا مضحکہ خیز تھا، اور اس بات کے مترادف تھا کہ پہاڑوں کی کوکھ سے، بلکہ یوں کہیے کہ ایک قوم کی کوکھ سے جو پہاڑوں سے زیادہ عظیم اور اور شان دار ہوتی ہے، ایک چوہا جنم لے، اور صورت حال کی ستم ظریفی یہ ہے کہ موسم

جانے والے مسلم سماجی اور مذہبی حیات نو کے اعلا مقاصد کی رٹ بھی لگائی جاتی ہے۔"
ذاکر صاحب نے اپنے اس مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سرسید اور ان کے بعض رفقا نے مسلم معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے بڑی ہمت سے جدوجہد اور مذہب کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی لانے کی مسلسل کوشش کی، لیکن یہ کوششیں کچھ زیادہ بارآور نہیں ہوئیں، تہذیب الاخلاق بند ہوگیا اور شاید اس کے ساتھ اس کا کام بھی ختم سمجھ لیا گیا، اور بقول ذاکر صاحب "یہ کام یقیناً اپنے اندوہناک انجام کو پہنچ چکا اور پھر علی گڑھ کے کسی فرزند نے سماجی اصلاح کے اس نہایت اہم کام کے لیے نہ صلاحیت کا اظہار کیا نہ میلان کا۔"

سرسید کے مذہبی افکار سے عام طور پر مسلمانوں نے اتفاق نہیں کیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب ذاکر صاحب یہ مضمون لکھ رہے تھے، صورت حال یہ تھی کہ خود علی گڑھ کو اپنے بانی کے مذہبی خیالات کے کسی پہلو سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ علی گڑھ کی پہلی نسل میں اگر کچھ لوگ سرسید کے مذہبی فکر سے متفق رہے ہوں، تو ان کے بارے میں اس شبہہ کا خاصا اندیشہ ہے کہ "اس مصلح نے ترجمانی مذہب کے معاملے میں جو برل خیالات اور مذہبی رواداری سے کام لیا اس کو ان لوگوں نے مذہب سے اپنی بے پروائی کے لیے ایک سہل جواز کے طور پر استعمال کیا۔"

تعلیم کو سیاست سے علاحدہ رکھا جائے، سرسید برابر اس کی تلقین کرتے رہے اور ذمہ داران علی گڑھ ان کے بعد بھی اسی کی رٹ لگاتے رہے، کہا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر ذاکر صاحب نے بھی شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کم و بیش اسی طرح کی بات کہی۔ لیکن غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ اگرچہ بظاہر دونوں نے ایک ہی بات کہی تھی لیکن حقیقت میں دونوں کی اس ایک بات کا مالہٗ اور ماعلیہ بالکل مختلف تھا۔ ذاکر صاحب تعلیم کو جو کچھ سمجھتے تھے درحقیقت وہ بذات خود ایک اعلا سطح کی سیاست تھی جس کی تکمیل ایک بلند اخلاقی مقصد کی حامل سماج اور مملکت

نئی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ سرسید اس بات کے حق میں نہ تھے کہ انگریزی سامراج کے خلاف ملکی اور قومی تحریکوں میں کسی صورت میں بھی کوئی حصہ لیا جائے۔ ذاکر صاحب کی جامعہ ملک کی تحریکِ آزادی کا تعلیمی محاذ تھی اور اس نے اساتذہ اور کارکن رخصت لے کر اور قومی تحریک کے عملی منصوبوں میں شریک ہوکر ستیہ گرہ اور قید و بند کی زندگی اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن یہ وہ موضوع ہے جس پر آیندہ مناسب موقعوں پر جستہ جستہ اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ یہاں تو ہم سرسید اور اُن کی تعلیمی حکمتِ عملی پر آنکھ بند کر کے چلنے والوں کے موقف سے متعلق ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر خود اُن کے مذکورہ مضمون سے درج کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں جو بات بہت واضح ہے وہ تعلیم کو سیاست سے علاحدہ رکھنے کی احتیاط ہے جس کی سرسید برابر تلقین کرتے رہے، اور علی گڑھ کے ذمّے دار حضرات آج تک اس کے قائل ہیں۔ اگر تھوڑا سا سوچ بچار کیا جائے تو اس نظریے کی قلعی کھُل جاتی ہے۔ انسانی جسم ایک جیتا جاگتا جسم نامی ہوتا ہے، اس لیے انسانی سرگرمیوں کو خانوں میں بانٹنا ایک ایسی بات ہے جسے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ آپ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم آپ کو ساری چیزوں سے علاحدہ کر کے تعلیم دیں گے اور وہ چیزیں اپنا کام آپ کرلیں گی۔ آپ ایسا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ اس طرح اسے پا نہیں سکتے۔ ہر نئی نسل بے شمار خارجی عوامل سے متاثر ہوتی ہے، خواہ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں یا نہ کریں۔ حضرت علی کا قول ہے: 'میں نے اپنی طویل عمر میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے باپ دادا کے مطابق کم اور اپنے عہد کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہوتے ہیں'۔

"جس طرح قومی معیشت کے بہت سے ضروری مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہو جائے، اسی طرح تعلیمی اصلاح بھی اُس

وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سیاسی اداروں کو بہتر نہ بنایا جائے۔ اس لیے یہ بات کہ تعلیم کو سیاست سے الگ رکھا جائے جیسا کہ سرسید بظاہر چاہتے تھے نہ تو ممکن تھی اور نہ مناسب' اور یہ اس لیے کہ تعلیم کسی طرح بھی اتنی آسان چیز نہیں جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف تعلیم حیرت انگیز طور پر پیچیدہ چیز ہے' اور واقعی اچھی تعلیم کا سچّا عزم اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ایک لبرل تعلیمی حکمت عملی نہ اپنائی جائے جس میں سوشیولوجی اور سیاست کا بھی اتنا ہی اہم مقام ہو جتنا کہ ایک معلم کا۔ سچّی تعلیم کا مقصد چونکہ اچھے شہری پیدا کرنا ہے اس لیے تعلیمی و سیاسی کوششوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک ایسی دنیا کے افراد تیار کر رہے ہیں جن کا اس دنیا کی تشکیل میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ایسی غیر فطری علاحدگی ماحول سے بے تعلق اور دوری پیدا کر دیتی ہے' اور شاید یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے قدیم طلبہ کی صفوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنے بھائی انسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

"ایسے لوگوں کی افسوسناک حد تک کمی اس بنا پر بھی ہے کہ علی گڑھ اتنا مذہبی نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے۔ دوسروں کی حالت سدھارنے کے لیے کچھ کرنے کے جذبے اور جوش کا اگر کوئی معقول سبب پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ کسی شخص کا مذہبی میلانِ طبع ہی ہو سکتا ہے۔ ہم سب اس وقت جوش و خروش سے کام کرتے ہیں جب یہ محسوس کرتے لگتے ہیں کہ ہمارا کام عالمِ فطرت اور ابدی قوتوں کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ ہم سمندر سے ایک ہی پیالہ بھرنے پر اکتفا نہیں کریں گے' ہم کسی بھی جنگ میں اپنی ساری قوت اُس وقت تک صرف نہیں کریں گے جب تک ہمیں یہ احساس نہ ہو جائے کہ ہمارا منصوبہ عالمِ انسانیت کی نجات کے ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ علی گڑھ کا فرض تھا کہ اپنے طالب علموں میں کچھ اسی طرح کا مذہبی عقیدہ پیدا کرتا۔ کیا علی گڑھ کامیاب رہا ہے؟ اس بات میں شک و

شبہہ کی بڑی گنجائش ہے، کیونکہ اس سے زیادہ ہمت شکنی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ علی گڑھ سے اسلام کے ایسے ترجمان اتنی بڑی تعداد میں نکلیں جن میں نہ ہوش ہو نہ فراست۔ اب یا تو ہمیں یہ دعوا نہیں کرنا چاہیے کہ ہم مذہبی تعلیم کے علمبردار ہیں، یا پھر مذہبی تعلیم کی ضرورت کو زیادہ مؤثر اور غیر معذرت خواہانہ انداز میں پیش کرنا چاہیے۔۔۔۔

"ان خیالات سے حتمی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وقت آگیا ہے جب علی گڑھ خود اپنے آپ کو جانچے، اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے اور مستقبل کے لیے ایک واضح نصب العین کا تعین کرے۔ یہ اس لیے کہ صحیح اور ٹھوس تعلیمی حکمتِ عملی کے لیے ایک واضح نصب العین ضروری ہے، نیز یہ کہ نصب العین واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے، کیونکہ خیال عمل میں کسی سمجھوتے کا متحمل نہیں ہو سکتا، خواہ عملی نقطۂ نظر سے اس سمجھوتے کی کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ بتائی جائیں۔ اس لیے وہ مخصوص سوال جو ان لوگوں کے ذہنوں میں ہر دم رہنا چاہیے جو عملی اقدامات کے ذریعے علی گڑھ کی تعلیمی مشینری کا سارا زور نئی سمتوں میں موڑ دیتے ہیں، یہ ہے کہ ـــــ 'آج سے دس یا پندرہ برس بعد مسلم ہندستان کو کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہوگی؟' علّی ضرورت یا ملت کی تقدیر کے لیے اگر کوئی ایسا نصب العین سامنے نہ رہا تو تعلیم ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے گی، اور جب ہم سوچ سمجھ کر اور دیدہ و دانستہ کوئی ایسا نصب العین متعین کر رہے ہوں تو ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں یہ نصب العین معمولی اور کمتر حیثیت کا نہ ہو۔ ایک کمتر درجے کے نصب العین کا حصول بعض اوقات بے قدری اور تنزل کا سبب بن جاتا ہے۔ غالباً کوئی ایسا ہی نصب العین تھا جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

کیا ملے گا اگر وہ چیز میں نے حاصل کر لی جو میں چاہتا ہوں،
ایک خواب، ایک سانس، ایک گریزاں مسرت کا جھاگ،
ایک ساعت کی خوشی کے بدلے ایک ہفتے کی آہ وزاری کون پسند کرتا ہے،

اور ایک کھلونے کے بدلے ابدیت کون بیچ دیتا ہے!
کھلونے کے بدلے ابدیت بیچ دینے کے خطرے کی طرف سے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

ذاکر صاحب نے اپنے ۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء کے مُسلم یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے میں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ علی گڑھ میں انھوں نے کیا سیکھا اور کیا پایا۔ یہاں اس خطبے کا وہ اقتباس درج کیا جاتا ہے جس کے بلیغ اشارے اور کنایے جو شاعری نہیں بلکہ حقائق ہیں، علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں ذاکر صاحب کی ذہنی و اخلاقی ترقی اور نشوونما کی خبر ہمیں بڑے دلنشین انداز میں دیتے ہیں، اور اُن سے مجموعی طور پر اُن تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جو اوپر علی گڑھ میں ان کی ابھرتی ہوئی شخصیت سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ بلاشبہہ وہ اپنے عہد کے فرزندان علی گڑھ میں بحیثیت مجموعی بڑے اونچے درجے پر فائز تھے۔ انھوں نے اس خطبے میں علی گڑھ میں اپنے پہلے دن کے تجربے کے بعد کہا تھا:

"یہ اُس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج! شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھنا، ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر

۱۔ ذاکر حسین، "ابدیت یا کھلونا" ترجمہ از ڈاکٹر مسرور ہاشمی، اسلام اور عصر جدید، دہلی، جنوری۔اپریل ۱۹۸۰ء

پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلافات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ
سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا۔ اپنی
قومی زندگی کے سارے عیب برملا دیکھے پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں
سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش
بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تند مزاجیوں اور
عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری
سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا
سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے
کے لیے انھیں زندگی کی تند و تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت
کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی
ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی و تربیتی تاثیروں
کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرمانبرداری سیکھی، اطاعت شعاری
سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب،
اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیاری
اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام
کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی
چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی۔ باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی
بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادر علمی کی طرف سے دل
میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اس میں اٹکا رہا۔"

"بن باس میں بھی دل اس میں (علی گڑھ میں) اٹکا رہا" ـــ یعنی جامعہ ملیہ
اسلامیہ میں بھی رہ کر جو بظاہر علی گڑھ سے بغاوت کی علامت تھی ذاکر صاحب علی گڑھ
سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہ کر سکے کہ وہ دراصل جامعہ کے کام کو ایک خاص سطح پر

سرسید کے ہمہ جہتی تعلیمی و تہذیبی منصوبے ہی کی ایک عملی صورت تصور کرتے تھے، سرسید کا وہ تعلیمی و تہذیبی خواب جو اب تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ ذاکر صاحب اس منصوبے کو قومی رنگ دے کر ہندستان میں مسلمانوں کی "نشاۃ ثانیہ" کا کام کرنا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اس کام کی کہانی جامعہ کی کہانی ہے، اس لیے ہم اسے آیندہ بیان کریں گے، یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جامعہ کیسے اور کن حالات میں قائم ہوئی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا پس منظر

جو لوگ ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مسلمان انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے نظام تعلیم سے کبھی بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ ایک عرصے تک سیاسی زوال کی لائی ہوئی سماجی و معاشی تباہ کاریوں، نفسیاتی اُلجھنوں اور طبیعت میں غم و غصہ اور احساس شکست و محرومی کا بار لیے وہ وقت کی راہوں میں بھٹکتے رہے، ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات اور سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کی جلاوطنی کے بعد انھیں حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اگرچہ ان کا ایک طبقہ اب بھی اس پر راضی نہ تھا۔

سرسید نے ایم اے او کالج قائم کیا اور اس سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا خاصا چرچا ہوا، لیکن یہ کالج سرسید کے خواب کی ادھوری تعبیر تھی، اور آخر تک انھیں اس کا احساس رہا کہ کالج سے تو محض ایک وقتی ضرورت کو پورا کرنا مقصود تھا، اور جن حالات میں کالج قائم ہوا تھا ان میں اس سے زیادہ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

سرسید درحقیقت مسلمانوں کی تعلیم کو حکومت کی مداخلت سے آزاد دیکھنا چاہتے

تھے، کیونکہ وہ بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم خود اُن کے اپنے ہاتھ میں نہ ہوگی، انھیں پورا فائدہ نہ پہنچے گا۔ ۱۸۷۳ء میں سیّد محمود نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی وہ ان کے والد والاتبار سرسیّد احمد خاں کے خیالات کی آئینہ دار تھی۔ اسکیم میں بیان کیا گیا تھا: "جب تک ہم ایسی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کہ تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسا کریں گے تو درحقیقت ہم اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یورپ میں بالکلیہ یا قریب اس کے اس ملک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علاحدہ ہیں ... یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو، جو تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا ان کا کامل طور سے بندوبست کر سکے۔"[1] اسی طرح کی بات، علاوہ اپنے لیکچروں میں کہنے کے، سرسیّد نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے ہوئے بھی کہی تھی۔[2] سرسیّد کے رفقا بھی اسی نصب العین کے حامل تھے۔ سرسیّد کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد مسلم یونی ورسٹی کی تحریک کا آغاز ہوا جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی گئی، ۱۹۱۱ء کا سال آتے آتے اس منصوبے میں اُمید سے زیادہ پیش رفت ہو چکی تھی۔ اُدھر کالج بھی ترقی کرتا جا رہا تھا، اور وہ اپنی شہرت اور حیثیت کی ایسی منزل پر پہنچ رہا تھا کہ اسے آسانی سے یونی ورسٹی بنایا جا سکتا تھا۔ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ مسلم یونی ورسٹی ایک آزاد الحاقی یونی ورسٹی ہوگی اور اپنے انتظام میں گورنمنٹ کی مداخلت سے بالکل آزاد ہوگی، لیکن جلد ہی یعنی وسط ۱۹۱۲ء تک یہ بات صاف ہوگئی کہ حکومت ایسی یونی ورسٹی دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا اور ملک میں ایک ایجی ٹیشن کی فضا بننے لگی۔ اسی زمانے

۱۔ محمد اکرام اللہ ندوی، وقارِ حیات، مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۱۹۲۵ء، صفحہ ۵۶۱

۲۔ ایضاً، صفحہ ۵۶۲

میں نواب وقار الملک نے جواب اپنی علالت کے سبب کالج کے سکریٹری نہیں رہے تھے اور تبدیل آب و ہوا کے لیے دہرہ دون گئے ہوئے تھے، ایک تعلیمی اسکیم تیار کی جس میں ایک جدید تخیل جامعہ اسلامیہ کا پیش کیا۔ یہ اسکیم بڑی مفصل تھی اور اس کے آخری حصے میں تعلیم و تربیت، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم وغیرہ کی طرف بھی واضح اشارے کیے گئے تھے، اس حصے کے شروع میں انھوں نے لکھا تھا کہ اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کو ایسی یونی ورسٹی دینا چاہتی ہے جیسی انھیں منظور نہیں تو پھر سرسید کے اعلا و ارفع مقاصد کے پیش نظر میری تجویز ہے کہ "اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے۔ یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کرکے "آل انڈیا مسلم یونیورسٹی" بن جائے گا اور اس یونی ورسٹی کے ذریعے سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کرسکیں گے، اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیے کہ تمام ہندستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علاحدہ "جامعہ اسلامیہ" (قومی دارالعلوم) خود قائم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونی ورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کیا جائے جو باستثنا ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے۔"[1]

عام طور پر اس وقت مسلمانوں میں جامعہ اسلامیہ کے اس تخیل کا خیر مقدم کیا گیا، اور علی گڑھ کی "ینگ ٹرکس" جماعت نے جس کے فعال اراکین میں عبدالرحمن بجنوری، تصدق احمد خاں شروانی، راجا غلام حسین اور سید محمود وغیرہ تھے، بیگم بھوپال کی سرپرستی میں دہرہ دون میں ایک ادارہ سلطانیہ کالج کے نام سے قائم کرنے کی تیاریاں بھی شروع کردیں۔ یہ منصوبہ بارآور نہیں ہوا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ بیگم بھوپال انگریز حکومت کی مرضی کے بغیر اتنا اہم قدم اٹھا نہیں سکتی تھیں۔

۱۔ محمد اکرام اللہ ندوی، حوالہ سابق، صفحہ ۱۹۱

لیکن اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمانوں میں ایک آزاد تعلیمی ادارے کا تخیل کس قدر مقبول ہے۔

۱۴۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم یونی ورسٹی تحریک کے محاذ پر مسلمانوں کی ناکامی کا ایک سیاسی سبب یہ بھی تھا کہ سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد ایم اے او کالج کے طلبہ و سیکریٹری اور کالج کے یورپین اسٹاف کے مابین جو اختلاف شروع ہوگیا تھا وہ رفتہ رفتہ اور گہرا ہوتا گیا مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت سے ذہنی بیداری اور اور قومی خودداری کا احساس پیدا ہوا۔ انگریزوں کے احساس برتری اور مسلمانوں کے اس جذبے میں تصادم کہ علی گڑھ کالج کے معاملات میں اُن کا عمل دخل زیادہ ہو، حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ ۱۹۰۷ء میں طلبہ کی جو اسٹرائک ہوئی اس کے اسباب کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ طلبہ کے جذبات اور کردار کو ۱۹۰۰ء ہی سے بعض ایسے اسباب نے مجروح اور متاثر کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس طرح کی اسٹرائک کوئی ایسا تعجب خیز واقعہ نہ تھا۔ ان اسباب میں یورپین اسٹاف کا رویّہ خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر کورنا، گارڈنر براؤن اور ٹول (جو بعد میں کالج کے پرنسپل ہوئے) سازشیں کرنے اور بے چینی پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ پرنسپل آرچ بولڈ سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ انھیں تینوں انگریز اساتذہ سے مشورہ کرتے تھے، اور یہ تینوں پکّے سامراجی تھے اور عام ہندستانیوں، طلبہ اور مسلم نوجوانوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ مثلاً کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ایک انگریز ٹیچر نے ایک طالب علم کے سر پشت پر دولتی چلا دی تھی، بیگم محمود اور زین العابدین کے چوکیداروں کے ساتھ ایک یورپین اُستاد نے بدسلوکی کی تھی جو کھلے بندوں کالج اور ٹرسٹیز سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ کورنا کلاس روم میں احمقانہ اور جارحانہ باتیں کیا کرتا تھا، مثلاً ایک بار اس نے سلطان ترکی کا ذکر کیا اور کہا: "اگر میرا بس چلتا تو میں سلطان عبدالحمید کو اپنا پنکھا قلی بناتا۔" مسٹر ٹول سے اگر طلبہ اور ان کے ہندستانی رفیق کار ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر جاتے

تو انھیں گھنٹوں برآمدے میں انتظار کرنا پڑتا[1]

کمیشن کے سامنے گارڈنر براؤن اور ٹول نے یہ بیان دیا تھا کہ ملک کے سیاسی حالات اور اخبارات نے جو کانگریس کی سیاسی آئیڈیولوجی کی حمایت کرتے تھے، اور جسے اسٹوڈنٹس یونین کی تائید بھی حاصل تھی، طالب علموں کے ذہن کو مسموم کیا ہے، براؤن اور ٹول نے یہ بات بھی زور دے کر کمیشن سے کہی تھی کہ طلبہ نے کانگریس سے مالی امداد سے درخواست بھی کی ہے۔ کمیشن نے ان دونوں باتوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی رپورٹ میں ان کی تردید کی[2]۔ لیکن، بہر حال، یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں طالب علموں کے ذہن پر انڈین نیشنل کانگریس کی قومی سرگرمیوں کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر سیّد محمود کے بقول جو ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک میں کالج سے نکالے گئے تھے، بہت سے طالب علم پوشیدہ طور پر کانگریس کے حامی اور ہمدرد تھے، عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شروانی، نثار احمد خاں شروانی، فدا حسین خاں شروانی اور غلام حسین کالج میں نیشنلزم کے روح رواں تھے۔ ۱۹۰۳ء میں ایک خفیہ سوسائٹی بنائی گئی تھی جس میں حکومت وقت کے خلاف مضامین پڑھے جاتے تھے اور تقریریں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنارس میں کانگریس کا جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اس میں سید محمود اور ان کے کئی دوست شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں طلبہ اپنے کمروں میں سلطانِ ترکی، برمی شہنشاہ، گوکھلے اور ایسی دوسری شخصیتوں کی تصویریں جو انگریزوں کی مخالف تھیں، آویزاں کرتے تھے[3]۔ ان تمام باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۶-۷ء میں علی گڑھ کالج کی سیاسی فضا کیسی تھی، قیاس کہتا ہے کہ اس سیاسی فضا کے پیچھے دیگر عوامل کے علاوہ، ایک عامل ۱۹۰۴-۵ء کی روس اور جاپان

۱۔ ایس۔ کے۔ بھٹناگر، ہسٹری آف دی ایم اے او کالج علی گڑھ، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۹، صفحات ۱۸۸، ۲۰۴

۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۵

۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۶

کی جنگ میں ایک چھوٹے سے ایشیائی ملک یعنی جاپان کے ہاتھوں مغرب کے ایک بڑے سامراجی ملک روس کی شکست فاش بھی تھی۔ اس جنگ میں جاپان کی فتح نے ایشیائی ملکوں کے احساس کمتری کو دور کیا اور ان کے باشعور طبقے میں سیاسی بیداری کی لہر تیز تر ہو گئی۔

۱۹۰۸ء میں ترکی میں انجمن اتحاد و ترقی کی قیادت میں ینگ ٹرکس انقلاب ہوا اور جلد ہی ہندستان میں انقلابی پارٹیوں اور مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اس انقلاب کا جھکاؤ جرمنی کی طرف ہے جو ایشیا اور افریقہ میں انگلستان کو پیچھے ڈھکیل کر آگے آنا چاہتا ہے۔ سلطان ترکی چونکہ خلیفۃ المسلمین بھی تھا اس لیے مسلمانوں کو ترکی اور ترکوں سے ایک خاص مذہبی اور جذباتی تعلق تھا، انقلاب سے پہلے سلطان عبدالحمید نے اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) کا جو نعرہ دیا تھا وہ ایک سیاسی نعرہ تھا۔ برطانوی سامراج کے خلاف سلطنت عثمانیہ کے حق میں عالم اسلام کو متحد کرنے کا، اور ینگ ٹرکس کی انگریز دشمنی بھی واضح تھی۔ ادھر علی گڑھ میں برطانوی سامراج کی مضرت رسانیوں سے مسلم نوجوان باخبر ہوتے جا رہے تھے، انیسویں صدی کے اواخر میں شبلی نعمانی کی تحریروں اور مولانا حالی کی مسدس نے مسلمانوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر سمجھایا تھا کہ تم خود ایک شان دار تہذیب کے وارث ہو جس نے دنیا کو اعلا تمدنی زندگی اور جمہوری سیاست کے گر سکھائے ہیں، اس لیے تمھیں مغربی تمدن سے مرعوب نہ ہونا چاہیے، تمھیں چاہیے کہ تم برطانوی سامراج کے خلاف صف آرا ہو جاؤ اور نوجوان ترکوں (ینگ ٹرکس) کی طرح اپنے ہموطنوں سے اتحاد کر کے قومی آزادی کی سبیل نکالو۔ عام مایوسی اور بے بسی کی فضا میں شبلی نے مسلمانوں کو فتح اور کامرانی کا مژدہ سنایا اور ایک نیا راگ چھیڑا کہ

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

ادھر ہندو نوجوانوں میں حب الوطنی نے ایک نئی زندگی پیدا کر رکھی تھی اور

ان کی ایک خاصی تعداد نے آزادیٔ وطن کی خاطر دہشت پسندی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، سوراج اور سودیشی کا نعرہ ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا، کئی مسلمان نوجوان بھی اپنے نوجوان ہموطنوں کے ساتھ تھے، جن میں دو نام بہت نمایاں ہیں، ایک مولانا ابوالکلام آزاد کا اور دوسرا مولانا حسرت موہانی کا[1]۔ حسرت موہانی علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے، بیسویں صدی کے پہلے دہے میں وہ علی گڑھ سے اُردوئے معلّٰی نکال رہے تھے اور علی گڑھ کالج کے نوجوانوں میں حُب الوطنی اور آزادی کا جذبہ بیدار کر رہے تھے۔ ترکی، ایران اور مصر کے نوجوانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی خبریں اخبارات کے ذریعے جب تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں تک پہنچتی تھیں تو ان میں بھی خود اعتمادی اور خودداری کی زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

۱۹۰۷ء کی اسٹرائک کو جو ایک لحاظ سے علی گڑھ کالج کے یورپین اسٹاف اور انگریز دوست انتظامیہ کے خلاف نوجوان طلبہ کی صدائے احتجاج تھی، اگر اس وقت کی قومی و بین اقوامی سیاسی فضا کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا

۱۔ ذاکر صاحب مولانا حسرت موہانی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۵۱ء کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں یومِ حسرت منایا گیا تھا، اس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "یہ جلسہ ایک ایسے شخص کی یاد میں کیا جا رہا ہے جس کا اس ادارہ سے بہت گہرا تعلق ہے۔ حسرت کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بڑی دلآویزی ہے۔ جس زمانے میں لوگ انقلابی نہیں ہوتے تھے، حسرت اُس وقت انقلابی تھے۔ جب لوگ جیل نہیں جاتے تھے اُس وقت حسرت نے جیل میں چکی پیسی۔ جب لوگ بم نہیں پھینکتے تھے، اُس وقت حسرت بم پھینکنے والوں کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ لارڈ ہارڈنگ کے زمانے میں ایک بم پھینکنے والا علی گڑھ میں حسرت کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا اور اس یونی ورسٹی پر بم پھینکنا چاہتا تھا لیکن حسرت نے اس کو بم پھینکنے سے روک دیا، اس لیے نہیں کہ انھیں لارڈ ہارڈنگ سے کوئی ہمدردی تھی یا وہ بم پھینکنے کے مخالف تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اس دارالعلوم سے محبت کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ادارہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے اور اس کا کام چلانے والوں کی راہ میں دُشواریاں پیدا ہو جائیں۔" (مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۸ دسمبر ۱۹۵۱ء)

ہے کہ کالج کی یہ اسٹرائک درحقیقت ایک نئے دور کا آغاز تھا۔[۱] اس اسٹرائک نے پہلی بار علی گڑھ کالج کے ان قدیم طالب علموں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جو علی گڑھ سے باہر رہتے تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے تمام خرابیوں کا ذمے دار کالج کی منتظامیہ کو خاص طور پر اس کے سکریٹری اور پرنسپل کو ٹھرایا اور کہا کہ ان لوگوں کی سرکار برطانیہ سے غیر ضروری وفاداریوں نے نوجوان طالب علموں کو ان سے دور کر دیا ہے۔ اب اس کے بعد علی گڑھ کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں دو پارٹیاں بن گئیں، ایک علی گڑھ پارٹی جو Clique کہلاتی تھی اور دوسری Reforms League کے نام سے مشہور ہوئی۔ قدیم طلبہ کی ان دونوں پارٹیوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ ان کا سیاسی رجحان تھا جو ہمارے خیال میں ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی شکل میں پہلے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی دونوں پارٹیوں، اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی با اختیار کمیٹیوں کی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتا رہا۔

علی گڑھ کے نوجوان طلبہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی ریفارمس لیگ کے سیاسی رجحان ہی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۰۹ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اپنے انقلابی اغراض و مقاصد کے پیش نظر دیوبند کے ابنائے قدیم کی تنظیم جمعیتہ الانصار کے نام سے قائم کی اور پھر جلد ہی ۱۹۱۰ء میں ان کے ایما سے دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ دستار بندی دیوبند میں منعقد ہوا تو اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی قیادت میں علی گڑھ کے احرار ملت کا ایک وفد بھی شریک ہوا۔ یہیں پہلی بار اس بات کی کوشش کی گئی کہ

۱۔ اقبال کو لندن میں جب اس اسٹرائک کی خبر ملی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ ''اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے''، ''طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی اور اس کے ذریعے اپنی سیاسی مصلحت پسندی کے پیش نظر انھیں یہ خاص مشورہ دیا تھا:

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

علی گڑھ اور دیوبند ایک دوسرے سے قریب آئیں[1]

۱۹۱۱ء میں شاہی دربار کے موقع پر تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان ہوا اور مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ انگریزوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ مسلمانوں کی خیرخواہی کریں گے، محض خود فریبی ہے۔ اب تک حکومت اور اس کے مسلم حوارئین مسلمانوں کو سمجھاتے آرہے تھے کہ اگر سلطنت برطانیہ مسلمانوں کی خیرخواہ نہ ہوتی تو وہ کیوں بنگال کو تقسیم کرکے مشرقی بنگال کا ایک الگ صوبہ بنادیتی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، لیکن اس تقسیم کی منسوخی کے اعلان کے ساتھ اس "خیرخواہی" کی ساری پول کھل گئی۔ اسی سال ٹرپولی پر اٹلی کا حملہ ہوا جس کے دھماکے علی گڑھ کالج کے احاطے میں شدت سے محسوس کیے گئے۔ ترکی چاہتا تھا کہ وہ اپنی فوجیں مصر کی راہ سے ٹرپولی بھیجے جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا تھا، لیکن عملاً مصر پر اس وقت برطانوی اقتدار غالب تھا اور اس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ خبر جب علی گڑھ کالج کے احاطے میں گونجی تو طالب علموں میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ برطانیہ اٹلی کا حامی اور موید ہے، اب روزانہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں طلبہ کی میٹنگ ہوتی جس میں ٹرپولی پر اٹلی کے مظالم کی خونیں داستان بیان کی جاتی اور نہایت سخت الفاظ میں اٹلی اور دوسرے سامراجیوں کی مذمت کی جاتی[2]۔ طالب علموں نے شہدائے ٹرپولی کی بیواؤں اور بچوں کی امداد کے لیے ایک فنڈ قائم کیا، اچھا کھانا اور اچھا پہننا چھوڑ دیا، اور اس سے جو کچھ بچتا وہ ٹرپولی فنڈ کو دے دیا جاتا۔

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی، The Deoband School and the Demand for Pakistan ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۶۳ء صفحات ۵۸۔۶۰

۲۔ چودھری خلیق الزماں، Pathway to Pakistan، لانگ مینس، ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۷۔ چودھری صاحب ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ گئے تھے جہاں وہ ۱۹۱۶ء تک زیر تعلیم رہے۔

ابھی ٹریپولی کا غم تازہ ہی تھا کہ ۱۹۱۲ء میں کہ جب حکومت وقت مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات کو ٹھکرا رہی تھی، سامراجیوں نے ترکوں کے خلاف بلقان کی جنگ شروع کرادی۔ اس جنگ میں بھی برٹش گورنمنٹ کھلم کھلا ترکوں کی مخالف تھی، اس سے علی گڑھ کے طالب علموں میں انگریز دشمنی کی لَے اور تیز ہوگئی اور انھوں نے کھل کر ترکوں کی حمایت میں کام کرنا شروع کیا[1]۔ اسی سال ۱۱ر نومبر کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری علی گڑھ گئے جہاں انھوں نے ترکی جانے والے اپنے طبّی مشن کے مقاصد لوگوں کو سمجھائے، چھ ہزار روپے کی رقم تو فوراً جمع ہوگئی، بعد میں کل رقم پینتالیس ہزار تک پہنچی[2]، اس کے ساتھ چھ طالب علموں نے طبّی مشن کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ تھے کالج کے عبدالرحمٰن صدیقی، محمد شعیب قریشی، عزیز انصاری، خلیق الزماں، اور اسکول کے منظور علی اور عبدالرحمٰن پیشاوری[3]۔ ان نوجوانوں کی شاندار خدمات کا اعتراف حکومت ترکیہ کے اعلا عہدہ داروں نے ممنونیت کے گہرے جذبے کے ساتھ کیا۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ملک میں مسلمانوں کے دیگر طبقات کے علاوہ علی گڑھ کے نوجوان گروہ کے ذہن وضمیر کی بیداری اور ان میں نئے سیاسی رجحانوں کی آبیاری میں مولانا محمد علی کے کامریڈ اور ہمدرد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ کا نمایاں حصہ تھا، ان اخبارات نے اس خیال کی اشاعت بڑے پُرجوش لہجے میں کی کہ "پین اسلامزم" کا نعرہ سامراج دشمن نعرہ ہے اور اسے دنیائے اسلام کے مغلوب ومحکوم ملک مغربی استعمار کے خلاف ایک متحدہ

۱۔ ذاکر صاحب اس وقت اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں طالب علم تھے اور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ وہ کس طرح تقریریں کرکے ترکوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرتے اور بھجواتے تھے۔

۲۔ بھٹناگر، حوالۂ سابق، صفحہ ۳۱۳

۳۔ کامریڈ، ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۳

محاذ بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ "پین اسلامزم" کی پُرانی تحریک اب قومی آزادی کی نئی تحریکوں میں بدل چکی تھی۔ اور یہاں ہندستان میں اقبال کی نظموں نے مسلمانوں کے دل میں یقین اور ذوقِ عمل پیدا کیا اور بڑے پُرجوش آہنگ میں 'طلوع اسلام' کی بشارت دی[1]۔

۱۹۱۳ء میں مسجد کان پور کا خونیں واقعہ پیش آیا، اور پھر شرق اوسط کے مقدس مقامات اور حجاز کی حفاظت کا سوال اٹھا اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف شدید غم و غصہ پیدا ہوا۔ "خدام کعبہ" کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑی تو ناچار ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینا پڑا، اور غالباً برطانیہ یہ چاہتا بھی تھا کہ ترک اس کے مخالف کیمپ میں جائیں تاکہ اسے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے اور صلیبی جنگوں میں مغرب کی ہزیمت کا انتقام لینے کا موقع ملے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان واقعات کا کیا اثر علی گڑھ کالج کے طالب علموں پر پڑا ہوگا اور اُن کی ہمدردیاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہوں گی۔ جنگ کے دوران ہندستان میں بدیسی حکومت نے قوم پرور ہندوؤں اور مسلمانوں پر بڑی سختیاں کیں، قومی اخباروں پر پابندیاں عائد کیں، تشدد کا ہر طریقہ اختیار کیا اور ملک کو معاشی طور پر بُری طرح لوٹا اور برباد کیا۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ریشمی رومال کی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا، اور مکہ معظمہ میں انھیں اور ان کے شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی اور راجا مہندر پرتاپ وغیرہ نے ہندستان کی آزاد جمہوری حکومت

۱۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ذاکر صاحب پہلے اٹاوہ اسکول میں اور پھر ایم اے او کالج میں اقبال کی شاعری سے متاثر ہوئے، اُن کی نظمیں وہ ایک خاص انداز سے بلند آواز سے پڑھتے یا گنگناتے، بہت سی نظمیں اور اشعار انھیں یاد ہو گئے تھے، ان اشعار سے وہ اپنی گفتگو اور یونین کے مباحثوں میں بڑا کام لیتے تھے۔

بنائی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشہور پیکٹ ہوا، غرض ہندو مسلم اتحاد اور ایک بڑی قومی تحریک کے آثار پیدا ہو چلے تھے، لیکن چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اور سختیاں اور پابندیاں بہت زیادہ تھیں، اس لیے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو جنگ کے خاتمے کا انتظار تھا۔

خلافت اور ترک موالات

جنگ ختم ہوئی تو اس کے ساتھ نئی آزمائشیں شروع ہوئیں، ترکی مقبوضات کی تقسیم اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں اضطراب اور احساس محرومی پیدا ہوا۔ علی گڑھ کالج کے در و دیوار پر بھی سوگ کی فضا طاری ہوگئی، دوران جنگ انگریزی راج کے حامیوں نے حکومت سے ساز باز کر کے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ حکومت ہی کی شرط پر مسلم یونی ورسٹی ایکٹ منظور کرلیں گے۔ قوم کے رہنما جو جیلوں میں تھے، رہا ہوئے تو ان کے سامنے کئی اہم مسائل ایسے آئے جو فوری توجہ کے طالب تھے، ان میں ایک خلافت کا مسئلہ بھی تھا، اسی کے ساتھ مانٹیگو چیمسفورڈ دستوری اصلاحات کے نفاذ کے معاملے نے بھی قوم پرور عناصر کو نئی اُلجھنوں میں مبتلا کر دیا تھا، خلافت کمیٹی قائم ہو چکی تھی، اور علما نے الگ سے مسلمانوں کے حقوق اور ملک کی آزادی کے حصول کے لیے جمعیتہ العلما کے نام سے اپنی تنظیم بنالی تھی، جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کے مظالم نے ہندو مسلم اتحاد کو اور مضبوط کر دیا تھا، مگر ابھی چونکہ کوئی واضح پروگرام نہ تھا اس لیے انتشار اور سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی، مسلمانوں میں کوئی ہجرت کی بات کہتا تھا اور کوئی جہاد کا اعلان چاہتا تھا، ایسے میں گاندھی جی نے جب حکومت سے عدم تشدد پر مبنی ترک موالات کا پیغام دیا تو سبھی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آئے تو انھوں نے گاندھی جی کے خیال کی بھرپور تائید کی اور علما نے بھی اس کے وجوب کا فتوا دیا۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کو خط لکھا کہ

حکومت برطانیہ نے خلافت کے مسئلے پر بے اصولی، ناانصافی اور غیر اخلاقی حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے اور ستم یہ کہ وہ اپنے غیر اخلاقی اقدامات کو جائز بھی سمجھتی ہے۔ ایسی حکومت کے لیے میرے دل میں نہ کوئی قدر ہو سکتی ہے نہ احترام[1]۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ کے خصوصی اجلاس میں گاندھی جی کی ترک موالات کی تجویز بھاری اکثریت سے منظور کی گئی۔ مضامین کمیٹی میں سوائے مسٹر جناح کے تمام مسلمان ممبروں نے گاندھی جی کی تجویز کی تائید کی۔ اس تجویز کے کئی جزو تھے جن میں ایک سرکاری اور امدادی اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ بھی تھا۔ جلد ہی یہ عظیم قومی تحریک پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

ناممکن تھا کہ ذاکر صاحب جیسا ذہین اور حساس نوجوان جس نے اپنے سیاسی فکر کی پہلی بتّی مولانا ابوالکلام آزاد کے چراغ 'الہلال' سے جلائی تھی، ملک و ملت کے بدلے ہوئے حالات اور نئے سیاسی رجحانات سے متاثر نہ ہوتا، خاص طور پر جب وہ دیکھتا تھا کہ ان سیاسی رجحانات کے حامل وہ لوگ تھے جن کی اس کے دل میں بڑی عزت تھی، مثلاً حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، حاجی موسیٰ خاں، مولانا محمد علی وغیرہ، اور جو کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں کے بھی حامی تھے، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے ترک موالات کا پیغام علی گڑھ کالج میں پہنچایا، یہ سب کے سب کالج کے خیر خواہ تھے اور ان میں سے کئی اس کے ٹرسٹی بھی تھے۔

گاندھی جی کو ابھی ذاکر صاحب نے دیکھا نہ تھا، لیکن ان کے متعلق جو کچھ اخباروں میں چھپتا تھا اسے وہ پڑھتے تھے، ناگزیر تھا کہ ذاکر صاحب جیسا صاف ذہن اور پاک دل نوجوان گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ ذاکر صاحب نے تھوڑے ہی دنوں بعد جرمنی میں اپنے قیام کے دوران ڈاکٹر ایرن ترالش کے ساتھ مل کر گاندھی جی پر ایک کتاب لکھی جو Die Botschaft de Mahatma Gandhi

---

[1] تینڈولکر، مہاتما، جلد دوم، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱

کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے جرمنی میں گاندھی جی کے سیاسی و سماجی فکر اور فلسفۂ عدم تشدد پر کئی تقریریں بھی کیں جو وہاں کے باشعور طبقے میں بہت پسند کی گئیں۔

گاندھی جی نے اُن طالب علموں کے والدین کے نام ایک اپیل شائع کی جو اس وقت علی گڑھ کالج میں زیرِ تعلیم تھے اپیل میں کہا گیا تھا: آپ کے بچے علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم سے متعلق جو فکر ہے اس میں میں آپکا شریک ہوں... میں خود چار بچوں کا باپ ہوں... اور مجھے والدین کے فرائض کا احساس بھی ہے لیکن میں ان سب سے بڑھ کر اس فرض کو سمجھتا ہوں جو خدا کا حق ہے۔ میں نے مختلف جگہوں پر ہزاروں والدین کو خطاب کیا ہے اور کسی نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں سے بچے باہر نکل آئیں جن پر حکومت کا کنٹرول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری اس بات سے آپ کے جذبات مجروح نہیں ہوں گے اگر میں آپ کے بچوں سے آپ کی مرضی کے خلاف اسکول اور کالج چھوڑ دینے کو کہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ کے طالب علموں کے والدین بھی دوسرے والدین کی طرح اس ضرورت کا احساس رکھتے ہوں گے کہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے یا گورنمنٹ سے امداد پانے والے اسکولوں اور کالجوں سے نکال لیں جس نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور پنجاب میں اپنے ظالمانہ رویّے سے پوری قوم کی توہین کی ہے۔ کاش آپ کو بھی اس کا احساس ہوتا کہ وطن عزیز کا مقدر ہم والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا ہم انھیں اس غلامی کی لعنت سے جس نے ہمیں اپنے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا ہے، چھٹکارا نہ دلائیں گے؟... اگر وہ آزاد بچوں اور بچیوں کی طرح تعلیم حاصل کریں تو اس سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔[1]

گاندھی جی کی اس اپیل کا کچھ لوگوں پر یقیناً اثر ہوا، لیکن زیادہ تر لوگوں نے، خصوصاً ٹرسٹیز کی اکثریت اور کالج ایڈمنسٹریشن نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور ہر وہ

۱۔ ایضاً، صفحات ۲۸-۲۷

حربہ استعمال کیا جس سے وہ کالج کو ترک موالات کی تحریک سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو سنڈیکیٹ کی میٹنگ ہوئی جس میں ترک موالات کی مخالفت کی تجویز منظور کی گئی اور پرنسپل (ڈاکٹر ضیاء الدین) اور اسٹاف سے کہا گیا کہ وہ ہمت سے صورت حال کا مقابلہ کریں۔ اس دوران کچھ طالب علم گاندھی جی اور مولانا محمد علی کے پاس پہنچے اور انھوں نے انھیں علی گڑھ آنے کی دعوت دی کہ وہ آئیں، طلبہ کو ترک موالات کا پیغام دیں اور انھیں سمجھائیں کہ مجوزہ سرکاری یونی ورسٹی مسلمانوں کے تعلیمی و تہذیبی مسائل کو حل نہیں کر سکتی، اور یہ کہ انھیں اپنے تعلیمی ادارہ کو حکومت کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیے۔ ۱۱ر اکتوبر کو علی برادران، گاندھی جی اور سوامی ستیہ دیو علی گڑھ پہنچے، ۱۲ر اکتوبر کو گاندھی جی نے یونین کلب میں طلبہ سے خطاب کیا اور ترک موالات کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی، لیکن وہ کالج کے بائیکاٹ کے سلسلے میں طلبہ سے کوئی وعدہ نہ لے سکے۔

جامعہ ملیہ کا قیام اور ذاکر صاحب

ذاکر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ گاندھی جی اور علی برادران کی آمد کے موقع پر علی گڑھ میں موجود رہیں، لیکن وہ بیمار تھے اور ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں دکھانا چاہتے تھے۔ افسوس کہ تاریخیں ٹکرا گئیں۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ یونین کی کابینہ میں ان کے دوست اس بات پر راضی ہو جائیں کہ مقررہ تاریخ (۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو یونین کا جلسہ سہ پہر میں جہاں تک ممکن ہو تاخیر سے ہو لیکن ایسا نہ کیا جا سکا اور جب وہ اسی دن دہلی سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے یونین میں تقریر کی اور واپس چلے گئے۔

گاندھی جی واپس چلے گئے تھے، علی برادران رک گئے تھے لیکن نہایت اُداس، دل شکستہ اور مایوس تھے، انھیں اُمید تھی کہ ان کی مادر درسگاہ ان کی پکار سنے گی، گاندھی جی کی آمد کی لاج رکھے گی جو خلافت تحریک کے پُرزور مویدین میں تھے اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لیے لڑ رہے تھے، انھیں شرمندگی تھی کہ علی گڑھ

نے شدائد اور ایثار و قربانی کا سامنا کرنے سے گریز کیا' اور انگریز پرستی کی تن آسانی کو ترجیح دی۔

۱۲ر اکتوبر کو جب ذاکر صاحب شام کو دہلی سے لوٹے تو حسب معمول علی گڑھ اسٹیشن پر طالب علم موجود تھے۔ ان میں ذاکر صاحب کے بعض دوست بھی تھے جو انھیں لینے اسٹیشن آ گئے تھے۔ طلبہ میں ایک گروپ ایسا تھا جو اس دن یونین میں گاندھی جی اور مولانا محمد علی کی تقریر پر تبصرہ کر رہا تھا اور بڑے تکلیف دہ انداز میں کر رہا تھا' کچھ ایسے تھے جو بازاری اور اہانت آمیز جملے کہہ رہے تھے' گویا جیسے وہ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کی سُبکی اور ناکامی کا جشن اپنے خاص انداز میں منا رہے ہوں۔ ذاکر صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کے اپنے بعض دوست بھی ان طلبہ کے ہم نوا ہیں۔ طلبہ اور اپنے دوستوں کے اس ظالمانہ رویے سے وہ بے چین ہو گئے' مجیب صاحب نے ہم لوگوں سے کئی بار ذکر بھی کیا اور بعد میں لکھا بھی کہ ذاکر صاحب نے انھیں بتایا تھا کہ اس دن اسٹیشن پر گاندھی جی کا توہین آمیز تذکرہ اس قدر وحشیانہ تھا کہ میں شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ تعلیم' تہذیب اور ہر وہ چیز جو اعلا اور پاکیزہ ہے' سب کے خلاف یہ طرزِ عمل' یہ اندازِ گفتگو' ایک جرم تھا' مجھے خیال آیا کہ اس گناہ کا کفارہ تو ادا ہی کرنا ہوگا![1] یہ شریفانہ احساس ذاکر صاحب کی نیک فطرت اور ان کی اب تک کی ساری ذہنی اور اخلاقی تربیت کے عین مطابق تھا' علی گڑھ اسٹیشن پر وہ ایک "لمحہ" درحقیقت ذاکر صاحب کی حیاتِ مستعار کا وہ لمحہ تھا جس نے ان کی زندگی کا اصل رُخ متعین کر دیا' وہ لمحہ دراصل اربابِ قضا و قدر کا متعین کیا ہوا لمحہ تھا جس کے بھید عقلِ انسانی پر نہیں کھلتے۔

وہ رات جو ۱۲ر اکتوبر کا دن گزار کر آئی تھی رجعت پرستوں کے لیے اطمینان و راحت کی رات' لیکن غیرت مندوں کے لیے شرم و ندامت کی رات تھی' نہ معلوم اُس رات ایسے کتنے لوگوں کی آنکھوں سے پچھتاوے کے آنسو بہے' کتنے لوگوں کے دل مضطرب

۱۔ محمد مجیب' حوالہ سابق' صفحہ ۲۵

رہے اور کتنوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے اس عظیم الشان دانشکدے کو ملک و ملت کی خدمت کی راہ کی قربانیوں سے محروم نہ رہنے دیں گے۔ چونکہ کوئی ریکارڈ نہیں، اس لیے ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ رات ذاکر صاحب پر کیسی گزری، ہاں، اس بات سے کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ، باوجود اس کے کہ ان کے قریبی دوستوں نے اس رات کی صبح کو ان کے رویے اور انداز گفتگو میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی، ۱۲ر اکتوبر کی شام کو علی گڑھ اسٹیشن پر انھیں اضطراب اور ندامت کا جو احساس ہوا تھا، وہ ۱۳ر اکتوبر کے یونین کلب کے جلسے میں آنسو بن کر بہہ نکلا جسے بہتوں نے دیکھا اور جس کی لکیریں اس دن کی رپورٹ کی سطریں بن کر کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔

یونین کے اس جلسے کا حال جس میں ذاکر صاحب کے فیصلہ کن اقدام نے ہوا کا رُخ بدل دیا، رشید احمد صدیقی نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

"صبح ہوئی، یونین میں جلسہ ہوا، میں اور مرشد (ذاکر صاحب) بھی ایک طرف بیٹھ رہے۔ مولانا محمد علی نے حسب معمول بڑی پُر زور تقریر کی، لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے۔ دوپہر ہونے والی تھی، دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے۔ تقریر کی آخری اور کمزور موجیں کنارِ ساحل سے ہم آغوش ہونے والی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

پڑھا... اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، دم بخود رہ گیا، مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا، یہ کیا ہوا؟ فرمایا، رشید صاحب، الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور محمود کے حوالے کر دیجیے گا۔

کالج کے کاغذات ان کو واپس بھیج دیجیے گا۔ میں نے کہا 'مرشد' اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔ آپ اس طریقۂ کار کے کچھ ایسے مؤید بھی نہ تھے۔ آخر یہ کیا ہوا؟ فرمایا' تحریک غلط ہو یا صحیح۔ اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی تحریک میں حصّہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمّے داری اُٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں' پانسا پھینکا جا چکا ہے' انجام جو کچھ ہو' اچھا خدا حافظ![1]"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تھوڑی دیر رُک کر ہم ۱۹۲۰ء کے نوجوان ذاکر حسین کی دلآویز شخصیت کے خدوخال عابد صاحب کی ایک تحریر کے درج ذیل اقتباس کے آئینے میں بھی دیکھیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت سے متعلق ہمارے خیال اور تاثر کی سچّی' کھری اور عینی شہادت ہے:

"ذاکر صاحب ہندستان کی تحریک آزادی کے طوفانی دور میں پلے اور بڑھے۔ اس طوفان و ہیجان کے زمانے میں جہاں بحرِ زندگی کی سطح پر ساحل سے ٹکر لینے والی تند و پُرشور موجیں اُبھریں وہاں قعرِ دریا میں ان موتیوں نے بھی پرورش پائی جن میں بقول غالب دریا کا اضطراب محو ہو گیا تھا۔ ایک ایسا موتی جس کے سکون میں طوفانوں کی خاموش قوت چھپی ہوئی تھی' نوجوان ذاکر حسین تھا جو ۱۹۲۰ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے ایم۔اے فائنل میں پڑھ رہا تھا...

۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب میں میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔اے کا امتحان

۱۔ رشید احمد صدیقی' ہمارے ذاکر صاحب' صفحات ۵۸-۵۷

پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ وہ ایم۔ اے۔ معاشیات کے دوسرے سال کے طالب علم تھے اور شعبۂ معاشیات میں جونیئر لکچرر بھی۔ مجھے پہلی ملاقات میں نہیں تو دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی و اخلاقی صفات اور دل کش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ ان سے گفتگو کریں تو چشم زدن میں وہ بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ اُبھر کر سطح پر آتے تھے۔ وہ خود کسی مسئلے پر غور کریں تو ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطے کو روشن کر دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ پورے دائرے میں پھیلتی تھی۔ ان کی تقریر میں بھی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے سیدھی دل میں اُتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعے دماغ کو قائل کرتی تھی۔۔۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کے لیے ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خوش باش، لاابالی مزاج رکھتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے کوئی گہرا، وزنی، سنجیدہ مقصد نہیں بلکہ ایک ہلکا پھلکا دلچسپ مشغلہ ہے۔

"مگر چند ہی روز بعد ذاکر صاحب کی شخصیت کا ایک نیا پہلو جو اب تک دبا اور چھپا ہوا تھا اُبھر کر نظروں کے سامنے آیا اور معلوم ہوا کہ اس بظاہر بے تہ، بے پروا نوجوان کے سینے میں ایک پُرخلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل ہے اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور انتھاہ ہمت اور حوصلہ ہے"۔[1]

ذاکر صاحب کی طلبہ اور اسٹاف بھی عزت کرتے تھے، ایک ممتاز طالب علم، اچھی

۱۔ سید عابد حسین، "ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ مرد مومن، مرد حق"، اسلام اور عصر جدید، جولائی ۱۹۶۹ء

گفتگو کرنے والے، دلکش شخصیت اور دیانت دار نوجوان کی حیثیت سے اُن کی شہرت عام تھی اور کالج میں لوگ رہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھنے لگے تھے جہاں اُن کی بات کا ایک وزن اور ایک وقار تھا' پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین انھیں اپنا رقیب سمجھتے تھے۔ تحریک ترک موالات کا ذاکر صاحب پر اثر ہوا' تو گویا علی گڑھ میں تحریک کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ یونین کے جلسے سے علی برادران تو چلے گئے' مگر مجمع کو مضطرب اور بے چین چھوڑ گئے۔ جوش و خروش کا ایک طوفان تھا کہ تھمنے میں نہ آتا تھا۔ اسی میں کسی نے اُٹھ کر کہا کہ اگر ہم اس ادارہ کو چھوڑ دیں تو جو لوگ ہمیں چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہیں' انھیں چاہیے کہ وہ ہماری بہتر تعلیم کی ذمّے داری قبول کریں۔ اس پر مجمع میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا' اور اس شخص پر جس نے یہ بات کہی تھی ڈاکٹر ضیاء الدین کا جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایک سینیر طالب علم ابن حسن تھے جو اسی زمانے میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے تجویز کی معقولیت پر غور کرنے کو کہا تو انھیں بھی طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ ذاکر صاحب ان دنوں بیمار تھے، صحت ان کی کمزور تھی' اور وہ اس موقع پر کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں تیز بخار تھا' لیکن جب طنز و تعریض کی اشتعال انگیزیاں بہت بڑھ گئیں' اور ہر معقول بات مخالفت کے طوفان میں دبتی نظر آئی تو ان سے نہیں رہا گیا۔ کھڑے ہوئے اور ایک زور دار اور مدلل تقریر کی' اور ایک آزاد اور جداگانہ تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز کی تائید کی۔ اتفاق سے چند ماہ پیشتر انھیں بھی کالج میں معاشیات کا اسسٹنٹ لکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے ایک دوست سیّد محمد اُٹھے اور کہنے لگے کہ "یہ شخص میرا دوست ہے' یہ اچھا آدمی ہے' سچا آدمی ہے۔ مگر اس وقت اس کے سینے میں شیطان گھس گیا ہے۔ یہ بھی اپنی تنخواہ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے' اس لیے یہ ترکیب کر رہا ہے کہ وقت ٹل جائے اور ہم کچھ نہ کر پائیں' دوستو! دھوکا نہ کھاؤ۔" اس پر وہ پھر کھڑے ہوئے' تقریر کی اور طلبہ کی اکثریت کو یہ کہہ کر اپنا حامی بنالیا کہ وہ لیکچررشپ سے استعفیٰ دے رہے ہیں' اور وہ وظیفہ بھی نہیں قبول کریں گے جو انھیں ملنے والا ہے' ابن حسن اور دوسرے طلبہ نے بھی اسی طرح

کے اطلاعات کے لیے[1] ذاکر صاحب کی طبیعت کچھ ایسی تھی، شاید یہ ان کے دادا کا اثر ہو کہ انھیں چیلنج قبول کرنے میں ایک لطف آتا تھا، ایسے میں وہ 'جاں' کے مقابلے میں 'تسلیم جاں' کے علمبردار بن جاتے تھے۔ یہ خیال کہ جو لوگ اداروں کے بائیکاٹ کے حامی ہیں، ان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے اور انھیں اتنے وسائل فراہم کرنے چاہییں کہ ایک قومی ادارہ جس میں طلبہ آیندہ تعلیم حاصل کرسکیں، قائم کیا جاسکے، ایک چیلنج کی شکل میں ان کے ذہن میں جاگزیں ہوگیا، اس جلسے میں تو انھوں نے کسی سے کچھ نہیں کہا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں، لیکن چند دن بعد وہ دہلی پہنچے جہاں وہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی اور دوسرے ممتاز لوگوں سے ملے، اور انھیں یقین دلایا کہ طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایم اے او کالج چھوڑ کر قومی ادارے میں آجائے گی بشرطیکہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جاسکے۔ قوم کے رہنما اس کے لیے تیار تھے، یوں اور اس طرح ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آئی اور علی گڑھ کالج کی مسجد میں اس ادارہ کا افتتاح کرتے ہوئے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے خطبے میں اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔

لیکن قبل اس کے ہم شیخ الہندؒ کے خطبۂ افتتاحیہ کے دو ایک اقتباس یہاں نقل کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کا ذکر کردیا جائے جو طلبہ نے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو یونین کے جلسے میں منظور کی تھی۔ تجویز میں صلحنامۂ سیورے کے موقع پر ترکی کے خلاف سرکار برطانیہ کے رویئے کی پُرزور مذمت کی گئی تھی اور بورڈ آف ٹرسٹیز سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت سے امداد لینا بند کردیا جائے اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے او کالج کا الحاق منسوخ کردیا جائے، طلبہ کا فیصلہ ہے کہ اگر ٹرسٹیز نے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۰ء تک ان کے مطالبات نہیں تسلیم کیے تو وہ کالج کو ایک قومی ادارے میں بدل دینے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور وہ کسی گورنمنٹ چارٹرڈ یونیورسٹی سے کوئی

۱۔ عبدالغفار مدھولی، 'جامعہ کی کہانی'، کوہِ نور پریس دہلی، ۱۹۶۵ء، صفحات ۲۲-۲۱

سروکار نہ رکھیں گے۔ اس کے بعد طلبہ نے کلاسوں میں جانا بند کر دیا' کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنی ساری سرکاری اور غیر سرکاری طاقت اور اپنے سارے ہمدردوں کی تائید و قوت کو جو تحریک موالات کے مخالف تھے' مجتمع کیا' سارے ملک سے والدین اور سرکاری ملازمین علی گڑھ پہنچے' طلبہ کو واپس بلا لینے کے لیے ان کے گھروں پر تار بھیجے گئے کہ طلبہ باغی ہو گئے ہیں' والدین اپنے بچوں کو آ کر لے جائیں' غرض حکومت کے بہی خواہوں اور کالج کے "نام نہاد" ہمدردوں نے ایک مضبوط دفاعی محاذ قائم کر دیا اس دفاع کی ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ با اثر طلبہ کو دنیوی اعزاز کے سبز باغ دکھائے گئے اور انھیں تحریک سے توڑ لینے کے لیے سرکاری عہدوں کے لالچ دیے گئے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا طلبہ عام طور پر احترام کرتے تھے' اور اُن کی بات اور اُن کا فیصلہ وقعت رکھتا تھا۔ خیال تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گئے تو علی گڑھ میں یہ تحریک کمزور پڑ جائے گی' اور پھر اس سے نپٹنا آسان ہوگا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بُلا کر سمجھایا کہ وہ خواہ مخواہ کیوں اس جھگڑے میں پڑ کر اپنی زندگی خراب کرتے ہیں' اس سے باز آ جائیں تو وہ جلد ہی انھیں ڈپٹی کلکٹری دلا دیں گے'، یہ گویا اُن کی پاک ضمیری کے لیے دوسرا چیلنج تھا جو دولت اور عہدے کی تحریص کی شکل میں پیش کیا گیا تھا' اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے چیلنج کا قبول کرنا ان کی طبیعت کا عین مقتضا تھا' انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا' اور قومی خدمت کی راہ میں اپنے قدم مضبوطی سے جما دیے:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

شیخ الہندؒ نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں جسے ان کی علالت اور کمزوری کے باعث ان کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی اور تحریک ترک موالات اور جامعہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"اے نونہالانِ وطن' جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں

ہیں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا...

"مجھے لیڈروں سے زیادہ نونہالانِ وطن کی ہمت بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے موالاتِ نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔"

جامعہ کے بارے میں شیخ الہند نے کہا:

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد، کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں، ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہییں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔"

ذاکر صاحب نے ۱۹۲۰ء کے ان ایمان پرور اور ولولہ خیز شب و روز کو ہمیشہ یاد رکھا اور اس کا ذکر بھی اپنی تقریروں، نجی خطوط اور گفتگوؤں میں کرتے رہے، ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر انھوں نے اپنے معرکتہ الآرا خطبے میں کہا:

"مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڑھ

کالج کی مسجد میں... (ایک) وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں. صاحبو، یاد رکھو وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی... اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی... یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔"

۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وائس پریسیڈنٹ ہاؤس، نئی دہلی سے جامعہ کے اولڈ بوائے اور اس وقت کے پرسنل سکریٹری شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب، عبداللطیف اعظمی صاحب کو ان کے خط کے جواب میں جس میں ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کے یوم تاسیس جامعہ کے موقع کے لیے پیغام کی درخواست کی گئی تھی، ذاکر صاحب نے لکھا تھا:

"جامعہ کے یوم تاسیس پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں. اس دن بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ مولانا محمود الحسن (محمود حسن) مرحوم مغفور کا خطبہ کانوں کو پھر سنائی دینے لگتا ہے. بڑے خلوص اور ولولے کے دن تھے وہ. اس کیفیت کو قائم رکھنا، کچھ بدلی ہوئی شکل ہی میں سہی، جامعہ کے مستقبل کو روشن بنانے اور قومی زندگی میں

اس کے مقام کو متعین کرنے میں بہت مددگار ہو سکتا ہے۔

"جامعہ کے پُرانے ساتھیوں اور نئے متعلقین کو یہ دن مبارک ہو۔"

والسلام

مخلص

ذاکر حسین [1]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا رسمی افتتاح علی گڑھ کالج کی مسجد میں تو ہو گیا تھا لیکن ابھی تک یہ واضح نہ تھا کہ کون سے طلبہ جامعہ کے ہیں اور کون سے ایم اے او کالج کے، رہتے سب ساتھ تھے کالج کے ہوسٹلوں میں، یہ صورت حال اب باقی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ کالج کے سکریٹری اُس وقت سید محمد علی تھے جن کی وفاداریاں سرکار برطانیہ سے بہت بڑھی ہوئی تھیں، انھوں نے ۱۳ر اکتوبر کو اخباروں میں چھپوایا کہ مولانا محمد علی نے زور زبردستی سے کالج کی عمارت کے چند کمروں کو کھول لیا ہے اور قومی یونی ورسٹی میں، بقول اُن کے، داخلہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے ان کو یہ نوٹس دیا ہے کہ ۱۴ر اکتوبر کو وہ ساڑھے تین بجے سہ پہر تک کالج کے احاطے کو چھوڑ دیں اور کالج کے حدود میں کوئی میٹنگ نہ کریں۔ مولانا محمد علی نے جو اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان احکامات کو نظر انداز کر دیا۔ اس دوران کئی با اثر اور ممتاز طلبائے قدیم مولانا سے ملے اور انھیں اس بات پر راضی کرنا چاہا کہ وہ قومی یونی ورسٹی کہیں اور قائم کر لیں، کہا جاتا ہے کہ عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر انصاری اور کچھ دوسرے لوگ اس بات سے متفق ہو گئے لیکن مولانا محمد علی کا اصرار تھا کہ ایم اے او کالج ہی کو قومی یونی ورسٹی میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ [2]

۱۔ عبداللطیف اعظمی، مشاہیر کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، صفحہ ۳۲

۲۔ بھٹناگر، حوالہ سابق، صفحہ ۳۴۸ (بحوالہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابتہ نومبر ۱۹۲۰ء)

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اگر اس واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جو بعض طلبائے جامعہ کو ۱۹۲۳ء میں پیش آیا۔ مرحوم سعید انصاری اس واقعے کے راوی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر مولانا محمد علی کی خدمت میں انجمن اتحاد کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جامعہ میں ایک عرصے تک مولانا کی عدم موجودگی سے جامعہ کو خاصا نقصان پہنچا تھا' اس کے بعد جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کے جذبات کا اظہار غالب کے اس مصرعے کے ذریعے کیا گیا تھا:

وہ جو ہم رکھتے تھے ایک حسرت تعمیر سو ہے

مولانا نے اپنی تقریر میں کہا : "ہم نے تعمیر کا ارادہ ہی کب کیا تھا جو آپ لوگ اس کی حسرت دل میں رکھتے ہیں" اور پھر علی گڑھ اور جامعہ کی تشریح اس طرح فرمائی: "بھئی، ہماری حالت تو اوائل مسلمانوں کی سی ہے۔ ہمارا اصل کعبہ تو علی گڑھ کالج ہے۔ جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے۔ ہمیں پھر مکہ کو دوبارہ فتح کرنا ہے[1]"

ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی جب "فتح مکہ" کا ارادہ رکھتے تھے تو کیسے اپنے آپ کالج کے حدود سے باہر چلے جاتے۔ ڈاکٹر اشرف جو ترک موالات کرنے والے طلبہ میں شامل تھے، لکھتے ہیں: "'بیعت رضواں' کا وہ دن بھی ہمیشہ یاد رہے گا جب اس سالارِ قافلہ نے ہم سب کو اکیلے اکیلے بلا کر بکی پارک کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں کلام پاک پر عہد لیا تھا کہ جب تک انگریزی اقتدار کا خاتمہ نہ ہو ہمارے لیے برطانوی حکومت سے کسی حالت میں تعاون جائز نہیں ہے۔ اس عہد و پیمان نے جانے میری طرح کتنے نوجوانوں کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا حوصلہ بخشا اور ہم نے طے کیا کہ اب ہماری زندگی قومی جدوجہد اور وطنی آزادی کے لیے وقف ہے[2]"

۱۳ر اکتوبر کو یہ افواہ اڑائی گئی کہ مولانا محمد علی نے طے کیا ہے کہ وہ پرنسپل کے کمرے

۱۔ سعید انصاری، "جامعہ ملیہ"، جوہر (جامعہ جوبلی نمبر) ۱۹۴۶ء، صفحات ۵۵-۵۴

۲۔ محمد اشرف، "جامعہ کا سیاسی پس منظر"، جوہر (جامعہ جوبلی نمبر)، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۳۱

اور آفس پر قبضہ کریں گے۔ ٹرسٹیز نے علی گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کیمبل سے مدد چاہی، وہ تو اس کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے، چنانچہ ۱۳/اکتوبر کو صبح ۵ بجے مسلح پولیس کے ساتھ انھوں نے اولڈ بوائز لاج کو گھیر لیا اور مولانا محمد علی سے لاج کو فوراً چھوڑ دینے کے لیے کہا، مولانا محمد علی طلبہ اور دیگر حضرات کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں کالج کی مسجد میں پہنچے، فجر کی نماز اور سر سید کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور پولیس لاریوں میں بیٹھ کر بدھ باغ کے قریب کشوری لال کی ایک عمارت میں جسے پہلے ہی سے کرایے پر لے لیا گیا تھا، اُترے۔ وہاں کوئی بیس خیمے بھی نصب کیے گئے تھے، اب یہی جامعہ ملیہ اسلامیہ تھی![1]

کیا عجب کہ مولانا محمد علی کے ذہن میں خود انھیں کا یہ شعر اُس وقت گونج رہا ہو جب ان کی قیادت میں ترک موالات کرنے والے اساتذہ و طلبہ کی یہ جماعت جو اُس وقت کی جامعہ ملیہ تھی سر سید کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر پولیس کی لاریوں میں بیٹھ رہی تھی:

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم تھے

اور یہیں ایک بار پھر ذاکر صاحب کے یہ جملے یاد کر لیجیے: "... سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی۔ باغی بنے، نکالے گئے۔ دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادرِ علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اس میں اٹکا رہا۔"

۱۔ بھٹناگر، حوالۂ سابق، صفحہ ۲۴۰

چوتھا باب

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ۔ قیامِ جرمنی

(۱۹۲۰ — ۱۹۲۶)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قافلہ علی گڑھ کالج کی شاندار عمارتوں کو چھوڑ کر اور کالج کے احاطے سے نکل کر جب کرایے کی دو کوٹھیوں اور ان خیموں میں اُترا جنھیں حکیم اجمل خاں نے کہیں سے فراہم کیا تھا، تو گویا ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ تعلیم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، ایک ایسا باب جسے جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے اپنے خونِ جگر سے لکھا، اور جو اس دور میں قومی تعلیم و تعمیر کے اعلا نصب العین کی راہ میں بے غرض خدمت، بے لوث جدوجہد اور بے مثال ایثار و قربانی کی داستان بن گیا۔

جامعہ کا یہ قافلہ جو کالج کی مسجد اور یکّی بارک کے درمیانی گیٹ سے صبح کو بہت سویرے نکلا تھا، اپنی پہلی منزل پر پہنچا تو بظاہر کھانے پینے کا کچھ انتظام نہ تھا لیکن دوپہر ہوتے ہوتے شہر علی گڑھ کے لوگ دیگوں میں ٹھیلوں اور چھکڑوں پر کھانا لادے، پولیس کے گھیرے سے بچتے بچاتے، وہاں پہنچے، اور جب تک مستقل انتظام نہیں ہوا، اسی طرح شہر سے کھانا ان کے لیے پہنچتا رہا۔ لیکن یہ تو جسم و جان کا رشتہ باقی رکھنے والی ظاہری غذا تھی، اصل غذا تو ان "رہروانِ راہِ شوق" کی وہ روحانی کیفیت تھی جس کی چمک ان کی چہروں سے عیاں تھی۔ جن لوگوں نے وہ سماں دیکھا تھا، وہ بیان کرتے تھے کہ بے ریا مذہبیت اور سچّی وطنیت نے مل کر /

جامعہ والوں میں ایسا ذوق وشوق اور ایسا والہانہ پن پیدا کر دیا تھا کہ اُن کو دیکھ کر ان سرفروشوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جن کی مجاہرانہ سرگرمیوں کی کہانیاں ہم نے اپنے بزرگوں سے سنی اور کتابوں میں پڑھی تھیں۔ یہ سب باتیں نیشنلسٹ اخباروں میں چھپتی تھیں، اور ملک کے طول وعرض میں جامعہ کے حالات وواقعات پہنچتے تھے، سارے ملک سے جوشیلے نوجوان جن میں غیر مسلم بھی تھے، قومی تعلیم کے اس ادارہ کی خدمت کے لیے امنگوں اور حوصلوں کے ساتھ کھنچے چلے آتے تھے۔[1]

شروع کے چند مہینوں میں جامعہ کی حالت ایسی تھی کہ اسے خلافت اور ترک موالات والوں کا کیمپ کہہ سکتے تھے، ویسے تو نومبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انتظامی اور تعلیمی امور کو چلانے کے لیے ایک نظام مقرر کر لیا گیا تھا[2]، ٹرسٹیز کا ایک

۱۔ اس سلسلے میں جوہر (جامعہ جوبلی نمبر) میں رانا جنگ بہادر سنگھ بی اے (جامعی) کا مضمون "ایک پُرانا ورق" پڑھ لینا ہی کافی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ایک خط بنام عبدالمجید خواجہ (مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۰ء) سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت کی جامعہ سے متعلق مولانا محمد علی کے سوچنے کا انداز ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ وغیرہ کے طرزِ فکر سے خاصا مختلف تھا۔ خواجہ صاحب کے کسی خط کے جواب میں ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں:

"پیارے خواجہ، السلام علیکم، آپ کا خط ملا، الحمد اللہ کہ اب صورت معقول نظر آرہی ہے۔ خواہ وہ ہمارے گفت وشنید کا نتیجہ ہو یا خود عقل سلیم کی وجہ سے محمد علی صاحب اب تمام امور کو ہمارے خیالات کے مطابق کرنے کو آمادہ اور طیار ہیں... اس لیے آپ کی پریشانی کو رفع کرنے کے لیے یہ خط روانہ کرتا ہوں۔ انشاء اللہ اب جلد تمام امور کے متعلق معقول صورت ظہور میں آئے گی۔ ہم سب کی رائے ہے کہ ۲۲ نومبر کے فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں (جس میں فراہمی سرمایہ وغیرہ کے متعلق فیصلہ ہوگا۔ قواعد قوانین، تعلیم کے اصول، اسٹاف کا تقرر غرض تمام ضروری امور طے ہوں گے) آپ کا آنا نہایت ضروری ہے۔ ہماری رائے ہے کہ محمد علی صاحب کو فراہمی سرمایہ اور دیگر سیاسی امور کے لیے دورہ پر روانہ کر دیا جائے اور آپ کو پرنسپل مقرر کر دیا جائے۔ انڈریوز (Andrews) اور تین اور قابل پروفیسر ہماری یونی ورسٹی میں آکر کام کرنے کے لیے آمادہ ہیں..."

بورڈ، مجلس منتظمہ (سنڈیکیٹ) اور مجلس تعلیمی قائم ہو چکی تھی، حکیم اجمل خاں چانسلر (امیر جامعہ)، مولانا محمد علی وائس چانسلر (شیخ الجامعہ[1]) اور حاجی موسیٰ خاں (فاؤنڈیشن کمیٹی یعنی مجلس تاسیس کے) آنریری سکریٹری اور مولوی انوار الہدیٰ اور تصدق احمد خاں شروانی جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے تھے اور کالج کے پرنسپل کے عہدے پر عبدالمجید خواجہ کا تقرر ہوا تھا — لیکن ابھی طلبہ کی درجہ بندی میں دیر تھی اور باضابطہ کلاسیں بھی نہیں شروع ہوئی تھیں۔ اونچے درجے کے طلبہ نیچے درجے والوں کو پڑھاتے تھے اور جب کبھی لیکچر ہوتے یا باہر سے کوئی خلافتی یا ترک موالاتی لیڈر مدعو ہوتا یا خود ادھر آنکلتا اور اس کی تقریر ہوتی تو سینیر طلبہ بھی ان میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور ان لیکچروں سے استفادہ کرتے۔ ایسے لیکچر اور اجتماعات اکثر وبیشتر ہوتے اور کافی ہما ہمی رہتی، اور اول اول قریب ایک سال یہ صورت بھی رہی کہ سینیر طلبہ کو چھ ہفتے کے ایک کورس میں شریک ہونا پڑتا جس میں انھیں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے اغراض ومقاصد اور ان کے اصول سمجھائے جاتے اور طریقۂ کار کی تربیت دی جاتی۔ اس کے بعد وہ وفود کی شکل میں ملک کے مختلف حصوں میں خلافت اور ترک موالات کے سیاسی کام کے لیے بھیج دیے جاتے۔

جامعہ کے شروع کے دو سال

ذاکر صاحب نے ان سیاسی وفود میں شاید ہی کبھی شرکت کی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ جامعہ کے کاموں میں ان کی مصروفیت بہت مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنا کچھ وقت افلاطون کی ریپبلک کے ترجمے کی تکمیل پر لگاتے تھے

۱۔ پہلے علامہ اقبال سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ شیخ الجامعہ کا عہدہ قبول کرلیں، لیکن انھوں نے معذرت کی تو مولانا محمد علی شیخ الجامعہ ہوئے۔

چھے وہ بہت پہلے شروع کر چکے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے ایڈون کینن کی کتاب Elementary Political Economy کا اردو ترجمہ مبادی معاشیات کے نام سے مکمل کیا جو پہلی بار جامعہ ہی کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ کبھی کبھی وہ ایم اے او کالج کے (جواب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی تھا) اپنے ان دوستوں سے ملنے ملانے چلے جاتے تھے جنھوں نے ترک موالات کی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ دوستوں سے ان کی ان ملاقاتوں کی تفصیل کا سُراغ تو نہ مل سکا، البتہ علی گڑھ میگزین کے مئی وجون ۱۹۲۱ء کے شمارے میں ان کا ایک ترجمہ "بزم ہستی میں ضروری ہے کوئی روحِ رواں" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس پر میگزین کے اڈیٹر نے ایک نوٹ لکھا تھا جو نہایت دلچسپ ہے اور جس سے ذاکر صاحب کی دلکش شخصیت اور علمی و ادبی صلاحیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ اڈیٹر نے لکھا تھا: "ہمارے مکرم دوست ذاکر حسین صاحب بی اے کا نام کسی تقریب یا تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ موصوف سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ وہ کالج کی ان چند مغتنم ہستیوں میں سے ہیں جن پر مادرِ کالج کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ وہ علی گڑھ میگزین کے قیام و بقا میں ہمارے دست و بازو رہ چکے ہیں۔ وہ اب کالج کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رُوحِ رواں ہیں، لیکن ہمارے ارتباط اور موانست کی کڑیاں ایسی نہ تھیں جو بُعدِ مکانی کے ساتھ ساتھ نہ بڑھتیں! سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، لیکن

کسے کہ محرمِ بادِ صباست می داند
کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقیست

... جی۔ کے چسٹرٹن جس کے مضمون "ہوا اور درخت" کا ترجمہ ہم آج پیش کرتے ہیں، انگلستان کے ادبی حلقے میں یکتائے عصر مانا جاتا ہے ...

"ہمارے اصرار و التجا سے نہیں بلکہ تخویفِ مجرمانہ سے ذاکر صاحب نے اس مضمون کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ پچھلے روز نمازِ جمعہ کے بعد ہمارے پاس پہنچے، پسینے

میں تر، پیاس سے بے تاب اور پانو آبلوں سے مجروح! ہم ان کی کمزوریوں سے واقف تھے، اگر ابتدا ہماری طرف سے نہ ہوتی تو پھر ممدوح کو زیر کرلینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ ذیل کا مکالمہ ناظرین کے تفنن طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے:

"ذاکر صاحب، بس، دیکھیے اگر آج آپ یہاں سے بغیر کوئی مضمون لکھے ہوئے گئے، تو پھر یہ نہ کہیے گا کہ 'ابتدا' ہماری طرف سے ہوئی' اور اس کو خوب سمجھ لیجیے کہ آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے پر آیندہ سے آپ ایک چپراسی پائیں گے جو آپ کا سدِ راہ ہوگا۔ یہ جو آپ وقت بے وقت اُڑے چلے آتے ہیں' اور اس کے چند منٹ بعد کمرے میں خورد و نوش کی کوئی چیز نہیں رہ جاتی' تمام بستر پر قلبہ رانی ہوتی ہے اور ڈاکٹر اقبال کی کل نظمیں جو ہماری بدقسمتی سے آپ کو از بر ہیں زور زور سے پڑھی جاتی ہیں' اور لوئی کہنی کے طریقۂ علاج پر لیکچر دیتے ہوئے آج کل جی جٹسو کے داؤ پیچ کی کھینچ تان میں جو جناب منہمک رہتے ہیں وہ آخر کب تک برداشت کیے جائیں گے۔

"سر کو ایک طرف جھٹک کر 'ہنہ! اچھا پانی پلایئے' پنکھا دیجیے اور ہاں خلوئے معدہ میں پانی پینا مضر ہے' اطلاعاً عرض ہے۔' نوکر کو آواز دی 'مشیّت!'

"یہ کہہ کر چارپائی پر دراز ہوگئے اور 'دوش میگفتم...'[۱] کی ضرب لگائی ہی تھی کہ ہم نے سختی سے روکا۔

۱۔ یہ اقبال کی مشہور نظم 'شمع اور شاعر' کے پہلے مصرعے کے الفاظ ہیں' نظم میں شاعر شمع کو خطاب کرتا ہے۔ پہلا شعر یوں ہے:

دوش میگفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش
گیسوئے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ

اقبال نے یہ نظم فروری ۱۹۱۲ء میں لکھی تھی۔ شاعر کا خطاب فارسی میں ہے اور پانچ شعر ہیں۔ شمع کا جواب اُردو میں ہے اور اکیاسی شعر ہیں۔

"نہیں نہیں، یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ ان لغویات کو ترک کر رکھیں گے۔ آپ نے غالباً ہمارے پچھلے الفاظ کو کافی غور سے نہیں سُنا۔۔۔ دست و گریباں ہونے کی دیر تھی۔۔۔

"اچھا اچھا، میں تیار ہوں، بتائیے کیا کروں۔۔۔ میرا تمام پروگرام گڑبڑ ہو گیا، میں تو مسجد سے واپس جا رہا تھا، شامت اعمال، ادھر آ نکلا۔

"کیوں نہیں، بڑا احسان کیا، اور پھر یہ شامت اعمال جس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہو، اللہ کی شان، اسے بھی شکایت کا حق حاصل ہو۔ چسٹرٹن کا یہ مضمون لیجیے اور اس کا ترجمہ ابھی ابھی کر ڈالیے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس دوران میں ڈاکٹر اقبال یا کسی شاعر کا کلام جناب کی زبان پر رواں نہ ہو، اور نہ جناب اپنے 'پروگرام' کا کوئی تذکرہ کریں۔

"(بے بس ہو کر) لیکن تشنگی، گرمی اور گرسنگی،

"یہ سب کچھ نہیں، نصف ترجمہ کر لیجیے تو پیاس رفع کی جائے گی اور جب پورا ترجمہ ختم ہو جائے گا تو آپ کی گرسنگی کا علاج ہوگا۔ رہا گرمی کا سوال، یہ ہمارے آپ کے کسی کے بس کا نہیں۔۔۔ اچھا اب سوا کام شروع کر دینے کے اور کوئی سوال جواب نہ ہو ورنہ۔۔۔

"ترجمہ شروع ہوا، آدھ گھنٹے کے بعد 'اُف پانی!'

"کیوں شرط بھول گئے، ترجمہ کہاں تک ہوا؟

"جھنجھلا کر — 'نصف ہو گیا' بس پانی پلائیے ورنہ یہ دیکھیے، ترجمہ چاک ہو کر داخل دفتر ہوتا ہے! دونوں ہاتھ کی چٹکیوں میں کاغذ کے دونوں سرے تھے اور زبان پر 'اے سوار اشہب دوراں بیا'

"دیکھا تو نصف ترجمہ واقعی ختم ہو چکا تھا اور مسودہ بالکل صاف اور نستعلیق لکھا ہوا تھا۔ 'نہیں نہیں، یہ پانی حاضر ہے!'

"ایک پورا گلاس پی کر دوسرا گلاس طلب کیا۔ وہ بھی ختم ہوا تو پان کی

فرمایش ہوئی۔ پورا پان، چونا محض برائے گفتن، کتھا رہ چند، چھالیہ ایک کف دست، چار چھوٹی الائچیاں، منہ میں رکھا ہی تھا کہ غائب! پان کے چند باریک باریک سبز ٹکڑے رہ گئے تھے جنھیں ہلکے ہلکے تھوک دیا۔ اس کے بعد پھر ایک گلاس پانی کی فرمایش ہوئی۔

"آخر اب پانی کی کون تُک ہے ...

"ارے بھائی، پان کھانے کے بعد ہی پانی پی لینے سے منہ خوب میٹھا ہو جاتا ہے۔

"یہ لیجیے، پانی حاضر ہے، لیکن پھر کام شروع ہو جائے، ایک دو ... دوسرے نصف گھنٹے میں بقیہ ترجمہ بھی ختم ہو گیا ...

"یہ ہے اس ترجمے کی شان نزول،

"ناظرین اسے غور سے ملاحظہ فرمائیں اور ممدوح کے کمال کی داد دیں۔ یہ ترجمہ بالکل قلم برداشتہ ہوا ہے اور ایک گھنٹے میں پورا ہوا ہے۔ عبارت کی پاکیزگی، الفاظ کی در وبست، زبان کی صفائی، بیان کی شستگی، انگریزی کے اصلی مفہوم کو بہترین طریقے سے اُردو میں ادا کر دینا اور لفظی ترجمے کو ہاتھ سے نہ دینا، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم ذاکر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ارباب نظر کی باصرہ نوازی کے لیے اس دیباچے مشجر کو میگزین کے اوراق میں رکھ کر پیش کرتے ہیں۔"

جامعہ ملیہ کے پرانے کاغذات میں ذاکر صاحب کا نام ۱۴ر نومبر ۱۹۲۱ء کو اساتذہ کی فہرست میں نظر آتا ہے اور ۲۴ر جنوری ۱۹۲۲ء کو مجلس منتظمہ کے اراکین کی فہرست میں ... اور چونکہ وہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے افسر انچارج تھے، اسی لیے مجلس تعلیمی کے رُکن بھی تھے۔[1]

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۲۸

ذاکر صاحب کے پرانے ساتھیوں میں سعید انصاری صاحب مرحوم (م ۱۹۸۴ء) بھی تھے جو جنوری ۱۹۲۲ء میں جامعہ میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "جامعہ کی ابتدائی زندگی بڑی پُر کیف اور روح افزا تھی۔ چھوٹی سی جماعت تھی اور سب ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے... جس دارالاقامہ میں آکر ہم اُترے اس کا نام "بنگالی کوٹھی" تھا۔ اس کے ایک بڑے کمرے میں ذاکر صاحب اور ان کے دو چھوٹے بھائی یوسف صاحب اور محمود صاحب رہا کرتے تھے... اس تمام عرصے میں علاوہ باضابطہ تعلیم اور یہاں کی عام فضا کے جس چیز کا مجھ پر اثر ہوا، وہ ذاکر صاحب کی زندگی، محبت اور سلوک کا تھا۔ ذاکر صاحب کی زندگی اس زمانے میں مجھے ایک سربستہ راز نظر آتی تھی جو مبہم کسی خیال اور عمل کی کوشش میں رواں دواں رہتی ہے۔ میں انھیں اپنے ساتھیوں میں "جمال الدین افغانی" کہا کرتا تھا، جن کے حالات کا میں نے اس زمانے میں خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ ان کی زندگی میں مجھے ایک خاص کشش اور جذب محسوس ہوتا تھا جس کو میں اس شعر سے زیادہ اور کسی طرح بیان نہیں کرسکتا۔

نہ جانے حسن تھا یا عشق اتنا جانتے ہم تھے
ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی

"ذاکر صاحب کی صحبت سے مستفید ہونے کا تو شاذ ہی موقع ملتا۔ وہ ٹھہرے مصروف آدمی اور ہمیں اپنے پڑھنے لکھنے سے کام، لیکن سرِراہے جب کبھی مل جاتے تو کوئی اچھی بات بتا جاتے، کوئی ابھارنے والی بات کر جاتے۔ سلوک ایسا کہ ہمیشہ دلجوئی اور وابستگی کا خیال... ہم سب مل کر ایک قلمی پرچہ نکالتے تھے جس کا نام پہلے الرشید... پھر جوہر رکھا گیا... ذاکر صاحب کو جوہر کا نکلنا عزیز تھا۔ اس کے لیے ہر طرح کا مشورہ، اچھی اچھی خبریں اور مختلف طریقوں سے اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ مجلسِ تعلیمی کے جلسوں میں جب سالانہ امتحانات کے نتیجے پر غور ہوتا تو ذاکر صاحب سب سے پہلے کامیاب شدہ طلبہ کی ایک فہرست لاکر جوہر میں شائع

ہونے کے لیے دے جاتے۔ جوہر منتظمین جامعہ کی کسی امر کی طرف توجہ مبذول کراتا تو ذاکر صاحب سب سے زیادہ اس رائے کی قدر کرتے اور اس کی تعمیل کرا کے اراکین جوہر کا دل بڑھاتے۔ ایک آدھ بار طلبہ کے اس کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے تو ذاکر صاحب نے بیچ بچاؤ کرا کے آپس میں میل جول کرا دیا۔ ذاکر صاحب کی ان تمام باتوں کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔۔۔"[1]

غالباً اسی زمانے میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ پر سیاسی رنگ غالب تھا، سعید صاحب کو یہ محسوس ہوا ہوگا کہ ذاکر صاحب کی زندگی ایک راز سربستہ ہے اور وہ ہمہ وقت کسی خیال میں گم اور اپنے کام میں خاموشی سے مصروف رہتے ہیں۔ انھیں اس دور کے بہت سے خلافتی اور ترکِ موالاتی لیڈروں کا طور طریقہ پسند نہ آتا ہوگا، لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے، کسی سے کچھ کہتے نہیں تھے، اور یہی سیاسی لیڈر جامعہ کے چلانے والے تھے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر شاید حکیم اجمل خاں بھی اس وقت کچھ پیچھے ہٹ گئے تھے کہ وہ اس طرح کے مسلمان لیڈر نہ تھے جن کی اُس دور کی جذباتی سیاسی فضا میں مسلمانوں میں زیادہ مانگ اور مان دان تھی۔

ذاکر صاحب جیسے سنجیدہ، ذہین اور حساس نوجوان کو یہ خیال بھی بے چین اور مضطرب رکھتا ہوگا کہ ان کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کوئی سبیل نکالنی ہوگی۔ وہ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر مزید تعلیم کے لیے انھیں ہندوستان سے باہر جانے کا موقع مل جائے تو بہت اچھا ہو۔ ان کے ایک دوست تھے خواجہ عبدالحمید[2] جو الٰہ آباد یونی ورسٹی میں اپنی سائنس کی تعلیم چھوڑ کر قومی یونی ورسٹی یعنی جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے تھے، لیکن انھوں نے جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ

۱۔ سعید انصاری، "جامعہ ملیہ" جوہر (جامعہ جوبلی نمبر)، صفحات ۵۳-۵۲

۲۔ یہ وہی خواجہ عبدالحمید ہیں جن کی انگریزی دواؤں کی فرم سِپلا مشہور ہے۔

انھیں اپنی سائنس کی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے باہر جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھی ہندستان سے باہر جائیں، بلکہ ممکن ہو تو پہلے ذاکر صاحب جائیں، غالباً وہ سمجھتے ہوں گے، اور ہمارے خیال میں صحیح ہی سمجھتے ہوں گے کہ جب تک ذاکر صاحب کو اس کے لیے مجبور نہ کر دیا جائے گا، وہ باہر کے سفر کا خیال "ٹالتے" رہیں گے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ پاسپورٹ کا حاصل کرنا تھا۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ اس میں دقت ہو گی کیونکہ ان کی سامراج دشمنی بالکل واضح تھی، دوسری بات یہ تھی کہ اس زمانے میں اور اس سے بہت پہلے سے نیشنلسٹ ہندستانی نوجوان یورپ و امریکہ پہنچ رہے تھے جو وہاں کے لوگوں کو ہندستان پر سلطنت برطانیہ کے مظالم اور حقوقِ انسانی کی پامالی کی المناک داستان سناتے تھے، اور مختلف طریقوں سے ہندستان کی تحریک آزادی کے لیے ان کی اخلاقی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اے۔ جی۔ نورانی نے لکھا ہے کہ یوپی کے بورڈ آف ریونیو کے ایک انگریز افسر فری مینٹل نے جو ذاکر صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا اور اس پر متعجب تھا کہ انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کیوں نہیں کی، ان کے جیسے ذہین نوجوان کو تو بیرونِ ملک کی کسی مشہور یونی ورسٹی میں تعلیم کے لیے جانا چاہیے، اور ذاکر صاحب کے بتانے پر کہ پاسپورٹ حاصل کرنے میں کیا دشواریاں ہیں، ضلع علی گڑھ کے کلکٹر سے ان کی سفارش کی اور تھوڑے ہی دنوں میں انھیں پاسپورٹ مل گیا[1]۔ لیکن یہ صرف انگلستان ہی کے لیے تھا

دسمبر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید کی سترویں سالگرہ کے موقع پر گزرے

۱۔ اے۔ جی۔ نورانی، 'پریسیڈنٹ ذاکر حسین'، پاپولر پرکاشن، بمبئی، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۹ — نورانی نے اپنی اس روایت کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ خواجہ عبدالحمید نے یہ بات انھیں بتلائی ہو کہ وہ بمبئی ہی میں رہتے تھے۔

ہوئے واقعات کو یاد کرتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ میں آج جو کچھ ہوں ڈاکٹر عبدالمجید کی وجہ سے ہوں، ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ "انھوں نے میرا، میرے حال اور میرے مستقبل کا چارج اپنے ذمے لے لیا اور خود ہی یہ طے کیا کہ میں مزید تعلیم کے لیے جرمنی جاؤں۔ میرے اپنے موانع، میری اپنی مشکلات، میری سستی اور کاہلی کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے طے کر لیا تھا اور مجھے جانا تھا فرار کی کوئی صورت نہ تھی۔ انھوں نے میرا ٹکٹ خریدا اور میرے ساتھ بمبئی تک گئے، تاکہ انھیں یہ اطمینان رہے کہ میں بخیریت جہاز پر سوار ہو گیا۔ اور ان چند دنوں میں جب ہم دونوں بمبئی میں تھے، انھوں نے مجھے شائستہ معاشرت کی مبادیات سکھائیں کہ کیسے اور کس طرح کے لباس پہنے جائیں، کیسے چھری اور کانٹے سے کھانا کھائیں اور کس طرح یورپ کے ملکوں میں رہیں۔ ان کو مایوس نہ کرنے کے شریفانہ خیال سے میں نے وہ سب کچھ یاد رکھا جو انھوں نے مجھے سکھایا تھا، اور مجھے یقین ہے کہ میں تمام آزمائشوں سے بڑی حد تک کامیاب گزرا۔"[1]

ذاکر صاحب جرمنی میں

ذاکر صاحب کا جرمنی جانے کا خود اپنا ارادہ کب سے تھا، یہ نہیں معلوم، بمبئی میں وہ جہاز پر سوار تو ہو گئے لیکن پاسپورٹ ان کا صرف انگلستان کے لیے تھا اور ظاہر ہے کہ اس پر جرمنی کا ویزا نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے وہ ٹریسٹ کی بندرگاہ پر اُتر گئے، اور آسٹریا ہوتے ہوئے جرمنی پہنچے (ستمبر ۱۹۲۲ء) جہاں انھوں نے کسی طرح ٹورسٹ ویزا حاصل کیا۔ بعد میں جرمنی کے دفترِ امورِ خارجہ نے ویریندر ناتھ چٹوپادھیائے کی سفارش پر جو مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی تھے

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، 'President Zakir Husain's Speeches' پبلیکیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۸۶

اور جنھیں ان کے دوست چَٹو کہتے تھے، اس ویزا کی مدت میں توسیع کر دی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اساتذہ و طلبہ کو، بہر حال، یہ معلوم تھا کہ ذاکر صاحب انگلستان نہیں بلکہ معاشیات میں ڈاکٹریٹ کے لیے جرمنی جائیں گے۔ جولائی یا اگست ۱۹۲۲ء کے ہفتہ وار جوہر (قلمی)[1] میں ایک شذرہ لکھا گیا تھا جو اس طرح تھا: "ہمیں یہ سُن کر کمال افسوس ہوا کہ سلک گوہر سے ایک بیش بہا موتی نکل گیا۔ یعنی اسٹاف سے ہمارے مکرم جناب ذاکر حسین صاحب علاحدہ ہو رہے ہیں اور بغرض تعلیم معاشیات جرمنی جا رہے ہیں، یوں تو عام طور پر ہر شخص کو لیکن بالخصوص ہمیں سب سے زیادہ افسوس ہے کہ قدر شناسانِ جوہر میں سے سرے (؟) کا نام نکل گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تحصیل علم کا پاک مقصد لے کر جا رہے ہیں تو ہمارے دل میں مسرت و خوشی کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:

به سفر رفتنت مبارکباد
به سلامت روی و بازآئی"

برلن یونی ورسٹی میں ایک انسٹی ٹیوٹ آف فارینرز تھا۔ ذاکر صاحب نے برلن پہنچ کر سب سے پہلے، چَٹو کے مشورے سے، اس کے جرمن زبان کے کورس میں

۱۔ طلبائے جامعہ ملّیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے علمی و عملی کارناموں میں ایک مفید اور دلچسپ چیز ہفتہ وار قلمی اخبار بھی تھا۔ اس کی ابتدا الرشید کے نام سے ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی لیکن جنوری ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کے نام پر اس کا نام بدل کر جوہر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے تقریباً ایک سال کے منتخب مضامین کا مجموعہ انتخاب مضامین جوہر (لقیب جامعہ) کے عنوان سے، زیر اہتمام شعبۂ تصنیف و تالیف جامعہ ملّیہ اسلامیہ (علی گڑھ)، دسمبر ۱۹۲۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۲۳ء سے ماہنامہ جامعہ نکلنا شروع ہوا۔ ملاحظہ ہو انتخاب مضامین جوہر "التماس" اور صفحہ ۱۲۳۔

داخلہ لیا۔ ٹورسٹ ویزا کی توسیع میں بھی اس سے آسانی ہوئی ہوگی۔ ۱۹۲۳ء کے گرمیوں کے سمسٹر میں انھیں برلن یونی ورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کورس میں باضابطہ داخلہ مل گیا[1]۔

ذاکر صاحب ستمبر ۱۹۲۲ء میں جرمنی پہنچے تھے اور وہاں سے فروری ۱۹۲۶ء کے اوائل میں ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔ اس طرح کوئی سوا تین سال انھوں نے وطن سے دور جرمنی میں گزارے، لیکن پردیس میں زندگی کی یہ مدت ان کی ذہنی و علمی ترقی کے لیے کئی لحاظ سے بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی جب انھوں نے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر خواجہ عبدالمجید کی سترویں برسی کے موقع پر اپنی کتابِ زندگی کے کچھ پچھلے ورق اُلٹے تھے اور اپنے جرمنی کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آج جو کچھ ہوں اسی سفر کی وجہ سے ہوں[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنی میں ذاکر صاحب نے بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، اُس کے نقوش آیندہ صفحات میں اربابِ نظر کی نگاہوں کے سامنے رفتہ رفتہ اُبھریں گے، مجیب صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جرمنی میں ذاکر صاحب کو تعلیم و تمدن اور تہذیب و ثقافت کے تقریباً ہر پہلو سے دلچسپی تھی، اور اسی کو ہم ذاکر صاحب کی تعلیم و تربیت میں جرمنی کی خاص دین کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بلاشبہہ مجیب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ سند کا درجہ رکھتا ہے کہ وہ جرمنی میں اُن کے بہت قریب کے ساتھیوں میں تھے۔

آکسفرڈ سے برلن سب سے پہلے عابد صاحب اور پھر مجیب صاحب گئے تھے، اور ستمبر ۱۹۲۲ء میں جب ذاکر صاحب ہندستان سے پہنچے تو یہ دونوں حضرات

۱۔ ذاکر حسین، Die Agrarverfassung Britisch-Indiens, Beyer & Mann, 1930, p.139.

۲۔ اگرچہ اس بات کو انھوں نے ڈاکٹر حمید کی ان کوششوں کے ذکر کے پردے میں کیا تھا جو انھوں نے ان کے جرمنی جانے سے متعلق کی تھیں۔ ان کی اس تقریر کا ایک اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے۔

شہر کے مضافات میں شلاختن زی (Schlachtensee) کے مقام پر ہر شوانیر (Herr Schwanner) کے مکان میں ان کی فیملی کے ساتھ رہتے تھے اور اپنے رہنے اور کھانے کا خرچ دیتے تھے۔ عابد صاحب نے قریب ہی ذاکر صاحب کے لیے بھی ایک مکان تلاش کر لیا اور وہ اسی مکان میں رہنے لگے، مجیب صاحب نے شوانیر کے مکان ہی میں پہلی بار ذاکر صاحب کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک قد آور شخص ہے جسم اس کا گداز ہے، اور بال کسی قدر تابدار، داڑھی بڑی اچھی ترشی ہوئی، ایک مجسم پیکرِ حسن، لباس سے خوش سلیقگی نمایاں، آنکھیں ایسی کہ ساری توجہ اپنی طرف مرکوز رکھنے پر مُصر، بس یوں سمجھیے کہ بولتی ہوئی آنکھیں جن میں پُراسرار گہرائی ہو۔ وہ دیکھتے رہ گئے، بات کرنے کی نوبت بعد میں آئی۔ یوں تو اُن کا طرزِ تکلم جس میں ایک ہلکے سے تبسمِ دلنواز کی آمیزش ہوتی تھی، دلنشین تھا ہی اور سننے والوں پر جادو کا سا کام کرتا تھا، لیکن زبانِ حال سے وہ یہی کہتے محسوس ہوتے تھے کہ اگر ان کے خیالات و جذبات کو بہت کچھ اُن کی آنکھوں کی زبان ہی سے سمجھ لیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ اُن میں آدمیوں کو سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی اور بہت جلد اپنے مخاطب سے متعلق یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ احساس و جذبے کی زبان سمجھنے میں اس کے ذوق کی تربیت کہاں تک ہوئی ہے۔ موقع و محل کیا ہے اور صورتِ حال کا تقاضا کیا کہتا ہے، اس کی سمجھ بھی انھیں ایسی تھی کہ رشک آتا تھا۔

مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ ان سے مل کر اور ان کے ساتھ رہ کر اندازہ ہوا کہ اُن کی ذہنی قوت بے پناہ ہے، اور اُن کا دماغ ہمہ وقت نئی نئی باتیں سوچتا رہتا ہے، لیکن یہ بھی محسوس ہوا کہ روزمرّہ کے کاموں کے بارے میں ان میں کسی قدر آلکس بھی ہے، اور ایسے کاموں کے لیے انھیں ہمیشہ کسی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔ معمول کے کاموں میں غیر ضروری توجہ و محنت کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں اُٹھایئے، ایسے موقعوں پر بڑی سادگی سے اُن کی طرف سے بے بسی اور بیچارگی کا اظہار ہوتا تھا اور اُن کی یہ ادا اُن کی پوری شخصیت سے اس قدر بے میل سی لگتی تھی کہ لطف آجاتا

تھا، اور اُن جیسے سیدھے سادے لوگ اکثر اس کے اسیر ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتے کہ ذاکر صاحب جیسے حسین، قدآور اور پُر وقار شخص کو آخر کیوں اس کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص اُن کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دے اور جہاں وہ جائیں اُن کے ساتھ رہے۔ لیکن جلد ہی یہ پتا چل گیا کہ ان میں جرأت، اقدام کا حوصلہ اور مختلف قسم کے انسانوں اور صورتِ حال سے نپٹنے کی صلاحیت ان لوگوں سے بہت زیادہ ہے جو علانیہ اپنے آپ کو ان اوصاف کے حامل ہونے کا دعوا کرتے ہیں[1]۔

یہ پتا لگانا آسان نہیں ہے کہ جرمنی میں ذاکر صاحب نے کس چیز پر کب اور کتنی توجہ دی، کوئی منصوبہ بنا کر کچھ سیکھا یا یوں ہی جیسا موقع ہوا ویسا کیا، اس لیے کہ طبعاً وہ اس کے قائل تھے کہ جو بھی موقع میسر آئے اس کا بہتر سے بہتر استعمال کیا جائے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس ڈائری نہیں ہوتی تھی، اور اگر ہوتی بھی تو ضروری نہیں تھا کہ وہ اس میں اپنے شوق، اور اپنی مصروفیتوں کا اندراج پابندی سے کرتے رہتے۔ مجیب صاحب کا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ ضابطے کی منظم زندگی گزاریں، شاید اس میں ان کے علی گڑھ کے قیام اور وہاں کے مجلسی ماحول کا بھی کچھ دخل رہا ہو۔ لیکن یہ بات اُن کی نجی زندگی ہی تک محدود تھی۔ وہ دوسروں کی زندگی میں نظم و ضبط کی قدر اور تعریف کرتے تھے۔ بعد میں بھی ایک استاد اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے طالب علموں کی کلاسوں اور ہوسٹلوں میں، اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں زندگی میں نظم و ترتیب کی قدر و قیمت اور اہمیت پر بہت زور دیا، اور جامعہ کے ہر کام میں نظم، ترتیب اور تناسب سے ایسا حُسن پیدا کیا کہ یہ ادارہ تعلیم و تربیت کا ایک تاج محل تصور کیا جانے لگا۔

یہ جو بظاہر اس وقت مجیب صاحب کو ذاکر صاحب کی نجی زندگی میں ایک

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۳۲

بے ترتیبی سی نظر آئی، اس کی وجہ انھیں کے نزدیک یہ تھی کہ ذاکر صاحب کو اپنی آزادی پر کسی قسم کی پابندی سخت گراں گزرتی تھی۔ اُن سے اگر کوئی باشعور آدمی گفتگو کرتا تو پانچ منٹ کے اندر ہی اُسے یہ محسوس ہونے لگتا کہ ذاکر صاحب کے لیے آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ان کا ذہن اور تخیل بیک وقت مختلف سمتوں میں ایک خاص افق تک یا اس کے ماورا حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ذاکر صاحب نہ تو اپنی ذاتی سرگرمیوں کو کوئی ترتیب دے سکتے تھے اور نہ کوئی ڈائری رکھ سکتے تھے۔ ذہنی طور پر وہ ایک ہی وقت میں اتنی مختلف سمتوں میں "محوِ سفر" ہوتے تھے کہ وہ صرف آگے ہی کی طرف دیکھ سکتے تھے۔[1]

ذاکر صاحب کے شوق اور ذہنی سفر کی بوقلمونی کی ایک مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے جرمنی پہنچنے کے بعد آٹھ مہینے کے اندر اندر برلن کے کاویانی پریس سے دیوانِ غالب کا وہ دیدہ زیب پاکٹ اڈیشن شائع کیا جو آج بھی اُس کے لیے جس کے پاس یہ ہے، آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور ہے۔[2]

برلن کے کاویانی پریس کو جو علوم فارسی جدیدہ اور علوم شرقیہ کی خدمت کے لیے اس وقت بہت مشہور تھا اور جس کا فارسی ٹائپ بہت خوبصورت تھا، تقی زادہ نے قائم کیا تھا، اس کے منیجر غنی زادہ تھے جن سے ذاکر صاحب کے ذاتی تعلقات ہو گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں کمپوزنگ سیکھنا چاہتا ہوں۔ غنی زادہ نے کہا کہ یہ کیا مشکل

۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۳۳

۲۔ ذاکر صاحب ستمبر ۱۹۲۲ء میں جرمنی پہنچے تھے۔ اپریل ۱۹۲۳ء کے رسالہ جامعہ میں دیوانِ غالب کے اس اڈیشن کا اشتہار ان الفاظ میں موجود ہے: "مطبع کاویانی برلن ۔۔۔ ہمارے لیے دیوانِ غالب (پاکٹ اڈیشن) کمال صحت و عمدگی کے ساتھ طبع کر رہا ہے جو اس ماہ کے آخر تک وصول ہو جائے گا، اور سوائے مکتبہ جامعہ کے دوسری جگہ نہیں مل سکے گا، نہایت خوشنما جلد اور نفیس کاغذ و طباعت۔"

ہے، پریس حاضر ہے'، اب انھوں نے مطبع شرکت کاویانی میں کمپوزنگ سیکھنی شروع کی اور جب اپنے منصوبے کی ضرورت کی حد تک مشق بہم پہنچالی تو دیوانِ غالب کی کمپوزنگ کے کام میں مطبع کی مدد کی اور اسے وہیں سے شائع کیا۔ اس کی جلد بندی پر بھی انھوں نے بڑی توجہ کی اور بہترین جلد سازی کی ایک فرم کے مالک سے رابطہ قائم کیا۔ "یہ دیوان (اردو) چھوٹے سائز پر ہے۔ کاغذ نہایت اعلا درجے کا لگایا گیا ہے۔ بیل دار جدول اور دورنگی چھپائی نے اسے نہایت دیدہ زیب بنادیا ہے، ایسا کہ اس شان کا دیوانِ غالب اس سے پہلے کہیں نہیں چھپا تھا۔ اس کی جلد بھی نہایت خوبصورت اور پاکیزہ ہے۔ جلد میں ایسی نرمی ہے کہ چھوؤ تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے اندر نرم اور نازک ننھے ننھے پتلے پتلے گدوں کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ غالب کی جو تصویر دی گئی ہے وہ لائپزگ کے ایک مشہور مصور نے بنائی تھی۔ 'اردوئے معلّیٰ' اور 'یادگارِ غالب' میں غالب کے چہرے بشرے کے متعلق جو معلومات ملیں وہ ذاکر میاں نے جرمن مصور کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرادی تھیں۔ اس نے ان کی بنا پر غالب کی شخصیت کا جو تصور قائم کیا اسے اپنی تصویر میں خطوط اور رنگوں کے لطیف امتزاج سے پیش کردیا۔ اسے یقیناً مصور کا کمال کہنا چاہیے کہ اس نے غالب کی شخصیت کے جوہر کو صحیح سمجھا اور موئے قلم سے اسے زندۂ جاوید بنادیا۔ اب غالب کی یہ خیالی تصویر اپنے فنی کمال کے باعث اصلی خیال کی جاتی ہے۔۔"[1]

دیوانِ غالب کے اس اڈیشن کی تیاری میں جو سرمایہ لگا اس میں ذاکر صاحب کے ساتھ عابد صاحب اور مجیب صاحب بھی شریک تھے۔ ان میں سے کسی کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ اس دیوان کی اشاعت کا منصوبہ بنایا جاتا۔ مگر شوق تو ہر رنگ میں سروسامان کا رقیب ہوتا ہے، ذاکر صاحب نے اس کام میں تقریباً اپنی ساری پونجی اور عابد صاحب اور مجیب صاحب سے جس قدر وہ لے سکتے تھے، وہ سب کچھ

۱۔ یوسف حسین خاں، حوالۂ سابق، صفحات ۹۲-۹۳

لگا دیا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ان دوستوں کو یقین دلایا تھا کہ غالب کے مطبوعہ دیوان کا یہ نسخہ جیسے ہی ہندستان پہنچا، مکتبہ جامعہ کے ذریعے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گا، ہماری رقم ہمیں واپس مل جائے گی اور مکتبہ کا بھی خاصا فائدہ ہو گا۔ بہرحال، رقم کی واپسی کے لیے ان لوگوں کو خاصا انتظار اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ذاکر صاحب مالی مشکلات سے گھبرانے والے نہ تھے، ابھی ان لوگوں نے مکتبہ جامعہ سے اپنی رقم واپس پائی ہی تھی کہ انھوں نے ایک دوسرا دشوار تر منصوبہ اپنے ان دوستوں کے سامنے پیش کر دیا، اور وہ تھا گاندھی جی پر جرمن زبان میں ایک کتاب کی اشاعت کا۔

ہر شوانیر جن کے ساتھ وہ رہتے تھے پرائمری اسکول کے اساتذہ کے لیے ایک رسالہ نکالتے تھے، اور ان کے ہونے والے داماد ڈاکٹر ایرن ترائش (Dr. Ehrentriech) جو اچھی انگریزی جانتے تھے ان کے ساتھ اس رسالے میں کام کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ گاندھی جی پر جرمن زبان میں ایک کتاب شائع کی جائے، چنانچہ انھوں نے اور ڈاکٹر ایرن ترائش نے مل کر اس کا مسودہ تیار کیا، اور پھر کتاب چھاپ دی گئی جس کا نام تھا 'Die Botschaft des Mahatma Gandhi'۔ اس زمانے میں جرمنی کی معاشی حالت بہت خراب تھی اور قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ گاندھی جی پر کتاب چھپ تو گئی لیکن اس طرح کہ ذاکر صاحب اور ان کے دوستوں (عابد صاحب اور مجیب صاحب) کی جو رقم اس میں لگی تھی، وہ سب ڈوب گئی، کیونکہ کتاب کے ناشروں سے اپنے لگائے ہوئے سرمایے کی واپسی کا کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔ ناشروں نے یہ سمجھا کہ چونکہ وہ ذاکر صاحب کے دوست ہیں، ان کی مالی پریشانیوں سے متاثر ہو کر ان کے دوست نے کتاب کی طباعت کے سلسلے میں انھیں عطیہ دیا ہو گا اور ذاکر صاحب نے اپنی طبعی شرافت کی بنا پر یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ان کی یہ غلط فہمی دور کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُدھر جرمن پریس میں اس کتاب کا خیر مقدم کیا گیا اور یہ کتاب

علمی و سیاسی دونوں حلقوں میں مقبول ہوئی۔

ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کا سفر

شروع ہی سے ذاکر صاحب کا یہ محبوب مشغلہ تھا کہ مختلف موضوعات اور مختلف چیزوں سے متعلق معلومات فراہم کریں، علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں بھی جب وہ اکثر ہوسٹل میں اپنے کمرے سے غائب رہتے تھے، اور یہ غیبوبت ہنگامی حالات میں تو دو دو، تین تین دن کی ہو جاتی تھی، تو کمرے کے ساتھیوں کے پوچھنے پر کہ "ذاکر صاحب، آپ کہاں رہے" ان کا جواب یہی ہوتا کہ "معلومات فراہم کر رہا تھا"، چنانچہ جرمنی میں بھی اس مصرع کے مصداق کہ

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت

ان کا یہ محبوب مشغلہ جاری رہا۔ انھیں معلومات فراہم کرنے کی حد تک ہر چیز سے دلچسپی تھی، چنانچہ جب سویڈن کے ایک شخص پٹیرسن سے جو کچھ دنوں کے لیے شوانیر خاندان کے مہمان تھے اور ڈنمارک اور سویڈن میں مویشیوں کی دیکھ بھال اور ڈیری فارم کے کام میں خاصا دخل رکھتے تھے، ذاکر صاحب کی گفتگو ہوئی تو انھیں اس موضوع سے بھی دلچسپی ہو گئی، اور انھوں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ پٹیرسن کے ساتھ اسکینڈی نے وین ملکوں کا دورہ کیا جائے، دونوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس مہم پر کیا خرچ آئے گا اور اس کا انتظام کیسے کیا جائے گا۔ دونوں ہی ہرچہ بادا باد کہہ کر اقدام کرنے اور مہم پر نکل جانے والی طبیعت رکھتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ذاکر صاحب پٹیرسن کے ساتھ ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے، افسوس کہ ذاکر صاحب کو ڈائری لکھنے کی عادت نہ تھی، اور نہ کسی اور ذریعے سے اس سفر کی تفصیلات مل سکیں جو یقیناً نہایت دلچسپ ہوں گی۔ بس صرف مجیب صاحب کی کتاب سے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ جب وہ اسٹاک ہوم میں تھے تو پتا چلا کہ جس ہوٹل میں وہ مقیم ہیں اس کا بل ادا کرنے کے لیے ان لوگوں

کے پاس پیسے نہیں ہیں. اتفاق کی خوبی دیکھیے کہ پیٹرسن کو خیال آیا کہ اگر ذاکر صاحب گاندھی جی پر ایک مضمون لکھ دیں تو شاید کوئی اخبار اسے شائع کرنے کے لیے تیار ہوجائے. ذاکر صاحب نے ایک طویل مضمون لکھا' پیٹرسن نے اس کا ترجمہ کیا اور ایک اخبار نے ذاکر صاحب کی تصویر کے ساتھ اسے شائع بھی کر دیا. اخبار نے اس مضمون کا جو معاوضہ دیا وہ اتنا تھا کہ اس سے انھوں نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور بخیریت جرمنی بھی واپس پہنچ گئے. اس اخبار کی ایک کاپی ذاکر صاحب نے مجیب صاحب کو دی تھی جو برسوں ان کے پاس رہی' پھر وہ نہ ملی![1]

ذاکر صاحب کو تہذیب اور سیاست کے اہم مسائل سے دلچسپی اور ان کی نظر اُن رجحانات پر گہری تھی جو اُس وقت کے تاریخی و معاشی عوامل کے سبب جرمنی اور جرمنی کے باہر دوسرے مغربی ملکوں کے علمی و سیاسی حلقوں میں زیر بحث رہتے تھے' اگر جرمنی میں پیسوں کی کمی کا ان پر اتنا ہی دباؤ ہوتا جتنا کہ اسٹاک ہوم میں پڑا تھا' تو شاید وہ جرمنی کے اخباروں کے لیے بھی مضامین لکھتے اور یقیناً ان کا معیار ایک عام صحافتی مضمون سے کہیں زیادہ بلند ہوتا. ہندستان کی آزادی اور گاندھی جی کی شخصیت اور افکار پر انھوں نے جرمنی کے مختلف شہروں میں جو تقریریں کیں وہ بہت پسند کی گئیں. اس زمانے میں جرمنی کے لوگوں کو ہندستان سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی' ذاکر صاحب نے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے ملنے والوں سے اپنی نجی گفتگوؤں اور اگر کہیں تقریر کا موقع ہوا تو اپنی تقریروں میں وہ جرمنوں کو ہندستان کی قومی تحریک' اس کے مقاصد اور اس کے ممتاز رہنماؤں' خصوصاً گاندھی جی سے متعلق بڑے موثر انداز میں واقف کراتے تھے' "مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر اپنی تقریر میں انھوں نے جرمنی کے لوگوں کو اُن نئی طاقتوں کے سامنے ہمت ہار دینے اور جھک جانے کے خطرے سے آگاہ کیا تھا جن سے

---

۱. محمد مجیب' حوالہ سابق' صفحہ ۳۴

اُن کے اپنے کلچر کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاسکتی تھیں۔ اس تقریر کو سُن کر ایک جرمن تاجر نے ذاکر صاحب کو ان باتوں کے لیے جو انھوں نے اس موضوع پر کہی تھیں، شکریہ کا خط لکھا اور یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ ان کی یا ان کے ملک کی کس شکل میں کیا خدمت کرسکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے وہ خط پڑھا تھا اور یہ بھی پوچھا تھا کہ اس کا کیا جواب لکھا جائے۔ اس پر اُن کا ردِعمل شانوں کی ایک بے پروا جنبش تھی جس کا مطلب تھا کہ اس معاملے کو آگے نہ بڑھایا جائے۔[1]

جرمنی سے بھیجی ہوئی چند تحریریں

ذاکر صاحب نے رسالہ جامعہ میں چھپنے کے لیے کئی مکتوب، مضامین اور دوسروں کے مضامین کے ترجمے بھجوائے، مثلاً اپنے ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں جرمنی میں چیزوں کی قیمت اور جرمن مارک کے نرخ مبادلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا: "... آپ لوگ پانیر میں نرخ مبادلہ پڑھ کر یہاں کے اخراجات کے گھٹنے بڑھنے پر ذرا جلد حکم نہ لگائیں۔ یہاں کی معاشی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہے کہ چند روز قبل بھی کوئی صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن اس تمام گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ یہاں خرچ زیادہ ہے۔ بہت بڑھنے پر بھی یہاں جتنے مصارف ہیں ان میں یہاں کی سی تعلیم دراصل کوڑیوں کے مول ہے۔ مثلاً سنیے کہ اس گرانی اور مبادلے کے اُتار چڑھاؤ کا اثر مجھ پر کیا پڑا۔ نومبر میں ہمارے فیملی (جس خاندان میں آج کل میرا قیام ہے) والوں نے رہنے اور کھانے کے لیے ہم سے ایک پونڈ (۱۵ روپیا) فی کس وصول کیا تھا، گرانی جو ہوئی اور قیمتیں دوگنی سہ گنی ہوگئیں تو اس مہینے میں دو پونڈ (۳۰ روپیا) کا مطالبہ ہے۔ لیکن یورپ میں رہنے اور کھانے پر اگر ۳۰ روپے ماہوار صرف ہوگئے تو کون بہت ہیں۔ میں یاد کرتا ہوں کہ آتے وقت بمبئی میں ہوٹل والے کو محض

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۳۵

قیام کے لیے ۵ روز میں پندرہ روپے دینے پڑے تھے تو کس قدر تعجب ہوتا ہوں...

"میں جزویات میں پڑے بغیر یہاں کے مصارف کے متعلق اپنی رائے بتا دوں تو بہتر ہے۔ میری رائے میں ہر شخص جو یہاں آئے اسے ۶ پونڈ (۹۰ روپے) ماہانہ کا انتظام یقیناً کر لینا چاہیے... یہاں یہ مصارف ادبی تعلیم کے لیے ہیں، صنعتی تعلیم کے لیے آئندہ خط میں لکھوں گا۔"[۱]

۱۷ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط میں ذاکر صاحب نے جرمنی میں صنعتی تعلیم کو مقابلتاً گراں بتایا تھا اور یہ لکھا تھا کہ "صنعتی تعلیم کی فیس پونڈ اور ڈالر میں مقرر ہو گئی ہے" اور یہ کہ "جرمنی میں صنعت کی تعلیم کے لیے بہترین انتظام یہاں کے ٹکنیکل ہائی اسکول میں ہوتا ہے، یہ دراصل یہاں کی صنعتی یونی ورسٹیاں ہیں۔" اس کے بعد انھوں نے یونی ورسٹی کی تعلیم سے متعلق جسے وہ خود بھی حاصل کر رہے تھے، تفصیل سے بتایا تھا اور لکھا تھا:

"یہاں یونی ورسٹی میں علوم کی صرف ایک ڈگری ہے، یعنی پی ایچ ڈی۔ اس کے لیے یونی ورسٹی میں اوسطاً ۳ سال قیام ضروری ہے، اگرچہ یہاں کی یونی ورسٹیوں میں یہ مدت کی قید اس قدر سخت نہیں جتنی کہ انگلستان میں ہے۔ اساتذہ کے اختیارات زیادہ ہیں اور ان کی سفارش پر اس مدت میں تخفیف بھی ہو جاتی ہے، لیکن صرف اس وقت کہ طالب علم نے اپنے مضمون پر کوئی تصنیف تیار کر لی ہو اور استاد اس سے مطمئن ہو۔ امتحان کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک خاص مضمون منتخب کر کے اپنے استاد کی زیر نگرانی اس پر ایک محققانہ تصنیف کرنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ دو مضمون اور پڑھنے ہوتے ہیں جن میں سے ایک فلسفہ ہے۔ ان دو مضامین کا معیار بہت بلند نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آسان نہیں ہیں۔ 'تصنیف' کے موضوع پر عالمانہ اور محققانہ مطالعہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ امید کرنا کہ اس

---

[۱] جامعہ، جلد ۱ نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۳ء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ، صفحات ۴۸-۴۷

تین سال کی مدت میں تحقیق بآسانی ممکن ہے، غلط ہوگا... بعض حضرات دریافت کرتے ہیں کہ (داخلے کے لیے) جرمن زبان کی شرط ہے یا نہیں؟ جناب، یہ ہندستان نہیں جہاں کی تعلیم میں سب شرطیں ہیں، صرف ہندستانی جاننا شرط نہیں، یہاں تمام لکچر جرمن میں ہوتے ہیں، 'تصنیف' جرمن زبان میں ہوتی ہے، حوالے کی کتابوں کا تقریباً سارا ذخیرہ جرمن میں ہے، پھر جرمن زبان کی شرط نہ ہونا کیا معنی؟

"یہ مقام مسرت ہے کہ اب ہندستانی بھی جرمنی آنے کا خیال کر رہے ہیں، لیکن بس دعا یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں آنے کا قصد کریں جن کے خیالات اور ذہن کی نشو و نما اگر تکمیل نہیں تو تقریباً مکمل ہو چکی ہو۔ ہر شخص کا یہاں آنا ممکن ہے کہ اس کے لیے واپسی پر کچھ کما لینے کا ذریعہ ہو جائے، لیکن قومی اور ملکی حیثیت سے گویا ان کا ہاتھ سے بالکل نکل جانا ہے۔ میں جس وقت یہ لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ان کثیر التعداد ہندستانی نوجوانوں کی شکلیں ہیں جو جرمنی میں صرف اپنا پیسا اور وقت ہی نہیں برباد کر رہے ہیں، بلکہ اپنی حرکتوں سے اپنے اخلاق کو ہمیشہ کے لیے فنا اور اپنے ملک کی آبرو ریزی کر رہے ہیں..."[1]

اسی خط میں کسی "مولانا صاحب" کے جرمنی جانے کے قصد کا اشارہ ملتا ہے۔ افسوس کہ اب ذاکر صاحب کے اُس وقت کے ایسے ساتھیوں میں کوئی بھی جو ان "مولانا صاحب" کے حدود اربعہ پر کچھ روشنی ڈال سکتا، زندہ نہیں رہا۔ لیکن ہمیں اس سے کیا! کوئی بھی ہو، بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ کوئی بزرگ تھے جن کے دل میں ہندستان سے باہر "تبلیغ اسلام" کا جوش رہ رہ کر پیدا ہوتا ہوگا۔ کسی سے ذاکر صاحب کو اس کی اطلاع ملی ہوگی کہ حضرت والا اس نیک کام کے لیے جرمنی جانا چاہتے ہیں، اب انھوں نے اس سے متعلق اس خط میں اپنے ردعمل کا اظہار جس اسلوب میں کیا وہ وہی تھا جو ایسے موقع پر برجستہ ان کے نوک قلم پر پہنچتے تلے الفاظ اور

۱۔ ایضاً۔ صفحات ۵۰-۴۹

پُرعظمت ترکیب کا جامہ پہن لیتا اور جریدۂ نثرِ اردو پر ثبت ہو جاتا۔ شاید یہ اسلوب انھیں پر ختم ہو گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا صاحب کی تشریف آوری کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی اور نہ ان کے یا دیگر مبلغین کے ورود و مسعود میں مجھے زیادہ دلچسپی ہے۔ ہاں، یہ خبریں سُن کر دل ہی دل میں کڑھتا ہوں۔ بھلا جن کے گرد و پیش اور بہت ہی قریب کفر و ضلالت کی کالی سے کالی گھٹائیں چھائی ہوں اور جن کے پیر تلے کی زمین کا ہر ذرہ تعلیمِ حق کا پیاسا ہو وہ کیوں ہزاروں میل کا سفر کر کے اس مظلوم اور پریشان ملک ہی کو اپنی تجلی گاہ بنانے پر مصر ہیں؟ یہاں کا کفر نہ معلوم ان لوگوں کے لیے کیوں اتنی کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں پچھلے دو تین جملے لکھ کر سوچنے لگا کہ آپ ان سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس معاملے پر میں ایک دُکھے ہوئے دل کی سی آواز دیتا ہوں۔ یہ خیال صحیح ہوگا۔ میں جب ہندستان سے چلا تھا تو یہ سوچ کر چلا تھا کہ بالکل طالب علمانہ زندگی کے چند سال گزار کر اپنے ملک کو واپس آجاؤں گا۔ یہاں آکر میرا یہ خیال اور پختہ ہو گیا۔ یہاں میں نے 'مبلغین اسلام' اور مجاہدین فی سبیل اللہ بھی دیکھے اور ملکی معاملات میں سخت سے سخت انقلاب پسند حضرات کو بھی دیکھا، لیکن جسے چکھا کڑوا پایا۔ سب اپنی اپنی دال روٹی کی فکر میں ہیں، کوئی تبلیغ کے نام سے روپیا وصول کرتا ہے، کوئی روس سے مدد کی فکر میں ہے، کوئی ان ترکیبوں میں ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس سے کچھ وصول کرے، کوئی کچھ کرتا ہے کوئی کچھ، بیشک خدا کی صفتِ عفو اس کی قہاری سے زیادہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے نام سے یہ سب کچھ کرنے دیتا ہے۔ تھوڑے ہی دن میں سب کا حال معلوم ہو گیا۔ اب میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف ہوں۔ کبھی کبھی فرصت کے وقت اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھ لیتا ہوں:

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر[۱]

۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۵

بچپن ہی میں ذاکر صاحب کی اپنی خواہش یہ تھی کہ وہ استاد بنیں اور وہ استاد بن بھی گئے اور اس کی وجہ سے انھیں زندگی میں وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوا جو ایک مہذب و محنت مند سماج میں ایک سچّے اور بڑے معلم کا ہونا چاہیے: بچپن کی یہ سادہ آرزو اگر پوری نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بھائی کی خواہش کے مطابق انجنیر یا ڈاکٹر بن جاتے یا اپنے چچا کی خواہش کے احترام میں اپنے والد مرحوم کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو یہ کہا جاتا کہ اُن کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین کی جادو بھری شخصیت نے ان کو اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ وہ بھی انھیں کی طرح ایک اچھا استاد بننے کی آرزو کرنے لگے تھے' یعنی یہ کہا جاتا کہ ذاکر صاحب کی بچپن کی یہ آرزو ان کے اپنے فطری میلان کی پکار نہ تھی' یا' اگر اسے مذہبی لوگوں کے محاورے میں کہیں' اُن کی یہ آرزو وہ آرزو نہ تھی جس کا فیصلہ عالمِ غیب میں ہوتا ہے اور جو پہلے بچپن میں ایک طفلانہ خواہش کے روپ میں نئی کونپلوں کی طرح جنم لیتی ہے' پھر مناسب حالات و واقعات سے اس کی آبیاری ہوتی ہے' اور آخر میں وہی ساری زندگی کی تڑپ اور وہ عظیم مقصد بن جاتی ہے جسے اقبال نے 'مقصدے از آسماں بالاترے' کہا ہے۔

ایسا واقعی محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ ذاکر صاحب استاد بنیں۔ ۱۹۱۷ء میں جب وہ بی اے کے طالب ہیں' ان کے دل میں کچھ لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے' دوستوں سے وہ موضوعات پوچھتے ہیں' جب کوئی ان کی مدد کو نہیں آتا تو وہ افلاطون کی ریپبلک کا ترجمہ شروع کر دیتے ہیں' سوال یہ ہے کہ آخر یہ افلاطون کی ریپبلک کا انتخاب کیوں! محض حسنِ اتفاق یا اُن کی آیندہ زندگی کے نقشے کا ایک ابتدائی خاکہ بن رہا ہے؟ پھر اپریل ۱۹۲۰ء کا ان کا مضمون 'ابدیت یا کھلونا'[۱] جس میں علی گڑھ کے ابیرداتا' کی مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کی تحریک کی جزوی کامیابی پر

۱۔ اس مضمون کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

ایک مختصر معروضی تبصرے کے پردے میں نوجوان مضمون نگار کے ابھرتے ہوئے تعلیمی فکر کی جھلکیاں صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ضیاءالدین پرنسپل ایم اے او کالج انھیں جزووقتی لکچرر مقرر کرتے ہیں، اکتوبر ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کے جلو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوتی ہے اور وہ باضابطہ کل وقتی اُستاد بن جاتے ہیں، اور پھر وہ اعلا تعلیم کے لیے جرمنی جاتے ہیں جہاں وہ معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے مطالعہ ومحنت کے ساتھ ساتھ اسی قدر شوق اور توجہ سے اُن تعلیمی افکار اور تعلیمی تجربوں کا مطالعہ ومشاہدہ بھی کرتے ہیں جو اس وقت یورپ اور خاص طور پر جرمنی کی تعمیر نو کی جدوجہد میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ کیا یہ سب محض اتفاقات کا ایک سلسلہ تھا جو اپنے آپ ظہور پذیر ہو رہے تھے؟

ذاکر صاحب کو جہاں فرد کی اہمیت کا احساس تھا وہیں وہ اس حقیقت کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے کہ فرد کے جوہر ایک متوازن اور صحت مند ہئیت اجتماعی ہی میں کھلتے ہیں۔ جرمنی میں معاشیات کے علاوہ تعلیم وسماج کے ربط باہمی سے متعلق مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے افکار بھی ان کے زیر مطالعہ رہے۔ اپریل ۱۹۲۳ء کے رسالہ جامعہ میں برٹرنڈ رسل کی کتاب ہئیت اجتماعی کی تعمیر نو کے آخری باب سے بعض اقتباسات کا ترجمہ "راہ عمل" کے عنوان سے چھپا تھا۔ یہ ترجمہ ذاکر صاحب نے برلن سے بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت برٹرنڈ رسل کے سماجیاتی اور تعلیمی افکار اُن کے زیر مطالعہ تھے، اس لیے کہ جولائی ۱۹۲۳ء کے شمارے میں اُن کا ایک اور ترجمہ "تعلیم و آزادیٔ فکر" کے عنوان سے شائع ہوا۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح شعروں کے انتخاب سے دلوں کا معاملہ کھلتا ہے، اسی طرح نثری تحریروں کے انتخاب سے ذہنی رجحان کی غمازی ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کے مذکورہ دونوں ترجموں سے ذیل میں کچھ اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ اپنے قیام جرمنی کے اوائل ہی میں ذاکر صاحب کو خود اپنی اس 'تقدیر' کا کچھ

احساس ہو چلا تھا۔ شاید مشیت الٰہی یہی تھی کہ وہ علم کی زندگی گزاریں، ایک مفکر معلم کی طرح اپنے ملک میں درس و تدریس اور تعلیم کی فکری اساس کے موضوع سے متعلق کچھ نئے خیالات پیش کریں اور نئے تعلیمی تجربے کریں۔

ذاکر صاحب نے 'راہِ عمل' کے آغاز میں برٹرنڈ رسل کی دو کتابوں Principles of Social Reconstruction اور Roads to Freedon کا مختصر تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اپنی ان دو کتابوں میں "جو خیالات مصنف موصوف نے ظاہر کیے ہیں اور ان کا جو اثر عام دماغی رجحانات پر ہوا ہے، اس کی بنا پر انھیں تعمیرِ نو کا اخلاقی راہنما کہنا بیجا نہ ہوگا۔" اب "راہِ عمل" سے اقتباس ملاحظہ ہوں :

"زندگی بخش اور حیات پرور خیالات رکھنے والوں کی آخری قوت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی سیاست حاضرہ کی نامعقولیت کے شکار انسانوں کو معلوم ہوتی ہے۔ ۔ ۔ خیال کی قوت بالآخر تمام انسانی قوتوں سے بڑی ہے اور جن لوگوں میں صلاحیت فکر اور انسانی ضرورتوں کے مطابق فکر کے لیے تخیل موجود ہے وہ غالباً کبھی نہ کبھی اپنا مقصد ضرور حاصل کرلیں گے۔ ۔ ۔"

"حیات انفرادی کی وحدت چاہتی ہے کہ فرد میں جو کوئی تخلیقی ہیجانات ہوں وہ اس کی زندگی میں پائے جائیں، اور اس کی تعلیم و تربیت ان ہیجانات کی حفاظت کرے اور انھیں اُبھارے۔ جماعتی زندگی کی وحدت کے لیے ضرورت ہے کہ مختلف افراد کے مختلف تخلیقی ہیجانات مل کر سب ایک مشترک زندگی، اور ایک مشترک غرض (جس کا محسوس ہونا ضروری نہیں) کی طرف مائل ہوں جس سے جماعت کے ہر فرد کو اپنی ذاتی تکمیل میں مدد ملے۔"

"دنیا کو ایک ایسے فلسفے یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو، لیکن افزونیِ حیات کے لیے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو وہ حیوانی زندگی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی قدرِ انسانی نہیں ... اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیے جو کسی نہ کسی معنی میں اس سے خارجی ہو؛ کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخصی ہو، مثلاً اللہ، حق، یا جمال۔ جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گزارتے، ان کی نظر ہوتی ہے ... وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر ... اس عالم ازلی سے لگاؤ ـــــ خواہ یہ ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ ہو ـــــ اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور اپنے ہمرکاب ایک ایسا امن وسکون لاتا ہے کہ ہماری دُنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتاً فنا نہیں کرسکتیں۔ حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصور ہے جسے اسپی نوزا خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے۔ جنھوں نے ایک مرتبہ اسے جان لیا، ان کے لیے یہ ہمیشہ کلید گنج عرفاں ہے ..."

"تعلیم اور آزادیِ فکر" پر ذاکر صاحب کا نوٹ ہے: "ہم ذیل میں مسئلۂ تعلیم پر موصوف (برٹرنڈ رسل) کے خیالات کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً اس مسئلے پر دیگر حکمائے فرنگ کے افکار پیش کرتے رہیں گے کہ ان سے آگہی ہمارے پیچیدہ مسئلۂ تعلیمی کے صحیح حل کے لیے از بس ضروری ہے۔"

"تعلیم میں ایک حد تک تسلط اور اقتدار ناگزیر ہے۔ ہاں، معلموں کو

اس تسلط کے استعمال کا ایک ایسا راستہ دریافت کرنا ہے جو حریت کے منشاء کے مطابق ہو۔ جہاں تسلط ناگزیر ہو وہاں ضرورت ہوتی ہے حرمت و تکریم کی۔ جو شخص بچوں کو در اصل اچھی تعلیم دینا چاہتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہنچانے کا آرزومند ہے، اسے اس جذبۂ تکریم سے لبریز ہونا چاہیے۔..."

"ہمارے مدارس میں ڈسپلن اور ضبط نفس پر جو اصرار پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک عیب ہے۔ ضبط نفس کی ایک قسم ہے جو ہر حصول مقصد کے لیے لازمی ہے لیکن یہ پسندیدہ قسم خود اندر سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بعید مقصد کے لیے استقلال کے ساتھ کوشش کرنے اور اس کی راہ میں بہت سی چیزیں ترک کرنے اور بہت سے مصائب برداشت کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ہیجانات کو ارادہ کا ماتحت کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے مہتم بالشان تخلیقی آرزوؤں سے عمل کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے... اس ضبط کے بغیر کوئی حوصلہ، اچھا ہو یا برا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضبط خود اپنے ارادے سے پیدا ہوتا ہے نہ کسی خارجی جبر سے..."

ذاکر صاحب اور کیرشن اشٹائنر کے تعلیمی خیالات

فلسفۂ تعلیم سے ذاکر صاحب کی دلچسپی اتنی گہری تھی کہ کبھی کبھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے انھوں نے جرمنی کا سفر جدید تعلیمی افکار اور تعلیمی تجربوں سے متعارف ہونے ہی کے لیے کیا تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اُن کی ملاقات کیرشن اشٹائنر (Kerschensteiner) سے ہوئی تھی یا نہیں، لیکن انھوں نے اس کی کتابوں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا، اور اسی طرح رکرٹ (Rickert)، ڈلتھائی (Dilthey) اور شلائر ماخر (Schleiermacher) کی تصنیفات بھی ذوق و شوق سے پڑھیں، اور بقول مجیب صاحب اُن کو ان مصنفین کے خیالات میں اس نظام کی ایک شکل دکھائی دی جس کا خاکہ اسلام، تمام سچی اور صحت مند ثقافتوں اور ایک اچھے معاشرے کے

نصب العین میں ملتا ہے۔[1]

شلائر ماخر، ہربرٹ اور ڈلتھائی انہامی منہاج تحقیق کے مبلغ تھے، ان کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ اس موقع پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیرشن اشٹائنر جو ذاکر صاحب کے قیام جرمنی کے زمانے میں موجود تھے اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے، ان کے تعلیمی خیالات اور تجربوں کی خصوصیت کیا تھی۔ جرمنی میں تعلیمی تجربوں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے[2]۔ یہاں تو اس کا موقع نہیں کہ تفصیل سے اسے بیان کیا جائے، لیکن جو لوگ جرمنی کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس کے سیاسی نشیب و فراز اور سماج پر مذہب اور کلیسا کے گہرے اثرات کا ضرور شعور رکھتے ہوں گے۔ نپولین کی لڑائیوں کے بعد جب جرمن ریاستیں سنبھالا لینے کی کوشش کر رہی تھیں، ۱۸۰۹ء میں فشتے نے جرمن قوم کو احساس دلایا کہ اس کی اصل قوت نوجوانوں کی صحیح اور بہتر تعلیم میں ہے۔ کچھ عرصے بعد اشٹائن نے پبلک اسکولوں کے ملک گیر نظام کا ایک بہت اچھا منصوبہ پیش کیا لیکن قدامت پرستی کا ردعمل اس کے حامیوں کی مخالفت کی صورت میں سامنے آیا، اور اس نے اس کے آگے سپر ڈال دی۔ ۱۸۴۸ء میں جبکہ لبرل ازم کے لیے فضا کچھ ہموار ہو چلی تھی، تعلیم کے شعبے میں لبرل پالیسی کے امکانات قدرے روشن ہوئے، لیکن یہ موقع بھی کھو دیا گیا۔ ۱۸۷۰-۷۱ء کی فرینکو جرمن لڑائی (Franco-German War) کے خاتمے کے بعد قومی تعلیم کی تنظیم نو کا ایک موقع پھر ملا، لیکن بسمارک اور اس کے متبعین آزاد تعلیمی تجربوں کے حق میں نہ تھے، اب جرمن امپائر قائم ہو گئی تھی اور اس کی مصلحت یہ تھی کہ اسکولوں اور طالب علموں کو اس امپائر کو مستحکم بنانے کے کام میں استعمال کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکولوں

۱۔ محمد مجیب، حوالہ سابق، صفحہ ۳۵

۲۔ جرمنی میں تعلیمی افکار، تعلیمی تجربوں اور کیرشن اشٹائنر کے کام کے مدرسے کے سلسلے میں ہمارا خاص ماخذ الیگزنڈر اینڈ پارکر کی کتاب The New Education in the German Republic (نیویارک، ۱۹۲۹ء) ہے

کی کارکردگی اور معیارِ تعلیم بہتر تو ہوا لیکن تعلیم کے میدان میں حکومت کے تحت اور آمرانہ رویے کے سبب نوجوانوں میں صفاتِ انسانی کی نمایاں کمی نظر آنے لگی۔

۱۸۷۰ سے لے کر ۱۹۱۸ء تک جرمنی میں تعلیمی تجربے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے، اور نئے تعلیمی خیالات کے خیر مقدم کے لیے عام سیاسی فضا سازگار نہ تھی۔ لیکن حکومت کی سختی اور اونچے طبقے کی مخالفت کے باوجود تجربے اور عمل کے شیدائی مستقل مزاج تھے اور خاموشی سے اسکولوں کی مکمل اصلاح کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ انھیں میں میونخ کے ایک اسکول سپروائزر ڈاکٹر جارج کیرشن اشٹائنر بھی تھے۔ وہ ۱۸۸۰ء ہی سے درسیات کی تنظیم اور طریقۂ تعلیم کو ایک نیا روپ دینے میں مصروف تھے جس سے ان کا "کام کے ذریعہ تعلیم و تدریس" (Education Through Activity) کا منصوبہ عمل میں آسکے۔ ان کے نظریوں کی اساس سائنسی عہد کے نئے تقاضوں پر تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اونچی جماعتوں کے اسکولوں میں کلاسیکیت اور چھوٹی جماعتوں کے اسکولوں میں تحکمانہ اذعانیت دونوں عہدِ جدید کی عملی اور تجربی روح کے منافی تھیں۔ مادی تہذیب بڑی تیز رفتاری سے ترقی کر رہی تھی اور اسکولوں کے نظام میں تبدیلی ضروری تھی۔ انسان کا علم نیچر کے بارے میں روز افزوں تھا، اور فطرت کی طاقتوں پر اُس کا کنٹرول بڑھ گیا تھا۔ اس سے انسان کا حوصلہ بڑھا تھا اور وہ فرد کے لیے زیادہ آزادی کا خواہاں تھا۔ اُس میں اب یہ سمجھ بھی آگئی تھی کہ اُسے سماجی تنظیم نو کی اشد ضرورت ہے۔ پُرانے اسکولوں میں صرف "سکھانے" کا کام ہوتا تھا۔ نئے اسکول جو بیسویں صدی کے آغاز میں قائم ہوئے تھے، اپنی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرانا چاہتے تھے کیونکہ انھوں نے انسانیات، نفسیات اور عمرانیات کے علوم سے اپنے تعلیمی اصولوں کو اخذ کیا تھا۔

انسان ایک زندہ وجود ہے اور اس لحاظ سے اس کی اپنی ایک خاص فطرت ہے، وہ ایک سماجی حیوان ہے اور اس حیثیت سے اس کے رویّوں، اس کے حرکات و سکنات کا ایک مخصوص انداز ہے۔ انسان کی ان حیثیتوں کے پیشِ نظر/

کیرشن اشٹائنر کے "کام کے مدرسے" (Activity School) میں تعلیمی مسئلہ کو فطرت انسانی کے پانچ متعین پہلوؤں کو سامنے رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی: جسمانی، ذہنی، سماجی، جمالیاتی اور اخلاقی۔ "کام کے مدرسے" نے اخلاق کا جو معیار قائم کیا تھا اس کا تعلق براہ راست مذہبی عقیدے سے نہ تھا۔ احساسات، خیالات اور الفاظ کے مقابلے میں نیک عمل روحانی اقدار کے سچے ترجمان قرار پائے تھے، یہ مکتبۂ خیال جمہوریت کی بقا کے لیے اس نقطۂ نظر کو ناگزیر سمجھتا تھا۔

"کام کے مدرسے" نے کام کے تصور کو شرف بخشا کہ اس کے نزدیک یہی وہ قوت تھی جس نے انسان کو وحشت کی سطح سے اونچا اُٹھایا اور تہذیب و تمدن کو جنم دیا۔ اس نے کام کو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا بہترین ذریعہ قرار دے کر محنت اور دستِ دولتِ آفریں کا وقار اُونچا کر دیا، لیکن اس سے یہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی کہ کام سے "کام کے مدرسے" کا واسطہ محض مادی افادیت کے پیش نظر تھا جس کا فوری اور ٹھوس نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اس مدرسے کے چلانے والے اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ تعلیمی قدر کا کوئی کام بغیر دماغی کاوش کے انجام نہیں پا سکتا اور تمام ذہنی سرگرمیاں اپنی جگہ خود ایک قدر ہیں، خواہ ان کا کوئی معروضی حاصل مشاہدے میں آئے یا نہ آئے۔

اس طرح "کام کے مدرسے" میں تعلیمی سرگرمیوں میں کام کی اہمیت کے ساتھ انسان کی تخلیقی قوت کو بھی نظر میں رکھا گیا تھا، کیونکہ ہاتھ کے کام میں ہنرمندی پیدا کرنا اور منصوبی طریقے (پروجیکٹ میتھڈ) کے ذریعے اظہار کی صلاحیت کو ترقی دینا ہی تعلیم کا اصل مقصد نہیں ہو سکتا۔ ذہن کی تخلیقی قوت کی نشو و نما کرنا اس سے زیادہ اہم کام ہے۔ جرمنی کے عینیت پسند مفکرین، کانٹ، فشتے اور ہیگل، سب اس پر متفق تھے کہ ذہن انسانی کی بنیادی خصوصیت مصروفیت اور حرکت ہے اور اس کا مطلب ہے تخلیق مسلسل۔

جمالیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کیرشن اشٹائنر کے "کام کے مدرسے" کا مقصد تھا اظہارِ خیال کی صلاحیت کو بیدار اور اس کی نشو و نما کرنا یا جو کچھ دل و دماغ

میں ہے اُسے محسوس و مرئی شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ آرٹ اور حرفہ، آزاد مضمون نگاری اور تخیلی شاعری میں بچوں کی تربیت سے اس اسکول کا منشا مستقبل کے فنکار اور مصنف پیدا کرنا یا ایسے شہری تیار کرنا تھا جو شاعری، مصوری، موسیقی، اچھی دستکاری جیسی، تمدنی اشیا کے جمالیاتی پہلو کی شناخت اور قدر کر سکیں۔

کیرشن اشٹائنر کے نزدیک "کام کے مدرسے" کا یہ کام بھی تھا کہ وہ سوچنے کے عمل میں بچوں کی رہنمائی کرے جس میں استدلال اور منطق سے کام لیا جائے، اس کا خیال تھا کہ ایسا کام جو صحت و درستی کا متقاضی ہو اور بچے میں اس کی تکمیل کی خواہش پیدا کرے، بنیادی طور پر تعلیمی کام ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جرمنی کے ماہرین تعلیم انسان کو بنفسہٖ ایک مقصد تصور کرتے آئے تھے، کسی ایسے مقصد کا دُم چھلا نہیں جس کا تعلق اس سے 'باہر' سے ہو۔ یہ بھی جرمن عینیت پسندی کی ایک شکل اور کیرشن اشٹائنر کے "کام کے مدرسے" کی ایک خصوصیت تھی۔

یہاں، مناسب ہوگا اگر مختصراً یہ بتا دیا جائے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران، اور خاص طور پر اس کے بعد، جرمنی کے فلسفۂ حیات کی رَو مشینی اور تکنیکی عہد کے تقاضوں کی مخالف سمت میں چل رہی تھی، جرمنی کے لوگ "روح اور باطنی زندگی" کا زمانہ تلاش کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مادی معیارات پر روحانی اقدار حاوی ہو جائیں۔ اس رجحان کا سلسلہ درحقیقت بیسویں صدی کے آغاز کی تحریک شباب سے جڑا ہوا تھا جس نے خود سو سال قبل کی جرمنی کی اس رومانی تحریک سے فیضان حاصل کیا تھا جو انسان کو تمدنی زندگی کا مرکز اور تمام سماجی ارتقا کا نقطۂ آغاز تصور کرتی تھی۔ اُس دَور کی جرمنی کی عینیت کا پستالوزی، کانٹ اور فشتے کی عینیت سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس کا تعلق شلر، گیٹے اور ہمبولٹ کی انسان دوستی سے بھی تھا۔ اب ایک بار پھر سائنسی تحلیل و ترتیب اور میکانکی نظم و ضبط کے بجائے روحانی ربط و ترکیب اور حیات انسانی کے مختلف عوامل میں ہم آہنگی کی قدر بہت بڑھ گئی تھی، اور ایک بار پھر 'پورا انسان' مطالعہ و مشاہدہ کا مستحق قرار پا رہا تھا اور فلاح انسانی سب سے اعلا خیر کا درجہ اختیار

کر رہی تھی۔

انسان دوستی کی اس تحریک کا اثر فلسفۂ تعلیم پر گہرا پڑا، اور جرمن تعلیمات میں فرد کی اندرونی دنیا میں تبدیلی اور شعور کی بیداری کو توجہ کا مرکز بنایا گیا جسے اہم تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے، یعنی ہر شخص کی زندگی اور ذہن پیچ در پیچ تجربوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور ان کی ساخت پر ان تجربوں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور چونکہ ہر شخص کی اثر پذیری کی کمیت و کیفیت میں فرق ہوتا ہے، اس لیے اشخاص و افراد کی شخصیتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ اُس دَور میں نفسیات کے علم نے جو نفسیات ترکیبی کے نام سے مشہور ہے، یہی انداز اختیار کر لیا تھا۔ اس کا اثر بھی فنِ تعلیم پر پڑا۔ شخصیت کی نشو و نما تعلیمات کا ایک اہم مقصد قرار پایا، بچپن، عنفوان شباب اور عہدِ شباب کے متعلق نفسیات کے گہرے مطالعے کے نتائج تعلیم کے نظریوں کا جزو بن گئے اور کہا گیا کہ فرد کو تخلیقی افعال کا سرچشمہ سمجھنا چاہیے۔ انھیں کے ذریعے وہ اپنے تجربات کے مجموعے کو معنی پہناتا ہے اور انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے نفس کے اندر اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے اور جو چیزیں باہر سے حاصل کرتا ہے ان کو اپنے اندر جذب اور منظم کرنے کے لیے اپنی تخلیقی قوت سے کام لیتا ہے تاکہ وہ بعد میں ان چیزوں کو جو اس کی روح میں جاگزیں ہیں عمل میں ظاہر کر سکے۔ تعلیم کا سب سے اہم منصب یہ ہے کہ وہ اس تخلیقی قوت کو ابھارے اور اس کی تربیت کرے۔

شخصیتیں چونکہ ایک سی نہیں ہوتیں، اور سب کی شخصیتوں کا احترام ضروری ہے، اس لیے ماہرینِ تعلیم نے کہا کہ ذہنِ انسانی کی مناسب نشو و نما کے لیے فرد کو آزاد فضا ملنی چاہیے اور اسے اپنے نفسی تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کو نظم و ضبط میں لانے کے مواقع حاصل ہونے چاہییں، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے فرد کی زندگی پر ماحول اور سماج کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور ان دونوں پہلوؤں میں ضروری توازن پر زور دیا۔

اس لیے اسکول کا کام اُس دَور کے جرمن ماہرینِ تعلیم کے نزدیک یہ تھا کہ

ایسے تجربے کے ذریعے جس میں دل اور دماغ دونوں شریک ہوں، اور جو بچوں کو حرکت میں لائے، بچوں کی سیرت سازی کی جائے، بچوں کو آزادی دی جائے (کیونکہ آزادی کے ماحول ہی میں ان کے انسانی افعال اور تخلیقی قوت کی نشوونما ہو سکتی ہے) اور بچوں میں مل جل کر رہنے اور ایک اچھے سماج کی تشکیل کا احساس بیدار کیا جائے۔

کیرشن اشٹائنر کے "کام کے مدرسے" کے طریقۂ تعلیم میں بچوں کی خود عملی کی صلاحیت اور تخلیقی قوت کو پروان چڑھنے کے پورے مواقع حاصل تھے، اور اسکول کا ماحول تجربوں کے ذریعے شخصیت کی تعمیر کے لیے پوری طرح سازگار تھا۔ اسی طرح مختلف مشاغل کے ذریعے بچوں میں مل جل کر زندگی گزارنے کا جذبہ بھی پیدا کیا جاتا تھا۔

ذاکر صاحب اور ایڈورڈ اشپرانگر

اسی زمانے میں جب ذاکر صاحب معاشیات میں پروفیسر زومبارٹ کے فکر انگیز لیکچروں سے جن کا اسلوب بیان نہایت جامع اور فلسفیانہ تھا، استفادہ اور جرمنی کے تعلیمی افکار اور نئے تجرباتی اسکولوں کا اپنے طور پر مطالعہ و مشاہدہ کر رہے تھے، پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر بھی برلن یونی ورسٹی میں تھے۔ ان کا شمار فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تمدن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ عابد صاحب نے انھیں کی نگرانی میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا۔ انھوں نے ذاکر صاحب پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زومبارٹ اور دوسرے بڑے پایے کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اُٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کہیں سے پایا تو شاید میرے استاد اشپرانگر سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے تھے۔"[1] اسی بات کو ایک دوسرے مضمون میں عابد صاحب نے یوں لکھا ہے: "اپنے خاص مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپی وہ (ذاکر صاحب) علمِ تعلیم اور فنِ تعلیم سے رکھتے تھے۔ انھیں میرے

۱۔ سید عابد حسین، "ذاکر صاحب"، نقوش (لاہور) شخصیات نمبر، ۴۷، ۴۸/جنوری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۲۶۹

استاد پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر سے جو فلسفۂ تعلیم کے جید عالم سمجھے جاتے تھے، گہری عقیدت تھی۔ بڑے شوق سے ان کے لیکچر سنتے تھے اور ان کی کتابیں پڑھتے تھے۔[1] اشپرانگر کا تعلیمی و تمدنی فکر کیا تھا اور وہ کیسے اُستاد ہوں گے، اس پر عابد صاحب کی درج ذیل جنچی تلی اور بلیغ عبارت سے کچھ روشنی پڑتی ہے:

"میں اُن کے لیکچروں اور سیمناروں میں موجود رہا جو میرے لیے نہ صرف روشن خیالی کا ذریعہ تھے بلکہ کوئی تین سال سے زیادہ تک جمالیاتی استفادہ اور اخلاقی رہنمائی کا سبب بھی رہے، اور ان سے یہ سیکھنے کو ملا کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا بلکہ حق و صداقت، غور و فکر، حُسن کی پرکھ اور ایک نوع کی قوت کے احساس سے زندگی حاصل کرتا ہے جو تہذیب ذات سے پیدا ہوتی ہے اور تکمیل کے تصور سے حیات پاتا ہے جو اسے اپنے ہم ذات کی محبت اور خدمت اور اپنے خالق کی پرستش سے حاصل ہوتا ہے۔ اشپرانگر نے اس کا احساس دلایا کہ جس طرح حیاتیاتی۔ اقتصادی قدر کی چیزیں زندگی کو قائم و دائم رکھتی ہیں اسی طرح نظری، جمالیاتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی اقدار بھی اسے توسیع بخشتی ہیں اور دوبالا کرتی ہیں اور زندگی کو زندگی کے قابل بناتی ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ کلچر ان اقدار کی ایک داخلی سطح سے معروضی سطح پر پیشکش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جس قدر کہ ہر انسانی ذہن کسی خاص قدر کے لیے حساس اور اثر پذیر واقع ہوا ہے، اس کے لیے وہ ایک خاص نوع کے نمونے، معروضے مرتب کرتا ہے اور دوسری اقدار کی قبولیت کے لیے مختلف اقسام کی دیگر اثر پذیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تعلیم جس کے حصول کے لیے بچوں کا ذہن نہایت زود اثر

۱۔ سید عابد حسین: "مردِ مومن، مردِ حق"، اسلام اور عصر جدید، جولائی ۱۹۶۹ء

ہوتا ہے' تہذیبی ملجا و ماوا کے استعمال کا وہ عمل ہے جو ایک یور کی طرح
اس کے تہذیبی ورثے کا خزانہ کھولتا ہے' اور شخصی حیثیت کو عالمگیر حیثیت
سے مترادف قرار دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک وسیع و عریض تہذیبی
رنگارنگی کے درمیان / اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جس سے ایک
کلیت جنم لیتی ہے. لیکن ان اقوال میں سب سے موثر قول جس نے مجھ میں
زندگی کو اعتماد کے ساتھ جینے کی صلاحیت پیدا کر دی یہ تھا کہ انسانی عزم جو اگرچہ
ایک بڑی حد تک مادی اور سماجی حالات سے متاثر ہوتا ہے' کبھی اس سے
پوری طرح متعین نہیں ہوتا بلکہ اس سے اوپر اُٹھ کر انسان کو ایک آزاد
اخلاقی پسند و ناپسند کی صلاحیت بخشتا ہے۔"[۱]

عابد صاحب نے بڑے محتاط لفظوں میں یہ کہا تھا کہ جرمنی میں ذاکر صاحب نے اگر کچھ فیضان حاصل کیا تو ایڈورڈ اشپرانگر سے "جو خبیرؔ کے ساتھ ساتھ نظیرؔ بھی رکھتے تھے"۔ ذاکر صاحب نے اشپرانگر کے افکار کا مطالعہ کیا' ان کے لیکچر سُنے' ان سے ملے اور انسپریشن حاصل کیا' لیکن چونکہ وہ خود بھی صاحب نظر تھے' اس لیے وہ محض "کتب" کی 'خبر' پر مطمئن نہیں رہ سکتے تھے' انھوں نے اس خبر کو اپنی گہری ذہانت سے پرکھا' اپنے سماج اور اپنے تمدن کے پس منظر اور پیش منظر میں اس کو جانچا اور پھر اس کے نتیجہ خیز اور فعال عناصر کو اپنے تعلیمی فکر اور تدریسی تجربے کی جولانگاہ میں اس طرح برتا کہ اس میں ایک انقلابی تحریک کی سی شان پیدا ہو گئی ـــــ تعلیم کی' خاص طور پر مسلمانوں کی تعلیم کی دنیا میں ایک ایسی انقلابی تحریک جو علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اُس کی اساس 'افادیت' پر تھی جبکہ اِس کی بنیاد 'عینیت اور ہمہ گیری' پر تھی۔

۱۔ (خود نوشت ڈاکٹر سید عابد حسین) حیاتِ عابد' مرتبہ ڈاکٹر صغرا مہدی' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی' ۱۹۸۴ء' صفحات ۱۶۲-۱۶۳)

ایڈورڈ اشپر انگر کے افکار سے اثر لینے اور انھیں اپنے سماج اور تمدن اور دنیا کے ہر آن بدلتے حالات کے پیشِ نظر ایک خاص اسلوب میں پیش کرنے کی ایک مثال وہ ہے جو ہمیں ذاکر صاحب کے اس خطبے میں ملتی ہے جس کا عنوان "مذہب اور سماج" ہے اور جو انھوں نے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ' میں "مذہب اور سماج" کے عنوان پر ایک سیمنار کی افتتاحی نشست میں دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے کہ علمی نقطۂ نظر سے انھوں نے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور نہ کبھی مذہبی عقائد و خیالات کے عمرانیاتی و انسانیاتی سرچشموں کا سُراغ لگانے کی کوشش کی ہے' اور یہ کہ "اگر میں یہ سب کر بھی لیتا تو شاید اس سے مذہب کی صحیح صحیح سمجھ بوجھ مجھ میں نہ پیدا ہو پاتی اور میری زندگی میں اس کا کوئی حیات افروز اثر نمایاں نہ ہوتا"، شرکارِ سیمنار کی توجہ ایڈورڈ اشپر انگر کے "مذہبی انسان" کے تصور کی طرف بڑے موثر انداز میں اس طرح مبذول کرائی تھی ؛

"پھر یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ (خوش نصیب) کون ہے جو مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ ایڈورڈ اشپرانگر نے انسانوں کے مختلف ٹائپ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے مطالعۂ نفسیات کے نتیجے میں اس نے مذہبی انسان کو بہ نفسہٖ ایک الگ ٹائپ مانا ہے۔ لیکن اشپرانگر کے مذہبی انسان نے یہ جان کر اس طرح کے سیمنار میں شرکت نہ کی ہوتی کہ یہاں ایسے دانش وروں اور عالموں کا مجمع ہوگا جو اس کی باتوں کو حلیمی اور رواداری سے سنیں گے، اس پر نرم لہجے میں تبصرہ کریں گے، اس کے مباحث سے تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ اتفاق یا اختلاف کریں گے اور پھر اپنے علمی ایجنڈے کے دوسرے آیٹم پر متوجہ ہو جائیں گے۔ اشپرانگر کا مذہبی انسان تو ایسے افراد کی تلاش کرے گا جن کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل اور دل زخموں سے چور ہوں، اس لیے کہ ابھی صداقتِ کامل پر یقین کامل نہیں حاصل ہو سکا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ابھی ناقابلِ حصول نظر آتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی راہ میں بہت سی مادی اور ذہنی رکاوٹیں ہیں، انسان کا ارادہ کمزور ہے، انسان کی فطرت ترغیبات

کا بہت جلد شکار ہو جاتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی یقین کامل کے حصول کے لیے اس کا شوق اور اس کا جذبہ خام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مذہبی انسان کا معاملہ تو اس وجودِ کامل و مطلق یعنی خدا سے ہے۔ ایسا انسان جب سماج میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے تو اس سے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس کی سماجی زندگی اور خود اس کا سماج اس وجودِ کامل، خیرِ مطلق اور عدلِ تام سے متعلق اس کے اپنے تصور کے مطابق ڈھل جائے۔"[1]

تفکر و تحقیق کا منہاج افہامی

اب اسی موقع پر تفکر و تحقیق کے اس منہاج افہامی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جسے بیسویں صدی میں تمدنی فلسفی اور افہامی نفسی ایڈورڈ اشپرانگر اور اُن کے ہمنوا فلسفیوں نے اور معاشین میں ذاکر صاحب کے اُستاد ورنر زومبارٹ نے جو اس کے امام تھے، ترقی دی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ذاکر صاحب کے فکر و عمل میں اس منہاجِ تحقیق کا بہت اثر تھا۔ ان کی شخصیت و سیرت، ان کے تعلیمی تجربوں، ان کے تعلیمی و تمدنی فکر اور ذوقِ جمال کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ وہ تمدنی و جماعتی زندگی کے مظاہر کو سمجھنے کے لیے 'افہام' یا 'سمجھنے' کے طریقے کو صحیح اور مناسب سمجھتے تھے۔

ابتدا اس منہاجِ تحقیق کی اٹھارویں صدی کے شروع میں ہوئی، لیکن اس وقت اس کے حامیوں کی تعداد بہت کم تھی، کوئی سو سال بعد ہرڈر وغیرہ نے لسانیات اور علم تمدن میں اسے برتنا شروع کیا اور ان علوم کی بنیادیں اس طریقے پر استوار کیں لیکن اس کام کی تکمیل شلائر ماخر اور ولہلم فان ہمبولٹ نے کی۔ پھر انیسویں صدی

۱۔ ذاکر حسین، "مذہب اور سماج" ترجمہ از شہاب الدین انصاری، اسلام اور عصرِ جدید، نئی دہلی، جنوری۔اپریل ۱۹۸۰ء، صفحات ۱۴۳۔۱۶۲

کے آخری تین چار دہوں میں علوم طبیعی اور ترتیبی طریقۂ تحقیق کا پرچم لہرایا اور علمی دنیا اس طرف چل پڑی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب "بکل نے اپنی مشہور تاریخ تہذیب میں انسانی تاریخ کو بھی اس منہاج علمی کا تابع بنا دیا، اس وقت ایک مورخ درائے زن (Droysen) سے نہ رہا گیا اور اس نے اس کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے طبیعین کو ان کی اس گستاخانہ جرأت پر متنبہ کیا اور جتلایا کہ 'زمین اور آسمان کے بیچ میں خوش قسمتی سے بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو عقلاً نہ منطق استقرار کے قابو کی ہیں نہ منطق قیاسی کے، جو استقرار اور تحلیل کے ساتھ قیاس اور ترکیب کی طالب بھی ہیں اور پھر بھی ان دونوں کی متفقہ سعی سے بھی بہت کچھ سہی مگر کل اور پورے طور پر قابو میں نہیں آتیں، جن کی توجیہ نہیں ہو سکتی مگر جنھیں 'سمجھا' جا سکتا ہے'۔ آگے کہتا ہے: 'اس اخلاقی دنیا میں کسی حقیر ماجرائے عشق و محبت سے لے کر تجارت عالمی کے بے پایاں تعلقات یا فلاکت و افلاس کی منتظر تحقیق کشاکش تک سب کچھ قابل فہم ہے۔ ہمارے علم کا طریقہ سمجھنے کا، 'افہام کا طریقہ ہے'۔[1] درائے زن کی پیروی میں اس افہامی منہاج تحقیق کو وہلم ڈلتھائی، ونڈل بانڈ، رکرٹ اور زمل نے روشن کیا، پھر ان کے بعد ہائنرش مایر اور ماکس شیلر وغیرہ نے۔[2] لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، بیسویں صدی میں علم نفسیات و علم تمدن میں اس طریقۂ تحقیق کے سب سے ممتاز ترجمان اور مبلغ ایڈورڈ اشپرانگر اور معاشیات میں ورنر زومبارٹ تھے۔

ایڈورڈ اشپرانگر نے 'افہام' یا 'سمجھنے' کے اس منہاج تحقیق کی اس طرح وضاحت کی ہے: "'سمجھنے' کے وسیع تر معنی ہیں 'ذہنی مظاہر کا ادراک مستند حقیقی علم کی شکل میں اس طرح کرنا کہ ان مظاہر کے منشا سے آگاہی ہو'۔ ہم صرف ان چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں جو کوئی منشا رکھتی ہیں۔ سمجھنے میں اور ادراک اور توجیہ میں یہی فرق ہے

۱۔ ذاکر حسین، معاشیات، مقصد اور منہاج، ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۳۲ء، صفحہ ۶۸

۲۔ ایضاً، صفحہ ۶۹

کہ سمجھنے میں منشا کا تعین ہوتا ہے اور ان چیزوں میں نہیں ہوتا... سمجھنے کا عمل گہرائی میں پہنچ کر اندرونی علاقوں کو معلوم کرتا ہے۔ یہ عمل ذہنی مظاہر کا منشا اس طرح معلوم کرتا ہے کہ وہ گویا ان میں جان ڈال دیتا ہے اور ان کا ادراک اس کُل کی نسبت سے کرتا ہے جس کے وہ اجزا ہیں۔

"اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'منشا' اور 'بامنشا' کے کیا معنی ہیں۔ اس کا جواب ہم بہت عام الفاظ میں دیتے ہیں: 'منشا' وہ چیز رکھتی ہے جو کسی نظام قدر میں بحیثیت ایک تعمیری عنصر کے جگہ پاتی ہو اس لیے بامنشا وہ نظام یا اجزا کی وہ ترکیب کہلائے گی جو کسی نظام قدر کی تعمیر کرتی ہو' اس سے علاقہ رکھتی ہو یا اس کے چلنے میں مدد کرتی ہو۔ کسی کُل کے اجزا صرف اس وقت 'منشا' رکھتے ہیں جبکہ خود وہ کُل کسی قدری نقطۂ نظر کے ماتحت آسکے...

"کسی قوم کی تہذیب کے مظاہر یا سازوسامان کا بامنشا ہونا اس پر موقوف ہے کہ یہ چیزیں اس تہذیب کی مجموعی زندگی میں کہاں تک مدد دیتی ہیں۔ اگر ان کو اس کُل سے کوئی علاقہ نہ رہے تو وہ 'بے منشا' ہو جائیں گی۔ ہر 'بامنشا' کُل بجائے خود ایک بالاتر کُل کے 'بامنشا' یا 'بے منشا' جزو کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ منفرد احساسات' اعمال' اور اجزائے زندگی اس وقت بامنشا کہلاتے ہیں جب وہ ہماری مجموعی زندگی کے لیے اہمیت رکھتے ہوں۔ اس سوال کا جواب کہ خود زندگی مثلاً ایک منفرد انسانی زندگی بہ ہیئت مجموعی کوئی منشا رکھتی ہے یا نہیں' اس پر منحصر ہے کہ یہ انسانی زندگی کسی بڑے نظام قدر کا جزو ہے یا نہیں۔ یہ سلسلہ جس میں ہم ہمیشہ بلند تر کُل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں' آخر میں اس انتہائی اور غیر متعین کُل تک پہنچتا ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ یہ دنیا بھی کوئی منشا رکھتی ہے یا نہیں ہماری حدِ فہم سے باہر ہے۔ یہاں تک ہمارے ادراک کی انتہائی پرواز بھی نہیں پہنچتی۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے کہ انسانی حالات پر قیاس کرکے کوئی رائے قائم کرلیں۔"[۱]

۱۔ ایڈورڈ اشپرانگر' نفسیات عنفوان شباب' ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین' اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ' نئی دہلی' ۱۹۳۰ء' صفحات ۵-۳۰

ذاکر صاحب نے معاشیات انہامی کے حوالے سے 'انہام' اور 'سمجھنے' کے طریقے کی کسی قدر تفصیل اپنی کتاب معاشیات، مقصد اور منہاج میں بیان کی ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے 'انہام' کے نظریۂ عام کو بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ اسے ایک عام پڑھا لکھا شخص بھی (اس کے لیے فلسفے کا طالب علم ہونا ضروری نہیں) بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ پہلے تو وہ علوم طبیعی کے دائرۂ عمل کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان علوم کو اس سے سروکار نہیں کہ یہ مظاہر قدرت کیوں ہیں اور کس لیے ہیں! یہ وہ معمّا ہے جسے مظاہر کو سادہ سے سادہ اجزاء میں تحلیل کر کے ان سادہ اجزاء میں ترتیب ذہنی پیدا کرنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ انسان نے جب شعور کی منزل میں قدم رکھا تھا تو اسی وقت سے اس نے قدرت کے رازہائے سربستہ کا سراغ لگانے کی کاوش شروع کر دی تھی۔ اُس کا ذہن، اس کی روح محض مشاہدۂ خارجی سے مطمئن نہیں رہ سکتی تھی، اس کے شوق نظر کا تقاضا تھا کہ وہ ضمیر فطرت کی گہرائیوں میں اتر جائے اور رمزحیات کا سُراغ لگائے، لیکن جب جب اس نے اس کی جرأت کی، تب تب اُسے اپنی درماندگی اور عجز کا شدید احساس ہوا۔ " سوائے اس کے کہ وجدان و الہام کی بخشش نے کسی سینۂ انسانی پر ان اسرار سربستہ کا انکشاف فرما کر اسے محرم راز و بہر بنا دیا ہو، اور ان خاصانِ بارگاہ ربّانی کے ماننے والوں نے اس انکشاف کو، ان کے اعتماد پر، بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہو۔ ورنہ بحر ہستی کے کنارے پر انسان کھڑا صرف اس کے تموجات ظاہری کو دیکھتا ہے اور اس کی بے ترتیبوں میں اپنے ذہن سے کچھ ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے،

جولانِ موج را نگراں از کنار جُست

"... مگر اسی کائنات میں ایک چھوٹی سی دنیا خود اس انسان نے بنائی ہے، یعنی تمدنی زندگی کی دنیا۔ اور چونکہ اس نے بنائی ہے اس لیے اس کے مقصد، اس کے معنی، اس کے منشا سے آگاہ ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے تو کیا بیجا ہے؟ فطرت کی دنیا میں اسے خالی مشاہدہ اور ترتیب مشاہدات پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ اس

عالم تمدن میں وہ 'سمجھنے' کی کوشش کرتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔ وہ برگ گل پر شبنم کے ذرّ تابدار کو دیکھ کر پھول کی طرح مسکرا سکتا ہے یا شبنم کی طرح رو سکتا ہے مگر انھیں سمجھ نہیں سکتا۔ پر اُس آنسو کو خوب سمجھ سکتا ہے جو اُس بیوی کی آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے'

جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدان وغا حُبِّ وطن سے مجبور"

عالم فطرت کو انسان نہ سمجھ سکے اور سرّ کائنات اس کی فہم سے ماوراء ہو تو ہو لیکن وہ اپنے ہم جنس انسانوں کے داغہائے سینہ، ان کے دلوں کی دھڑکنیں، ان کی خوشیاں اور مسرتیں، ان کے مصائب و آلام اور افکار و خیالات کی خارجی تشکیلات، یعنی تمدن کے لیے ضرور ایک نگہ محرمانہ رکھتا ہے۔ مظاہر فطرت کو وہ دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے، مظاہر تمدن کو وہ سمجھتا ہے اور زندگی کے کیف سے لطف اُٹھاتا ہے۔

نظریۂ انہام کی وضاحت کرتے ہوئے ذاکر صاحب لکھتے ہیں: "کسی مظہر تمدنی کو سمجھنے کے معنی ہیں کہ ہم نے اس کے منشا و مقصد کو بوجھ لیا۔ یعنی ہمارے ذہن میں پہلے سے ایک نقشہ موجود تھا اور اپنے اس ذہنی نقشے میں ہم نے اس مظہر کو ایک جگہ دے دی ... مظاہر قدرت کا جو علم ہمیں حاصل ہو سکتا ہے وہ مجازی علم ہے لیکن مظاہر تمدن کا ہم حقیقی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ تمدن کے مظاہر کو ہم من حیث الکل سمجھ سکتے ہیں، یعنی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مظہر یوں کیوں ہے؟ دوسری طرح کیوں نہیں؟ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ معنی، مقصد، منشا کے ایک خاکے سے اس کا تعلق ہے اور ہم سمجھ اس وقت تک سکتے ہیں جب تک یہ تعلق باقی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو سمجھتے ہیں تو گویا اسے ایک بوجھی بوجھی، جانی پہچانی چیز کا جزو بناتے ہیں۔ سمجھنے سے، انہام سے، جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں مدرِک اور مدرَک، موضوع علم اور معروض علم، دونوں ایک ہی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مدرِک ایک طرح

۱۔ ذاکر حسین، معاشیات: مقصد و منہاج، صفحات ۶۱-۶۵

خود منظہر مدرک میں داخل و ساری ہوتا ہے اور اس گھر کے بھیدی پر دنیائے تمدن کے سب راز فاش ہوتے ہیں۔ تمدن 'ذہن خارجی' ذہن معروض ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے والا 'ذہن داخلی' ذہن موضوع ہے۔ اس ذہن داخلی میں خیالات سوچنے کی، مقاصد متعین کرنے کی، ان کے حصول کی تدابیر نکالنے کی صلاحیت یعنی بالفاظ دیگر 'تمدن' پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، یعنی پنہاں کو پیدا کرنے، اپنی ذات کو خارجی دنیا کے اداروں اور علاقوں میں متشکل کرنے کی قابلیت ہے۔ مدرک اور مدرَک کی اس یگانگت کا علم خود مدرک کو اس طرح ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو اپنے افکار کو، اپنے مقاصد کو جو سب پہلے اس میں پنہاں تھے، باہر عالم آب و گل میں پیدا، متشکل، دیکھتا ہے۔ تمدن کے سارے اجزا پہلے ذہن انسانی ہی میں تو تھے، اس لیے یہ ذہن اس تمدن کو اپنا مخلوق جانتا ہے اور اپنی اس مخلوق کو جاننے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتا ہے جیسے کہ خود اس کا، کائنات کا، جملہ موجودات کا خالق، کل نظام عالم کو جانتا اور سمجھتا ہے۔

"افہام کا یہ نظریۂ عام ان بنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم، یعنی ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لیے ممکن ہے اور یہ کہ ہم پورے طور پر اور ہر پہلو سے اسی چیز کو جان سکتے، سمجھ سکتے ہیں جسے ہم خود بنا بھی سکیں . . . یہ بھی جان لینا چاہیے کہ خود تمدن کے مظاہر کا علم بھی انسان اسی درجہ اور حد تک حاصل کر سکتا ہے جہاں تک یہ اجزاء تمدن اسی کی تخلیق ہیں، ورنہ اگر یہ خود انسانیت کے وجود کا منشا، اس کی تمدن ساز صلاحیتوں کی غرض و غایت نظام عالم میں معلوم کرنے کا حوصلہ کرے تو اسے پھر انھیں پابندیوں سے دوچار ہونا پڑے گا جن کا احساس اسے عالم فطرت کا علم حقیقی حاصل کرنے میں ہوتا ہے . . . [۱]"

---

۱۰ ایضاً۔ ۸۰۔ "

قیام جرمنی کا عام تمدنی اثر

جرمنی کے عالموں کے علم اور بصیرت کا اثر ذاکر صاحب پر بہت گہرا پڑا۔ اُن کے یہاں انھیں فکر کی گہرائی، تمدنی زندگی میں اخلاقی و روحانی اقدار کی تلاش کا سچا جذبہ اور وہ سادگی اور انکسار نظر آیا جو مشرق میں علم و اقدار کے خدمت گزاروں کی خصوصیت تھی، انھوں نے ان میں مشرق کو اور خاص طور پر ہندستان کو سمجھنے کی خواہش بھی پائی، اس لیے کہ ان کو یہ احساس تھا کہ ہندستان اور جرمنی کے اندازِ فکر میں ایک خاص ہم آہنگی ملتی ہے۔ ذاکر صاحب پر ان باتوں کا بھی بہت اثر پڑا اور اپنی ذہنی و اخلاقی شخصیت پر ان اثرات کا انھوں نے ہمیشہ جذبۂ ممنونیت کے ساتھ اعتراف کیا۔

جرمنی سے واپس ہونے سے کوئی دو تین ہفتہ پہلے ۱۰ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ذاکر صاحب کی تجویز پر برلن کے برسٹل ہوٹل میں ایک استقبالیہ کا انتظام کیا گیا تھا جس میں برلن یونی ورسٹی کے پروفیسر، صنعتوں کے تنظیم کار اور ہندستانی طلبہ شریک تھے۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے ایک اہم اور بہت اچھی تقریر کی تھی اور جواب میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر ہیبر (HABER) کی تقریر ہوئی تھی[1]۔ اپنی تقریر میں یونی ورسٹی کے پروفیسروں اور برلن کے صنعتی کارخانوں کے اہم نمایندوں کو خطاب کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ ہندستان جیسے دور دراز ملک میں آپ کی شہرت پہنچی اور وہاں سے بہت سے طالب علم اس سچے جذبے سے یہاں آئے کہ آپ جیسے عظیم عالموں اور دانشوروں کے قدموں میں بیٹھیں اور تعلیم و تربیت اور فیض و فیضان حاصل کریں۔ اس میں تاخیر ضرور ہوئی کہ جرمنی کی دانش گاہوں میں ہندستان کے طلبہ داخل ہوں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم خود یہاں آنا نہیں چاہتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم جرمنی سے

۱۔ کے۔ اے۔ حمید، A Life To Remember، لال وانی پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۷۲ء، صفحہ ۵۳

واقف نہ تھے۔ یورپ کی ایک بڑی طاقت سے ہمارا تعلق بہت گہرا ہے لیکن اس کے باوجود یورپ کے بارے میں درحقیقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے، اور اس میں حکمرانی کی فنکارانہ عیاری کو بڑا دخل تھا، اس نے بڑی ترکیب سے کچھ ایسی صورت حال پیدا کردی تھی کہ ہم نے یہ باور کرلیا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی ملک ہیں ـــــ انگلستان اور ہندستان، یہاں تک کہ ہندستانیوں کی نئی نسل ایک ناقابلِ فہم بدیسی ثقافت سے مسحور ہوگئی۔ اب ہندستان کے وہ نوجوان طالب علم بھی جو یورپ کی دانش گاہوں سے استفادہ کرنے کے خواہشمند تھے، اس پر مطمئن ہو گئے کہ ایک یورپین دیوی ـــ انگریز قوم ـــ کی قربان گاہ پر اپنا سر جھکا دیں جسے استعاری اساطیر کے مطابق قدرت نے ہندستان کی سرزمین پر اُتارا ہے۔ ہندستان اس بات سے واقف نہ تھا کہ یورپ کے پَین تھی اُون (PANTHEON) میں ایک سے زیادہ دیوی دیوتا ہیں جن کا ظاہر تو ایک ہی جیسا ہے لیکن جن کے باطن میں نمایاں فرق ہے، اور ان میں سے بعض تو ایسی خصوصیات کے حامل ہیں جو اس کی اپنی روح تہذیب سے حیرتناک حد تک قریب ہیں۔

یہ تو جنگ کی ہولناکیوں کے درمیان اور اس کے فوراً بعد ہوا کہ ہندستان نے جرمنی کو دریافت کیا اور پتا چلا کہ ان دونوں قوموں کے مابین ایک روحانی رشتہ ہے۔ پھر تو ہندستانی طلبہ نے جرمنی کی طرف رُخ کیا۔ لیکن وہ جرمنی علم قانون کی اس عیارانہ فنکاری میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے نہیں آئے جس سے بے پڑھے لکھے لوگوں میں بغیر محنت مشقت کے وہ کامیاب زندگی گزار سکیں، یا وہ ایسی تعلیم حاصل کرنے نہیں آئے جس کے سہارے وہ بدیسی حکومت و تسلط کی مشین کا ایک پُرزہ بن جائیں یا کسی یونی ورسٹی ٹاؤن میں اونچی سوسائٹی کے ایک ایسے رکن کی حیثیت سے عیش وعشرت کی زندگی گزاریں جس کی تراش خراش دوسروں کے رحم و کرم پر ہو۔ ان ہندستانیوں میں جو جرمنی آئے، زیادہ تر اپنے مقصدِ حیات اور اپنے ہم وطنوں کے عزائم اور مشکلات کا شعور رکھتے تھے، اب وہ اس ملک میں ہیں اور انھیں امید ہے کہ

اُن کی جرمن تعلیم سے اُن کے مقاصد کو تکمیل کا صحیح رُخ مل جائے گا۔

ذاکر صاحب نے عصر حاضر میں زندگی کے تمام شعبوں میں شدید مادیت کی کارفرمائی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم "قدامت پسند، پسماندہ" ہندستانی اب بھی انسانیت پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں سائنس اور صنعتی تکنیک کے کارناموں سے انکار ہے۔ ہاں، یقیناً ہندستان ہندستان نہ رہ جاتا اگر سائنس اور صنعتی تکنیک ہی کو مقصد حیات سمجھ لیتا، اور انسانی زندگی کی بنیادی قدروں کو نظرانداز کر دیتا محض اس لیے کہ تیز رفتار پیداوار والی نفسیات اس کی سرگرمیوں کا محور بن جائے۔ "میں جانتا ہوں کہ جرمنی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے، اور اس راستے پر بہت دور جا چکا ہے لیکن آپ کے شاعروں اور فلسفیوں کی بدولت زندگی کو سطحی بنا دینے والے اس رجحان کے مقابلے میں دنیا کے پاس ایک بڑی روحانی طاقت بھی موجود ہے۔ اس لیے اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ ہندستانی طلبہ، جیسے جیسے جرمنی سے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جرمنی کے سائنس اور ٹیکنولوجی کے مراکز میں پہنچ رہے ہیں۔ آج جو یہ بات کہی جا رہی ہے کہ 'جرمنی یورپ کا ہندستان ہے'، تو اس میں بڑی صداقت ہے۔"

ذاکر صاحب نے استاد اور شاگرد کے مخلصانہ اور شریفانہ تعلق کے بارے میں ہندستان کی قدیم اور مشہور عالم روایت کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارا استاد اپنے طالب علموں کو علم ہی نہیں دیتا بلکہ حقیقت میں وہ ان کی زندگی کی تشکیل و تہذیب کرتا ہے۔ "اس لیے مجھے اس پر تعجب نہ ہوگا اگر ان نوجوان ہندستانیوں میں سے کوئی جو آج یہاں اس تقریب میں موجود ہیں، کسی نہ کسی دن اپنے وطن کے برگزیدہ سپوت کی حیثیت سے ——— اور مجھے امید ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ایک دن یقیناً مادرِ وطن کا برگزیدہ سپوت ثابت ہوگا[۱] ——— اپنی عظمت کو بڑے پیمانے پر اپنے جرمن پروفیسروں کے اثر اور فیضان سے منسوب کرے جو کام کے معاملے میں بڑے سخت گیر ہوتے ہیں اور کوئی

۱۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ مادرِ وطن کے یہ برگزیدہ سپوت، 'بھارت رتن'، خود ذاکر صاحب ہوں گے۔

رو رعایت نہیں کرتے —— اور یہ اس لیے نہیں کہ ہم ہندستانیوں میں اثر پذیری کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ جرمنی میں ہمیں بڑی محبت ملی ہے[۱]"

۱۹۶۲ء میں فیڈرل ری پبلک آف جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ہائنرش لیوبکے کو دہلی یونیورسٹی کے ایک مخصوص جلسۂ تقسیم اسناد میں اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے یونی ورسٹی کے چانسلر[۲] کی حیثیت سے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ "... اگر مجھے اس پر فخر ہو تو مجھے معاف کیا جائے کہ میں خود اپنی ذہنی و اخلاقی نشو و نما کے لیے ایک جرمن یونی ورسٹی کا حد درجہ ممنون احسان ہوں"۔ اسی طرح پونا یونیورسٹی کی جرمن ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ "کوئی چالیس برس ہوئے میں نے جرمن سیکھی۔ اس عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اسے بھول جاؤں۔ میں تقریباً روز ہی اسے پڑھتا ہوں اور میں اس کا بے جھجک اعتراف کرتا ہوں کہ اسی کی وجہ سے ذہنی طور پر بہت کچھ مالدار اور تونگر ہوں... جرمن زبان میں استقامت و صلابت ہے اور اپنے عظیم مصنفین کی بدولت اس میں ایسی صفائی و شستگی اور نزاکت و لطافت بھی پائی جاتی ہے کہ اگر اس کے سیکھنے میں زحمت اٹھانی پڑے تو وہ اس زحمت کی سزاوار اور مستحق ہے[۳]"۔

۱۔ یہ تقریر جرمن زبان میں ہے اور اس کی ایک کاپی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں محفوظ ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ راقم الحروف کے لیے جامعہ کے پروفیسر محمد امین صاحب (صدر شعبۂ علوم حیاتیاتی) نے کیا۔ یہ تلخیص و ترجمہ اسی انگریزی ترجمہ سے ہے۔

۲۔ ذاکر صاحب اس وقت جمہوریۂ ہند کے نائب صدر تھے اور دہلی یونی ورسٹی کے ایکٹ کے مطابق نائب صدر یونی ورسٹی کا چانسلر ہوتا ہے۔

۳۔ ذاکر صاحب نے یہ تقریر ۲۱ر نومبر ۱۹۶۲ء کو کی تھی جس میں انھوں نے جرمن زبان و ادب کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے جرمن زبان و ادب کی خوبیاں بھی بیان کی تھیں۔ یہاں یہ بات لکھنے میں کوئی حرج نہیں کہ ذاکر صاحب کو جرمنی کی ہر چیز پسند تھی، بلکہ اس ملک ہی سے انھیں ایک خاص تعلق تھا۔ ۱۹۵۴ء میں عابد صاحب جرمنی گئے تھے، غالباً ایک سال کے لیے۔ جانے سے پہلے انھیں علی گڑھ سے ذاکر صاحب کا ایک خط ملا تھا۔ لکھا تھا: "جرمنی پہنچ کر مجھے ضرور خط لکھیے گا، چاہے مجھے لکھنے کی توفیق ہو یا نہ ہو۔ سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے یہ کم نصیب ملک بہت عزیز ہے"۔ (۲۶ر مئی ۱۹۵۴ء)

جرمن یونی ورسٹیوں کی خالص علمی فضا سے ذاکر صاحب متاثر تو تھے ہی لیکن اس کے علاوہ اُن پر اس بات کا بھی گہرا اثر پڑا کہ جنگ عظیم کی بربادیوں پر جرمن قوم کس طرح اپنے فکر و عمل کی دنیا کو بہتر طور پر آباد کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہے! شکست و ہزیمت، ذلت و نکبت کی اس بوجھل فضا میں جو ناقابل برداشت تاوانِ جنگ اور بھاری صنعتوں کی آبادکاری و بحالی سے متعلق اہانت آمیز شرائط کے بارے اور بھی بوجھل ہو گئی تھی، یہ جرمن قوم ہی کی ہمتِ مردانہ تھی جس نے اسے نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ بین الاقوامی دنیا میں وہ سر اُٹھا کر چلنے لگی۔ ذاکر صاحب نے جرمنی کے تعمیرِ نو کے اداروں اور اُن خیالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جو ان اداروں کے پیچھے کارفرما تھے۔ انھوں نے ایسے کئی تعلیم کا کام کرنے والوں سے ملاقات کی جو تجرباتی اسکول چلا رہے تھے، اور ایسے چند اسکول دیکھے بھی۔ ان تجرباتی اسکولوں میں زیادہ تر ایسے تھے جن کی خصوصیت اساتذہ کا باہمی اشتراکِ عمل اور تعاون تھا جنھوں نے مل کر ان اسکولوں کو قائم کیا تھا۔ جب تک اساتذہ کے خیالات میں ہم آہنگی اور مل جل کر کام کرنے کی امنگ رہتی تھی، یہ اسکول چلتے رہتے تھے، جیسے ہی اختلافات نے راہ پائی یہ ختم ہو گئے۔

آپا جان، مس گرڈا فلپس بورن دسمبر ۱۹۳۲ء میں جامعہ تشریف لائیں اور یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو وہ باضابطہ جامعہ کے اسٹاف میں شامل ہو گئیں۔ جامعہ آنے سے قبل انھیں اصرار کے ساتھ مشورہ اور انتباہ دیا گیا تھا کہ وہ جامعہ کی خدمت کے ارادے سے ہندستان نہ آئیں اس لیے کہ ان کے لیے جامعہ کی سخت زندگی ناقابلِ برداشت ہوگی، لیکن وہ جامعہ آگئیں، اور آنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا جرمنی میں جیسے حالات رونما ہو رہے تھے ان میں یہودیوں کا مستقبل تاریک تھا۔ خود ان کے اپنے خاندان کے لوگ منتشر ہو رہے تھے اور جلاوطنی کی زندگی کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا۔ پہلے تو وہ فلسطین گئیں، اور وہاں کچھ عرصے قیام کے بعد ذاکر صاحب کو اطلاع دی کہ وہ ہندستان آرہی ہیں۔ ذاکر صاحب انھیں لینے کے لیے بمبئی گئے اور

انھیں جامعہ لے آئے۔

آپا جان، مس گرڈا فلپس بورن کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ یہی وہ خاتون تھیں جو برلن میں یونی ورسٹی کے علاوہ ذاکر صاحب کو جرمنوں کی ذہنی اور ثقافتی دنیا سے روشناس کرانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی تھیں۔ چٹو کی سب سے چھوٹی بہن مسز نمبیار کو اس سے بڑی دلچسپی تھی کہ مہذب اور خوش اخلاق جرمنوں اور ہندستانیوں کے درمیان میل جول کے مواقع فراہم کریں۔ اس کے لیے وہ شام کی پارٹیوں کا انتظام کیا کرتی تھیں، ایسی ہی ایک پارٹی میں ذاکر صاحب وغیرہ مس گرڈا فلپس بورن سے پہلی بار ملے۔ کچھ دنوں بعد ان پارٹیوں کا سلسلہ بند ہو گیا اور ان لوگوں کی سماجی مشغولیتیں ختم سی ہو گئیں۔ آپا جان کے انتقال پر مجیب صاحب نے ان کی یاد میں جو مضمون لکھا تھا اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ "(برلن میں) گھر پر ایک روز ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ 'جب سے وہ دعوتیں بند ہو گئیں نئے لوگوں سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی'۔ شاید انھیں اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

"شاید لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا معقول لوگوں سے ملنا انھیں کی عنایت سے ہو سکتا ہے۔

"پھر کچھ کیجیے نا!

"کیا کروں۔

"مس فلپس بورن ہی کو ٹیلیفون کیجیے۔

"آپ نے اچھا یاد دلایا، ابھی کرتا ہوں

"ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تو میں پاس کھڑا تھا۔ چائے کی دعوت میں میں بھی بلایا گیا۔"[۲]

۱۔ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ محمد مجیب، "آپا جان، مس گرڈا فلپس بورن"، جوہر (جامعہ جوبلی نمبر)، صفحہ ۲۶۶

اس طرح ۱۹۲۲ء میں، یہ اس دوستی کا آغاز تھا جس کی گہرائیوں کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور جو ۱۹۴۳ء تک برقرار رہی جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آپا جان کا انتقال ہو گیا جہاں وہ جامعہ کے قبرستان میں دفن ہیں[1]۔ وہ برلن کے ایک خوشحال یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اپنی تینوں بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہنرمند تھیں۔ انھوں نے میونخ کے مشہور اسکول میں گانا سیکھا تھا۔ وہ اس فن کو برتتی رہتیں تو خاصی مشہور ہو جاتیں، ان کی معقول آمدنی ہوتی اور وہ اپنی زندگی آرام اور اطمینان سے گزارتیں، لیکن اطمینان سے رہنا انھیں گوارا نہ تھا[2]۔

مس فلپس بورن کی دلچسپیوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، اور وہ تعلیم کا کام کرنے والوں میں ممتاز افراد اور مشہور موسیقاروں، آرکسٹرا کے نغمہ سازوں، ڈراما نویسوں اور آرٹسٹوں سے ذاتی طور پر واقف تھیں۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی، شاید اُن میں اُس اعلا و ارفع روحانی وجد میں پرواز کی صلاحیت زیادہ تھی جسے بقول مجیب صاحب جرمن Begeisterungsfähigkeit کہتے ہیں، اور انھیں دولت بھی حاصل تھی اور سماجی حیثیت بھی۔ جب انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کو جانا اور سمجھا اور انھیں اُن کی دلچسپیوں کا علم ہوا، تو وہ اسی میں پوری طرح لگ گئیں۔ انھوں نے نہ معلوم کتنے ممتاز جرمنوں سے ذاکر صاحب کی ملاقات کرائی جنھیں موسیقی، ادب اور کلچر کے دوسرے پہلوؤں سے دلچسپی تھی۔ مس فلپس بورن کے ساتھ ذاکر صاحب نے موسیقی کی بہترین

۱۔ ذاکر صاحب نے اپنی کتاب 'تعلیمی خطبات' کا انتساب ۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو مس فلپس بورن کے نام ان الفاظ میں کیا تھا: "آپا جان گرڈا فلپس بورن کے نام: آپا جان! اس کتاب کے آخری حصے آج چھپ کر آئے ہیں۔ ان تقریروں میں میں نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے، اس میں آپ کا بہت حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ اجازت دیں تو اس مجموعے کو آپ کے نام منسوب کروں۔"

۲۔ آپا جان، مس گرڈا فلپس بورن سے ذاکر صاحب، جامعہ اور اہلِ جامعہ سے دوستی کی داستان مجیب صاحب کی کتاب اور مذکورہ مضمون سے ماخوذ ہے۔

محفلوں میں شرکت کی، بہترین اوپیرا، ڈرامے، آرٹ کی نمائشیں اور اسکول دیکھے، غرض انھیں کی رہنمائی میں جرمن تعلیم، ثقافت اور فنون لطیفہ کے خوبصورت ترین پہلوؤں سے ذاکر صاحب روشناس ہوئے۔ لیکن اتنی گہری دوستی کے باوجود دونوں کی اپنی اپنی زندگی تھی اور اسے وہ الگ الگ گزارتے تھے۔ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ جہاں تک ذاکر صاحب کا تعلق ہے، اس دوستی میں رومانیت کی کوئی خوبو بھی نہیں تھی، اور اگر کبھی رومانی تعلق کے مسئلے پر گفتگو چھڑ جاتی تو وہ اس کے خلاف بڑے شستہ، پُرزور، پُروقار اور دانشورانہ انداز میں گفتگو کرتے اور اپنے موقف کو تسلیم کرا لیتے۔

مس گرڈا فلپس بورن کے علاوہ ایک اور یہودی خاتون تھیں جو ذاکر صاحب کا بڑا خیال رکھتی تھیں اور ہر وقت اس فکر میں رہتی تھیں کہ وہ کس طرح ان کی مدد کریں۔ ان کا نام فراؤلین ہشت تھا اور انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کی عمر کا تعین مشکل تھا، تیس کے مقابلے میں چالیس سے زیادہ قریب لگتی تھیں۔ ان کے بال گھنے تھے اور سر خاصا بڑا تھا، شاید انھیں کے بوجھ سے ان کے جسم میں ایک نمایاں خم تھا۔ اُن کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں جن میں صدیوں کا دکھ درد اور آیندہ بھی یہودیوں کو جو مصائب پیش آنے والے تھے، سب کچھ سمٹ آیا تھا۔ مجیب صاحب بڑی ہمت کر کے ان کی طرف دیکھتے تھے اور گفتگو تو شاید انھوں نے مس ہشت سے کبھی کی ہی نہیں۔ انھوں نے ذاکر صاحب کے بہت سے متفرق کام کیے، ان کی تھیسس کے ترجمے میں مدد کی اور اسے ٹائپ بھی کیا۔ بس یہی سب کچھ تھا جو وہ ذاکر صاحب کے لیے کر سکتی تھیں۔ لیکن وہ اسے کافی نہیں سمجھتی تھیں، ذاکر صاحب ان کے اس جذبے کی قدر تو کر سکتے تھے لیکن اس کا کوئی علاج ان کے پاس نہ تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ذاکر صاحب کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ گفتگو کا انداز بڑا دلآویز تھا۔ ذہانت اور حاضر جوابی جس میں موقع و محل کے لحاظ سے مزاح کا ایک لطیف عنصر بھی ہوتا، اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ، بے چارگی اور بے بسی کا موقع ہو تو اس میں بھی ایک حُسن اور معصومیت ـــــ یہ اور اسی طرح کے ان کے دوسرے

اوصاف مَردوں کے اُس 'ٹائپ' کی یاد دلاتے تھے جو یورپ کی مہذب خواتین کے حلقے میں پسندیدگی اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ داڑھی کی خاص تراش خراش کے ساتھ نیک خیال، نیک ارادہ، نیک عمل اور قلب و نظر کی طہارت کے سبب ان کے چہرے پر وہ جو ایک معصوم اور پاکیزہ چمک تھی اس سے عیسائی خواتین کو ان کے چہرے بشرے میں حضرت مسیحؑ کی شکل و صورت کی ایک جھلک محسوس ہوتی تھی' اور ہم نے سنا ہے کہ کبھی کبھی اس سلسلے میں ان میں آپس میں گفتگو بھی ہوتی تھی ــــــ اور یہ نیک خیال، نیک عمل، نظر کی طہارت اور قلب کی بیداری ذاکر صاحب کی افتادِ طبیعت کے تہذیبی چوکھٹے میں 'حیا' کے شعور و احساس کی مرہونِ منت تھی جسے جزوِ ایمان کہا گیا ہے اور اسی کے سہارے مغرب کی مخلوط سوسائٹی میں جس سے پہلے پہل ان کو سابقہ پڑا تھا' بقول عابد صاحب وہ 'در ایام جوانی چناں کہ افتد دانی' کی وادیِ پُرخار سے بڑی پامردی کے ساتھ گزرے اور اپنا دامن بچائے قدم بڑھاتے چلے گئے۔ راہِ زندگی میں منکرات کے کانٹوں سے دامن بچاکر گزر جانے ہی کا نام تقوا ہے۔

ذاکر صاحب جس زمانے میں جرمنی میں تھے' وہ جرمن قوم کی سخت آزمایش کا زمانہ تھا۔ جرمنوں نے پہلے بھی جنگیں لڑی تھیں' اپنوں سے بھی اور دوسروں سے بھی' لیکن ۱۸۷۰۔۷۱ء میں اتحادِ جرمنی کی تحریک کے نتیجے میں ایک نئی جرمن قوم وجود میں آئی تھی۔ جرمنی کے مفکروں' شاعروں اور فنکاروں نے اسے اخلاقی و روحانی اقدار کی اساس فراہم کی تھی اور اس کے ٹکنیکی ماہروں' حوصلہ مند صنعت کاروں اور مہم جو تاجروں نے اسے امید و حوصلے سے معمور کر رکھا تھا۔ اب یہ قوم حدودِ جرمنی سے باہر نکل کر اپنی سیاست و تجارت کی دنیا کو وسیع کرنا اور اپنے افکار کا دائرۂ اثر بڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن جب جرمن قوم کی یہ حوصلہ مندیاں یورپ کی طاقت ور اقوام کے قومی مفاد سے ٹکرائیں تو جنگ عظیم ہوئی اور مغربی تہذیب کے پورے نظامِ اقدار کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ جرمنی اس جنگ عظیم میں ہار گیا اور ایک ہاری ہوئی قوم کی حیثیت سے اسے سب سے زیادہ ان اقدار کے بارے میں شبہہ ہوا جن پر اس کو یقین و اعتماد تھا۔

اب اسے اُس خاکستر سے اپنی ایک نئی دنیا بنانی تھی جسے جنگ کے شعلے چھوڑ گئے تھے۔

ذاکر صاحب جرمنوں کی تعمیرِ نو کی کوشش اور بہا ہمی کو دیکھ رہے تھے، اور چونکہ جرمنی میں مطالعے اور مشاہدے کے سوا ان پر اور کوئی ذمّے داری نہیں تھی، اس لیے ان کے پاس یہ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے کافی وقت تھا کہ کس طرح مصائب و آلام، اگر کسی میں جینے کا حوصلہ ہو، نئی زندگی کی تعمیر کا گارا اور مسالا بن جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ دیا تھا جو یہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی تعصب و تنگ نظری کے ہر قوم کی تعمیری صلاحیتوں کا اعتراف کرے اور ان سے متاثر ہو۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسی قوم کے درمیان ہیں جو وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کرنے کے لیے جسے وہ جنگ میں کھو چکی تھی، سخت جد و جہد کر رہی ہے۔ وہ اپنے مسائل کو سمجھتی ہے، نئے خیالات پر توجہ دیتی ہے، نئی باتوں کے پتا چلانے اور نئی تعمیر کے کام میں دیوانہ وار جُٹی ہوئی ہے۔ جُزئیات کے سلسلے میں حد درجہ باریک بیں ہے اور اسی پر اس کے کمالِ فن کے تصور کی بنیاد ہے۔ جب کام کرتے ہیں تو تھکنے کا نام نہیں لیتے، اور دیانت داری سے جی لگا کر کام کرنا ہی ان کے نزدیک عرفانِ ذات کی سب سے اچھی صورت ہے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جرمن اپنے خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنے کے بجائے اس بات کے زیادہ خواہشمند ہیں کہ وہ اپنے ذہن کے افق کو اور وسعت دیں۔ گاندھی جی پر رومین رولاں کی کتاب بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوئی تھی اور اُن دنوں ہر معقول ہندستانی طالب علم کو یہ احساس تھا کہ جرمنی میں لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ہندستان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانیں، یہ خواہش دراصل اعلا اقدار کی تلاش کے ساتھ اپنی شخصیت کو پہچاننے کی ایک آرزو بھی تھی۔ ناممکن تھا کہ ذاکر صاحب جیسا حساس ایک ہندستانی نوجوان جرمن قوم کے فکر و خیال کی دنیا کے اس ہیجان اور نت نئی ذہنی و جمالیاتی سرگرمیوں سے متاثر نہ ہوتا ـــــ اور وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ یہاں انھیں زندگی کا ایک نیا نظریہ ملا، ان میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ ایک بہتر نمونے کے مطابق اپنی دنیا کی از سرِ نو تشکیل کریں،

اور بقول اقبال جو اُن کے لیے فیضان کا ایک دوسرا سرچشمہ تھے، یہ خیال گزرا کر

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

اور یہیں ایک ایسے انسان کو وجود میں لانے کی تمنا بھی بیدار ہوئی جو نقال، مقلد اور غلام بننے کے بجائے، تخلیق کار ہو، یہیں انھیں یہ حوصلہ بھی ملا کہ اب تک کے بیکار پڑے تمدنی وسائل کو کام میں لا کر زندگی کو مالا مال کریں، اور اسی ملک میں شاید پہلی بار ان میں وہ بے اطمینانی اور بے صبری بھی پیدا ہوئی جو انسان کی تخلیقی صلاحیت کو بروے کار لاتی ہے اور اس صلاحیت کے مرئی نقوش کو دوام بخشتی ہے۔

پانچواں باب

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

(۱۹۲۶ — ۱۹۴۸)

ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے گئے تھے، لیکن ان کے جامعہ کے احباب انھیں جامعہ کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ گاندھی جی کی ترکِ موالات کی تحریک میں بہت سے سیاسی رہنما اور کارکن گرفتار کیے گئے تھے اور ملک کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے، حکومت کے سخت رویّے نے بھی کمزور دل والوں کی ہمتیں پست کر دی تھیں، خلافت کے تقریباً سبھی رہنما پکڑے گئے تھے، ذاکر صاحب ستمبر کے مہینے میں جرمنی پہنچے تھے، اسی سال شروع میں (فروری ۱۹۲۲ء) چوری چورا اور چند دوسرے مقامات پر تشدد کے واقعات کی وجہ سے گاندھی جی نے اپنی ترکِ موالات کی تحریک واپس لے لی۔ اُدھر جنگِ عظیم کے بعد ترکی میں ترک قوم پرستوں نے صلح نامہ سیورے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور برطانیہ کی شہ اور پشت پناہی سے یونانیوں کی جو فوج تیزی سے انگرہ کی طرف بڑھ رہی تھی اُسے سکاریہ کی لڑائی میں مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ایسی شکست ہوئی کہ ترک فوجیں یونانیوں کا ازمیر (پرانا نام: سمرنا) تک تعاقب کرتی چلی گئیں اور پھر ازمیر سے بھی انھیں بھگا کر سمندر میں ڈھکیل دیا۔ ترکوں کی اس قومی جنگ میں "خلیفۃ المسلمین" کا [illegible] ادھر [illegible] نیشنلسٹ ترکوں کو خلیفہ اور خلافت

کے ادارے سے جذباتی تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ خود دنیائے اسلام میں، اور خاص طور پر اس برصغیر (ہند و پاک و بنگلہ دیش) میں، اُس وقت کے سب سے بڑے ہیرو مصطفےٰ کمال تھے جن کی قیادت میں رفتہ رفتہ جمہوریۂ ترکیہ کی نیشنل اسمبلی نے پہلے تو خلیفہ کے اختیارات محدود کیے اور پھر مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا۔ ہندستان کی تحریک خلافت کا یہ بہت بڑا نشیب تھا، اِس نشیب کے بھنور میں شیر دل مولانا محمد علی نے بہت پیچ و تاب کھایا، کمال اتاترک کو تار دیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے نمایندوں کا ایک وفد ترکی جائے گا جو ان سے مسئلۂ خلافت پر تبادلۂ خیال کرے گا، لیکن انھیں اس تار کا کوئی جواب نہیں ملا، اور جیسا کہ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں بعد میں خالدہ ادیب خانم سے معلوم ہوا کہ ہندستان کی خلافت کمیٹی نے جو رقمیں ترکی بھیجی تھیں انھیں مصطفےٰ کمال نے اپنی پارٹی کی تنظیم پر خرچ کیا[1]۔

دیکھا جائے تو اب خلافت کمیٹی کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا، اور ہوا بھی یہی کہ رفتہ رفتہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا فوری سبب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں تھیں، انھیں سے جامعہ کو اس وقت تقویت حاصل تھی، ان میں سے اب جب کہ ایک ختم ہو گئی تھی اور دوسری بے جان تھی، تو ہم جامعہ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جامعہ خلافت کمیٹی کی مالی امداد سے چلتی تھی، یہ امداد پہلے تو کم ہوئی کہ خود خلافت کمیٹی کی آمدنی کم ہو گئی تھی، اور پھر بند ہو گئی۔ اب جامعہ کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور اس کے بیشتر ٹرسٹیز میں، قومی تحریکوں کی ناکامی کے سبب جن کے حوصلے پست تھے اس کے بند کر دیے جانے کے چرچے ہونے لگے تھے۔ خود مولانا محمد علی کے یہاں بھی جو درحقیقت اپنے کعبۂ مقصود یعنی علی گڑھ کالج کو فتح کرنے اور اسی کو قومی یونی ورسٹی بنانے کا خواب دیکھا کرتے تھے، اب جامعہ کو قائم رکھنے کے سلسلے میں وہ پہلے جیسا جوش و خروش نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۴۰

رہنماؤں میں گاندھی جی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ قومی زندگی میں جامعہ ملیہ جیسے آزاد تعلیمی ادارے کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ قائم رہے اور ترقی کرے۔ ان کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ، سینیر طلبہ اور کارکنوں کی ایک مخلص جماعت بھی اپنے خون جگر سے سینچے ہوئے اس پودے کو زندہ اور سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اس کڑے وقت میں انھوں نے ذاکر صاحب کو بہت یاد کیا، انھیں اس کا یقین تھا کہ ذاکر صاحب جیسا مخلص، شریف النفس، باہمت اور حوصلہ مند نوجوان جرمنی سے واپس آکر جامعہ کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے گا۔ ان لوگوں نے انھیں تار بھجوایا کہ فاؤنڈیشن کمیٹی جامعہ ملیہ کو بند کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے! جواب آیا: "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"[1] غالباً یہی زمانہ ہے جب برلن میں ایک دن ذاکر صاحب نے عابد صاحب اور مجیب صاحب سے جامعہ اور اس کی مشکلات کا ذکر بڑی فکرمندی سے کیا اور کچھ اس طرح کی بات کی کہ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ انھیں ہندستان واپس جاکر اس کے کام میں ہاتھ بٹانا ہے، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ عابد صاحب نے پیش کش کی کہ وہ بھی جامعہ میں کام کریں گے۔ اس پر مجیب صاحب نے بھی جامعہ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ذاکر صاحب نے ان کی طرف کچھ شبہہ کی نگاہ سے دیکھا اور تھوڑی دیر بعد کہا "نہیں، آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے۔ جامعہ آپ کے لیے موزوں جگہ نہیں ہوگی۔ آپ وہاں چل کر کیا کریں گے۔" انھوں نے کہا کہ "جو آپ کریں گے وہی میں بھی کروں گا۔" ذاکر صاحب نے کہا کہ "میرا معاملہ مختلف ہے۔ میرا تو یہ عہد ہے۔" لیکن جب مجیب صاحب نے اصرار کیا تو ذاکر صاحب نے کہا کہ "اگر میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں اور ایک ویران میدان میں پہنچ کر کہوں کہ جامعہ ملیہ یہی ہے تو کیا آپ اسے یقین کرلیں گے۔" مجیب صاحب

1- عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحہ ۶۹

نے کہا کہ "اگر آپ کہیں گے تو میں یقین کر لوں گا"۔ اس پر ذاکر صاحب نے انھیں گلے لگا لیا اور کہا کہ "اچھا آپ بھی جامعہ چلیے"۔[1]

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی میں

ذاکر صاحب کا جواب پاکر طلبہ کا ایک وفد دہلی جاکر حکیم اجمل خاں مرحوم سے ملا اور اُن سے درخواست کی کہ ذاکر صاحب کے آنے تک وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ ان طلبہ نے حکیم صاحب کو جامعہ کے لیے اپنی طرف سے ہر طرح کے ایثار اور قربانی کا بھی یقین دلایا۔ اس پر انھوں نے اس وفد کو اطمینان دلاکر واپس علی گڑھ بھیج دیا۔ ۲۸ر اور ۲۹ر جنوری ۱۹۲۵ء کو دہلی میں حکیم صاحب کی رہائش گاہ "شریف منزل" میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے ہوئے جس میں بالآخر یہ طے پایا کہ جامعہ کو جاری رکھا جائے گا اور اس کو مستحکم بنانے کی تدبیریں کی جائیں گی۔ ۲۹ر جنوری کے جلسے میں گاندھی جی بھی موجود تھے۔ انھوں نے حکیم صاحب کی ہمت بندھائی اور کہا کہ مشکلات اور مالی پریشانیوں کے باوجود جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا' چاہے اس کے لیے مجھے بھیک مانگنی پڑے'۔ گاندھی جی کی اس پیش کش پر ۱۷ر مارچ ۱۹۲۵ء کو حکیم صاحب نے فاؤنڈیشن کمیٹی سے جس کا جلسہ علی گڑھ میں ہوا تھا' یہ منظور کرا لیا کہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو علی گڑھ سے منتقل کر دیا جائے[2] اور شیخ الجامعہ (عبدالمجید خواجہ) کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ

۱۔ محمد مجیب، "مجیب صاحب کی خود نوشت سوانح" (تلخیص و ترتیبہ از ضیاء الحسن فاروقی)' ماہنامہ جامعہ (مجیب نمبر) بابت ستمبر' اکتوبر ۱۹۸۴ء' صفحات ۳۶۔۳۷؛ مزید دیکھیے: محمد مجیب' حوالہ سابق' صفحہ ۴۱۔

۲۔ اس سلسلے میں مولانا شوکت علی اور ان کی پارٹی جامعہ کے "نقل مکانی" کے حق میں نہ تھی۔ ۱۱ر فروری ۱۹۲۵ء کو حکیم صاحب نے عبدالمجید خواجہ کو لکھا: "... مولانا شوکت علی صاحب سے باتیں ہوگئیں۔ ڈاکٹر انصاری اور میں نے اس عزم کا اظہار کر دیا کہ جامعہ دہلی ہی میں آنی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ہم لوگ اپنی ذمّے داری سے جدا ہو جائیں گے۔ بالآخر وہ خاموش ہو گئے۔ اب آپ یہ سمجھ لیں کہ جامعہ کو دہلی ہی میں لانا ہے"۔ (عبدالمجید خواجہ پیپرس' نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری' نئی دہلی)

انھوں نے جامعہ کو دہلی لے جانے کے لیے ضروری انتظامات شروع کر دیں۔ چنانچہ ۲۶-۱۹۲۵ء کا جامعہ کا تعلیمی سال قرول باغ دہلی میں طبیہ کالج سے متصل کرایے کی چند کوٹھیوں میں شروع ہوا۔

مارچ ۱۹۲۵ء کے اس اہم فیصلے کے بعد کہ جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے، حکیم اجمل خاں مرحوم نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مشورے سے یورپ کے سفر کا پروگرام بنایا۔ اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر کیا تھا، اس وقت ان کی زندگی کا نصف النہار تھا، لیکن اس بار ملک کے سیاسی انتشار اور ہندو مسلم مناقشات نے ان کا دل توڑ دیا تھا، ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی، اور یہ گویا اُن کی زندگی کی شام تھی، اور شام بھی کیسی، اُداس اُداس، دھواں دھواں، دل بٹھا دینے والی ــــ یورپ میں وہ طبی ماہرین سے اپنی گرتی ہوئی صحت سے متعلق مشورہ کرنا چاہتے تھے، لیکن غالباً اس سفر کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ چند روز کے لیے مُلک کی تاریک فضا سے دور رہ کر قدرے سکونِ قلب حاصل کریں۔

اپریل ۱۹۲۵ء کے اواخر میں حکیم صاحب پیرس پہنچے جہاں ان کا ایک ماہ قیام رہا۔ وہیں پیرس میں ذاکر صاحب حکیم صاحب سے ملے۔ وہ ۱۹۲۵ء کے شروع میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ضروری مواد و ماخذ کی تلاش میں لندن گئے ہوئے تھے۔ لندن سے برلن واپس ہوتے ہوئے ذاکر صاحب نے پیرس میں حکیم صاحب سے ملاقات کی اور ان میں باہم جامعہ کے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ ذاکر صاحب نے انھیں جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا یقین دلایا[1] اور پیرس سے جب حکیم صاحب

۱۔ شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ کو حکیم صاحب نے ۱۴ر مئی ۱۹۲۵ء کو پیرس سے لکھا تھا: "ذاکر بھی لندن میں ہیں اور غالباً ایک ہفتہ کے بعد ملنے کے لیے وہ بھی آئیں گے، اور ممکن ہوا تو پیرس سے ہمارے ہم سفر ہو جائیں گے۔ وہ برلن اور ہم سوئٹزر لینڈ چلے جائیں گے۔ آج ان کا خط لندن سے آیا تھا۔ جامعہ ملّیہ کے نقل مکان سے جس کے مکانوں کا غالباً آپ نے ابھی تک انتظام نہیں کیا ہوگا' (باقی اگلے صفحے پر)

اور ڈاکٹر انصاری سوئٹزر لینڈ کی سیاحت کرتے ہوئے ایک طبی نمائش دیکھنے کے لیے وی آنا (آسٹریا) پہنچے تو ذاکر صاحب نے عابد صاحب، مجیب صاحب، خواجہ عبدالمجید اور اور برکت علی قریشی کو حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے ملنے کے لیے وی آنا بھیجا۔ ذاکر صاحب چونکہ حکیم صاحب سے مل چکے تھے اور ان دنوں اپنے امتحان کی تیاری میں بھی مصروف تھے، اپنے ان دوستوں کے ساتھ وی آنا نہیں گئے[1]۔ حکیم صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا:

"گو وی آنا ہمارے پروگرام میں نہ تھا لیکن جب ہمیں لوزین میں اس طبی نمائش کا حال معلوم ہوا تو اسے اس وجہ سے پروگرام میں داخل کرنا پڑا کہ ہم طبیہ کالج کے لیے جو چیزیں خریدنی چاہتے ہیں ان کے انتخاب کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے ان عزیزوں نے جو برلن میں تعلیم پا رہے ہیں اور جامعہ کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں، ایک تعلیمی خاکہ کھینچا تھا۔ اس لیے انھوں[2] نے برکت علی صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب، عابد حسین صاحب

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) وہ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہم چھ آدمی برلن سے اور غالباً دو لندن سے جامعہ ملیہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ امید ہے کہ یہ لوگ حبیب اور ہادی کی سنت کی پیروی کرنے والے ثابت نہ ہوں گے۔" (عبدالمجید خواجہ پیپرس، نہرو میوزیم لائبریری) ـــــ پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر ہادی حسن عدم تعاون کر کے جامعہ ملیہ آ گئے تھے، لیکن تھوڑے دنوں بعد وہ جامعہ چھوڑ کر مسلم یونی ورسٹی کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، حکیم صاحب کے خط میں اشارہ انھیں دونوں بزرگوں کی طرف ہے۔

۱۔ کے۔ اے۔ حمید، حوالۂ سابق، صفحہ ۲۴

۲۔ یہ اشارہ خاص طور پر ذاکر صاحب کی طرف ہے۔

اور مجیب صاحب کو ہمارے پاس اس غرض سے بھیجا کہ ہم بھی اس تعلیمی اسکیم پر
غور کرلیں اور اپنی رائے بھی ان پر ظاہر کریں۔ یہ سب لوگ ۱۰ر جولائی کو دلی آنا
پہنچے اور اپنی آرزوؤں کا ایک بڑا حصہ ہم لوگوں نے ان اعزہ کی نذر خوشی
سے کر دیا۔[1]

ذاکر صاحبؒ کے جرمن اساتذہ

دہلی میں مغربی جرمنی کے سفارت خانے کے توسط سے ذاکر صاحب سے متعلق برلن یونی ورسٹی سے جو کاغذات ہمیں موصول ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ پی ایچ ڈی کے لیے ان کا خاص مضمون نیشنل اکونومی تھا اور اس کے ساتھ دو ضمنی مضامین فلسفہ اور عربی تھے جنھیں ہماری یونی ورسٹیوں میں Subsidiaries کہتے ہیں۔ ذاکر صاحب جس زمانے میں جرمنی گئے تھے اس وقت صورت یہ تھی کہ اگر کوئی ہندستانی طالب علم انٹرمیجیٹ پاس کرکے وہاں اعلا تعلیم کے لیے جاتا تو اُسے پی ایچ ڈی کورس میں داخلہ مل جاتا تھا، اور ذاکر صاحب تو ایم۔اے (معاشیات) کا پہلا سال پاس کرکے یہاں سے گئے تھے۔ اعلا تعلیم کے جرمن نظام میں اِس وقت پی ایچ ڈی کی تعلیم کے ۱۲ سمسٹر ہوتے تھے، ذاکر صاحب چونکہ اپنی انٹرمیجیٹ کی سطح کی تعلیم کے بعد تین سال (۲ سال بی، اے، کے اور ایک سال ایم، اے، سال اوّل کے) یعنی کوئی چھ سمسٹر اعلا تعلیم میں گزار چکے تھے، اور علی گڑھ کے ایم، ایم شریف (پروفیسر فلسفہ) اور پروفیسر ہادی حسن (پروفیسر فارسی) نے ان کی علمی قابلیت، تقریر و تحریر کی اعلا صلاحیت اور کردار و حُسنِ اخلاق سے متعلق بہت اچھے سرٹیفکٹ دیے تھے، اس لیے انھیں اپنے پروفیسروں کی سفارشں پر کہ وہ برلن یونی ورسٹی کے بھی ایک محنتی، دیانت دار اور اچھے طالب علم

۱۔ قاضی محمد عبدالغفار، حیاتِ اجمل، ۱۹۵۰ء، صفحات ۳۵۲-۳۵۱

تھے، پانچ سمسٹر کے بعد ہی امتحان دینے کا اہل سمجھ لیا گیا تھا۔ چنانچہ ان کا زبانی امتحان ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوا، پروفیسر زومبارٹ اور پروفیسر زیرنگ ان کے ممتحن تھے۔ اور معاشیات میں یہ دونوں ان کے خاص استاد بھی رہے تھے۔ امتحان میں کامیابی کا ان کا گریڈ Valde Laudabile (بہت زیادہ قابل تحسین) تھا جرمنی کی یونیورسٹیوں میں اس وقت یہ قاعدہ تھا کہ ڈگری اس وقت ملتی تھی جب امیدوار زبانی امتحان میں کامیابی کے بعد اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی مطبوعہ ایک سو پچاس کاپیاں یونی ورسٹی میں داخل کرتا تھا۔ اور یہاں دہلی میں اُس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جو حالات تھے ان کا تقاضا تھا کہ ذاکر صاحب جلد از جلد جامعہ پہنچیں اور اس کی ذمے داری سنبھالیں، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ کچھ تو اس وجہ سے اور ممکن ہے کہ کچھ مالی دشواریوں کے سبب اس وقت فوراً مقالے کی طباعت کا موقع نہ رہا ہوگا۔ ہمارے پاس برلن یونی ورسٹی کے فیکلٹی آف فلاسفی کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر فان فکر کے نام پروفیسر زیرنگ اور پروفیسر زومبارٹ کی ایک مشترک تحریر کی مستند نقل ہے جو ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء لکھی گئی ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ مسٹر ذاکر حسین جن کے مقالے "ہندستان میں برطانیہ کی زرعی پالیسی" سے متعلق زبانی امتحان ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو لیا جا چکا ہے، نیشنل مسلم یونیورسٹی، دہلی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں پروفیسر ہیں جہاں اساتذہ کی تنخواہیں زیادہ نہیں ہیں، اس لیے ہماری سفارش ہے کہ انھیں مقالے کی ایک سو پچاس مطبوعہ جلدوں کے بجائے صرف پچھتر جلدیں جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے ان دونوں پروفیسروں نے ان کی درخواست ہی پر یہ تحریر لکھی ہوگی۔ اس وقت تک Beyer & Mann (Langensalza) سے مقالے کے چھپوانے کا انتظام ہو چکا ہوگا، چنانچہ مطبوعہ مقالے پر سنہ طباعت ۱۹۳۰ء درج ہے اور اسی میں زبانی امتحان کی تاریخ ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء اور ڈگری پانے کی تاریخ ۱۶ر مارچ ۱۹۳۰ء کا اندراج بھی ہے۔ آخر الذکر تاریخ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے قبل ان کا مقالہ کسی ہمدرد اور دوست کے توسط سے چھپ چکا تھا۔

اس سلسلے میں دو باتیں اور قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ برلن یونی ورسٹی کے ضابطے کے مطابق ذاکر صاحب کو مطلوبہ معیار کی لاطینی زبان بھی سیکھنی تھی، لیکن انھوں نے اس بنا پر اس سے استثنا چاہا تھا کہ انھوں نے دو کلاسیکی زبانیں عربی اور فارسی پہلے ہی سے سیکھ رکھی تھیں۔ اس پر ان زبانوں میں اُن کی جانچ کی گئی اور یہ تصدیق کی گئی کہ ان زبانوں میں ان کی قابلیت لاطینی زبان میں مطلوبہ قابلیت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح لاطینی زبان سیکھنے سے انھیں مستثنا کر دیا گیا تھا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ برلن یونی ورسٹی میں ذاکر صاحب نے جن اساتذہ کے سیمناروں اور لکچروں میں شرکت کی تھی، اُن کے نام اُس مختصر سوانحی نوٹ میں ملتے ہیں جو ان کے مطبوعہ مقالے کے آخر میں شامل ہے۔ وہ نام یہ ہیں:

۱۔ بکر	۲۔ بورٹ کیوچ	۳۔ برائیسگ	۴۔ ڈیٹے
۵۔ کوخلر	۶۔ ہرکنر	۷۔ مائیر	۸۔ مارکس
۹۔ رتھورخ	۱۰۔ میرواتھ	۱۱۔ شوماخر	۱۲۔ زیرنگ
۱۳۔ زومبارٹ	۱۴۔ اشپرانگر	۱۵۔ وائل	

یوں تو ذاکر صاحب کے سبھی اساتذہ اُن کے کام سے مطمئن اور خوش تھے، لیکن زومبارٹ، زیرنگ، رتھورخ اور مائیر جنھوں نے ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ان کا زبانی امتحان لیا تھا، ان سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے ان کی علمی صلاحیت سے متعلق بڑی اچھی رائے لکھی تھی۔[1] زیرنگ کی رائے اُن کے تحقیقی مقالے کے متعلق بہت اچھی تھی۔ زیرنگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: "میرے نزدیک یہ ایک بڑا علمی کارنامہ ہے"۔[2]

وطن کو واپسی

اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ یونی ورسٹی میں داخل کرنے اور ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو

۱۔ اُن کی یہ رائیں انھیں کے خط میں ہم نے دیکھی ہیں۔
۲۔ یہ رپورٹ بھی ہمارے سامنے ہے۔

زبانی امتحان کے بعد ذاکر صاحب نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہندستان واپس آنے کی تیاریاں شروع کر دیں' اور پھر فروری ۱۹۲۶ء کے اوائل میں نارڈ ائیشر لائڈ کے جہاز ایس' ایس' ڈرف لنگر سے روانہ ہو کر کولمبو پہنچے جہاں سے وہ بذریعہ ٹرین دہلی آئے۔ جامعہ میں ان لوگوں کے جرمنی سے روانہ ہونے کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ ۹ر فروری ۱۹۲۶ء کے روزنامہ ہمدرد میں ان لوگوں کی واپسی کی خبر "جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خوش بختی" کے عنوان سے شائع ہوئی اور ۱۶ر فروری کے ہمدرد میں ان کے کولمبو پہنچنے اور وہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہونے کی خبر اس طرح شائع ہوئی کہ "جامعہ میں ان کے خیر مقدم کی خاص تیاریاں کی جا رہی ہیں۔" ۱۶ر فروری ۱۹۲۶ء ہی کے ہمدرد میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے جلسۂ تہنیت کی مختصر روداد بھی ملتی ہے جس میں "اسکول کے (اس) مایہ ناز فرزند کی بخیریت مراجعت وطن پر اظہار مسرت کیا گیا تھا" اور مبارک باد کا ایک ریزولیوشن بھی منظور کیا گیا تھا' اس جلسے کی صدارت اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین صاحب نے فرمائی تھی اور اساتذہ وطلبہ کی بڑی تعداد کو خطاب اور ذاکر صاحب کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اسکول ان کی ذات پر فخر کرتا ہے۔"

ذاکر صاحب کے ایک ممتاز شاگرد جنھوں نے آگے چل کر بمبئی میں جامعہ کے لیے اپنے استاد کی سرمایہ فراہم کرنے کی کوششوں اور جامعہ کے مقاصد کی اشاعت کے کام میں بڑی مدد کی' معین الدین حارث مرحوم تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تاریخ تو اب یاد نہیں مگر فروری کا مہینا اور جاڑوں کے وہ دن ضرور یاد ہیں جن میں جامعہ کی بستی میں یہ خبر پھیلی کہ تین نوجوان . . . جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے' بہت جلد دہلی آ رہے ہیں . . . مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جامعہ کے اس وقت کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک قافلہ ان مہمانوں کے جو آگے چل کر جامعہ کے صحیح معمار ثابت ہوئے' استقبال کے لیے دہلی اسٹیشن گیا تھا تو میں بھی اس قافلے میں شامل تھا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو ایک ڈبے سے یہ

تینوں نوجوان باہر آئے ... ۴۵ سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی وہ منظر میری نظروں میں محفوظ ہے۔ قدرے بھاری جسم کے اور چہرے پر سیاہ داڑھی والے ڈاکٹر ذاکر حسین جو گھنی داڑھی کی وجہ سے اپنی عمر سے کچھ زیادہ کے معلوم ہو رہے تھے، ان کے مقابلے میں اکہرے بدن کے ڈاکٹر عابد حسین اور ان دونوں کے مقابلے میں مختصر جثے کے پروفیسر محمد مجیب۔ تینوں شخصیتیں پروقار اور ان کے چہروں پر کچھ ایسا تبسم تھا کہ ان کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہونے والوں کے دلوں کو انھوں نے موہ لیا۔ یورپ کی اعلا تعلیم سے مرصع ہوکر وطن واپسی کی خوشی تو انھیں یقیناً ہوگی، مگر اپنے لیے وہ جو میدان (عمل) طے کر چکے تھے، اس کی پہلی منزل پر پہنچ کر وہ غیرمعمولی طور پر مسرور و شاداں نظر آرہے تھے۔ ادھر ان کا استقبال کرنے والے اس خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے کہ جامعہ کی اس کشتی کو جو ادھر دو تین سال سے جھکولے کھا رہی تھی، کھیون ہار مل گئے اور اب یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ جامعہ کی یہ کشتی اپنے ساحلِ مقصود تک پہنچ سکے گی۔[1]

ذاکر صاحب دہلی میں سیدھے جامعہ ملیہ پہنچے، اس کے بعد چند روز کے لیے وہ اپنے وطن قائم گنج گئے۔[2] جامعہ میں انھیں شیخ الجامعہ کے دفتر سے متصل ایک کمرہ دے دیا گیا اور انھوں نے بغیر کسی رسمی کارروائی کے وہ عہدہ قبول کرلیا جس کی مشکلات بے پناہ تھیں، یہ عہدہ پھولوں کی سیج نہ تھی، یہ ایک ایسا سفر تھا جس کی منزل بہت دور تھی، یہ عہدہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ کار کوہکنی ہے، یہ صحرا نوردی ہے، اس کی لذت جوئے شیر کی تمنائے مسلسل اور دوریِ منزل میں ہے، یہ جو خیر مقدم کے مسرت زا جوش و خروش میں تم بھی خوش نظر آرہے ہو، اسے ایک عارضی وقفہ سمجھو، پھر تو تمھیں اس راہِ وفا میں برسوں سینے کے بل چلنا ہے، ہاں اس میں تمھارا زادِ راہ اگر ہے تو

۱۔ معین الدین حارث، "جامعہ ملیہ اسلامیہ اور عابد صاحب"، کتاب نما ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر، نومبر ۱۹۸۰، صفحہ ۲۸-۲۷

۲۔ مرتبہ مسعود حسین، "ذاکر میاں، چند یادیں، چند باتیں"، نقشِ ذاکر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۰، صفحہ ۱۲۹

صبر و استقامت، تحمل و توکل اور اللہ کی رحمت پر کامل یقین، بس نام کی معمولی سی تبدیلی کے بعد عرفی کا یہ شعر نذر ہے:

زومیدشو ذاکر د انگندہ عناں باش
ہر چند کہ از کعبۂ مقصود نشاں نیست

حکیم اجمل خاں اور ذاکر صاحبؒ

حکیم اجمل خاں مرحوم امیر جامعہ تھے اور ہندستان کی قومی اور مسلمانوں کی ملی سیاست دونوں سے اُن کا گہرا تعلق تھا، گاندھی جی کو ان پر بہت اعتماد تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے میں جو اس وقت انتشار کی زد میں تھا اور جو گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں دونوں کے سیاسی و تہذیبی مقاصد کی اصل تھا، گاندھی جی کو حکیم صاحب ہی سے تقویت حاصل تھی۔ حکیم صاحب مسیح الملک بھی تھے اور یونانی طب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، ایک ممتاز سیاسی اور مہذب شخصیت کے علاوہ ہندستان کے رجواڑوں میں ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی مان دان تھی، اور ریاستوں کے نوابین اور راجے مہاراجے انھیں علاج معالجے کے لیے بلایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایسے خاندانی رئیس تھے جو غریبوں کی ہر طرح مدد کرتے اور بحیثیت طبیب امیروں سے لے کر نادار مریضوں پر صرف کرتے تھے، اور دوسری طرف ملک و ملت کے اجتماعی کاموں میں بھی سخاوت و فیاضی سے ہاتھ بٹاتے تھے۔ ساری قوم حکیم صاحب کا احترام کرتی تھی اور دہلی کے تو وہ بے تاج کے بادشاہ تھے۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو ابھی ابھی جرمنی سے واپس لوٹے تھے اور جہاں انھوں نے قریب ساڑھے تین سال مغربی تہذیب کے آداب نہ صرف دیکھے بلکہ ان میں سے کتنے برتے بھی تھے، ایسے امیر جامعہ سے واسطہ تھا جو اپنی روشن خیالی کے ساتھ مشرقی تہذیب کے شریفانہ آداب کا رمز شناس اور ان کا ایک خوبصورت نمونہ تھا، اور ذاکر صاحب خود بھی جدید ذہن رکھتے ہوئے بنیادی طور پر مشرقی ثقافت کی اقدار

کے نہ صرف حامل بلکہ ان پر عامل بھی تھے۔ اس ثقافت میں خود اپنے احترام کے ساتھ بڑوں اور بزرگوں کا احترام، خواہ یہ بڑے بزرگ کسی قوم اور فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک اچھی اور مستحسن قدر کا درجہ رکھتا تھا، ذاکر صاحب کی طبیعت میں یہ قدر اتنی رچی بسی تھی کہ ان کا جدید جرمنی میں قیام بھی اس قدر کی چمک دمک کو ماند نہ کر سکا تھا۔ ذاکر صاحب اس وقت کے سبھی بزرگ اور ممتاز قومی قائدین اور خاص طور پر حکیم صاحب کا بہت احترام کرتے تھے، اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندستانی قوم اور مسلمانوں کی جماعت سے ان کا رابطہ انھیں قائدین کے ذریعے قائم اور مستحکم ہو سکتا تھا۔

شیخ الجامعہ کا اصل کام تو یہ تھا کہ وہ جامعہ ملیہ میں تعلیمی کام کی تنظیم کرے اور دیکھے کہ معیار کے مطابق تعلیم ہوتی ہے یا نہیں اور یہ کہ جامعہ میں علمی کام کس سطح کا ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں جامعہ در اصل تھی کہاں؟ اسے تو از سرِ نو بنانا اور اس کے لیے وسائل فراہم کرنا تھا۔ ذاکر صاحب فروری ۱۹۲۶ء میں جامعہ پہنچے تھے۔ اس سے چھ سات مہینے پہلے جامعہ علی گڑھ سے دہلی آ کر قرول باغ میں جب اگست ۱۹۲۵ء میں کھلی تھی تو اس وقت اساتذہ وطلبہ کی تعداد کُل ملا کر تقریباً اسّی تھی، اور یہی وہ مختصر سی جماعت تھی جو اکتوبر ۱۹۲۰ء کے جوش وخروش، حوصلوں اور ولولوں کی یاد دلاتی تھی اور اسی جماعت سے جس میں مختلف طبیعتوں کے ادھیڑ عمر کے لوگ اور نوجوان تھے، ذاکر صاحب کو ایک قومی ادارہ کی تعمیر کا کام لینا تھا، جس کے لیے مالی وسائل کی فراہمی اور اس کے لیے جہدِ مسلسل انھیں کی ذمے داری قرار پانے والی تھی۔

اُس وقت ملک کے سیاسی حالات اچھے نہ تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، اس لیے اس کا امکان بہت کم تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے مدد ملے گی۔ اُدھر جامعہ ملیہ جو قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھی، اپنا قومی مسلک چھوڑ نہیں سکتی تھی، خواہ ملک میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں علاحدگی پسندی کا رجحان کتنا ہی کیوں نہ بڑھے۔ اس صورت میں

اور ڈاکٹر انصاری عام مسلمانوں سے رابطے کا ذریعہ بن سکتے تھے اور ذاکر صاحب نے اس کے لیے خاص طور پر انھیں دونوں کی طرف دیکھا بھی، لیکن یہ دونوں اپنی پیشہ ورانہ اور سیاسی مصروفیتوں کے سبب جامعہ کو بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے حکیم صاحب تو جامعہ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اس کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے اور ذاکر صاحب جیسے مخلص اور باہمت نوجوان کی پوری مدد کرنا چاہتے تھے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ وہ قرول باغ سے بلی ماران جہاں حکیم صاحب رہتے تھے، گئے اور حکیم صاحب سے نہ مل سکے کہ وہاں پہلے ہی سے ایک "ہجوم عاشقاں" ہوتا تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب ذاکر صاحب کے پاس مشکل ہی سے تانگے کے کرایے کے پیسے ہوتے تھے لیکن وہ حکیم صاحب کو خوب سمجھتے تھے اور حکیم صاحب کو بھی ان سے ایک خاص تعلق خاطر تھا[۱] اس لیے عاشقی کی یہ کلفتیں دونوں برداشت کرتے تھے اور مطمئن تھے۔

سیاست کے عملی میدان سے الگ ہوکر جہاں ہندو مسلم آویزش کے سوا اب کچھ باقی نہ تھا، حکیم صاحب اپنی زندگی کے باقی ماندہ ماہ و سال جامعہ کے لیے وقف کر دینا چاہتے تھے[۱] لیکن افسوس کہ اب ان کی صحت بہت گر گئی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے ذاکر صاحب کو اواخر جنوری ۱۹۲۷ء میں چندے کے لیے بہار کے دورے پر بھیجا اور وعدہ کیا کہ وہ بہار کے خاص خاص مقام پر خود آکر جامعہ کے لیے فراہمی سرمایہ کی اپیل کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے یہ وعدہ پورا کیا اور اس سے ذاکر صاحب کو اپنے مشن میں خاصی کامیابی ہوئی۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حکیم صاحب نے اس زمانے میں جامعہ کے اخراجات کا ایک حصہ اکثر اپنی جیب سے ادا کیا، دسمبر ۱۹۲۶ء کا الماس اور زمرد کی دو انگوٹھیوں کا اور بوندی کے مہاراجا کے علاج کے سلسلے میں ایک معقول رقم کے ملنے کا واقعہ حیات اجمل میں مذکور ہے[۲]۔ اسی طرح خرابیِ صحت اور علالت کے باوجود وسط دسمبر ۱۹۲۷ء میں بمبئی کا

۱۔ عبدالمجید خواجہ پیپرس (نہرو میوزیم لائبریری)، دیکھیے لوزین سے ۱۱ر جون ۱۹۲۵ء کا لکھا حکیم صاحب کا خط بنام خواجہ صاحب

۲۔ قاضی عبد الغفار، حوالۂ سابق، صفحات ۵۱۲-۵۱۱

سفر کر کے شاہ افغانستان امان اللہ خاں سے جامعہ سے متعلق بات کرنے اور ایک مجمع عام میں جامعہ کی طرف سے شاہ کی خدمت میں بزبان فارسی سپاس نامہ پیش کرنے کا واقعہ بھی اس میں درج ہے۔ جامعہ کے لیے یہ اُن کا آخری سفر تھا اور پھر سفرِ آخرت کہ اس کے چند روز بعد ہی ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو ۲ بج کر ۱۵ منٹ پر یہ "بلند اقبال مسافر اپنی منزلِ حقیقی پر جا پہنچا۔"

حکیم اجمل خاں کی وفات یوں تو پورے ملک کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا' لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے تو یہ سانحۂ عظمیٰ تھا' جامعہ والوں پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا' خود ذاکر صاحب پر کیا بیتی ہوگی! مگر اجمل خاں ہی کی زندگی سے انھوں نے یہ بھی سیکھا تھا کہ حصولِ مقصد کی سعی میں آخری سانسیں بھی قربان کر دینی چاہییں' انھوں نے دیکھا تھا کہ اس ایک مردِ حق آگاہ میں جو سسکتی جامعہ ملیہ کو علی گڑھ سے دہلی اٹھا لایا تھا اور اس کی مسیحائی کی تھی' کتنا صبر و تحمل' کتنی خودداری' کیسی لطیف وضعداری' کیسی شرافت' تعمیر و تخلیق کا کتنا ولولہ' کیسی بلند خیالی اور وسعتِ قلب' ضبطِ نفس اور استغنا' پریشانیوں میں مسکراتے رہنے کی کتنی ہمت اور کتنا حوصلہ تھا' اور انھوں نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُس شخصیت سے بہت زیادہ اثر بھی قبول کیا تھا "جس کی جڑیں" خود ان کے بقول "تمدنِ اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے تھے۔" اور "جس کے ہر ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہو جائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے" ' اس لیے وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ اجمل خاں نہیں رہے مگر اجمل خاں کا خدا موجود ہے جو کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا' وہ جانتے تھے کہ اس ایک ذات کا غم جو سوجتن کر کے جامعہ کا خرچ پورا کرتی تھی' کس طرح اس کے ایمان کی گہرائیوں میں چھپا رہتا تھا جہاں اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر تھا' انھوں نے

دو سال اس شخصیت کو بہت قریب سے دیکھا، برتا، اور تہذیب و شرافت اور صبر و استقامت کے اس پیکرِ جمیل سے مصیبتوں کو ہنسی خوشی جھیل لینا سیکھا تھا — اور وہ اس عظیم شخص کی وفات کے غم کو جو اُن کا ہمدرد، شریک اور مشیرِ مخلص تھا، جھیل لے گئے اور اپنے عزم و ارادے کو اور زیادہ مضبوط محسوس کیا۔ یہ گویا اشارہ تھا اس بات کا کہ حکیم اجمل خاں زندہ ہیں اور تادیر زندہ رہیں گے۔

گاندھی جی سے ذاکر صاحب کی پہلی ملاقات

اوپر کہا گیا ہے کہ جامعہ کی ذمّے داری سنبھالنے کے بعد ذاکر صاحب نے چند ممتاز مسلم رہنماؤں سے یہ جاننے کے لیے رابطہ قائم کیا تھا کہ ان سے جامعہ کو چلانے میں کیسی اور کتنی مدد اور رہنمائی مل سکتی ہے۔ اسی خیال سے وہ جون ۱۹۲۶ء میں سابرمتی آشرم جا کر گاندھی جی سے بھی ملے کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہ صرف قائم کرنے والوں میں تھے بلکہ انھوں نے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں اسے بند ہونے سے بچایا بھی تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس ملاقات کی تفصیل خود بیان کی ہے، جس سے گاندھی جی سے ان کے گہرے تعلق کے ایک اور سبب پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اس مضمون کے ایک اقتباس کا اُردو ترجمہ درج ذیل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ گاندھی جی سے اُن کی یہ پہلی ملاقات اُن کی زندگی کا ایک اور اہم واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"۱۹۲۶ء کی ایک صبح تھی[1]۔ میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میرے تین ساتھی (عابد صاحب، مجیب صاحب اور شفیق صاحب) گاندھی جی سے ملنے سابرمتی آشرم آئے تھے۔ ہم گزشتہ رات میں قدرے دیر سے پہنچے تھے اور جلدی جلدی میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ صبح ناشتہ گاندھی جی کی کٹیا میں ہوگا جہاں اب ہم چاروں ایک صف میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمارا رُخ باورچی خانے کی طرف تھا اور

۱- جون ۱۹۲۶ء کی ایک صبح ([illegible])، [illegible]، صفحہ [illegible]

]ہمارے سامنے کھانا پروس رہی تھیں۔ یکایک پیچھے سے ہمارے کانوں میں آواز آئی: "بہت خوب"۔ ہم نے مڑکر جو دیکھا تو گاندھی جی تیز قدموں سے ہماری طرف آرہے تھے۔ وہ آئے اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے، وہ محبت سے ہمیں دیکھ رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور اس طرح ہنس ہنس کر ہم سے باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ہمیں برسوں سے جانتے ہوں۔

•جرمنی میں ان کا بڑا شہرہ تھا جہاں رومین رولاں کی کتاب کا جرمن ترجمہ بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوا تھا۔ میں نے خود، جب میں وہاں تھا، اُن سے متعلق ایک کتاب شائع کی تھی اور ان کے عدم تشدّد کے پیغام پر تقریریں کی تھیں۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں ان سے مل رہا تھا اور ان کے روبرو تھا۔ آشرم میں میرا قیام دو تین دن رہا اور مجھے کھل کر اُن سے گفتگو کا موقع ملا۔ جامعہ میں رہنے اور کام کرنے کا میں پہلے ہی عہد کر چکا تھا، اور اس کی وجہ سے کئی ممتاز شخصیتوں، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، سے میرے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے تھے، اور میں نے ان سے بھی یہ جاننا چاہا تھا کہ مجھے اپنے کام میں ان سے کیسی رہنمائی اور کتنا سہارا ملے گا، اور یہ کہ اس سلسلے میں کام کا کیا طریقہ ہوگا کہ بہتر سے بہتر نتیجے برآمد ہوں۔ میں گاندھی جی کے پاس بھی اسی لیے آیا تھا۔۔۔ میں جامعہ ملیہ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات و احساسات معلوم کرنا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے چلانے اور ترقی دینے میں کتنی اور کس طرح ہماری مدد کر سکیں گے۔ ۱۹۲۴ء (اور ۱۹۲۵ء کے اوائل) میں جب کہ اس کے بااثر حامیوں کی ایک خاصی تعداد نے یہ کہہ دیا تھا، یا وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے، کہ اب اس کا جاری رکھنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ممکن، تو اس وقت انھوں نے ہی جامعہ کو ختم ہونے سے بچایا تھا[1]۔ دیکھنا یہ تھا کہ

۱- جی۔ ڈی۔ برلا کی ذاتی یادداشت In the Shadow of Mahatma (اورینٹ لانگ مینس لمیٹڈ بمبئی، ۱۹۵۳ء صفحات ۱۴-۸) جی۔ ڈی۔ برلا کے نام گاندھی جی کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۲۴ء

اب وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

"ملک میں شک و شبہہ اور تناؤ کی جو فضا تھی اس میں ایسا لگتا تھا کہ وہ جامعہ کے لیے کچھ زیادہ نہ کر سکیں گے۔ لیکن انھوں نے جس طرح اپنی بات کہی اس کا میرے اوپر بڑا گہرا اثر پڑا اور اس سے میں نے بڑی تقویت اور فیض حاصل کیا' اس سے کہیں زیادہ اگر وہ کسی اور طریقے سے وہ بات کہتے اور دل کھول کر مالی امداد کا وعدہ کرتے۔ مجھے پیسے تو مل جاتے لیکن مجھے یہ خیال بھی ہوتا کہ جامعہ کی تعمیر و ترقی زر و مال ہی سے ہو سکتی ہے آدمیوں سے نہیں۔ انھوں نے جس انداز سے اپنی باتیں کہیں اور کہتے وقت ہم نے ان کا جو عالم دیکھا' اس سب سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ میں جذبات سے مغلوب نہیں ہوا' میں وہاں سے یہ خیال لے کر نہیں اٹھا کہ اب جامعہ ملیہ اور خود میرے لیے زندگی آسان ہوگی' ہاں' اپنے لیے جو راہِ عمل میں نے طے کر لی تھی اس پر چلنے کے لیے میں نے اپنے اندر مضبوط تر عزم اور زیادہ قوت محسوس کی۔

"گاندھی جی نے جس طرح گفتگو کی اس سے یہ صاف عیاں تھا کہ وہ سچائی کی تلاش میں ہیں' سچائی جس سے جامعہ ملیہ سے ان کا تعلق متعین ہوگا۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ کی جڑیں مضبوط ہوں' جامعہ ترقی کرے تاکہ اس سے اُس تصور کی ترجمانی ہو جو اس سے متعلق ان کے ذہن میں بالکل واضح تھا۔ انھیں جامعہ کی فکر ہوگی' وہ اس کی رفتارِ ترقی پر نظر رکھیں گے' وہ اس کے پھلنے پھولنے کے آرزومند ہوں گے' لیکن وہ اس کی ایسی کوئی مدد نہیں کریں گے جس میں اس کا خطرہ ہو کہ

(سلسلۂ گذشتہ صفحہ) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے کوئی پچاس پچپن ہزار روپے بھجوائے تھے۔ ان دنوں اس کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ فاؤنڈیشن کمیٹی اسے بند کرنے کی سوچ رہی تھی' لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے' گاندھی جی نے حکیم اجمل خاں سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا' چاہے اس کے لیے مجھے بھیک مانگنی پڑے۔ گاندھی جی کے یہ الفاظ حکیم صاحب کے لیے بڑی تقویت کا سبب تھے اور انھوں نے فاؤنڈیشن کمیٹی سے یہ طے کرا لیا تھا کہ جامعہ ملیہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔

جامعہ ملیہ اپنی انفرادیت شخصیت اور شناخت کے ارتقا کی آزادی سے محروم ہو جائے۔ انسانوں کی طرح ادارے بھی ہوتے ہیں جنھیں وہی سب کچھ ہونا چاہیے جو وہ بننا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے خیالات ان کی پوری شخصیت کے آئینہ دار تھے، اور ان کی شخصیت عالم فطرت کا کوئی سانحہ یا موروثی تمدن کی پیداوار نہ تھی۔ اسے ایک اخلاقی ڈیزائن کے مطابق انھوں نے خود بنایا تھا۔ ایک دستکار کی طرح، برسوں صبر و استقامت سے، انھوں نے اس پر کام کیا تھا اور اب بھی وہ اس سے مطمئن نہ تھے۔ . . ان کا انداز گفتگو ایسا نہ تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جو کام کرنا چاہتے تھے، وہ ختم ہو چکا ہے، بلکہ وہ اس طرح بات کرتے تھے جیسے وہ کام ابھی جاری ہے اور اس میں ان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، اوزاروں پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو سکتی ہے، ارادے کمزور پڑ سکتے اور قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ فکر اور عمل میں کامل ہم آہنگی یکایک نہیں پیدا ہو جاتی، یہ سعی پیہم چاہتی ہے، مسلسل خود احتسابی کی خواہاں ہوتی ہے، اور اس عمل میں خلوص اور انکسار کی کیفیت ایک خاص ندرت کی حامل بن جاتی ہے۔ گاندھی جی کا خلوص نہ صرف یہ کہ ظاہر تھا بلکہ میرے لیے ایک چیلنج تھا کہ مجھ میں بھی انھیں کی طرح اور اتنا ہی خلوص اور سچائی ہو اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے اپنے کام کو ایک احترام کے جذبے سے کرنا ہے، اور اپنے اندر تواضع و انکسار پیدا کرنا ہے، اس لیے کہ جتنا بڑا کام ہوتا ہے اسی قدر اس کے مطالبات مشکل اور محنت طلب ہوتے ہیں، ہر شخص کو ہمہ وقت اور ہر لحاظ سے اپنے کام کا اہل ہونا چاہیے۔[1]"

گاندھی جی کے سوچنے کا طریقہ عام رہنماؤں سے مختلف تھا، وہ ایک سچے مذہبی آدمی تھے اور چاہتے تھے کہ جامعہ کے اساتذہ و طلبہ میں سچی مذہبیت ہو اور

۱- ذاکر حسین، Mahatma Gandhi 100 Years "Moral Awareness" مرتبہ ایس رادھا کرشنن، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء، صفحات ۱۲۵ - ۱۲۳

خدا کو تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ کریں۔ جامعہ کے دلی منتقل ہونے کے بعد جب نومبر ۱۹۲۰ء کے شروع میں وہ جامعہ آئے تو ان کا بڑے تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ حکیم اجمل خاں کی خیر مقدمی تقریر اور طلبہ کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیے جانے کے بعد گاندھی جی نے اس سپاسنامے کے جواب میں جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا:

> "... ہندستان کی آزادی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ دو ہیں، خدا کا خوف اور انسان یا انسانوں کی جماعت سے جس کا نام حکومت یا سلطنت ہے بے خوف ہونا ہے... مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے میں خوش ہوں کہ آپ عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنے خالق کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے گی اور آپ ہمیشہ اس کی یاد اپنے دل میں رکھیں گے۔"[۱]

جون ۱۹۲۶ء میں گاندھی جی سے ذاکر صاحب کی پہلی ملاقات ہر لحاظ سے بڑی نتیجہ خیز رہی۔ گاندھی جی کو اس کا یقین ہوگیا کہ اب عملاً جامعہ ایک اچھے مسلمان کے ہاتھ میں ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہے اور ملک و قوم کی آزادی و خوش حالی کے لیے اسے ضروری سمجھتا ہے۔ ادھر خود ذاکر صاحب کو گاندھی جی کے رویے اور خیالات سے بڑا سہارا ملا، دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کا باہمی اعتماد بڑھتا گیا۔

سیٹھ جمال محمد کی مسیحائی

احمد آباد سے ذاکر صاحب حیدر آباد چلے گئے۔ تھوڑی بہت رقم جامعہ کے لیے

جمع بھی ہوئی، لیکن اس سے زیادہ یہ ہوا کہ بعض بااثر لوگوں سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا جو آئندہ فراہمیِ سرمایہ کے سلسلے میں بہت کام آیا۔ عام چندے سے سرمایہ جمع کرنے کی کوششیں مختلف وفود کے ذریعے ملک کے کئی صوبوں میں جاری تھیں، خود ذاکر صاحب حیدرآباد کے بعد بہار کا دورہ کر چکے تھے، اور بہار تو خود حکیم صاحب بھی گئے تھے۔
وسط دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب جب شاہ محمد امان اللہ خاں والیِ افغانستان سے ملنے بمبئی گئے تھے تو اپنے ساتھ ذاکر صاحب کو بھی لے گئے تھے جہاں ایک عام جلسے میں جامعہ کی طرف سے انھوں نے شاہ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ شاہ امان اللہ خاں جب بمبئی سے یورپ کے لیے روانہ ہو گئے تو حکیم صاحب نے ذاکر صاحب کو مدراس بھیج دیا جہاں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ ذاکر صاحب نے ۱۹۶۴ء میں سیٹھ جمال محمد سے منسوب مدراس کے جمالیہ کالج کے پوسٹ گریجویٹ سیکشن کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اپنے ان مرحوم دوست اور محسن کو بڑے اچھے الفاظ اور بڑے گہرے جذبات سے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ سیٹھ صاحب سے میری دوستی کا آغاز حکیم اجمل خاں کے توسط سے ہوا تھا۔ حکیم صاحب کے حکم سے میں دسمبر ۱۹۲۷ء میں مدراس آیا تھا۔ سیٹھ جمال محمد کے نام حکیم صاحب نے مجھے ایک خط دیا تھا۔ "جیسے ہی میں مدراس پہنچا، میں نے سیٹھ صاحب سے ملاقات کی اور حکیم صاحب کا خط انھیں دیا۔ انھوں نے جس تفصیل اور فکرمندی کے ساتھ جامعہ کا حال پوچھا، اس سے میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اُمرا عام طور پر کسی ایسے تعلیمی ادارے سے متعلق زیادہ جاننا نہیں چاہتے جس کی مالی حالت سقیم ہو۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں دہلی جا کر حکیم صاحب کو ان کا یہ پیغام دوں کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق جس وقت مناسب سمجھیں مدراس تشریف لائیں، اُن کے مشن کو کامیاب بنانے میں وہ پوری کوشش کریں گے۔ انھوں نے میری ہمت بھی بڑھائی اور کہا کہ یقین رکھیے کہ اللہ کا کوئی کام وسائل کی کمی کے سبب کبھی رُکا نہیں ہے۔ عرصے سے مجھے ایسی حوصلہ افزا اور تقویت بخش صبح نصیب نہیں ہوئی تھی۔[۱]

۱۔ یہ ۹ اور ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح تھی۔ ایک طرف اگر یہ صبح حوصلہ افزا تھی تو دوسری طرف یہ نہایت المناک بھی تھی۔

جب میں کانگریس پنڈال کی طرف واپس جارہا تھا تو راستے میں ایک دوست نے یہ اطلاع دی کہ رام پور میں حکیم صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔ ... میرا دل ڈوبنے لگا اور ہر طرف اندھیرا سا چھاگیا۔ میں یہ طے نہ کرسکا کہ سیٹھ صاحب کے پاس جاؤں اور ان کو بتاؤں کہ ہمارے امیر اور اُن کے دوست اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن اسی دن شام کو سیٹھ صاحب خود مجھے تلاش کرتے ہوئے میری جائے قیام پر پہنچے اور فرمایا کہ مشیت الٰہی یہی تھی۔ لیکن اطمینان رکھیے میں آپ کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو حکیم صاحب کیے کرتا اگر وہ مدراس آتے، آپ جائیے، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کیجیے اور مجھے لکھیے کہ آپ جامعہ کے لیے چندہ کرنے مدراس کب آسکتے ہیں، میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد کے ہمراہ مدراس آیا جو اپنی مصروفیتوں کے سبب دو چار روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے تھے، وہ دونوں حضرات چلے گئے لیکن میں ٹھہرا رہا۔ سیٹھ صاحب مجھے اپنے دوستوں کے پاس لے گئے اور اتنا سرمایہ جمع ہوگیا کہ اس سے نہ صرف جامعہ کے سارے قرض ادا ہوگئے[۱] بلکہ کچھ دن جامعہ کا کام بھی چلا۔ ان کی یہ ایک بات اب تک مجھے یاد ہے: 'میں نہیں چاہتا کہ آپ پیسے کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، آپ جو کام کر رہے ہیں وہ خدا کا کام ہے، یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ کے لیے سرمایے کا بندوبست کریں' حقیقت تو یہ ہے کہ میں چندہ جمع کرنے کی اس مہم میں محض ایک خاموش ساتھی کے طور پر شریک تھا، جن لوگوں کے پاس وہ گئے تھے انھوں نے ایک مخصوص رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سیٹھ صاحب نے ان وعدوں کی میزان نکالی اور مجھے ان وعدوں کی تکمیل کے انتظار کی زحمت سے بچانے کے لیے خود اتنی رقم کا چیک یہ کہہ کر میرے حوالے کیا کہ 'آپ جائیے آپ کو بہت کام ہیں، میں موعودہ رقمیں لوگوں سے حاصل کرلوں گا'[۲] ایک 'بھکاری' کی حیثیت سے میں

۱۔ جس وقت حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوا ہے جامعہ مقروض تھی اور قرض کی ادائگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

۲۔ جون ۱۹۶۸ء میں سیلون سے واپسی کے سفر میں چند روز کے لیے میں مدراس میں ٹھہرا تھا۔ اُس زمانے میں جمالیہ عربک کالج کے پرنسپل مولانا عبدالوہاب بخاری مرحوم تھے۔ راقم الحروف اُن کی میت میں (باقی اگلے صفحے پر)

نے اپنی عمر کا جو حصہ گزارا اس میں مجھے بہت سے اچھے اور سچے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، لیکن اُن جیسا کوئی نہ ملا جس نے یقین کے اس گہرے احساس کے ساتھ مجھے رخصت کیا ہو کہ جیسا اس شخص کو ضرور ملتا ہے جس کے بارے میں دینے والے کو یہ یقین ہو کہ وہ جس کام میں لگا ہوا ہے، واقعی وہ کرنے کا کام ہے، خدا کا کام ہے۔ سیٹھ جمال محمد سے مجھے مالی اور اخلاقی تائید ہی نہیں حاصل ہوئی، بلکہ اس سے زیادہ بیش قیمت چیز یعنی ان کی دوستی مجھے نصیب ہوئی، ایک ایسے شخص کی دوستی جس کی روحانیت کی جڑیں اس کی شخصیت میں بڑی گہرائی تک چلی گئی تھیں، جس کی فہم انسانوں اور معاملات انسانی سے متعلق بڑی تیز اور باریک بیں تھی اور جو اپنی عارفانہ بصیرت سے مظاہر کے پردے کے پیچھے جو حقیقت کو چھپائے رکھتا ہے، دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔۔۔ ان کی دوستی خود ایک پُراثر دعائے خیر و برکت تھی۔"

انجمن تعلیم ملّی کا قیام

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد شروع فروری ۱۹۲۸ء میں دہلی میں اُن کی

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) سیٹھ جمال محمد مرحوم کے صاحبزادے جمال محی الدین مرحوم سے ملنے کے لیے جن کا مکان کالج کے قریب تھا، حاضر ہوا۔ وہ اُس وقت بہت علیل تھے، یہ سُن کر کہ میں جامعہ ملیہ سے متعلق ہوں، اُٹھ بیٹھے اور معذرت خواہی کے انداز میں کہا کہ "دیکھیے میری حالت کیا ہے، کاروبار بھی ہمارا خراب ہوگیا، آپ ذاکر صاحب سے میرا سلام کہیے اور اس تمنا کا اظہار بھی کہ کاش میں اس قابل ہوتا کہ جامعہ کے لیے کچھ کر سکتا۔" وہاں سے واپس پہلے ہی ایک موقع پر ذاکر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور میں نے جمال محی الدین صاحب کا سلام و پیام اُن کو پہنچایا۔ ذاکر صاحب کی آنکھیں نم ہوگئیں، فرمایا: "ضیا صاحب، اُن کے والد مرحوم کا جامعہ پر اور خود مجھ پر بڑا احسان ہے، انھوں نے ایسے موقع پر ہماری مدد کی تھی جب حکیم صاحب کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تقریباً ساری رقم خود انھوں نے ہی دی تھی، ورنہ تو دو ہی ایک آدمیوں نے چندے کیے ہوں گے۔ ہمیں اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ان کے لیے دعائے خیر کرنا چاہیے۔"

یاد میں ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس کی صدارت پنڈت موتی لعل نہرو نے کی تھی۔ ملک کے تقریباً سبھی مشہور ہندو مسلم رہنما اس میں شریک تھے۔ اس جلسے میں یہ طے ہوا کہ ایک یادگاری فنڈ "اجمل جامعہ فنڈ" کے نام سے قائم کیا جائے جس کے لیے آٹھ لاکھ روپے جمع کیے جائیں اور اس رقم کو حکیم صاحب کی یادگار جامعہ ملیہ کی ترقی اور استحکام کے لیے صرف کیا جائے۔ فیصلہ بہت معقول اور مناسب تھا اور حکیم صاحب کے ساتھی رہنماؤں کی توجہ محنت سے یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا۔ "اجمل جامعہ فنڈ" کے لیے اگر آٹھ لاکھ کے بجائے پانچ لاکھ روپے ہی جمع ہو جاتے، تو بڑا کام ہو جاتا، جامعہ کی بنیاد مضبوط ہو جاتی اور حکیم صاحب کی روح کو سکون مل جاتا۔ مگر ہماری قومی زندگی کا یہ بڑا سانحہ ہے کہ حکیم اجمل خاں جیسے ہر دلعزیز اور ممتاز قومی رہنما کے کمسن بچے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے لیے قوم اس وقت اتنا بھی نہ کر سکی۔

اس سلسلے میں گاندھی جی اور گھنشیام داس برلا کے مابین جو خط و کتابت ہوئی وہ کئی لحاظ سے ہماری قومی تاریخ کا ایک عبرت ناک باب ہے، اور علامت ہے اس الجھاؤ کی جو ہندوستانی نیشنلزم سے متعلق ملک کے اہم لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ گاندھی جی نے ۱۰ فروری ۱۹۲۸ء کو حکیم اجمل خاں میموریل فنڈ سے متعلق برلا کو لکھا کہ "میں نے ینگ انڈیا اور نوجیون میں (اس فنڈ کے لیے) اپیل کی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کے احباب اس کے لیے اپنا حصہ ضرور دیں۔" انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر آپ زیادہ نہیں دینا چاہتے، تو پھر میں چاہوں گا کہ آپ کی اجازت سے پچھتر ہزار کی اُس رقم میں سے جو آپ نے مجھے دی ہے، ایک معقول رقم اس میموریل میں دے دی جائے۔ اگر آپ کو اس میں بھی پس و پیش ہے تو مجھے بے تکلف لکھ بھیجیے۔"

۱۷ مارچ ۱۹۲۸ء کو برلا نے مہادیو دیسائی کو ایک عجیب و غریب خط لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ "میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں جمنا لال جی (جمنا لال بجاج) سے گفتگو کی۔ میں نے ابھی حال میں اس ادارے کو دیکھا تھا۔ میں نے جمنا لال جی سے اپنے تاثرات بتا دیے تھے جنھیں، مجھے اُمید ہے کہ انھوں نے مہاتما جی تک پہنچا دیا ہوگا۔ اس

ادارے کو جیسا کہ یہ اس وقت ہے، بہ مشکل قومی ادارہ کہا جا سکتا ہے۔ اب اس ادارے کی امداد کے خیال کے پیچھے دو مقصد ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قطع نظر اس کے کہ یہ ادارہ قومی ہو یا محض کسی ایک فرقے کا، ہمیں مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اس کی مدد کرنی چاہیے، اور دوسرا یہ کہ ہمیں اسے ایک قومی ادارہ بنانے کی غرض سے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر ہمیں پہلے مقصد کے پیش نظر اس کی مدد کرنی ہے، تو پھر ہمیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ مستقبل میں یہ کیا بنے گا۔ لیکن اگر ہم اسے قومی ادارہ بنانا چاہتے ہیں، تو پھر تو ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اس وقت تو یہ ایک قومی ادارے کے مقابلے میں کہیں زیادہ محض ایک فرقے کا ادارہ ہے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی جب میں نے وہاں کسی ہندو لیڈر کی کوئی تصویر نہیں دیکھی جبکہ اس کے بورڈنگ ہاؤس کی دیواروں پہ انور پاشا اور کمال پاشا کی تصویریں آویزاں تھیں۔ لائبریری میں عربی کتابیں بکثرت تھیں۔ ادارہ کا نام خود عربی ہے۔ ہر جگہ مسلم کلچر ہی نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہاں تعلیم ورناکیولر میں دی جاتی ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سنسکرت اور ہندی کے مقابلے میں عربی اور فارسی کی زیادہ ہمت افزائی کی جائے۔ ادارے کے موجودہ ماحول میں تو کوئی ہندو طالب علم تعلیم حاصل کرنے وہاں نہ جائے گا۔ اگر (باپو) اسے ایک قومی ادارہ بنانا چاہتے ہیں، تو ان تمام امور پر ضرور غور کرنا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس ادارے کے مسلم مزاج کے باوجود اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی دانشمندی کی بات ضرور ہوگی۔ میں نے یہ سب باتیں اس لیے نہیں لکھی ہیں کہ کسی روپ میں بھی میں ان کی رائے کو متاثر کروں، لیکن میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس سلسلے میں میرے خیالات جاننا چاہیں۔ انھیں پورا اختیار ہے کہ ہر لحاظ سے وہ جتنی رقم مناسب خیال فرماتے ہوں، اتنی دے سکتے ہیں۔"[1]

۱۹۲۸ء کا سال جامعہ کے لیے سخت پریشانیوں کا سال تھا اور مجلس امناء (Trustees)

۱۔ جی۔ ڈی۔ برلا 'باپو' جلد اول' بھارتیہ ودیا بھون' بمبئی' ۱۹۷۷ء' صفحات ۹۸-۱۰۰

عملی طور پر ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کر رہی تھی، "اجمل جامعہ فنڈ" کا منصوبہ ناکام ثابت ہو چکا تھا[1]، اُس وقت پچپن ہزار روپے کی ضرورت تھی اور اس کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ خیال ہے کہ ایسے میں ذاکر صاحب کو جرمنی کے اُن تجرباتی اسکولوں کی یاد آئی ہوگی جو ہم خیال اساتذہ کی ایک جماعت کی نگرانی میں چلائے جاتے تھے اور جن میں سے کئی ایک کے طریقۂ کار اور کارکردگی کا انھوں نے مشاہدہ بھی کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی چشمِ بصیرت نے دیکھ لیا کہ جامعہ ملیہ اگر چل سکتی اور کوئی مفید کام کر سکتی ہے تو اسی طرح کہ ٹرسٹیز کی بے حسی اور بے مقصدی کے پیشِ نظر ایک جرأت مندانہ اقدام کیا جائے اور جامعہ کے پرانے دستور العمل اور نظام کے بدلے جامعہ کے کاموں کی از سرِ نو تنظیم کر کے اس کے چلانے کے لیے ایک نئی انجمن بنائی جائے۔ ذاکر صاحب کا یہی وہ قائدانہ رول ہے جو اس وقت ملک میں تعلیم کا کام کرنے والوں اور خصوصاً مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں مفقود تھا، یہ قیادت اہلِ شوق کو خارا شگنی کی دعوت تھی، یہاں تیشہ نہ تھا، اک نالۂ بے آہ و فغاں تھا جس کی کاٹ اکثر تیشوں سے تیز ہوتی ہے :

براثرِ کوہکن نالہ فرستادہ ایم — تا جگرِ سنگ را ذوقِ دریدن دہیم

ذاکر صاحب نے سوچا، ذہن میں کام کا ایک نقشہ مرتب کیا، گاندھی جی سے ملے، ان کے سامنے اس نقشے کے خطوط واضح کیے[2] اور ۹ر جولائی ۱۹۲۸ء کو امیرِ جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۔ اس فنڈ میں بمشکل پندرہ ہزار روپے جمع ہو سکے تھے۔ (محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۵۸)

۲۔ نورانی نے اپنی کتاب 'پریسیڈنٹ ذاکر حسین' (صفحات ۲۴-۳۲) میں گاندھی جی کے دو خط نقل کیے ہیں، ایک ڈاکٹر انصاری کے نام (مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۲۸ء) اور دوسرا مولانا شوکت علی کے نام (مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۲۸ء)۔ ان خطوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ گاندھی جی اس کے حق میں تھے کہ ذاکر صاحب کو اپنی سمجھ اور حوصلے کے مطابق کام کی آزادی دی جائے، ورنہ جامعہ ملیہ ختم ہو جائے گی۔ ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر انصاری کی تائید بھی ذاکر صاحب کو پوری طرح حاصل تھی، البتہ مولانا شوکت علی کے سوچنے کا طریقہ کچھ اور رہا ہوگا جس میں حقیقت پسندی سے زیادہ جذباتیت کو دخل ہوگا، اور وہ اور اس طرح کے دوسرے حضرات رکاوٹ بن سکتے تھے۔

کہ جامعہ کی مالی حالت سے متعلق تفصیل سے لکھا اور یہ کہا کہ مسئلے کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو امناءِ جامعہ (ٹرسٹیز) غیر معمولی سعی و کوشش سے مطلوبہ رقم (پچپن ہزار روپے) فراہم کریں یا پھر اپنی طرف سے جامعہ کو بند کر دیں اور اس کے کام سے دست کش ہو جائیں، لیکن اس کو بند کرنے سے پہلے قوم کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اگر اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو کوئی اور جماعت اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے چلائے۔"[1]

ڈاکٹر انصاری نے ذاکر صاحب کے خط کے ساتھ جامعہ کے مفصل حالات جامعہ کے ٹرسٹیز کو لکھ بھیجے، اور یہ بھی لکھا کہ ہم آیندہ سال کے مصارف اور پچھلے قرض کی ادائیگی کے لیے پچپن ہزار روپیا جمع نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں جامعہ کے معاملات سے دست کش ہو جانا چاہیے، مجھے یقین ہے کہ اس سے جامعہ مر نہ جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسی منفی اقدام سے ہماری اس عزیز درس گاہ کے لیے نئی زندگی کا سامان ہو جائے۔" میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس بارے میں مفصل گفتگو کی ہے کہ اگر ہم امناء (ٹرسٹیز) جامعہ سے دست کش ہو گئے تو وہ کیا کریں گے۔ انھوں نے اپنے ارادوں کا جو خاکہ میرے سامنے پیش کیا ہے وہ عزم و استقلال کی قابلِ ستایش مثال ہے۔"[2]

ڈاکٹر انصاری نے اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ ۲۵ر جولائی ۱۹۲۸ء کو مجلس امناء کا ایک غیر معمولی جلسہ ہوگا جس میں اس مسئلے پر غور و فکر کر کے آپ کو شریک ہونا ہے۔ شرکت نہ کر سکنے کی صورت میں تحریری رائے جلسے سے قبل ضرور بھیج دی جائے۔[3]

اُدھر ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کو جو چھٹیوں میں اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے خط لکھا کہ "جامعہ مقروض ہے، روپیا مفقود ہے، جامعہ کے بند کرنے

۱- عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۱۹

۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۲۰

۳- ایضاً، صفحہ ۱۲۱

کا سوال درپیش ہے، آپ اس کام کو یا اس کے کسی حصے کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کام کو جاری اسی وقت رکھا جا سکتا ہے جب آپ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور مشکلات سہنے کے لیے تیار ہوں۔" مجلس امناء کے اکثر اراکین نے تو ڈاکٹر انصاری کے خط کا جواب ہی نہیں دیا اور جنھوں نے جواب دیا ان کی رائے تھی کہ "کام چلنے والا نہیں ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، اسے بند کردو۔" ذاکر صاحب کے خط کا جواب اُن کے نوجوان ساتھیوں نے یہ دیا کہ "ہم جامعہ کے کام کو جاری رکھیں گے اور جامعہ کو چلانے والی جماعت کے ہر شرط پر ممبر بننے کے لیے تیار ہیں۔" آخر مجلس امناء کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے ـــــ اس طرح ۱۹۲۸ء میں ایک نئی سوسائٹی یعنی "انجمن تعلیم ملّی" کی داغ بیل پڑی جو بعد میں انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلائی۔ اس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر انصاری، معتمد ذاکر صاحب اور خازن سیٹھ جمنالال بجاج مقرر ہوئے۔ اس میں دو طرح کے ممبر تھے، ایک تو معاون ممبر اور دوسرے حیاتی ممبر جنھوں نے بیس سال تک اپنی خدمت کے لیے ایک سو پچاس روپے سے زیادہ مشاہرہ نہ لینے کا عہد کیا تھا۔ یہ سب ممبر جامعہ کے اسٹاف میں تھے۔ اس طرح انجمن تعلیم ملّی کے قیام کے بعد جامعہ کو سیاسی قیادت کی ذہنی کیفیت سے، جو حالات کے تحت بدلتی رہتی تھی، نجات مل گئی، اور ذاکر صاحب کو آزادی کے ساتھ جامعہ کو چلانے کا موقع ملا۔

اب ذاکر صاحب اساتذہ کی ایک جماعت کے ایسے سربراہ تھے جس کا خود کوئی حق نہ تھا اور سربراہی کی ساری ذمّے داریاں اسی کے سر تھیں۔ ذاکر صاحب نے خود ساری ذمّے داریاں اوڑھیں اور اپنے لیے کسی خاص رعایت کا مطالبہ نہیں کیا۔ یورپ سے واپسی پر جب انھوں نے جامعہ میں دوبارہ کام کرنا شروع کیا تو انھیں صرف سو روپے تنخواہ ملتی تھی جب کہ اُن کے اُن دو ساتھیوں کو جن کے پاس یورپ کی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں تھیں تین تین سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان تنخواہوں کی ادائیگی جامعہ کے بس کی بات نہ تھی، ان کے دونوں ساتھیوں نے یہ پیش کش کی کہ وہ سو روپے سے زیادہ نہیں لیں گے اور خود ذاکر صاحب نے اپنی تنخواہ سو روپے ماہانہ

کے بجائے اسّی روپے کر لی۔ اور چونکہ پابندی سے ہر ماہ سب کو پوری تنخواہ نہیں دی جاسکتی تھی، اس لیے قاعدہ یہ بنایا گیا تھا کہ سب سے کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو سب سے پہلے تنخواہ دی جاتی تھی، اس لحاظ سے ذاکر صاحب سب سے بعد میں تنخواہ پانے والوں میں تھے، بعد میں اس خیال سے کہ تنخواہوں کی ادائیگی میں کچھ باقاعدگی آئے یہ طے کیا گیا کہ ساٹھ روپے یا اس سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کو نصف تنخواہ دی جائے اور نصف اُن کے حساب میں جمع کر دی جائے. اس طرح عملاً ذاکر صاحب کی تنخواہ گھٹ کر چالیس روپے ماہانہ رہ گئی اور ۱۹۴۴ء تک جب تنخواہیں پوری ملنے لگیں اور اساتذہ کے سارے مطالبات بیباق ہو گئے، انھیں اسی قدر تنخواہ ملتی رہی۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۸ء تک جب وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے ان کو اسّی روپے ماہانہ بطور تنخواہ ملتے رہے۔[1]

اب اس بات کو یاد کیجیے کہ ۱۹۲۸ء کے آخری مہینوں میں جب انجمن تعلیم ملّی کی بنیاد پڑ چکی تھی اور جامعہ کو چلانے کی ساری ذمّے داری ذاکر صاحب کی قیادت میں جامعہ کے اساتذہ و طلبہ پر آن پڑی تھی، مدراس کے سیٹھ جمال محمد کی فیاضانہ امداد نے جس سے جامعہ کا اس وقت تک کا سارا قرضہ ادا ہوا اور اگلے سال کے اخراجات بھی کچھ چلے، ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو کس قدر ممنت گزار کیا ہوگا، اور جیسا کہ سیٹھ جمال محمد نے کہا تھا کہ جامعہ کا کام خدا کا کام ہے، ذاکر صاحب نے تو اس امداد کو تائیدِ الٰہی تصور کیا ہوگا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

لیکن بندۂ مومن کو بھی کوشش تو کرنی ہی ہوتی ہے، ایڑیاں تو رگڑنی ہی ہوتی ہیں تب کہیں سینۂ صحرا سے زمزم کا چشمہ اُبلتا ہے۔ ذاکر صاحب کو یہ سبق یاد تھا اور انھوں نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے ایسے وقت میں سرمایے کی فراہمی کے لیے حیدر آباد اور بھوپال کے

سفر کیے[۱] جب ملک میں گاندھی جی کی نمک ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کا زور شور تھا' اور جامعہ کی فضا بھی آزادی کے نعروں سے گونج رہی تھی۔

نمک ستیہ گرہ اور تحریک سول نافرمانی

سول نافرمانی کی تحریک کے شروع ہوتے ہی شفیق الرحمٰن قدوائی اور حافظ فیاض احمد نے اس میں عملاً شریک ہونے کا اعلان کر دیا' دیو داس گاندھی بھی تیار ہو گئے' طلبہ میں سی۔ کرشنن نائر' کے۔ سی۔ ڈیگا اور حسین حسان نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ اس کا اثر دوسرے اساتذہ' کارکنوں اور طلبہ پر بھی پڑا' اور اب ذاکر صاحب کو طے کرنا تھا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر جامعہ کے تعلیمی کام کو معطل کر کے سب لوگ تحریک میں شریک ہو گئے (اور تحریک نہ معلوم کب تک چلے) اور تحریک ناکام رہی تو پھر جامعہ کے کام کو از سرِ نو شروع کرنا ناممکن ہو جائے گا' ذاکر صاحب کو اس خطرے کا پورا احساس تھا' اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ جامعہ ملیہ ایک ادارے کی حیثیت سے تحریک سے الگ رہے گی' البتہ جو لوگ اس میں شریک ہونا چاہیں' انھیں جامعہ سے اس کی اجازت اور لمبی رخصت لینی ہوگی تاکہ جامعہ پہلے سے اپنے کام کا انتظام کر سکے۔ اس موقع پر انھوں نے انجمن اتحاد کے جلسے میں جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا:

"۔۔۔ جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے' میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ تو خود جنگ آزادی کے لیے سپاہی

۱۔ گلشن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چھوٹے بچوں کا قلمی رسالہ تھا جو ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۹ء میں نکلتا تھا۔ اس کے مارچ اور اپریل ۱۹۲۹ء کے شماروں میں ذاکر صاحب کے رنگون جانے کا ذکر ہے "ایک بار گاندھی جی کے ساتھ اور دوسرا [illegible]

تیار کر رہی ہے. صحیح تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے. کارکنانِ جامعہ کی یہ چھوٹی سی جماعت اسی ایک کام میں لگی ہوئی ہے، اب اس کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں. لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے. یہ ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی اس سیاسی تحریک میں شرکت کے لیے بے تاب ہیں، وہ اپنی خدمت کے جذبے کا سب سے بہتر اظہار شاید اسی طرح کر سکتے ہوں کہ انھیں ضرور اس تحریک میں شریک ہونا چاہیے، لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لیے پہلے جامعہ سے انھیں اجازت لے لینی چاہیے ..."[1]

ذاکر صاحب نے شفیق الرحمن قدوائی اور دوسرے اساتذہ و طلبہ کو سول نافرمانی میں شریک ہونے کے ارادے پر مبارکباد دی اور انھیں خوشی خوشی رخصت کیا، عابد صاحب کے نام ذاکر صاحب کے ایک خط مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۰ء سے معلوم ہوا کہ مجیب صاحب کا بھی اس تحریک میں حصہ لینے کا ارادہ تھا، لیکن نہ معلوم کس وجہ سے انھوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا، ذاکر صاحب کا یہ خط بہت دلچسپ ہے اس لیے اس کا متعلقہ اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"... مجیب صاحب کے ارادے کا حال سن کر خوشی بھی ہوئی، تعجب بھی ہوا. خدا کرے یہی کر گزریں. ان کی شخصیت کو مضبوط بنانے میں جیل کی آب و ہوا بھی مدد دے سکتی ہے،

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک[2]"

---

۱. عبد الغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحات ۱۲۹-۱۲۸

ادھر ذاکر صاحب نے آزادی کے متوالوں کو سول نافرمانی کے لیے رخصت کیا، اور اُدھر انھوں نے خود اُس ادارے کو زندہ رکھنے اور چلانے کے لیے بھوپال اور حیدرآباد کا رُخ کیا جس سے بادۂ حریت کے سرشار و سرمست فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ ریاستوں سے جامعہ جیسے 'باغی' ادارے کے لیے روپیا حاصل کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اس وقت اس پر پوری توجہ اور محنت کی اور وقار اور خودداری کے ساتھ مسلسل کوشش کے بعد نومبر ۱۹۳۰ء میں نظام حیدرآباد سے ایک عمارت کے لیے پچاس ہزار روپے کا یکمشت عطیہ اور روزمرہ کے اخراجات کے لیے ایک ہزار روپے کی ماہانہ امداد منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے، یہ ایک بڑی کامیابی تھی اور اس میں ذاکر صاحب کی مردم شناسی، اُن کی موہنی شخصیت، انداز گفتگو اور فہم و تدبر کا بہت زیادہ دخل تھا۔ نظام حیدرآباد کی کونسل میں ایسے لوگ شاید ہی ہوں جنھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد کی اہمیت کا احساس ہوا ہو، اور نہ ایسے بااثر لوگوں سے ذاکر صاحب کے ذاتی تعلقات تھے جن کو جامعہ کی قدر و قیمت سمجھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک اکبر یار جنگ مرحوم تھے جنھوں نے اس ناتے کہ وہ قائم گنج کے اور ذاکر صاحب کے عزیزوں میں تھے، حیدرآباد کے چند ممتاز لوگوں سے ان کا تعارف کرایا اور انھیں اپنے یہاں مہمان رکھا، اب یہ ذاکر صاحب کا کام تھا کہ وہ تگ و دو کریں، لوگوں سے ملیں، اور ان میں سے کئی ایک سے بار بار ملیں، انھیں جامعہ کے کام کی نوعیت اور اس کی افادیت سمجھائیں اور اگر دل کو نہیں تو ان کے ذہن کو اپنی ذہانت اور شیریں بیانی سے اس طرح مسحور کر دیں کہ انھیں، وقتی طور پر ہی سہی، ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ سے ہمدردی ہو جائے۔ لیکن دنیا میں ہر قسم کے اور مختلف سمجھ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اُس وقت نظام سرکار کی کونسل کے رکن ایک نہایت ہی قدامت پسند اور حکومت برطانیہ کے خاص وفادار بزرگ نظامت جنگ بھی تھے جن کے کہنے پر بالکل آخری مرحلے میں ماہانہ امداد کے ساتھ یہ تکلیف دہ شرط لگا دی گئی کہ اس کی ادائگی اسی صورت میں کی جائے گی جب دہلی کا چیف کمشنر ہر مہینے اس کی منظوری دے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اپنی جگہ اہانت آمیز تھی اور ذاکر صاحب کو اس سے بہت مایوسی ہوئی ہوگی،

ان کی اس کیفیت اور پھر ان کے صبر و قناعت کی ایک جھلک ان کے ۱۰ راگست ۱۹۳۱ء کے اس خط کے درج ذیل ٹکڑے میں دیکھیے جو انھوں نے عابد صاحب کو حیدرآباد سے لکھا تھا، یہ بتانے کے بعد کہ بھوپال کا نشانہ خالی گیا اور حیدرآباد سے کچھ رقم منظور ہوئی ہے، انھوں نے لکھا:

"تامسن صاحب[1] سے پہلی فرصت میں (یعنی ان کی) مل لوں گا۔ خدا کرے معاملہ یکسو ہو جائے، ورنہ یہی بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بہت ہے۔ اللہ مالک ہے۔ ہم بدوی لوگوں کے لیے شاید دو چار مہینے سے زیادہ کا اطمینان اچھا بھی نہیں۔"[2]

تامسن جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ناراض تھا کہ سول نافرمانی کی تحریک میں اس نے حصہ لیا تھا، دیکھا جائے تو اس بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن وہ پکا سامراجی تھا اور اس کا ہندستان مخالف رویہ بالکل واضح تھا، اس نے نظام کی حکومت کو مطلع کیا کہ وہ اس کے حق میں نہیں ہے کہ جامعہ ملیہ کو مالی امداد دی جائے۔ ذاکر صاحب اس سے ملے اور باوجود اس کے کہ اس کے پاس اپنے رویے کا کوئی جواز اور ان کے دلائل کا کوئی جواب نہ تھا، وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ تھوڑے دنوں بعد تامسن چلا گیا اور جونسن آیا۔ وہ اگرچہ سابق چیف کمشنر کے غیر منصفانہ رویے کے لیے معذرت خواہ تھا لیکن اس نے بھی کچھ نہ کیا۔ کہیں چار سال بعد مع بقایا ادائیگی کی منظوری دی گئی۔[3]

۱۔ مراد سر جون تامسن سے ہے جو اس وقت دہلی کا چیف کمشنر تھا۔

۲۔ متعلقہ فائل، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

شعبۂ ہمدردانِ جامعہ

حیدرآباد کی اس گرانٹ کے لیے ذاکر صاحب کو "رقیبوں" کے در پر جس طرح بار بار جانا پڑا' اس کو ذرا تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ غالباً اسی تجربے سے ان کو خیال ہوا کہ والیانِ ریاست اور طبقۂ امرا کی مالی امداد پر بہت زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے' اور پھر، چونکہ عام مسلمانوں میں جامعہ ملیہ کے تعلیمی مقاصد کی ترویج و اشاعت بھی ضروری ہے' اس لیے انھیں سے اصل رابطہ قائم کرنا اور انھیں کی امداد کا سہارا ڈھونڈنا چاہیے۔ اُدھر علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی صورت یہ تھی کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی میں اہلِ جامعہ کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے' نئی نئی اسکیمیں تیار کی جارہی تھیں' نئے نئے تعلیمی تجربے کیے جارہے تھے' رسالے نکلتے تھے' توسیعی لیکچر ہوتے تھے' معزز و ممتاز علمی شخصیتیں مدعو کی جاتی تھیں' اور ان سب کاموں کے لیے کچھ نہ کچھ مستقل آمدنی کی صورت تو نکالنی ہی تھی۔ آخر کار اس خیال نے ۳۳-۱۹۳۲ء کے تعلیمی سال میں شعبۂ ہمدردانِ جامعہ کی شکل اختیار کرلی' اور ساتھیوں کے مشورے سے ذاکر صاحب نے شفیق الرحمٰن قدوائی کو اس کی تنظیم کا کام سپرد کیا' اور شفیق صاحب نے اپنی دلنواز شخصیت' خداداد صلاحیت اور ان تھک محنت سے تھوڑی ہی مدت میں اسے ایک تحریک بنا دیا۔ ذاکر صاحب نے اس شعبے کے کام کے سلسلے میں قوم سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا:

> "جامعہ کے کارکن جامعہ کی آمدنی کا پائیدار اور قابلِ اعتماد مستقل انتظام اسے نہیں سمجھتے کہ بنک میں سرمایہ جمع ہو یا اربابِ حکومت کی طرف سے امداد ملے' بلکہ تمام مسلمانوں کے دل میں اس قومی تعلیم گاہ کی جگہ ہو جائے اور وہ قطرہ قطرہ کرکے فیض و کرم کا دریا بہا دیں جو بنکوں اور حکومتوں کے زوال کے بعد بھی جاری رہے۔"[1]

۱- ہمدردِ جامعہ' اکتوبر ۱۹۳۶ء' صفحہ ۴

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں جب شعبۂ ہمدردانِ جامعہ کے ترجمان ہمدردِ جامعہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس وقت تک تقریباً چار ہزار ہمدرد حلقۂ ہمدردانِ جامعہ میں شریک ہو چکے تھے۔ کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے تھوڑی تھوڑی مدد لی جائے۔ اس لیے اس حلقے میں دس روپے ماہانہ چندہ دینے والے بھی تھے اور چار آنے اور آٹھ آنے والے بھی، بلکہ موخرالذکر کی تعداد زیادہ ہی تھی اور اس وقت اس حلقے سے کوئی پندرہ سولہ ہزار روپے سالانہ جمع ہو جاتے تھے جس میں سے حلقے کی تنظیم اور چندہ جمع کرنے پر اخراجات کے بعد ایک معقول رقم جامعہ کے مصارف کے لیے بچ رہتی تھی۔[1]

۱۵ر جنوری ۱۹۳۷ء کو "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے عنوان سے ذاکر صاحب کی ایک بڑی قابلِ قدر تقریر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی۔ یہ وہی تقریر ہے جس میں انھوں نے جامعہ کا سب سے بڑا مقصد — جس کا حوالہ بعد میں نہ معلوم کتنی بار اور کتنے لوگوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں دیا — یہ بتایا تھا کہ جامعہ "ہندستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہبِ اسلام ہو اور اس میں ہندستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندستان دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے، مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت اور خلوص اور محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔" اپنی اس تقریر میں جامعہ کے تخیل اور اس کی اس وقت کی حالت کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد

۱۔ [illegible]

انھوں نے آخر میں کہا تھا:

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا خرچ کیونکر چلتا ہے۔ کئی سال سے جامعہ کو بھوپال اور حیدرآباد سے معقول امداد ملتی ہے اور حال میں دلّی کی میونسپلٹی نے بھی پانسو روپے ماہوار کی گرانٹ منظور کی ہے مگر جامعہ کے اخراجات کا بڑا حصّہ ان چھوٹے چھوٹے چندوں سے پورا ہوتا ہے جو حلقہ ہمدردانِ جامعہ کے ممبر عطا کرتے ہیں۔۔۔ یہی حضرات جو اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصّہ قوم کے بچّوں کی تعلیم کے لیے دیتے ہیں، جامعہ کے حقیقی سرپرست ہیں۔ مستقل سرمایہ نہ جامعہ کا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمّت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانونِ قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔"[۱]

شعبۂ ہمدردانِ جامعہ کی طرف سے ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں مقامی منتظموں کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ کے وفود بھی بھیجے جاتے تھے جنھیں اکثر ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا جو نہ صرف یہ کہ جامعہ ملیہ کے کام کی افادیت کا شعور نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس کے سیاسی و تہذیبی مسلک سے شدید اختلاف بھی رکھتے تھے، ان میں ایسے بھی ہوتے تھے جو چندہ مانگنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان کے

۱۔ ہمدردِ جامعہ، جنوری ۱۹۳۱ء، صفحہ

لیے دل آزار باتیں بھی کہتے تھے، یہ نہیں کہ پہلی بار ہی سوال کرنے پر کچھ دے دیں یا منع کردیں، ٹالتے تھے یا کہہ دیتے تھے کہ پھر آیئے۔ غرض خاصا صبر آزما کام اور ایک بڑی آزمائش تھی، خاص کر اُن شخصیتوں کے لیے جو اپنے علم، اپنی قابلیت اور اپنی وجاہت و شرافت کے لیے محترم تھیں، وہ اس لیے بھی محترم تھیں کہ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ میں بے غرض خدمت و ایثار کی ایک مثال قائم کردی تھی، اور انھوں نے اپنی عسرت و بے سروسامانی میں بھی اپنے شریفانہ وقار اور خودداری کو قائم رکھا تھا۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ "ایک دفعہ ایک رئیس نے امداد کا وعدہ کرکے پورا نہیں کیا۔ رقم اچھی خاصی تھی ۔ ۔ ۔ (ذاکر صاحب کے رفقائے کار) نے مشورہ دیا کہ دوبارہ ملیے اور تقاضا کیجیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی پیشانیِ استغنا پر شکن نہ پڑی اور انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ نہ دیں گے تو؟ ۔ ۔ ۔ "نہ دیں گے تو۔ خود ان کی ہوا نیزی ہوجائے گی۔"[1]

جوبلی کے چندے کے سلسلے میں رام پور میں تقریر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا: "۔ ۔ ۔ (جامعہ) کی پچیس سالہ جدوجہد کو آپ نے دیکھا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ملک اور قوم کے لیے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دستِ سوال آپ کے سامنے دراز کریں۔ آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ اس کی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی، اسے بشارت ہو کہ اس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے، اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی یا باہمی جنگ و جدل کے دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی ۔ ۔ ۔"[2]

۱۔ خواجہ غلام السیدین، "آندھی میں چراغ"، اڈرن اکیڈمی، ۱۹۶۲ء، صفحات ۲۶۶-۲۶۷

۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۷

اس طرح ذاکر صاحب جامعہ کی مدد کے لیے کسی سے کہتے تو انداز یہ ہوتا کہ یہ ایک نیک کام ہے اور اس میں ہاتھ بٹانا بڑی سعادت ہے، جامعہ کی مدد، درحقیقت اہلِ جامعہ کی مدد نہیں ہے بلکہ اُن مقاصد کو سہارا دینا ہے جن کی کامیابی قوم کے مستقبل کی درخشانی ہے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بڑا درخشاں تھا اور ان کے دوسرے اوصاف کی طرح اس نے بھی ان کی پوری شخصیت میں ایک ایسی کشش پیدا کردی تھی کہ جہاں جاتے لوگ اُن کا نام سُن کر کھنچے چلے آتے، اُن کی فکر انگیز باتیں سنتے اور محسوس کرتے کہ جو کام ذاکر حسین کر رہے ہیں، وہ کام یقیناً اچھا اور مفید ہوگا۔ لیکن ذاکر صاحب جیسے خوددار شخص کو بھی کبھی کبھی ایسے تلخ تجربات ہوتے تھے کہ اگر فقیری اور تنگ دستی میں اللہ کی کارسازی پر اُن کا یقین محکم اور اپنے مقاصد کی بلندی پر ان کا اعتماد مضبوط نہ ہوتا تو شاید اُن کا دل ٹوٹ جاتا۔

ہمیں ذاکر صاحب کی ایک تحریر ایسی ملی ہے جو ۱۹۳۶ء کے شروع کی ہے، اور جس میں انھوں نے بہ شکل ڈائری اپنے بمبئی اور حیدرآباد کے سفر کی چند مشغولیتوں کا تذکرہ کیا ہے، اور اس سلسلے میں خود کلامی کرتے ہوئے ایسے بعض لوگوں کی طبیعتوں اور اپنی ایسی کیفیتوں کو مختصراً بیان کیا ہے جن سے وہ ملے اور گزرے تھے۔ بمبئی میں ایک دن رات کے کھانے پر ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو وہاں کے مشہور جوہری تھے، لیکن کچھ عرصے سے ان کا کام خراب ہوگیا تھا، اُن سے مُلاقات کا حال لکھتے ہیں :

"ہنس مکھ ملنسار آدمی ہیں، مگر غریب بمبئی کے اکثر کاروباری لوگوں کی طرح اپنے کو عقلِ کل سمجھتے ہیں۔ اپنی ذکاوت اور کاروباری قابلیت کے افسانے سُناتے رہے جن میں اکثر سے ان کی نااہلی ثابت ہوتی تھی! . . . ۱۲ بجے تک اپنا قصیدہ پڑھتے رہے۔ جب ہم لوگوں کے چہروں سے نیند کے آثار نہ چھپ سکے تو اجازت لی اور چلے گئے، کچھ دیر تک شفیق صاحب سے ان کے متعلق گفتگو ہوئی، خصوصاً دورانِ گفتگو انھوں نے چندہ جمع کرنے

والوں کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی اُس سے دل دُکھا تھا۔ جی چاہتا ہے کو کبھی دست سوال دراز نہ کروں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ جامعہ کے لیے کیا کروں۔ دیکھیے وہ مرد خدا کب ملے جو سوال کی لعنت سے بچائے۔"

اسی طرح اس سفر کے ایک اور دن کی مصروفیتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"سہ پہر میں اجمل[1] کے لیے چند نوٹ تیار کیے۔ خالی مشورے دینا کافی نہیں ہوتا۔ اگر حارث کی کچھ مدد کی جائے تو یقیناً وہ اس پرچے کو اچھا کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ رات کا کھانا ناخدا صاحب کے ساتھ کھایا۔ دونوں بھائی اچھے لوگ ہیں۔ دینی امور میں شغف ہے۔ بہت سی چیزیں شائع کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ کاش کوئی مرکزی ادارہ ان منتشر نیک نیت لوگوں کی کوششوں کو ایک رشتے میں پرو کر ان کی تاثیر کو بڑھا سکے، ورنہ بہت کام ہوتا ہے لیکن اثر کم۔ سوچتا ہوں کہ جامعہ یہ کام کرے۔ لیکن پہلے کچھ کر کے دکھائے تب ہی تو لوگ اُسے مرکز بنائیں، اور کرکے یہ کیسے دکھائے جب وسائل نہ ہوں۔ یا اللہ، کب تک اس مردِ غیب کا انتظار کرنا پڑے گا جو ان وسائل کی کمی کو کچھ تو دور کر سکے اور بجائے اس کے کہ میں لوگوں سے بھیک مانگتا پھروں، انھیں جامعہ کا کام بتاؤں اور انھیں ٹھیک مشورہ دے سکوں۔ اب تو مشورہ دیتے بھی ڈرتا ہوں، اس لیے کہ آخر میں جب 'چندہ' کا منحوس ذکر آتا ہے تو مشورے کی

۱۔ روزنامہ اجمل جو حکیم اجمل خاں مرحوم کی یاد میں بمبئی سے نکالا گیا تھا۔ اس کے اڈیٹر اور مشہور صحافی اور سماجی کارکن معین الدین حارث مرحوم تھے جو ذاکر صاحب کے نہایت ممتاز شاگرد اور جامعہ کے مایہ ناز فرزند تھے۔ ان کا انتقال بمبئی میں ۱۳ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ہوا۔

ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ دیکھیے یہ انتظار کبھی ختم بھی ہوتا ہے یا نہیں!"

جرمنی سے واپس ہونے کے بعد دس سال تک جامعہ کو باقی رکھنے، اس کو چلانے اور اس کی سرگرمیوں کو وسیع کرنے میں ذاکر صاحب کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑی، بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ بولنا پڑا، اپنے بے لوث اور ایثار پیشہ ساتھیوں کی مالی پریشانیوں اور دکھ درد کو جنھیں وہ سب لوگ خندہ پیشانی اور صبر و شکر کے ساتھ جھیلتے اور اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، اپنی اسی طرح کی عسرت کی زندگی کی آزمائشوں کے ساتھ وہ دیکھتے اور اپنے دل پر محسوس کرتے، پھر فراہمیِ سرمایہ کے لیے مستقل سفر جو یقیناً بہت آرام دہ نہ ہوتا ہوگا اور اس پر مستزاد نہ معلوم کتنے پسندیدہ و ناپسندیدہ لوگوں سے ملنا اور ہر طرح کی خوش گوار اور ناخوش گوار باتوں کو سننا اور برداشت کرنا ــــ ان سب باتوں کا ان کے اعصاب پر بُرا اثر پڑا اور عام صحت بھی خاصی متاثر ہوئی۔ ہمدرد جامعہ کے جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارے میں "شیخ الجامعہ کی صحت" کے عنوان سے ایک نوٹ شائع ہوا تھا جس میں غالباً پہلی بار جامعہ کے ہمدردوں کو ان الفاظ میں اطلاع دی گئی تھی کہ "شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مدظلہٗ کو ایک عرصے سے ضعفِ بصر کی شکایت ہو گئی تھی اور دہلی کے اطبا کی ہدایت کے مطابق آپ نے عینک کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں بائیں آنکھ کی بصارت نے نہایت مخدوش صورت اختیار کر لی اور آپ ماہرینِ چشم ڈاکٹروں کے اصرار پر بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر کیوے (Klewe) نے اس آنکھ کا آپریشن کیا۔"[1]

مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کی آنکھ کی اس تکلیف اور بمبئی میں آپریشن کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ ان کی یہ تکلیف طرح طرح کی بیماریوں کا نقطۂ آغاز

۱۔ ہمدرد جامعہ، جنوری ۱۹۳۷ء، صفحہ ۱۳

تھی اور اس واقعے میں ان کی طبیعت اور شخصیت کے بڑے دلچسپ پہلو ملتے ہیں، اس لیے ہم اسے اختصار سے ذیل میں درج کرتے ہیں :

۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم جامعہ کی دعوت پر ہندستان آئی تھیں۔ جامعہ میں انھوں نے "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے عنوان پر آٹھ لیکچر دیے تھے۔ چھپوانے کی غرض سے ان لیکچروں کی ترتیب کا کام مجیب صاحب کے سپرد ہوا تھا، لیکن ذاکر صاحب بھی اس میں شریک ہو گئے۔ وہ مجیب صاحب کے ساتھ مل کر یہ کام سہ پہر کے آخری حصے میں کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنی آنکھوں میں درد محسوس کیا۔ جلد ہی اس درد نے شدت اختیار کرلی اور انھوں نے لکھنے کا کام بند کر دیا۔ شاید یہ اُس بیماری کی پہلی علامت تھی جسے آگے چل کر گلوکوما (GLAUCOMA) تشخیص کیا گیا، درد ختم ہو گیا تو وہ اسے بھول گئے اور کوئی علاج نہیں کرایا، بلکہ اگر کوئی اس کا ذکر کرتا تو جھنجھلا جاتے، اب انھوں نے آرام کے لیے کچھ وقت نکالنے کے بجائے اپنے آپ کو اور زیادہ تھکانا شروع کر دیا، کچھ تو ان کی اپنی طبیعت، کچھ جامعہ کے حالات کے تقاضے، اور سب سے زیادہ مشرقی تہذیب کے آداب کا لحاظ جو ان کی فطرت ثانیہ بن گئے تھے، ان سب باتوں نے مل کر کھانے اور ملنے ملانے کے سلسلے میں انھیں غیر محتاط بنا دیا تھا، یوں تو اچھا کھانا ان کی کمزوری تھی، وہ شوق سے کھاتے بھی تھے اور کھلاتے بھی تھے، لیکن جامعہ کے اس وقت کے حالات میں عین وقت پر مہمان نوازی کا موقع ہوتا تو ماحضر پیش کر دیتے اور چاہے خود ان کو کھانے کی خواہش نہ ہو لیکن دسترخوان پر مہمان کا ساتھ ضرور دیتے اور جی بھر کر دیتے۔

۱۹۳۶ء کے موسم خزاں کے دن تھے، ایک روز وہ دفتر سے صبح کوئی گیارہ بجے

۱۔ پچھلے صفحات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ زمانہ جامعہ میں سخت مالی مشکلات کا زمانہ تھا، لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی چونکا دینے والا تھا کہ وہ مشکل حالات میں ایسے کام کرتے تھے کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔

ہی گھر آ گئے۔ انھیں بھوک لگ رہی تھی۔ جلدی جلدی میں یوں ہی سا کچھ تیار کیا گیا جسے انھوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کوئی بارہ بجے علی گڑھ سے ایک مہمان آ گئے۔ اب ان کے لیے کھانا تیار کیا گیا، ذاکر صاحب نے آداب مہمان نوازی کا لحاظ کرتے ہوئے کھانے میں مہمان کا ساتھ دیا، اور ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ ساتھ دینے کا حق بھی ادا کیا۔ کھانا ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ نئی دہلی سے ایک دوست گاڑی لے کر آ گئے، ذاکر صاحب بھول گئے تھے کہ اس دن وہ ان کے یہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے۔ انھوں نے معذرت کی لیکن دوست نے کہ ان کی بیوی نے ذاکر صاحب کے پسندیدہ کھانے بڑے شوق سے تیار کیے تھے، انھیں نہیں بخشا۔ ذاکر صاحب ان کے ساتھ گئے اور اس اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ کیا جائے تو پھر مناسب ہے کہ اسے اچھی طرح کیا جائے، انھوں نے بڑی خوش دلی سے کھانے کا حق ادا کیا، کھانوں کی تعریف کی اور دوست کی اہلیہ محترمہ کے خلوص کی داد دی۔ دوسرے ہی دن ان پر گلوکوما کا سخت دورہ پڑا اور وہ بے چینی کی حالت میں پڑے تڑپا کیے، ایسی بے چینی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔[1]

گلوکوما کی یہی تکلیف تھی جس کی اطلاع ہمدرد جامعہ (جنوری ۱۹۴۷ء) کے توسط سے ہمدردان جامعہ کو دی گئی تھی۔ دہلی میں ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا اور کچھ علاج معالجہ بھی ہوا لیکن پھر انھیں ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ آنکھ کا آپریشن کرانے کی غرض سے بمبئی گئے۔ اس وقت انھیں کھانسی اور زکام کی شکایت تھی اس لیے آپریشن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے جامعہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کر دی، نتیجے میں کھانسی اور بھی بڑھ گئی، مگر آپریشن تو بہرحال ہونا ہی تھا، کھانسی کے علاج کے لیے تیز دوائیں دی گئیں، اور پھر آپریشن ہوا جو کامیاب رہا۔ بمبئی میں ان کا قیام ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید کے یہاں تھا۔ انھوں نے اور ان کی جرمن بیوی دونوں

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحات ۶۳-۶۴

نے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں، اور بڑے اعلا پیمانے کی تیمارداری کی، ذاکر صاحب جب بھی اس کا ذکر کرتے تو شکرگزاری اور ممنونیت کے ساتھ کرتے۔

۱۹۴۷ء کی جنوری میں آنکھ کا یہ آپریشن ہوا، وسط فروری میں وہ دہلی واپس آئے، مارچ میں انھوں نے شفیق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ برما کے دورے کا پروگرام بنایا، روانہ ہونے ہی والے تھے کہ رنگون میں آتش زدگی کا ایک شدید حادثہ ہوا اور وہاں کے کاروبار کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور برما کا یہ سفر ملتوی ہوگیا۔ لیکن ذہن سفر کے لیے تیار تھا، کلکتے کے حلقۂ ہمدردانِ جامعہ کے مہتمم کی دعوت پر یہ حضرات کلکتہ پہنچے، ان کے پہنچنے سے وہاں حلقے کی تنظیم اور چندے کی وصول یابی کے کام میں جان پڑگئی، اپریل کا مہینا تھا، ذاکر صاحب کی صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی، لیکن پندرہ بیس دن تک انھوں نے کلکتے میں جامعہ کے کام و پیام کے لیے ان تھک محنت کی۔ ہمدرد جامعہ (جون ۱۹۴۷ء) میں اس سفر کی روداد چھپی ہے۔ وہاں کے مہتمم نے لکھا کہ "کلکتہ کے کاروباری حالات اور موسم کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو ہفتے کے اندر وفد جامعہ کی کامیابی صرف شیخ الجامعہ صاحب کی مسحور کن شخصیت کا ایک معجزہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے باوجود صحت کی خرابی کے کلکتہ کے قیام میں دکان دکان اور گھر گھر جاکر ڈیڑھ دو سو آدمیوں سے ملاقات کی اور حلقۂ ہمدردانِ جامعہ میں شرکت کی دعوت دی ... پندرہ بیس دن کے قیام میں ڈیڑھ دو سو آدمیوں سے ملاقات کرنا کلکتہ جیسے شہر میں کچھ آسان کام نہ تھا۔ پورا پورا دن بلکہ اکثر رات کو بھی دس گیارہ بجے تک اسی کام کے سلسلے میں دوڑ دھوپ رہتی تھی۔"

اکتوبر و نومبر ۱۹۴۷ء کے ہمدرد جامعہ میں جب حلقۂ ہمدردانِ جامعہ کی پانچ سال کی رپورٹ شائع ہوئی تو پتا چلا کہ رفتہ رفتہ ہندستان کے گوشے گوشے میں جامعہ کی آواز پہنچ گئی ہے اور جس نے جامعہ کو جان لیا اُس سے اس نے اپنا خراج وصول کیا ہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں کوئی پانچ ہزار آدمیوں سے کوئی پچیس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی تھی، اس میں سے ایک پائی بھی ایسی نہیں تھی جو جامعہ کو بے سوچے سمجھے کسی نے دی ہو، اور دینے والوں میں مختلف النوع سیاسی و مذہبی خیال کے لوگ تھے۔ سوال یہ

ہے کہ اس پراگندہ حالی کے زمانے میں بنیادی طور پر یہ کس کی شخصیت تھی، کس کی بلند مقصدی تھی، کس کے سخن کی دلنوازی، کس کے قلب کا سوز، کس کی روح کا اضطراب تھا، جس نے اگر ایک طرف ساتھیوں میں بلند نگہی، تحمل و برداشت اور ایثار و خدمت کی متاعِ گراں بہا بکھیر دی تھی، تو دوسری طرف پانچ ہزار قلوب میں جامعہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ ذاکر صاحب کی شخصیت تھی، اور اس وقت وہی ایک ذات تھی جس نے قوم کو تعلیم کا ایک نیا تصور دیا، تہذیب کے معنٰی کو وسعت بخشی اور تعمیری کام کی قدر و قیمت کا احساس بیدار کیا، اور یہ سب کام اس انداز سے کیا کہ روشن ضمیری کا مفہوم واضح ہو گیا۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں بیسک نیشنل ایجوکیشن[1] یا وردھا اسکیم کا چرچا ہوا۔ ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے تخیل کو نہ صرف یہ کہ ایک عملی منصوبے کی شکل دی تھی، بلکہ وہ اس کے ایک پُرجوش مبلغ بھی تھے۔ اگست ۱۹۳۸ء میں جامعہ میں "استادوں کا مدرسہ" قائم کیا گیا تو اس کی غرض و غایت یہی تھی کہ اس میں وردھا اسکیم کے اصولوں کے مطابق استادوں کی تعلیم ہوگی۔ اس زمانے میں مسلم سیاست ایک نئے مرحلے میں قدم رکھ رہی تھی اور عام مسلمان کانگریس کی Muslim Mass Contact کی تحریک کے باوجود اس سے دور ہوتے جا رہے تھے، وردھا اسکیم تو گاندھی جی کے تعلیمی افکار کا نتیجہ تھی، عام مسلمان جن میں اب مسلم لیگ کا اثر بڑھ رہا تھا، اسے کیسے پسند کر سکتے تھے، ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ حلقۂ ہمدردانِ جامعہ کے کام میں وہ پہلے کی سی تیز رفتاری نہ رہی، اور ایسی باتیں بھی سُنائی دینے لگیں کہ اب جامعہ ملیہ اسلامی ادارہ نہیں رہا اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے اکثر ساتھی اچھے مسلمان نہیں ہیں۔ جامعہ میں بھی کچھ لوگ اس خیال کے رہے ہوں گے کہ اگر ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کی وردھا اسکیم میں اپنے آپ کو اس قدر نہ اُلجھایا ہوتا تو مسلمانوں کی رائے جامعہ کے بارے میں اچھی رہتی اور

۱۔ اس کے بارے میں آئندہ ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

علاوہ ہمدردانِ جامعہ کے توسط سے چندے کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا۔

۱۹۲۸ء کے بعد سے ذاکر صاحب کی صحت مستقل خراب رہنے لگی، کبھی بخار آجاتا، کبھی آنکھوں میں تکلیف ہو جاتی، اسی زمانے میں یہ بھی پتا چلا کہ ذیابیطس کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، ایک بار جسم میں پھنسیاں نکلیں اور بخار بھی رہا، لیکن اس سب کے باوجود "مشقِ سخن" میں فرق نہیں آیا۔ جامعہ کے کاموں کے علاوہ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کے نصف اوّل میں بنیادی قومی تعلیم کے تصورات کی تشریح و توضیح اور ان کے نفاذ کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں انھیں بار بار سفر کرنا پڑا۔ دہلی میں ہوتے تو ان سے ملاقات کے لیے تعلیم کا کام اور انتظام کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ یہ لوگ اتنی باتیں کرتے تھے اور خود ذاکر صاحب ان میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ آخر وہ تھک جاتے اور یہ تھکن اعصاب میں تہ بہ تہ اکٹھا ہوتی رہتی۔ پھر ایسے لوگ بھی آتے جو ذاکر صاحب کے وقار اور اثر سے فائدہ اٹھانا چاہتے اور صوبوں میں بنیادی تعلیم کے کام میں کسی عہدے یا پوزیشن کے لیے ان سے سفارش چاہتے۔ ایسی باتوں سے ان کی طبیعت اور الجھتی اور ان کی تھکن میں اور اضافہ ہوتا۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، یہ تمام کام ذاکر صاحب بغیر کسی سکریٹری کے انجام دیتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ ان کے لیے کسی سکریٹری کا بندوبست کرتی اور نہ کوئی صوبائی حکومت یا تنظیم ایسی تھی جو ضابطے کے مطابق یہ انتظام کر سکتی تھی۔"[1]

رات دن کی محنت، بے پناہ مصروفیت اور کثرتِ کار کے سبب جولائی ۱۹۳۸ء میں آنکھ کی تکلیف پھر عود کر آئی اور دوبارہ آپریشن کی نوبت آگئی، تھوڑے دنوں بعد یہ آپریشن بھی بمبئی میں ہوا اور کامیاب رہا۔[2] لیکن جامعہ ملیہ کی مالی دشواریوں، اس کے کاموں اور دوسری قومی و ملی مصروفیتوں میں احتیاط اور آرام کہاں اور کیسے ہو سکتا تھا!

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۱۴

۲۔ سیٹھ جمنا لال بجاج نے جو جامعہ ملیہ کے خازن رہ چکے تھے، علاج معالجے کے لیے ذاکر صاحب کو دو سو روپے بھیجے تھے۔ ذاکر صاحب کو اتفاق سے مس گرڈا فلپسبورن سے یہ بات معلوم ہوگئی۔ ذاکر صاحب (باقی اگلے صفحے پر)

اُس زمانے میں ریاست حیدر آباد کے صدر اعظم سر اکبر حیدری تھے جن سے ذاکر صاحب پہلے ہی سے اچھی طرح واقف تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کے دوست تھے اور جب ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم ہندستان آئی تھیں تو اُن سے مل کر بہت متاثر ہوئی تھیں تعلیم سے اُن کی دلچسپی اور اُن کی معارف نوازی کی بڑی شہرت تھی، ذاکر صاحب کی بالغ نظری اور اُن کی ذہانت اور شخصیت کی سحر آفرینی کے وہ قدر دان تھے، جامعہ میں تعلیم کا جو کام وہ کر رہے تھے اس کی افادیت کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور خالدہ ادیب خانم جیسی بین الاقوامی شہرت کی شخصیتوں سے اُن کے گہرے تعلق کے سبب انھیں ذاکر صاحب اور جامعہ سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا' اور خالدہ ادیب خانم نے تو جامعہ کی مدد کے لیے ان سے سفارش بھی کی تھی۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں وہ دہلی آئے تو بڑی خوشی سے انھوں نے جامعہ آنے کی دعوت قبول کی اور مدرسہ ابتدائی کے بچّوں کے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا:

"بچّو! اس وقت میرا دل مسرت سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے تمھارے مدرسے اور تم سے بہت امیدیں ہیں۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمھارا

(سلسلۂ صفحۂ گزشتہ) اس وقت بمبئی میں تھے۔ انھوں نے جمنا لال جی کی اس "فیاضانہ مہربانی" کا اور اُس "خیال و جذبے کا جس نے انھیں اس پر آمادہ کیا ہوگا" شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا: "میں آپ سے سچ سچ کہتا ہوں۔ میں اپنی علالت کو اپنے لیے پیسے اکٹھا کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ میری مالی حالت ایسی نہ تھی جو آپریشن اور متعلقہ اخراجات کی متحمل ہو سکتی۔ لیکن میرے چھوٹے بھائیوں نے علاج کا تقریباً سب خرچ اٹھایا ہے اور ایک عزیز دوست ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید نے آرام وہ قیام کا سارا انتظام کیا ہے۔ اس طرح آپ کی بھیجی ہوئی رقم ایسی "بچت" ہے جو اِس "کاروبارِ شوق" میں کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس کی اجازت دیں کہ اس رقم کو جامعہ کی کسی ضرورت یا کسی ایسے کام پر جسے آپ پسند فرمائیں، خرچ کر دیا جائے۔ (ذاکر صاحب کا خط جمنا لال بجاج کے نام' مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء' جمنا لال بجاج پیپرس' نہرو میوزیم لائبریری)

شیخ ایک ایسا آدمی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ خدا کرے تم قوم کے ایسے رہنما ثابت ہو جن پر جامعہ ہی نہیں بلکہ سارا ملک فخر کرسکے[۱]۔"

ہم نے اس موقع پر جامعہ ملیہ میں سر اکبر حیدری کی آمد کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ انھیں کی توجہ خاص سے ایک ایسے وقت میں جب وردھا اسکیم کی پُرزور حمایت کے سبب ہندستان کے مسلمان ذاکر صاحب اور جامعہ سے کچھ دور ہونے لگے تھے، جون ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد سے ایک لاکھ روپے کا یکمشت عطیہ ملا تھا[۲]۔ ظاہر ہے کہ اس میں خود ذاکر صاحب کی دلکش شخصیت اور قائدانہ صلاحیت کے جادو کا اثر بھی شامل تھا— لیکن، اب وہ بہت تھک گئے تھے، اُدھر گلوکوما کی تکلیف نے ایک بار پھر انھیں پریشان کرنا شروع کر دیا، اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر انھیں کچھ سکون و آرام نہ ملا تو بیٹھ جائیں گے۔ اپنی ریڈیو سے حالاتِ حاضرہ پر پندرہ روزہ تقریروں کے لیے وہ بین الاقوامی صورت حال کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، اور انھیں یقین سا تھا کہ جنگ نہیں ہوگی، چنانچہ جون ۱۹۳۹ء میں انھوں نے رختِ سفر باندھا اور علاج اور آرام کی غرض سے جرمنی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ لیکن اُن کے اندازے کے برخلاف ستمبر کے شروع ہی میں جنگ شروع ہو گئی اور انھیں جرمنی سے بھاگنا پڑا۔ جنگ کے شروع ہو جانے پر اہلِ جامعہ کو یہ اضطراب تھا کہ نہ معلوم ذاکر صاحب پر کیا گزری، اور جب ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کے تار سے یہ اطلاع ملی کہ وہ بخیریت سوئٹزرلینڈ پہنچ گئے ہیں تو اطمینان ہوا۔ ۱۱ ستمبر کو انھوں نے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) سے عابد صاحب کے

۱۔ ہمدردِ جامعہ، فروری ۱۹۳۸ء، صفحات ۵۔۴

۲۔ پہلا حیدرآباد سے جو پچاس ہزار کی رقم ملی تھی اس سے جامعہ نے جمنا کے کنارے اوکھلا گاؤں میں زمینیں خرید لی تھیں اور مدرسہ ابتدائی کی عمارت کا اقامتی حصّہ تعمیر ہوا تھا جس میں ۱۹۳۶ء میں یہ مدرسہ شہر سے منتقل ہو چکا تھا۔ اب حکومت حیدرآباد کے اس عطیہ سے مدرسہ ثانوی کی عمارت کا منصوبہ تھا۔

نام خط لکھا کہ ۸ر جولائی کو وہ وینس پہنچے تھے '۱۰ر جولائی کو وی آنا' وہاں سے اپنے بھتیجے امتیاز صاحب مرحوم کے ساتھ بوڈاپسٹ چلے گئے' وہاں سے وی آنا واپس آئے' مگر ہوائی جہاز پر (یہ ان کا ہوائی جہاز کا پہلا سفر رہا ہوگا' لکھا ہے کہ "یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا") ' "پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے. ڈاکٹروں نے وہ 'رہ جانے' کیے کہ معاذاللہ' درگفتن نمی آید. قرار پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا' آنتیں البتہ بہت خراب ہیں' پرانی پیچش ہے اور خوب ہے. اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں. زیادہ ڈھیل کی گنجایش نہیں. قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیے تھی' لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لیے ابھی موقع ہے' علاج ہو سکتا ہے. خون کی جو حالت ہونی چاہیے تھی اس سے بہت بہتر ہے' اس لیے علاج میں سہولت ہے. قلب بھی (ستم ظریفی ملاحظہ ہو!) پرچا ہے. دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا. علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی' سات انجکشن تجویز کیے گئے اور حکم ملا کہ کیسنگن چلے جاؤ' وہاں تین ہفتہ رہو..."

یہ خط بہت دلچسپ ہے. کیسنگن (جرمنی) میں جہاں "چاروں طرف پھولوں کی بھرمار تھی" طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی' ان کے خیال میں اگرچہ بادل منڈلا رہے تھے لیکن جنگ کا امکان نہ تھا. "اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ر اگست کو خاکسار کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولد ہوا! یعنی) ایک عدد عظیم الشان کیڑا' طول جس کا کوئی نو انچ تھا' برآمد ہوا' پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے. انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا. انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا' اور کہا کہ اچھا ہوا یہ نکل گئے. بہت پرانا ہے." اس کے بعد جرمنی سے بھاگ نکلنے اور جنیوا (سوئٹزرلینڈ) پہنچنے کی روداد ہے' پھر لکھا ہے

۱- پورا خط رسالہ جامعہ (بابتہ نومبر ۱۹۳۹ء) میں چھپا تھا.

کر ۔۔۔ فی الجملہ اچھا ہوں، خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں اور ہضم کرتا ہوں، اور کیا چاہیے وقت گزار کر پھر یہیں کہیں انگلش لینے کا انتظام کروں گا، اور اگر اٹلی غیر جانبدار رہا تو ان شاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آملوں گا۔۔۔"

سوئٹزرلینڈ سے ذاکر صاحب نومبر ۱۹۳۹ء میں واپس آئے۱، یہاں صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں مستعفی ہو چکی تھیں اور مسلمانوں کی سیاست کی باگ ڈور رفتہ رفتہ مسلم لیگ کے ہاتھ میں جا رہی تھی جس کا کوئی بین الاقوامی نقطۂ نظر نہ تھا اور جسے اُن اصولوں اور نظریوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو عالمی جنگ کے پیچھے کارفرما تھے۔ اس وقت اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر انھیں کانگریس اور ہندوؤں کے بالمقابل صف آرا کر دیا جائے، اور اس میں وہ کامیاب رہی۔ یہاں تک کہ اس کے سیاسی مقاصد نے ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس کے اجلاس لاہور میں پاکستان ریزولیوشن کی شکل اختیار کر لی ـــــ ملک کے سبھی محبانِ وطن پر اس کا بُرا اثر پڑا، اور ذاکر صاحب تو بہت ہی زیادہ پریشان ہو گئے کہ یہ اُن تعلیمی و تہذیبی اور اس لیے صحیح و صحت مند سیاسی مقاصد پر ایک ضرب کاری تھی جو انھیں جان سے زیادہ عزیز تھے اور جن کے حصول کے لیے انھوں نے برسوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد سے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے

۱۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ واپسی پر ذاکر صاحب نے یہ دلچسپ قصہ سنایا: جرمنی کی سرحد پر کسٹم والوں کے لیے جب میں نے اپنا بکس کھولا تو اس میں اُردو کی کچھ تحریریں تھیں۔ کسٹم افسر نے پوچھا کہ یہ کس قسم کی دستاویزیں ہیں؟ میں نے جواب دیا: "یہ کچھ تحریریں ہیں جو میں نے جرمن افواج کی نقل و حرکت اور ان کی کیفیت کے بارے میں خفیہ طور پر لکھی ہیں، مگر آپ گھبرائیں نہیں۔ جب تک میں گھر پہنچوں گا جنگ میں جرمنی کی فتح ہو چکی ہوگی۔" افسر نے مجھے غور سے دیکھا، ہنسا اور پھر کچھ اور پوچھے بغیر بکس کو بند کر دیا۔

(محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۱۱)

مسلمانوں کے تعلق میں کوئی خاص فرق آگیا ہوگا اور پہلے کے مقابلے میں ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ رفتہ رفتہ تنگ اور محدود ہوتا گیا ہوگا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہمدردِ جامعہ کے شماروں سے پتا چلتا ہے کہ مختلف ذریعوں سے جامعہ کی آمدنی میں اضافہ ہی ہوتا رہا' مثلاً اگست ۱۹۴۲ء تا جولائی ۱۹۴۳ء ہمدردانِ جامعہ سے مختلف مدات میں آمدنی کے گوشوارے کے مطابق ۸، ۴۷۰۰۰ = روپے وصول ہوئے (ہمدردِ جامعہ' ستمبر ۱۹۴۳ء' صفحہ ۸)۔ یہ آمدنی حلقۂ ہمدردانِ جامعہ کے توسط سے پچھلے برسوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھی۔ اور ۴۴-۱۹۴۳ء میں تو یہ ۶۷۰۲۸٫۰۰ = روپے ہوگئی۔[۱] نومبر ۱۹۴۳ء کے ہمدردِ جامعہ میں (صفحہ ۱۱) جامعہ کا میزانیہ بابتہ ۴۴-۱۹۴۳ء شائع ہوا تھا۔ اس میں کُل متوقع آمدنی ۵۶۶، ۴۸،۱ = ۰۰ روپے دکھائی گئی ہے اور یہ نوٹ لکھا گیا ہے؛ "خدا کا شکر ہے کہ اس سال کا میزانیہ جامعہ کی زندگی میں پہلا میزانیہ ہے جس میں تمام اخراجات پورا کرنے کے بعد ہم بچت دکھا سکے ہیں (بچت برائے ادائیگی قرضہ جاتِ سابق، ۳،۹۲۲ = ۰۰ روپے)۔ لیکن اصل بچت ابھی بہت دور ہے' کیونکہ ہمارے زمانے پہلے کے قرض چلے آ رہے ہیں جو آمد و خرچ کا توازن نہ ہونے کے سبب ہر سال بڑھتے رہتے تھے' تاہم یہ کیا کم شکر کا مقام ہے کہ اس سال ہم وقت پر پوری پوری تنخواہیں ادا کر رہے ہیں اور پچھلے قرضوں میں سے بھی کچھ بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔۔۔"

جامعہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کا قیام

ذاکر صاحب کی دلچسپیاں مختلف قسم کی تھیں' اور اُن کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اُن کی نظر ہمیشہ دور نئے نئے افق تک پہنچتی تھی' ٹھیک اسی زمانے میں جب بنیادی قومی تعلیم کا غلغلہ بلند ہوا اور جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں' ذاکر صاحب اس نظریۂ تعلیم کے

۱۔ عبدالغفار مدھولی' حوالہ سابق' صفحہ ۳۷۵

حامی، مبلغ اور شارح کی حیثیت سے مشہور ہوئے تو مسلمانوں میں ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں، خود جامعہ میں بعض لوگ وردھا اسکیم سے ذاکر صاحب کے اس قدر گہرے تعلق کو سمجھ نہ سکے، ان کا خیال تھا کہ اس سے مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی اور جامعہ کی مشکلات بڑھ جائیں گی، ذاکر صاحب نے یہ معلوم ہونے پر کہ حکومت کے مولانا عبیداللہ سندھی کی ہندستان واپسی پر راضی ہونے کا امکان ہے، پروفیسر محمد سرور کو مکہ معظمہ بھیجا کہ وہ ان کے پاس رہیں اور جب مولانا کے ہندستان آنے کا پروگرام بنے تو انھیں جامعہ اور شیخ الجامعہ کی طرف سے جامعہ میں قیام کرنے کی دعوت دیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے عزیز شاگرد تھے اور ان کی ریشمی رومال کی تحریک میں شامل تھے۔ کوئی پچیس برس سے وہ ہندستان سے دور مختلف ملکوں میں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور بیشمار شدائد اور مصائب سے گزرے تھے۔ مسلمانوں میں شیخ الہند سے ان کے گہرے تعلق اور ان کی تحریک کے ایک عظیم المرتبت مجاہد اور انقلابی ہونے کی وجہ سے ان کو ایک ہیرو کا مرتبہ حاصل تھا اور ان بے مثال قربانیوں اور دور دراز ملکوں میں برسوں زندگی کی سختیاں جھیلنے کی وجہ سے ان کی شخصیت کی ایک افسانوی حیثیت ہو گئی تھی۔ ۵ر اپریل ۱۹۳۹ء کو وہ جامعہ آئے تو ان کا بڑا پرجوش استقبال کیا گیا اور ان کے اعزاز میں جو غیر مقدمی جلسہ وعصرانہ ہوا اس میں شہر دہلی کے معزز حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

اوّل اوّل مولانا عبیداللہ سندھی جامعہ میں "یادگار شیخ الہند" کے نام سے ایک درس گاہ چلانا چاہتے تھے جس کا پروگرام انھوں نے شائع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد حکمت ولی اللہی کی، ایک تحریک کی حیثیت سے، تبلیغ و اشاعت تھا۔ اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں جو جنوری ۱۹۴۱ء میں اخباروں میں شائع ہوا تھا، انھوں نے

[illegible] ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵

لکھا تھا کہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ان کے رفقا نے "اعلا درجے کی فراخ دلی سے تحریک کا خیر مقدم کیا ہے . . . اور اس وقت بھی جامعہ ہر قسم کی مالی امداد دینے کے لیے تیار ہے . مگر میں اس کے بجٹ پر بجز اشد ضرورت کے کسی قسم کا بوجھ ڈالنا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتا ہوں . ہماری درس گاہ اندرونی استقلال قائم رکھنے کے بعد اسی طرح جامعہ ملیہ کی جا امداد دینے لگی جیسے بنیادی تعلیمی اسکیم کا ٹریننگ اسکول جامعہ کا حصّہ ہے۔"

مضمون کے آخر میں مولانا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا : "ہم ایک طویل زمانے تک دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبے سے پریشان ہو گئے تھے . اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے . وطن پہنچنے سے آخری صدمے کا خوف تو جاتا رہا ، مگر اب تک چونکہ ہماری منشا کے موافق کام کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا ، ہماری وحشت پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوا۔

"یادگار شیخ الہند کا کام شروع کرنے کے ارادے سے جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے متاثر ہوئے . ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے پر کالج دیکھے ہیں . ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی میں نظر آیا . جب ہم اسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں تک سرور محسوس کرتے ہیں . ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے نوجوان کو توفیق عنایت کی جس نے اولوالعزمی سے قوم میں معیاری زندگی کی اساس قائم کرلیا . خدا کرے جامعہ کے محصلین قوم کے ادنا طبقے کو اس معیار تک لانے میں کامیاب ہوں . . . جامعہ کے اساتذہ و منتظمین کو جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں ، وہ اس تحریک کی ہمدردی سے معمور ہیں . ہم اسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں ۔"[۱]

---

۱ - ہمدرد جامعہ ، جنوری ۱۹۴۱ء ، صفحات ۷-۸ ، ۱۰-۹

تبلیغی جماعت کے کام سے دلچسپی

۱۹۴۲ء میں کسی موقع پر تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس سے ذاکر صاحب کی ملاقات ہوئی، اور پہلی ہی نظر میں انھوں نے اپنی تیز ذہانت، دلکش شخصیت اور خیالات و افکار کی تشریح کرنے کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر مولانا کا دل جیت لیا، دوسری طرف وہ خود بھی مولانا کی روحانی عظمت اور یقین کی قوت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، گویا دونوں ہی نے ایک دوسرے سے زبان حال سے کہا:

آں دل کہ رَم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بہ یک نگاہے

اب ذاکر صاحب نے ہر جمعہ کو فجر کی نماز نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد میں مولانا کے پیچھے پڑھنے اور ان کی تقریر سننے کو معمول بنالیا، اور میوات کے اہم جلسوں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ وہ پہلے ہی سے تبلیغی جماعت کے کام سے واقف تھے، مولانا محمد الیاسؒ کے سامنے جو اعلا مقصد تھا، انھوں نے مسلمانوں میں مذہبی اور سماجی شعور بیدار کرنے کے لیے کام کا جو طریقہ اپنایا تھا، اور اس کے لیے ان کے دل میں جو یقین، خلوص اور احساس امانت تھا، روزمرہ کی زندگی میں جو سادگی، استغنا اور ایثار پیشگی تھی، اس سب سے وہ اور بھی روز بروز مولانا سے مانوس اور اُن سے قریب ہوتے گئے۔

مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ "انھیں (مولانا کو)، بہرحال، اپنے کام کی توسیع کے لیے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تائید کی ضرورت تھی اور اسی لیے دہلی کے اونچے طبقے کے مسلمانوں سے ان کا ربط ضبط بڑھا۔ یہاں مقرر کی حیثیت سے اُن کی صلاحیتیں ناکافی ثابت ہوئیں، اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ذاکر صاحب سے ان کا تعارف نصرتِ الٰہی کے لیے اُن کی دُعاؤں کی قبولیت کی علامت ہے، ... کچھ عرصے کے لیے ذاکر صاحب نے اپنے آپ کو پوری دلچسپی سے تبلیغی جماعت کے کام کے لیے وقف کر دیا، یہاں تک کہ مولانا نے بھی انھیں اس کا موثر ترین مبلغ تسلیم کر لیا۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ جب کبھی

کسی اجتماع میں ہم دونوں ساتھ ہوتے تو مولانا مجھ سے کہتے: "بھائی ذاکر، میں تو ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں، میں تو خود اپنے خیالات کو بھی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتا، آپ مجھ سے زیادہ انھیں سمجھتے ہیں، براہِ کرم، آپ میری طرف سے تقریر کیجیے۔"[1]

تبلیغی جماعت اور مولانا محمد الیاسؒ ہی کے اثر سے اس زمانے میں ذاکر صاحب کو یہ خیال ہوا کہ میوات کے علاقے میں نمونے کی ایک اسلامی بستی بسائی جائے جہاں عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی اخلاق و معاملات بھی پائے جاتے ہوں اور جہاں اسلامی تعلیمات کے زندہ اور چلتے پھرتے نمونے دیکھنے والوں کو نظر آئیں، ان کے نزدیک اس زمانے میں اسلام کی یہ بڑی خدمت ہوگی کہ ان نمونوں کو لوگ دیکھیں، اور متاثر ہوں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک بلند تصور قائم کریں۔ اپنے اس خیال کو ذاکر صاحب نے مولانا محمد الیاس اور تبلیغی جماعت کے بااثر لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور تقریباً سبھی نے اس کو پسند کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ذاکر صاحب کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اس کام کو شروع کرنے اور اس کی نگرانی کے لیے مولانا علی میاں کا انتخاب بھی کر لیا تھا لیکن اس کا آغاز کسی وجہ سے نہیں ہو سکا۔ ذاکر صاحب نے مولانا علی میاں کو لکھا تھا:

"دفتر شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، ۱۰ر مئی ۱۹۴۴ء

محب محترم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

رخصت ہوتے وقت جو گفتگو میوات میں ایک مرکز کے قیام کے متعلق ہوئی تھی، اس کا سلسلہ جاری رہا، شیخ الحدیث اور مولوی احتشام الحسن صاحب سے گفتگو ہوئی، پھر اتوار کے دن قریشی صاحب اور ملک وزیر علی کے ہمراہ

نظام الدین حاضر ہوا، اور مفصل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اگر آپ تیار ہوں تو یہ کام اللہ کا نام لے کر شروع کر ہی دیا جائے، بس بسم اللہ کیجیے، ضروری یہ ہے کہ آپ چند روز کے لیے تشریف لے آئیں اور ہم چند لوگ میوات چل کر بعض مقامات دیکھ لیں اور فیصلہ کریں کہ مرکز کہاں ہو۔ اس کے بعد کارروائی شروع کر دی جائے۔ قریشی صاحب نے دو سال کے جملہ مصارف اٹھانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

غالباً مولوی احتشام الحسن صاحب نے بھی آپ کو خط لکھا ہوگا۔ اولین فرصت میں اس باب میں کچھ کر ڈالیے۔ اس نیک کام کو انجام دینے کی سعادت آپ ہی سے مخصوص معلوم ہوتی ہے، مبارک ہو۔

والسلام

مخلص

ذاکر حسین[۱]

جامعہ میں مولانا عبید اللہ سندھی کی آمد، ان کے شاندار استقبال، یادگار شیخ الہند کے منصوبے کے تحت بیت الحکمت کے کام سے ذاکر صاحب اور جامعہ کی دلچسپی، تبلیغی جماعت کے کام میں ذاکر صاحب کی شرکت اور اس کے بانی مولانا محمد الیاس سے ان کی گہری عقیدت کا حال جب مسلمانوں کو معلوم ہوا تو ان میں ایسے لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جو وردھا اسکیم سے ان کے تعلق خاص کے سبب اس شبہہ میں پڑ گئے تھے کہ ذاکر صاحب اب سچے مسلمان نہیں رہے، اور ان میں سے بہت سے نیک نیت مسلمانوں کو ندامت بھی ہوئی۔ مارچ یا اپریل ۱۹۴۳ء میں ایک دن ایک متدین نوجوان

۱۔ سید ابو الحسن علی ندوی، 'پرانے چراغ' (حصہ دوم)، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۷۹۔ اس خط کی ایک نقل مصنف کے پاس بھی ہے جسے حضرت مولانا نے عنایت کیا ہے۔

ذاکر صاحب سے ملاقات کے لیے آئے، اور کوئی چیز ان کے ہاتھ میں بوقت رخصتی معانقہ دے گئے اور کہہ گئے کہ یہ ناچیز ہدیہ قبول فرمایئے اور یہ بھی کہہ گئے کہ ہر ماہ ایک معینہ رقم پہنچ جایا کرے گی۔ یہ دس ہزار روپے کی نقد رقم کا عطیہ اور سو روپے ماہانہ کا ایک ماہ کا چندہ تھا۔[1]

یہ عطیہ خاصا بابرکت ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت میں رفتہ رفتہ خوشگوار تبدیلی آتی گئی اور کوئی سترہ اٹھارہ برس بعد ذاکر صاحب اور ان کے رفقائے کار کو یہ محسوس ہوا کہ دنیا ابھی مردان غیب سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ غالباً اسی عطیے کا ذکر ذاکر صاحب نے یکم مارچ ۱۹۴۴ء کے انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسے میں جامعہ کا میزانیہ (بابتہ سال اگست ۱۹۴۳ء تا جولائی ۱۹۴۴ء)[2] پیش کرتے ہوئے اس طرح کیا تھا:

"دہلی کی امداد میں دو مخلص ہمدردوں کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک رقم بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت بھی نہیں دی اور اس خلوص و محبت سے یہ مدد پہنچائی کہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ مدد پہنچی اس وقت سے جامعہ کی مالی آزمایش کا دور ختم ہوگیا۔ یہ رقم ناظم انجمن کو اس وقت دی گئی جب کہ وہ مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کی کوئی سبیل نہ پاکر احباب کے مشورے اور اصرار سے حیدر آباد کے سفر پر جا رہا تھا۔ روانگی سے تھوڑی دیر قبل ان مخلص ہمدردوں میں سے ایک نے آکر ناظم انجمن کو دس ہزار روپے کے نوٹ دیے اور فرمایا کہ تم جس بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ سے سفر کا قصد کر رہے ہو، شاید یہ رقم اس میں کچھ کمی کر سکے اور تم جہاں جانا ہے ہو وہاں اطمینان کے ساتھ جامعہ کے لیے کوشش کر سکو۔"

۱۔ ہمدرد جامعہ، اپریل ۱۹۴۳ء، صفحہ ۴

۲۔ اس میزانیہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اور اسی جلسے میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا:

"جامعہ کے سب کام جیسے تیسے چل تو رہے تھے لیکن قرض کے روز افزوں بار اور ہر ضروری خرچ کے لیے روپے کی کمی، تنخواہوں کا وقت پر تقسیم نہ ہو سکنا، کسی بل کا وقت پر ادا نہ ہونا، پھر ماہ بہ ماہ سال بہ سال ان دشواریوں کا جاری رہنا، ان سب نے کارکنان جامعہ کو کچھ تھکا سا دیا تھا۔ سب اس کا نہایت ہمت اور قابل تعریف ضبط سے مقابلہ کر رہے تھے، اور ایسا نہ ہوتا تو ان حالات میں کام چلتا ہی کیسے رہتا۔ ادھر گرانی نے ہر کارکن اور ہر ادارے کی مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ قرض کا دروازہ بند تھا اور نقد ناپید۔ بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن خدا کا بڑا شکر ہے کہ سال ختم ہونے سے پہلے ہماری مشکلات کے رفع ہونے کی بہت کچھ سبیل اس کے کرم سے ہوگئی... جامعہ کی مالی حالت میں جو خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے وہ، اگر گرانی نہ ہوتی تو ہماری دشواریوں کو بہت کچھ ختم کر دیتی۔ لیکن نئی دشواریوں نے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ پھر بھی کام کرنے والے اب زیادہ اطمینان سے کام کر سکتے ہیں اور انھیں اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ قوم نے ان کے خلوص اور ایثار کے اعتماد پر جو مدد کی ہے، وہ اس کے مستحق ہیں..."[1]

ظاہر ہے کہ سال مذکور کا میزانیہ جامعہ والوں کی کامیابی کی علامت تھی، یہ علامت تھی اس بات کی کہ راہ محبت کے راہی، اگر وہ چلتے رہیں اور جو کچھ پڑے صبر و ضبط سے اسے جھیلتے رہیں، منزل پر پہنچ ہی جاتے ہیں، بلکہ ایسے راہیوں کو تو منزل خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے:

۱۔ عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحات ۳۵۳-۳۵۰

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں
آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست
ہر کجا دردے دوا آنجا رَوَد ہر کجا فقرے نوا آنجا رَوَد
ہر کجا تشنہ ست آب آنجا رَوَد ہر کجا مشکل، جواب آنجا رَوَد

ذاکر صاحب کو مولانا روم کے یہ اشعار بہت پسند تھے اور ان میں امید کا جو پیغام اور آبِ رحمت کے جس انعام کا وعدہ ہے اس پر انھیں یقین کامل تھا۔ اُن کے عزیز ساتھی، ہمدردانِ جامعہ کے ناظم، شفیق الرحمٰن قدوائی نے اس سال عید کے موقع پر ان اشعار کو خوشخط چھپوا کر جامعہ کے ہمدردوں میں تقسیم کیا[۱] کہ اب اپنی برسوں کی صبر آزما محنت و مشقت کے بعد ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی، رحمت الٰہی کے ذکر و شکر کے ساتھ، ایک خاص اور باوقار انداز میں اپنے ہمدردوں کا بھی بھرپور شکریہ ادا کرنے کے موقف میں تھے۔

۱۹۴۳ء کے شروع میں کلکتے کے مشہور تاجر شیخ محمد جان نے چار ہزار روپے دیے تھے، اس کے علاوہ انھوں نے پہلے کی طرح ایک کمرہ اور بنوانے کے لیے دو ہزار روپے عنایت کیے[۲]۔ غالباً مئی ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد جاتے ہوئے ذاکر صاحب چند روز کے لیے بھوپال رُکے۔ فرمانروائے بھوپال نے توجہ کی اور دس ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ عنایت کیا اور پانچ سو روپے کی ماہانہ امداد کی تجدید بھی کی[۳]۔ حیدرآباد میں اُن کی کوششوں سے نظام کی حکومت نے جامعہ کی ایک ہزار کی ماہانہ امداد بڑھا کر تین ہزار ماہانہ کر دی اور تیس ہزار کی رقم یکمشت قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھی منظور کی[۴]۔ ذاکر صاحب

۱۔ عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحہ ۳۵۲

۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۴

۳۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۳

۴۔ ہمدردِ جامعہ، جون ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳

جب حیدر آباد گئے تھے تو مجیب صاحب کو قائم مقام بنا کے گئے تھے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: "(اس وقت) روز مرہ کے اخراجات کے لیے پیسا نہ تھا۔ ذاکر صاحب کے جانے کے بعد دوسرے ہی روز صبح مجھے اپنی میز پر ایک بڑا لفافہ ملا جس میں دس ہزار روپے کے نوٹ تھے، اور کوئی شخص جس نے اپنا نام نہیں لکھا تھا، پچھلے دن سہ پہر میں میز پر رکھ گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ گمنام مُعطی ایک شخص کے شریکِ کاروبار تھے جس نے تین سال پہلے ہمدردانِ جامعہ کو اپنا دس روپے ماہانہ کا چندہ دینا بند کر دیا تھا۔"[1] دیکھیے، ایک وہ وقت تھا کہ لوگ مانگنے پر بھی نہیں دیتے تھے اور ایک زمانہ یہ آیا کہ بلا مانگے ملنے لگا۔ عشق کی راہیں چلتے چلتے آسان ہو رہی تھیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جشنِ سیمیں

۱۹۴۴ء کے وسط میں اعلان کیا گیا کہ ۱۹۴۵ء کے آخر یا ۱۹۴۶ء کے شروع میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی (جشنِ سیمیں) منائی جائے گی کہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں اس کے قیام کو پچیس برس ہو جائیں گے۔ اور تھوڑے ہی دنوں بعد اس کے اخراجات اور نئے منصوبوں کے لیے بمبئی سے (اپریل ۱۹۴۵ء) فراہمی سرمایہ کی مُہم شروع کی گئی، جہاں ذاکر صاحب شفیق الرحمٰن قدوائی کو ساتھ لے کر خود تشریف لے گئے اور وہاں حارث صاحب اس وفد میں شریک ہو گئے۔ حارث صاحب کی توجہ سے پہلے ہی سے بمبئی کے انگریزی اور اُردو اخبارات میں جامعہ ملیہ کے کام، قومی و ملّی زندگی میں اس کی اہمیت، مجوزہ سلور جوبلی اور آیندہ کے منصوبوں سے متعلق مضامین اور خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ادھر ذاکر صاحب نے جامعہ کے ساتھیوں کی ہمّت بڑھائی، ان سے اعتماد چاہا، اور کہا کہ اب جب کہ میں جامعہ کی جوبلی کے سلسلے میں باہر جاتا ہوں "مجھے یقین ہے کہ آپ میری مدد میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ جوبلی کے اس

۱۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحات ۷۶-۷۵

سال سب کے سب اپنے کام میں دل و جان سے لگ جائیے اور قوم کو دکھا دیجیے کہ کام کیسے عبادت بن جاتا ہے۔"

پہلے جشن جوبلی کے لیے مارچ ۱۹۴۶ء کی کچھ تاریخیں طے ہوئی تھیں، بعد میں جب پتا چلا کہ اس زمانے میں ملک میں انتخابات ہوں گے، تو طے کیا گیا کہ یہ جشن ۱۹۴۶ء کے آخر میں ۱۵ر نومبر تا ۱۸ر نومبر منایا جائے گا۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ذاکر صاحب کو حکومتِ ہند کے مشیر تعلیم ڈاکٹر سارجنٹ اور راجکماری امرت کور وغیرہ کے ہمراہ ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانا پڑا۔ انھوں نے ۲۴ر اکتوبر کو راستے سے ایک خط عبدالغفار مدھولی مرحوم کے نام بھیجا جس میں اس سال کے ۲۹ر اکتوبر (یوم تاسیس جامعہ) کے خاص موقع پر اہل جامعہ کے لیے ایک پیام تھا۔ یہ خط چونکہ ایک 'میرِ کارواں' کا 'اہل کارواں' کے نام ہے، اور کئی لحاظ سے اہم ہے، اس لیے درج ذیل ہے:

"غفار صاحب، السلام علیکم،

"میں چاہتا تھا کہ ہندستان چھوڑنے سے پہلے صحیفۂ[1] جوبلی کے لیے آپ کو تحریر بھیجوں جو آپ جامعہ کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر صحیفے میں شائع فرما سکیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ چلتے وقت کس طرح اور کاموں میں پھنسا رہا اور یہ تحریر نہ بھیج سکا۔ راستے سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے ۲۹ر اکتوبر سے پہلے آپ کو مل جائے . . .

"جامعہ کی پچیسویں سالگرہ! کیا کیا خیال، کس کس کی یاد، کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں، اور کیسی کیسی ہمت افزا سماعتیں، بے وفائیوں اور وفاداریوں، کم ہمتی اور استقامت، خاصی کٹھن راہ پر تھک تھک کر تھم تھم

۱۔ عبدالغفار مدھولی صاحب جشن جوبلی کمیٹی کے ناظم تھے، اور صحیفۂ جوبلی اُن کی ادارت میں اہل جامعہ کو جوبلی کے کاموں کی تنظیم اور تیاریوں سے باخبر رکھنے کے لیے نکالا گیا تھا۔

جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے دے کر اسی راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ جامعہ کی پچیسویں سالگرہ! اس کے ذکر سے آپ سب کے ذہن میں بھی ایسی ہی تصویریں آئیں گی۔ اگر ہم انھیں خیالات پر معاملہ ختم کردیں تو سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا جیسا ہوتا ہے۔ ہمارے ارادے کا اس میں دخل روز بروز کم ہوتا جائے گا۔ بہت سے دوسرے اداروں کی طرح جامعہ بھی اسی لیے چلتی رہے گی کہ کسی کو بند کرنے کا خیال نہ آئے گا اور چلتی ہوئی چیز کا قاعدہ ہے کہ کوئی مانع حالات یا ارادہ راہ میں نہ آئے تو چلتی ہی رہتی ہے۔ جامعہ والوں کو جامعہ کے ایسے ہی چلتے رہنے پر راضی نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس پچیسویں سالگرہ کو تعمیری تنقید اور محکم عزم کے ساتھ ایک موقع بنادیں۔

"پچیس برس! لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں پچیس سال کیا ہوتے ہیں۔ ہاں، سوئی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی بغیر کسی قابلِ ذکر تغیر کے ساتھ گزر جاتی ہیں۔ جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے ان کے لیے پچیس سال بھی بہت ہوتے ہیں، پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رُخ بدل لیتی ہیں، قومیں اپنی اعتباری حیثیت کو بدل لیتی ہیں، رحمت بن جاتی ہیں، عذاب بن جاتی ہیں۔ ہم نے اپنے کام سے مزاجِ قومی کو متاثر کیا؟ زندگی کے کسی شعبے میں اس کی فکر یا سعی کو بدلا؟ اپنے وجود کو ملّی استحکام بخشا؟ دوسری قوموں میں حیثیت کو بلند کرنے، رحمت بننے، عذاب بننے کا ذکر ہی کیا ہے! اسے سوچنا چاہیے، مایوس ہونے کے لیے نہیں بلکہ مشکلوں اور مجبوریوں کو سمجھنے، ان پر غالب آنے کے وسائل سوچنے، اپنی غلط فہمیوں کی اصلاح کرنے اور ہمت سے آگے قدم بڑھانے کے لیے۔ پچیس برس اور اتنا سا کام! ہاں! بہت کم کام ہے، بہت معمولی کام ہے، بظاہر بہت بے اثر سا کام ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے کاموں کا بیج ہے۔

جامعی کاموں میں، میرا گمان ہے کہ، پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا یکجا ہو جانا۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دے کر اسے طے بھی کر لیتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے :

من از طریق نہ گویم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

"جہاں پچیس مہینے مل کر کام کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف و بے سرو سامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں ہے۔ اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بے شک نہیں اور نہ یہ خیال دل میں لانا چاہیے کہ اوروں سے بھی تو کچھ بہت بن نہیں پڑا۔ دوسرے کی کم معیاری کو اپنے لیے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی اور پست نظری کی بات ہے لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ رفیقانِ راہ سے اس پچیسویں سالگرہ پر یہ درخواست ہے کہ اب طریق کے تعینّ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنی سعی کو زیادہ موثر بنانے میں لگ جائیں۔ یکسوئی اور دیانت سے کام میں جمے رہیے اور اس پر رنج نہ کیجیے کہ بہت وقت گزر گیا۔ آدمی اپنا فرض ادا کرتا رہے اور دامن امید کو ہاتھ سے نہ جانے دے تو

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ذاکر حسین"

ذاکر صاحب اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے، اسی کے فضل و کرم پر بھروسا کر کے انھوں نے جوبلی کے موقع پر اعلان کیا کہ جامعہ کو اپنے آیندہ کے کاموں کے لیے کم از کم دس لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔ ان میں جامعہ کی مسجد،

بیت الحکمت، صنعتی مدرسہ، انصاری شفاخانہ، لڑکیوں کا مدرسہ، اور ایک اچھے کنڈرگارٹن کے قیام کے منصوبے خاص تھے۔ سرمایے کی فراہمی اور جامعہ کے پچھلے کاموں اور آیندہ کے مجوزہ منصوبوں سے قوم کو روشناس کرانے کے لیے ملک کے مختلف حصّوں میں وفود بھیجے گئے، اور نمایشیں منعقد کی گئیں، اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ذاکر صاحب خود بمبئی گئے، اس کے بعد وہ مالیگاؤں، بسین، حیدرآباد، رام پور اور دوسرے مقامات پر بھی گئے۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذاکر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے وفود نے کل ملا کر کوئی نو لاکھ روپے جمع کیے[1]۔ یہ بڑی کامیابی تھی، بڑی کامیابی اس لیے کہ چندہ مانگنے والوں نے اپنے ایثار اور قربانی کا سودا اپنی بے سروسامانی کا رونا رو کر نہیں کیا تھا، بلکہ اس انداز سے لوگوں کی توجہ جامعہ کی طرف مبذول کرائی تھی کہ اگر وہ اس کی مدد کریں گے تو گویا وہ اُس مفید کام میں شریک ہو جائیں گے جو انھیں کے بچّوں کے لیے کیا جا رہا ہے، یعنی وہ خود اپنے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔ بمبئی میں ذاکر صاحب نے نہ معلوم کتنی گلیوں اور کوچوں کی خاک چھانی، میلوں پیدل چلے، چلتے چلتے تھک جاتے تو اپنے عزیز شاگرد حارث صاحب سے کہتے کہ "حارث صاحب، آپ آخر مجھ سے یمشی الاسواق کا پیغمبرانہ کام کب تک لیں گے، اب نہیں چلا جاتا، یہ دیکھیے، پیروں میں چھالے پڑ گئے، خدا کے لیے اب تو کوئی ٹیکسی کر لیجیے"[2] اور ان گلیوں اور کوچوں میں ایسے نامعقول اور ناواقف لوگ بھی ملے جن کی تلخ باتوں کو انھیں گوارا بھی کرنا پڑا۔ لیکن اسی بمبئی میں ان کے اعزاز میں جلسے بھی ہوئے، ہوٹلوں میں قدردانوں نے

۱۔ اس میں ریاستوں کی امداد، اور بمبئی کے خواص اور عوام اور ملک سے عمومی چندے کی سب رقمیں شامل تھیں، ۶ لاکھ ۵، ہزار روپے کی وہ رقم الگ سے تھی جس کا اعلان اس وقت کی عارضی قومی حکومت کی طرف سے جوبلی کے خاص جلسے میں کیا گیا تھا (رودادِ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ، منعقدہ ۱۳، اکتوبر ۱۹۴۸ء بعنوان "حساب آمد و خرچ جوبلی تا مارچ ۱۹۴۸ء")۔

۲۔ ذاکر صاحب سے متعلق یہ بات خود حارث صاحب نے راقم الحروف کو بتائی تھی۔

پارٹیاں بھی کیں، اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی "خون جگر کی نمود" یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کام کو سراہا بھی اور اس کے آیندہ منصوبوں میں دامے درمے شریک ہونے کا وعدہ بھی کیا اور اس کا عملی ثبوت بھی دیا۔ بہرحال، موقع تلخ نوائی کا ہو یا ستایش اور حوصلہ افزائی کا، ہر جگہ ذاکر صاحب کی کلاہ کا بانکپن قائم رہا۔

بمبئی میں ایک جلسے میں ذاکر صاحب نے فرمایا: "اگر ہماری قوم میں جان ہے تو اسے ضرور میرے ساتھیوں کے کام کی قدر کرنی چاہیے[۱]" ایک دوسرے موقع پر انھوں نے کہا: "جامعہ کے کارکنوں نے اپنے کام سے اس بات کا استحقاق پیدا کر لیا ہے کہ وہ قوم سے مطالبہ کریں کہ وہ ان کے کام کی قدر کرے۔ اگر قوم نے اس کا جواب خاطر خواہ نہ دیا تو پھر مسلمانوں میں ایسے نوجوان جو پُرخلوص طریقے سے قومی کاموں میں لگ جائیں کیسے پیدا ہوں گے[۲]" بمبئی کا ماحول جامعہ کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھا، جامعہ ملیہ اسلامیہ نیشنلسٹ اور مشترک گنگا جمنی تہذیب کا حامی ادارہ تھا، اس کے اکابر گاندھی جی کے ساتھیوں میں تھے، ذاکر صاحب نے بنیادی قومی تعلیم کے منصوبے کو اپنی ذہانت اور قابلیت سے ایک قابلِ عمل تعلیمی قومی تحریک بنا دیا تھا، بمبئی کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت مسلم لیگ کی ہمنوا، مسٹر محمد علی جناح کی پرستار اور مطالبۂ پاکستان کی پُرزور حامی تھی، وہاں ذاکر صاحب کچھ بہت زیادہ اُمید لے کر نہیں گئے تھے، لیکن ملنے ملانے اور صحیح حالات سے آگاہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بمبئی کے مسلمان جامعہ کے ہمدرد بن گئے۔ ان مسلمانوں سے ذاکر صاحب نے صاف صاف کہا: "اگر آپ لوگ ہمارے کاموں کو اچھا سمجھیں اور ان سے خوش ہوں تو ہماری امداد کیجیے۔ اس وقت ہم بخوشی ایسی امداد قبول کریں گے۔ اور اگر آپ نے محض مروت میں ہماری امداد کی تو یقین کیجیے کہ آپ ہمارا کام بنانے کے بجائے اور بگاڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں آپ

۱۔ صحیفۂ جوبلی، نمبر ۳، ۸ مئی ۱۹۴۵ء

۲۔ ایضاً۔

ہرگز ہماری مدد نہ کیجیے جب تک کہ آپ ہمارے کاموں سے مطمئن نہ ہو جائیں۔[1]

بمبئی میں مسلمان کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی جوبلی فنڈ کے لیے چندہ دیا اور وہاں سے کوئی پونے دو لاکھ روپیا ملا۔ اس کے علاوہ ٹاٹا ٹرسٹ نے صنعتی مدرسے کے قیام کے لیے پچاس ہزار روپے دیے اور اس طرح دیے کہ سر سہراب نے ٹاٹا ٹرسٹ کی طرف سے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ لوگ جامعہ ملیہ کے تعلیمی مقاصد کی افادیت کی قدر کرتے ہیں اور اس کے کام سے مطمئن ہیں۔[2] کچھ دنوں بعد وہ رام پور گئے جہاں نواب رام پور نے ایک لاکھ روپے کے عطیے اور باشندگان رام پور نے پچاس ہزار روپے کی امداد کا اعلان کیا۔[3] اسی زمانے میں ذاکر صاحب حیدر آباد گئے جہاں غالباً پہلی بار اُن کی شخصیت کا احترام اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی خدمات کا اعتراف بغیر کچھ کہے سُنے کیا گیا اور اس طرح کیا گیا کہ نظام حیدر آباد کے صدر اعظم سر مرزا اسمٰعیل نے انھیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور پانچ لاکھ روپے کا چیک اس انداز سے پیش کیا کہ جیسے دینے والا لینے والے کے احسان سے دبا جا رہا ہو، یہ ایک شریف انسان کا ایک دوسرے شریف انسان کی خدمت میں اپنے جذبۂ احترام کا ہدیہ تھا۔[4]

۱۵ر تا ۱۸ر نومبر ۱۹۴۶ء جامعہ کی جوبلی ہوئی تو اس کے خاص جلسے میں جو ۱۷ر نومبر کو صبح دس بجے ہوا تھا اور جس کی صدارت والیٔ بھوپال نواب حمید اللہ خاں صاحب نے کی تھی، ذاکر صاحب کی وہ فصیح، پُر اثر اور دلگداز تقریر ہوئی تھی جسے پڑھتے پڑھتے

۱۔ ایضاً۔

۲۔ بمبئی میں ذاکر صاحب کی کامیابی میں ان کے دوست خواجہ عبدالحمید کا بھی بڑا حصہ تھا کہ انھوں نے خاص طور پر بڑے تاجروں اور صنعت کاروں سے ذاکر صاحب اور جامعہ کا تعارف کرایا۔ انھوں نے ذاکر صاحب کے آرام کا بھی بہت خیال رکھا۔

۳۔ ہمدرد جامعہ، مئی ۱۹۴۶ء، صفحہ ۱۱

۴۔ محمد مجیب، حوالۂ سابق، صفحہ ۷۶

نہ صرف وہ خود آبدیدہ ہو گئے تھے بلکہ جسے سُن کر بہتوں کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے۔ یہ تصویر ذاکر صاحب کی چند بہترین تقریروں میں ہے، اور ایک ادبی کارنامہ تصور کی جاتی ہے جسے پڑھنے والا آج بھی مسرت اور بصیرت کی متاعِ گراں بہا سے مالامال ہے۔ اس میں انھوں نے برسوں کی امید وبیم، آرزوؤں اور حسرتوں اور جامعہ کی کشمکش زندگی کے نشیب وفراز کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۲۸ء میں "انجمن تعلیم ملی" کے قیام کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی تھی اور کہا تھا:

"میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابل توجہ واقعہ ہے۔ اس نے اس زر پرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جس کا اصلی انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرز عمل کی رہینِ منت ہیں، ہمارے مستقبل کے لیے اس نئے طرزِ خدمت کا رواج فالِ نیک ہے۔ دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لیے ایک نئی راہ نکلی ہے۔ تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہوگیا ہے، یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو، بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو۔۔۔ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہیے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اس کے بغیر بے چین رہیں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ[1] مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہماری تعلیم کا کام کرائے کے کام کی جگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔"

۱۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن تعلیم ملی کا نام انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا اور اسی نام سے اس کا رجسٹریشن ہوا۔ اغراض ومقاصد کم وبیش وہی ہے۔

شعبۂ ہمدردانِ جامعہ کے کام کی ضرورت اور جامعہ کی تاریخ میں اس کے رول کی وضاحت کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہ ہمارے نزدیک اس شعبے کی سرگرمیاں جامعہ جیسے جدید طرز کے ایک مسلم تعلیمی ادارے کا ایک نیا اور کامیاب تجربہ تھا، فرمایا:

"آزادی اور مختاری کی یہ تدریجی نشو و نما بے حقیقت ہوتی اگر اپنے مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقۂ کار اختیار نہ کرتی، چنانچہ جامعہ نے یہ کیا...

جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقے کی مدد کمیاب تھی۔ اہلِ ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہ کی تھی، کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے، اپنے وجود اور اپنے طرزِ کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے؟ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہورِ ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی، جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبانِ ثروت سے نہیں بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائے گا..."

کام رُکا نہیں، حیدرآباد، بھوپال، رام پور، کشمیر اور دہلی میونسپلٹی کی مستقل امدادوں سے، جو کام رُک رُک کر ہوتا، مگر ہوتا، اس میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی اور جامعہ کا کام رفتہ رفتہ بڑھا۔ جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایے کے ایک پیسے کے، کام شروع کیا تھا۔" ذاکر صاحب

نے اس کام کی تفصیل بتائی، مختلف اداروں کا ذکر کیا اور پھر اپنے خاص اسلوب میں شریفانہ انکسار اور درویشانہ وقار کے ساتھ اپنی تمناؤں اور اپنے حوصلوں کی طرف اشارہ کیا، قوم کی غیرت کو جھنجھوڑا، اور اس کے منتخب اور محترم نمایندوں کے توسط سے جو اس موقع پر جمع تھے، اسے اپنی ذمّے داریوں کا احساس دلایا۔ ذاکر صاحب نے کہا:

"غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔ لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے، ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے، اور بلا کسی بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اُٹھانے کا بھی یارا نہیں۔ پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوشش اور یہ جوئے کم آب!! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارتے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنادے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینا ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور ہاں، خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں، لیکن اگر یہ آرزو بےچین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینا بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خونِ جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں، اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُکسے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی و تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشوونما

کا ساماں ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمت اللعالمینؐ کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو اور ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے، اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھریں کہ یہ دولت لٹانے سے ہی بڑھتی ہے۔ اعلاحضرت، اکابر قوم اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی! اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمّے بھی ہے . . . ."

اس خاص موقع پر ذاکر صاحب کے ذہن میں یقیناً اپنی اور اپنے ساتھیوں کی مشکلات، پریشانیوں اور بے لوث خدمت کی صبر آزمائیوں کی پُردرد داستان کا ہر صفحہ ابھر اُبھر کر آتا ہوگا اور ہر دُکھ بھرا واقعہ ان کی توجہ کا دامن اپنی طرف کھینچتا ہوگا کہ آج جب کہ جامعہ کی پچیس سالہ زندگی کی داستان سنائی جا رہی ہے، ہمیں نہ بھلایا جائے، آرزوؤں اور حوصلوں، تمناؤں اور خوابوں سب کا ذکر بجا، لیکن ہم جن ایثار پیشہ لوگوں کی زندگیوں اور کڑے وقتوں سے متعلق رہے ہیں، داستان میں ان کے بیان کے ساتھ آپ کے اسلوب خاص میں کچھ ہمارا بھی ذکر ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے قوم کی طرف سے جب اپنے مخلص اور ایثار پیشہ ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا تو اس انداز سے ادا کیا کہ نہ معلوم کتنوں کی آنکھوں میں اُمڈے آنسو پلکوں سے چھلک گئے کہ جامعہ کی یہ داستان جو سنائی جا رہی تھی درحقیقت اس کے اساتذہ و کارکنوں کی داستان تھی اور اساتذہ و کارکنوں کی داستان ایک لحاظ سے اس کے مختلف پہلوؤں کے پیش نظر خود ذاکر صاحب کی داستان تھی۔ ذاکر صاحب نے قوم کی طرف سے اپنے رفیقوں کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا:

"آخر میں، اعلیٰ حضرت، میں چند لمحوں کے لیے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کر کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ کاش میں اس کا مستحق ہوتا! حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہ قوم کے بچوں کے لیے اپنی جانیں کھپاتے رہے اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لیے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیا آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لیے زمین خریدوا دیتے ہیں اور اپنے مطالبات کو موخر کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ایک فال نیک ہیں۔ انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے:

آغشتہ اند ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانون باغبانیِ صحرا نوشتہ اند[۱]

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

۱۔ ذاکر صاحب نے موقع کی مناسبت سے غالب کے اس شعر میں تھوڑا سا تصرف کیا ہے یعنی 'ایم' کی جگہ 'اند' کر دیا ہے۔ اصل شعر میں 'آغشتہ اند' کے بجائے 'آغشتہ ایم' اور 'نوشتہ اند' کی جگہ 'نوشتہ ایم' ہے۔

راقم الحروف جامعہ کے جشن جوبلی میں موجود تھا، اسے آج بھی وہ سماں یاد ہے جو ذاکر صاحب کی خون دل سے لکھی اس تقریر سے پورے مجمع پر چھا گیا تھا، سماں جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ کچھ اسی طرح کی کیفیت سامعین کی اس وقت تھی جب اسی جلسے میں ابو الاثر حفیظ جالندھری مرحوم نے اپنی معرکتہ الآرا نظم اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھی۔ نظم کا عنوان "جامعہ ملیہ اسلامیہ" تھا اور اس کے شروع کے اشعار یہ تھے:

اَدِرْ کَاْساً وَّنَاوِلْھَا اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِیْ
ابھی اک اور زندہ معجزے کا ذکر ہے باقی
رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے
مدینے ہی سے وابستہ یہ طور لامعہ بھی ہے
قیامِ جامعہ ان ظلمتوں میں، ان فضاؤں میں
چراغ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں
مقابل ساحرانِ مغربی کے اک یدِ بیضا
خدائی اتنے فرعونوں کی، تنہا جرأتِ موسیٰ
یہ ملت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
وجود اس جامعہ کا معجزے سے کم نہ مانے گی

اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں ذاکر صاحب کی تقریر کے آخری حصے سے جس میں انھوں نے قوم کی طرف سے کارکنان جامعہ کا شکریہ ادا کیا ہے اور غالب کے ایک شعر کے سہارے خونِ دل سے قانون باغبانِ صحرا کے رقم کرنے کی بات کہہ کر گویا جامعہ کی پچیس سال کی پُر اثر داستان بیان کر دی ہے۔ حفیظ کی یہ نظم عرصے تک جامعہ میں اور جہاں بھی جامعہ والے تھے وہاں گونجتی رہی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے بانیانِ جامعہ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے

بعد شاعر نے کہا تھا:

نہ سمجھو تربتوں میں اب وہ زیرِ خاک سوتے ہیں
کبھی سوتے نہیں جو بیج بیداری کا بوتے ہیں

شہیدانِ مقاصد کو کہاں آرام ملتا ہے
بحالِ قید و آزادی، برابر کام ملتا ہے

ابھی جاری ہے ان روحوں کا فیضِ کارفرمائی
طلوعِ جامعہ سے ہے عیاں ان کی مسیحائی

پسِ مردن ملا ہوگا انھیں اتنا ہی چین اب تک
کہ وقفِ جامعہ ہے خدمتِ ذاکرحسین اب تک

جوانمردوں نے جھیلی تھی جفا پیرانہ سالی میں
دفن کے بیج آخر ہو گئے افکارِ عالی میں

وہ عالی فکر جس کو جامعہ کا باغباں کہیے
دمِ جاری و ساری مانیے روحِ رواں کہیے

یہی سادہ سے ذاکر یارِ رفیقِ کار ہیں ان کے
انھی سے پوچھیے پوشیدہ کیا اسرار ہیں ان کے

کبھی ان کی نظر پڑتی نہیں اسبابِ زینت پر
خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر

اسی اک دائرے میں کاٹ کر مدت اسیری کی
بساتے جارہے ہیں بستیاں روشن ضمیری کی

زمینِ شور پر ہل چل رہا ہے خشک سالی میں
کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں
یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حسن و جوانی کا
ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا
لہو کا قطرہ قطرہ وقفِ گلشن کر دیا اس نے
جمالِ ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اس نے

چھٹا باب

تعلیم، سماج، تمدّن

ہر فرد کی طبیعت میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں، یہ رجحانات اسی وقت قوت سے فعل میں آتے ہیں جب فرد سماجی زندگی کی مشغولیتوں میں پورے طور پر شریک ہوتا ہے، اور جب افراد باہم مل کر اپنے ذہنی رجحانات میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور متفقہ طور پر اجتماعی زندگی کا کوئی نصب العین طے کرتے ہیں، اس زندگی کے گزارنے کے کچھ اصول و قوانین بناتے ہیں اور خارجی چیزیں اور ادارے وجود میں آتے ہیں، تو وہ سب مجموعی طور پر اور مل کر ان کا تمدن کہلاتا ہے۔ "گویا تمدن ایک جماعت کے مشترک ذہنی رجحانات کا خارجی مظہر ہے۔" اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ فرد کی ذات کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی سماج اور کسی تمدن کا رکن ہو۔

جس طرح موج کی اپنی ذات اور اس کی حیثیت دریا ہی میں اپنا ممتاز وجود رکھتی ہے اور بیرونِ دریا نہ تو اس کا وجود ہے اور نہ اس کی کوئی حقیقت، اسی طرح فرد کی اس کی شناخت ہی ذہنی زندگی سے ہے، سماج سے باہر بطور حیوان کے سمجھ میں تو آسکتا ہے، لیکن بحیثیت انسان اس کی تفہیم سماج ہی میں ممکن ہے۔ دنیا میں اور اس کے اثر سے خود ہمارے ملک میں جب یورپ کے لبرل فلسفے کا بہت زور تھا اور انسان کی آزادی کا تصور رومانیت کا بنیادی تخیل بن گیا تھا، تو تعلیم کا مقصد بغیر

کسی سماجی یا تمدنی نصب العین کے یہ تھا کہ فرد بس کسی قدر ہنرمند یا دانشمند بن جائے اور اپنی دنیا میں مگن رہے — ذاکر صاحب لبرل فلسفے کے اس پہلو سے متفق نہ تھے۔ وہ تعلیم، سماج اور تمدن کے داخلی رشتے کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے اور یہی شعور اُن کے نظریۂ تعلیم، جامعہ کے تعلیمی تجربوں اور قومی تعلیم کے نصب العین کی شکل میں ڈھل گیا تھا۔ تعلیم کے اس نظریے کی اہمیت وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک واضح کرتے رہے۔ تعلیم، سماج اور تمدن کے اس داخلی رشتے کی وضاحت انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

"... اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اس کے سہارے اور اسی کے لیے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے ... (اور فرد) کی ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں 'تو' نہ ہو تو 'میں' کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لیے ذہنی زندگی کے لیے جو اصل معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے ...

"جس طرح کچھ عرصے میں جسم کا ایک ایک ذرّہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے، جس طرح درختوں کی پتیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے، اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں، ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قائم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے۔ جو جسم اپنے کو قائم نہیں رکھ سکتا وہ تو فنا ہوتا ہی ہے، پر جس میں اپنے کو بدلتے رہنے کی طاقت نہ رہے وہ بھی موت ہی کے گھاٹ اُترتا ہے۔ سماج میں افراد کے وجود کی غرض بس یہ ہے کہ اس بقا اور فنا، تحفظ اور تغیر، استقلال اور پیروان کا ذریعہ بنیں، اور انھیں اس قابل بنانے کے لیے سماج کی تدبیر اور اس کا فرض نئی نسلوں کی تعلیم ہے۔

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اسی طرح گزرے ہوئے زمانے سے موجودہ زمانے کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتی ہے اور جس طرح حافظے کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے . . .

"تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ جس طرح انسان کا جسم ایک چھوٹے سے تخم سے شروع ہوتا ہے، پھر مناسب غذا پا کر حرکت اور کام اور سکون و آرام سے طبیعیات اور کیمیا کے قانونوں کے مطابق کمال کے درجے کو پہنچتا ہے، اسی طرح ذہن کا نشو و نما بھی ذہنی غذا پا کر ذہنی قانونوں کے مطابق ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ذہن کو یہ غذا کن چیزوں سے پہنچ سکتی ہے اور اس کے اثر کے قانون کیا ہیں۔ تو گزارش یہ ہے کہ ذہنی غذا ملتی ہے تمدن سے، تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے، مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق کے اصولوں سے، سماج کے قانون سے، سماج کی رسم و رواج سے، سماج کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی سے، سماج میں خاندانی زندگی کے نمونوں سے، سماج کے گانوں، قصبوں اور شہروں کی زندگی سے، سماج کی حکومت سے، فوج سے، عدالتوں سے، سماج کے مدرسوں سے۔

"اب یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں . . . ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جس سے بنانے والا وابستہ تھا، اس وقت اور جگہ کے حالات کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ چیز بنائی

تھی۔ اُن سب کا اثر یوں کہیے کہ اس چیز میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے۔ کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں ابھرتی ہیں، سوئی ہوئی طاقتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔"[۱]

ذاکر صاحب نے اس نکتے کو بھی سمجھایا ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ مختلف ذہنوں کی ذہنی، جمالی اور عملی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، ان صلاحیتوں میں سب سے زیادہ نمایاں اثر اس سماج اور تمدن کا ہوتا ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر ایک ہی سماج اور تمدن میں پیدا ہونے والے مختلف بچوں کی ذہنی ساخت کے مطابق ہی ان میں تمدن کی مختلف چیزوں سے اثر پذیری کی قوت ہوتی ہے۔ ہر ذہن کے لیے ایک ہی غذا راس نہیں آسکتی۔ اس حقیقت کو بھولنا (بقول ان کے) ایسا ہے "جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش۔"[۲]

تعلیم کا یہ نظریہ ذاکر صاحب نے اپنے بعض نامور تعلیمی پیش روؤں کے اثر سے خصوصاً جرمن ماہرینِ تعلیم کے اثر سے، اخذ کیا تھا، لیکن اس خیال کی وضاحت، ہندستان کے خاص حالات میں اور اپنے خاص رنگ میں، جس طرح ذاکر صاحب نے کی، یہ انھیں کا حصہ تھا۔ اپنے ممتاز تعلیمی پیش روؤں کے وہ ہمیشہ احسان مند رہے، اور جب بھی موقع آیا انھوں نے اس کا برملا اظہار کیا۔ اپنے ۱۹۵۸ء کے سردار ولبھ بھائی پٹیل لیکچرس میں انھوں نے دو جگہ اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا:

"... میری تعلیمی فکر کا قریب قریب سارا ڈھانچہ اسی (کیرشن اشٹائنر) کا منت کش ہے گو اس میں آگے چل کر گاندھی جی کے فیضِ صحبت سے اور

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، صفحات ۲۰-۲۱

۲۔ ایضاً، صفحہ ...

ان کے بعض تعلیمی نکتوں کی تفسیر کرنے سے، قوت، گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ الفاظ ارادے بن گئے اور ایک ناپائدار اور نظری خاکہ میری زندگی کا ایک مستقل جزو ہو کر رہ گیا[1]"۔

اسی لیکچر میں سوال و جواب کے دوران ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

"... میں نے جرمن معلّموں اور مفکّروں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور خوشی سے اس کا اعتراف کرتا ہوں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میری فکر کی نشو و نما میں دوسروں کا دخل نہیں۔ مجھ پر اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اثر ہندستان، سوئٹزرلینڈ، انگلستان اور امریکہ کے معلّموں کا ہے۔ میں حق اور حکمت کو اپنا کھویا ہوا مال سمجھتا ہوں اور جہاں ملتا ہے فوراً اُٹھا لیتا ہوں[2]"۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کی اہمیت

ذاکر صاحب نے عملی طور پر غالباً سب سے پہلے جامعہ کے تعلیمی تجربوں کے ذریعے ملک کے سامنے یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا کہ جس تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اس کا صحیح مقام حاصل نہیں ہے، وہ تعلیم ناقص ہے، اس سے انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ "عملی طور پر" ہم نے اس لیے کہا ہے کہ یہ نظریہ نیا نہیں تھا، ملک کے باہر اور اندر بہت سے تعلیم کا کام کرنے والے نظری طور

۱۔ ذاکر حسین، ہندستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم، (پٹیل لیکچرس، مترجم عابد حسین) دہلی، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۷

۲۔ ایضاً، صفحہ ۷۹

پر اس سے واقف تھے۔ ذاکر صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نورانی ذہانت، افہام و تفہیم کی بے پناہ صلاحیت اور کسی بھی علمی و تمدنی و فنی نکتے کو حشو و زوائد سے پاک و صاف کر کے دلنشین انداز میں بیان کرنے کی خداداد قابلیت سے تعلیم میں ہاتھ کے کام کی اہمیت کی ایسی وضاحت کی کہ وہ ایک مرتب نظریۂ تعلیم کی شکل میں تعلیم کا کام کرنے والوں کے سامنے آیا، اور ان کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ نے اس پر عمل کر کے ملک میں معلمین کی ایک جماعت کو اس کی تعلیمی افادیت سے روشناس کیا۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات جن پر مغرب کے تعلیمی فلسفے کی گہری چھاپ تھی، سب سے پہلے تو اُن دو خطبوں میں ملتی ہے جو انھوں نے علی الترتیب دسمبر ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے دہلی اجلاس اور اگست ۱۹۳۵ء میں کاشی ودیا پیٹھ بنارس کے جلسۂ تقسیم اسناد میں دیے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مسلمانوں کی ثانوی تعلیم کے موضوع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسِ جوبلی میں اپنا معرکۃ الآرا خطبہ دیا جس میں انھوں نے ایک لحاظ سے جامعہ ملیہ کے تعلیمی و تمدنی نصب العین کی وضاحت کی تھی اور نہ صرف جدید طرز اور نمونے کے اسلامی تعلیمی اداروں کے اصول بتائے اور اُن کے لیے راہِ عمل کی نشاندہی کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ سچی قومیت میں جو حُب الوطنی کو ایمان کا جزو سمجھتی ہے اور سچی مذہبیت میں جو بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و خون دنیا کے تمام انسانوں کو ایک سمجھتی ہے اور سب کے لیے رحمت ہے، کوئی بنیادی تناقض نہیں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس میں جو اپریل ۱۹۴۱ء میں جامعہ ملیہ میں منعقد ہوئی تھی، اخلاقی ریاست کے قیام کی بات کی اور اس میں بنیادی تعلیم کے کام کی اہمیت واضح کی ۔۔۔ ان چار خطبوں کو، اور پھر ۱۹۵۸ء میں ان کے دیے ہوئے سردار ولبھ بھائی پٹیل لیکچرس کو غور سے پڑھیے تو ان کے تعلیمی افکار کے بنیادی عناصر سمجھ میں آجائیں گے۔ یہی عناصر ان کے تمام تعلیمی خطبوں میں مختلف انداز بیان، تمثیلات اور استعاروں کی بوقلمونی کے ساتھ ملتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کس طرز کے عملی معلم

اور تعلیمی مفکر تھے، اور تعلیم کے بنیادی اصول اور قدروں کی کیسی تخلیقی پرکھ رکھتے تھے۔ آزادی سے پہلے اور بعد میں بنیادی تعلیم بلکہ ہر قسم کی تعلیم کا جو حشر ہوا اور ان کے اخلاقی ریاست کے تصور پر جو کچھ بیتی، ذاکر صاحب کو اس کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا، اپنی دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس والی خیر مقدمی تقریر میں (۱۹۴۱ء) جس کا افتتاح ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کیا تھا، اسی اندیشے کا اظہار انھوں نے اپنے خاص انداز میں ان الفاظ میں کیا تھا:

"اس وقت ہماری خوش قسمتی سے راجندر پرشاد جی یہاں موجود ہیں... میں ان کی معرفت تعلیمی کام کرنے والوں کی یہ التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد از جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسا کر سکے، کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن، امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی حماقت،

> کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اس سماج میں جہاں بھائی بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔[۱]

اپنی اسی تقریر میں تعلیم میں کام کی اہمیت، ہاتھ کے کام یا دماغ کے کام کی اہمیت کو ذاکر صاحب نے بڑی وضاحت سے بیان کیا، انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا کہ اس سے متعلق طرح طرح کی باتیں کہی جاتی رہی ہیں، انھوں نے ان باتوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی، اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ تعلیم کے سلسلے میں جب کام کی بات کی جائے تو صرف ذہن میں وہی کام ہونا چاہیے جس سے تعلیم کے کام میں مدد ملے اور جس سے آدمی کی واقعی تعلیم و تربیت ہو۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ "آدمی کا ذہن اپنے کیے کو پرکھ کر، اس کے اچھے برے پر نظر کر کے، ترقی کرتا ہے اور آدمی جب کچھ بناتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے، چاہے یہ کام ہاتھ کا ہو چاہے دماغ کا، تو اس کام سے اسے ذہنی تعلیمی فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اس کام کا پورا پورا حق ادا کرے، اس کام کے لیے اپنے کو ذرا تجے، اپنے اوپر ذرا قابو پائے۔"[۲]

ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ کوئی کام تعلیمی کام اسی وقت ہوتا ہے جب (۱) اس

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحات ۹۲-۹۰

۲۔ ایضاً، صفحہ ۹۶-۹۵

میں ذہن کو دخل ہو اور (۲) اس سے کسی ایسی قدر کی خدمت مقصود ہو جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ محض ہنرمندی تعلیم نہیں ہے۔ ناواقف لوگ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ ہاتھ کے کام میں کسی خاص ذہنی تیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جزو لازم ہے اور اسی کی بدولت بعض کاموں کو تعلیمی قدر حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے کاموں کی چار منزلیں ہوتی ہیں، یا بقول ذاکر صاحب "یہ خیال کو معروضی شکل دینے کی چار منزلیں کہلاتی ہیں، اور وہ اس طرح ہیں :

"۱۔ اس بات کا واضح تصور کہ کیا کرنا ہے۔

"۲۔ اس کام کا منصوبہ بنانا، اس کے لیے مناسب وسائل کا اختیار کرنا اور اس کی مختلف منزلوں کا تعین کرنا۔

"۳۔ اصل کام کو انجام دینا۔

"۴۔ خود ہی اس کے نتیجے کی جانچ پڑتال کرنا۔ نمبر (۱) کی یعنی اس تصور کی روشنی میں کہ دراصل کرنا کیا ہے۔"[۱]

دیکھا آپ نے، تعلیمی قسم کے ہاتھ کے کام میں تیسری منزل کے علاوہ، سبھی عمل ایک ذہنی عمل ہوتا ہے۔ اب اگر اسی طرح کے ہاتھ کے کام کا مقصد کسی ایسی قدر کی خدمت ہے جو ہماری ذات سے ماورا ہے، یعنی وہ ایک معروضی قدر ہے تو وہ تعلیمی کام بن جاتا ہے اور اقدار کے ایسے خادم ہی کو صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے۔

۱۹۴۴ء کے خطبے[۲] میں معروضی اقدار اور تہذیبی اشیاء میں جس بنیادی تعلق

۱۔ ذاکر حسین، ہندستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم، صفحہ ۳۴

۲۔ اس خطبے کے طویل اقتباسات پروفیسر محمد مجیب کی کتاب، ڈاکٹر ذاکر حسین ــ اے بایوگرافی میں صفحات ۹۴ ـ ۹۰ پر ملاحظہ ہوں۔

کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ ذاکر صاحب کے ۱۹۵۵ء کے پٹیل میموریل لیکچرس میں اور کھُل کر سامنے آتا ہے، اور ایک ہے 'تعلیم یافتہ آدمی کی پہچان کیا ہوتی ہے' اسے انھیں لیکچرس میں کرشن اشٹائنر کی کتاب 'کام کے مدرسہ کا تصور' کے حوالے سے انھوں نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جامعہ میں بچّوں کی ذہنی تعلیم و تربیت کا جو نقشہ ذاکر صاحب نے بنایا تھا اور جس طرح کے تعلیم یافتہ انسان کی داغ بیل انھوں نے ڈالنی چاہی تھی، اور اس سب کی روشنی میں جامعہ میں جو تعلیمی، تہذیبی اور تربیتی تجربے ہو رہے تھے ان کی وجہ سے تعلیم کے کام سے دیسی اور بدیسی واقف کاروں نے جامعہ کو جانا اور پہچانا اور اس کے کام کی تعریف کی۔[1]

تعلیمی کام کی چاروں منزلیں (خواہ یہ کام ہاتھ کے ذریعے ہو یا دماغ کے ذریعے) جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، متعلم میں ذہنی فعالیت کو اُبھارتی اور اس کی طبیعت کی زمین میں احتیاط، استقامت اور منطقی صحت کے ساتھ سوچنے کی اشد ضروری عادتوں کا بیج بوتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان عادتوں کے حامل ایسے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں جو نفس پرست ہوں، کسی اعلا مقصد کا خیال بھی جنھیں کبھی نہ آیا ہو اور جن کی تنگ نظری اور خود غرضی مجرمانہ مقاصد کے حصول میں اِن عادتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے رہ رہ کر ان کو اُکساتی ہو، یہ سب ممکن ہے، لیکن ذاکر صاحب ایسے اشخاص کو تعلیم یافتہ نہیں کہیں گے۔ ان کے نزدیک تو "تعلیم یافتہ آدمی کی امتیازی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ تہذیبی اشیا کی طرف یعنی اعلا معروضی اقدار کی طرف ایجابی رویہ رکھتا ہو" کرشن اشٹائنر نے ایک سچے تعلیم یافتہ آدمی کی پانچ واضح صفات بتائی تھیں، ذاکر صاحب نے انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیا اور ہر ایجابی صفت کے ساتھ اپنی طرف سے ایک سلبی دُم چھلّا بھی لگا دیا:

> "۱۔ تعلیم یافتہ آدمی اشیا اور اشخاص کی اقدار کے بارے میں ایک خاص وسعتِ نظر رکھتا ہے ـــــ وہ اپنی آنکھوں پر اندھیاری نہیں چڑھا لیتا۔

۱۔ محمد مجیب، "ذاکر صاحب"، مجیب صاحب، احوال و افکار، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۴۵

۲۔ وہ ایک خاص حد تک نئی اقدار اور نئے تصورات کو کھلے دل سے قبول
کرتا ہے ــــ وہ 'سرگشتۂ خمار رسوم و قیود' نہیں ہوتا۔
۳۔ اس میں اخلاقی نشوونما کی ایک اندرونی لگن ہوتی ہے اور خود اپنے
آپ کو اور اپنے ماحول کو 'خوب سے خوب تر' بنانے کی کوشش کرتا رہتا
ہے ــــ وہ برخود غلط نہیں ہوتا اور یہ کبھی نہیں سمجھتا کہ وہ کمال کی آخری
حد پر پہنچ گیا ہے۔
۴۔ برخلاف ایک کٹھ ملّا یا ضابطہ پرست حاکم کی خشکی اور سختی کے اس میں
اقدار کے تعین کے سلسلے میں ایک وسعت نظر، ایک لوچ ہوتا ہے ــــ
وہ محض ایک چوب خشک نہیں ہوتا۔
۵۔ اس کے تعین اقدار کی بنیاد ایک معروضی قدر مطلق پر قائم ہوتی ہے
اور اس کے کردار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نفس میں نور کا
ایک مرکزی نقطہ ہے جو اس کے فعل، عمل اور احساس کو منوّر کرتا ہے ــــ
وہ کوئی پراگندہ طبع لاابالی آدمی نہیں ہوتا۔[1]

کیرشن اشٹائنر نے تعلیم کی تعریف یہ کی تھی: "ایک انفرادی منظم احساسِ اقدار جو تہذیبی اشیاء کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے"۔ تعلیم کی یہ مختصر اور پُرمغز تعریف گویا خلاصہ تھی تعلیم یافتہ انسان کی ان صفات کی جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ "اس میں تہذیبی اشیاء پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے، اس لیے کہ معروضی اقدار ان ہی اشیاء میں ایک مجسم اور پائیدار شکل اختیار کرتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے سے نشوونما پانے والے ذہن کو ان اقدار کا تجربہ ہوتا ہے اور جو امکانات تہذیبی اشیاء میں مضمر ہوتے ہیں وہ فرد کے موضوعی ذہن میں قوت سے فعل میں آتے ہیں۔

۱۔ ذاکر حسین، ہندوستان میں تعلیم کی ازسرنو تنظیم، صفحات ۳۸۔۳۷

ان اقدار کو تسلیم کرنے اور ان کی اطاعت کرنے کو معروضیت کہتے ہیں، یعنی موضوعی قدر کو سلسلۂ معروضی قدر کے تابع رکھنا۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ اور ذہن کا ہر وہ کام تعلیمی کہلائے گا جس میں کام کرنے والا معروضیت کو مدنظر رکھے؛ کسی نے خوب کہا ہے کہ معروضیت ہی کا نام اخلاق ہے، اس لیے کہ اخلاق عمل اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اپنے موضوعی رجحان اور دلچسپی پر معروضی معیاروں کو مقدم رکھیں۔ معروضیت کا صرف ایک ہی مقصد ہے، اقدار کا مکمل حصول — معروضیت لاشخصیت کا نام ہے۔[1]

تعلیم اور سماج

ہم لکھ چکے ہیں کہ ذاکر صاحب تعلیم، سماج اور تمدن کے داخلی رشتے کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے۔ یہی تعلیم اور معروضی اقدار کے مابین جو بنیادی ربط ہے، اس پر بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے، معروضی اقدار ایک تعلیم یافتہ انسان کو سماج اور تمدن میں ملتی ہیں۔ ان اقدار کی خدمت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سماج کو خوب سے خوب تر بنانے کی پوری کوشش کریں، تعلیمی مقاصد اور سماجی مقاصد میں کامل آہنگی ہوگی تو تعلیم یافتہ افراد سماج کی خدمت کے ذریعے سے ان اقدار عالیۂ مطلقہ کے اطاعت گزار بن جائیں گے جو اصل میں صفاتِ الٰہیہ کا پرتو ہیں، اس طرح سماج ایک اخلاقی سماج یا ریاست ایک اخلاقی ریاست کی شکل اختیار کرے گی — تعلیم اور سماج کے باہمی ربط سے متعلق ذاکر صاحب کا یہی نظریہ تھا۔ اسی کو انھوں نے ایک جگہ اصلاحی زبان میں اس طرح کہا ہے کہ تعلیم دراصل نام ہے فرد کے مخصوص شعور اقدار کا جو سماج کی تہذیبی اشیاء سے بیدار ہوتا ہے، اور یہ شعور اپنے آپ کو سماجی عمل میں ظاہر کرتا ہے۔

اور یہ سماجی عمل حقیقت میں ہے کیا؟ یہ ہے انفرادی ذہن کی تربیت کے علاوہ تعلیم کے ایک اور مقصد کے حصول کا ذریعہ جو عبارت ہے سماج کی زندگی کو سدھارنے

۱۔ ایضاً، صفحہ ۴۸

اور سنوارنے سے۔" اس بات کو ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ انفرادی ذہن اس وقت تک پوری ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی ساجی زندگی میں ترقی نہ ہو۔ جو شخص فرد میں تعقل و کمال پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ساج میں بھی یہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ افلاطون جیسے عارفِ زندگی کو بھی انفرادی خیر کی تلاش میں سماج کے سارے ڈھانچے اور اس کی نشوونما پر غور کرنا پڑا... ایک جمہوری ساج میں کہ یہاں فرد اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی غذا کے لیے اپنے ابنائے وطن کے تعاون کا محتاج ہے، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا کہ وہ خوشی سے اپنی ساج کی زندگی کو اخلاقی اور مادی حیثیت سے بہتر بنانے کی ذمّے داری میں دوسروں کے ساتھ شریک ہو۔ صرف انفرادی زندگی میں اقدار اعلا کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا کافی نہیں بلکہ ساج کو بھی اس قابل بنانا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی میں ان اقدار اعلا کی فرماں روائی کو تسلیم کرے...[1]

کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے، اس بلیغ فقرے پر غور کیجیے، اور یہ فقرہ ذاکر صاحب اکثر دُہرایا کرتے تھے، تو مذکورہ بالا اقتباس میں جو حکمت چھپی ہوئی ہے، وہ کھل کر سامنے آجاتی ہے، اصل عبادت وہی ہے جس کے نتیجے میں آدمی آدمی کے کام آئے، اور آدمی کا کام اس کا ساجی منصب اور اخلاقی فرض بن جائے، اور اس منصب اور فرض کا تقاضا اور اصرار یہ ہو کہ آدمی غرض پرستی اور تنگ نظری سے اوپر اُٹھ کر اپنے آپ کو بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف کردے، ایک کی خوشی اور دکھ درد سب کی خوشی اور دکھ درد بن جائے۔ ہندستان جیسے ملک میں جہاں آج بھی افلاس اور جہالت، بیماری اور بیکاری دیکھنے والے کو ہر طرف نظر آتی ہے، ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایسے تعلیم یافتہ افراد کو پیدا کرنا تھا جن کے دل سماج کی ان مصیبتوں اور خرابیوں کا بوجھ محسوس کریں اور جن کی آنکھوں

۱۔ ایضاً، صفحات ۴۳۔۱۴۱

میں اپنے غریب اور پریشان حال بھائیوں اور بہنوں کے لیے آنسو ہوں۔۔۔ ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ طبیہ کالج، پٹنہ، کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دیتے ہوئے کالج کے کارکنوں اور اس سال سند پانے والوں کے ذریعے سے ذاکر صاحب نے گویا ہر صاحب ضمیر، ہر حساس اور ہر تعلیم یافتہ انسان کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ سماج کی خدمت کو اپنا آدرش اور اس طرح اپنے آپ کو حق کا پرستار ہونے کا مستحق بنائے۔ انھوں نے اپنے خاص ادبی اسلوب میں کہا تھا:

"یوں تو آدمی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے۔ پر آپ کے چاروں طرف جو دُکھ اور بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ افلاس اور فاقے نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے۔ جہل نے جس طرح اس بُری حالت کو اور بدتر بنا دیا ہے، اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا، دُکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انھیں سن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گزارنے کے لیے یہ ٹھیک ہی ہو، اس لیے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سُنائی دے اور ہر دُکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سُننے لگے اور ہر جاندار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ سُنائی دے کر چاہے ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑے اور دکھائی دے کر ہماری آنکھوں کو رُلا رُلا کر بے نور نہ کرے، مگر اس کے وجود کا علم ہمیں ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔ میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دُکھ کے دور کرنے کے لیے آپ کمر باندھیں۔۔۔ آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے۔ مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام

ہے۔ خود غرضوں کے لیے پیسے کمانے کا موقع ہے مگر ان کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انھوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس، جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے ٹکڑے جمع کر لیے اور مرض اور بیماری کے خلاف جہاد کرنے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مُبارک کام میں ہاتھ نہ بٹایا... دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی چیز اتنی موثر نہیں ہوتی جتنا کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ جو اس کے طوق زرّیں کا آرزومند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لیے وقف ہو۔[1]

ذاکر صاحب جہاں انفرادی شخصیت کی تعمیر پر زور دیتے تھے، وہیں اس بات کو بھی بہت اہم سمجھتے تھے، اور مختلف انداز سے اساتذہ اور نوجوان طلبہ دونوں پر تکرار و اصرار کے ساتھ واضح کرتے رہتے تھے کہ شخصیت کی تعمیر جماعت یا سماج ہی میں رہ کر ہو سکتی ہے۔ مسلسل اور پیہم تنہائی میں شخصیت نہیں بن سکتی، انسانوں میں رہ کر انسانوں کا کام کر کے شخصیت بن سکتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو روزی کمانے کے قابل بنا سکے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی خود غرض بن جائے، اسے چاہیے کہ سماج میں زندہ رہنے، روزی کمانے اور ذہنی زندگی گزارنے کے لیے کہ ذہنی زندگی ہی حیات انسانی کی خصوصیت ہے اور بغیر سماج کے ناممکن ہے، سماج سے اگر وہ کچھ لیتا ہے تو سماج کو کچھ دے کر، اسے کچھ بہتر بنا کر، اس دنیا سے رخصت ہو۔ جو آدمی اپنے سماج کو اسی حالت میں چھوڑ کر اُٹھ جاتا ہے، وہ امانت میں خیانت کرتا ہے، ہر اچھا آدمی مرنے سے پہلے سماج کو پہلے سے بہتر حالت میں چھوڑتا ہے۔

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحات ۸۵-۸۱

عالم نو اور نیا انسان

تعلیم، تمدن اور سماج — اور اُن کے باہمی رشتوں سے متعلق ذاکر صاحب کے افکار و تصورات کا اصل سرچشمہ یوں تو تعلیم و تمدن سے متعلق مغربی فلسفہ تھا، لیکن انھوں نے انھیں مذہب کی عالمگیر اقدار، قرآنی ہیومانزم اور تمدن اسلامی کی صوفی روایات سے ہم آہنگ کر لیا تھا اور جب اس میں عقیدہ، اخلاص اور عمل کی اثر آفرینی بھی شامل ہوگئی تو ذہن میں ایک عالم نو کا خاکہ اُبھرا، اور پھر اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے انھوں نے قلب و نظر کی اپنی ساری صلاحیتیں لگادیں۔

اس عالم نو کے خاکے کے خطوط کچھ اس طرح تھے: ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں مرکزیت مذہب اسلام کو حاصل ہو، اور اُس میں قومی تہذیب اور عالمی تہذیب کے عالمگیر عناصر اس طرح شامل ہوں کہ سب مل کر انسانیت کا اعلا نمونہ پیش کریں، آزادیِ وطن اور متحدہ قومیت کی تعمیر کی سعیِ پیہم، یہ عقیدہ کہ مذہب کی سچی تعلیم محبت اور قومی اتحاد کا سبق دیتی اور دنیا کی زندگی میں شرکت اور عالمی امن اور انسانی تہذیب کی خدمت پر آمادہ کرتی ہے، علم محض روزی کی خاطر یا علم محض علم کی خاطر، جدید اور قدیم تعلیم کے اس اصول سے شعوری گریز کہ یہ دونوں بہت تنگ اور محدود ہیں، بلکہ یہ اصول کہ علم زندگی کی خاطر کہ جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے، سائنس کی روح جو عبارت ہو تلاش و جستجو اور تسخیر کائنات سے اور جس میں دینی عقیدے سے بے ادبی اور اس کی بے حرمتی کی آمیزش نہ ہو، قومیت کا جذبہ جو فرقہ وارانہ اور علاقائی تنگ نظری اور تعصب کی ملاوٹ سے پاک ہو، غرض ایک "نئے آدم" کی تخلیق جس کی زندگی میں اقدار عالیہ مطلقہ کو رچانے بسانے کی مسلسل کوشش کا سُراغ ملتا ہو۔

۱۹۲۸ء میں ذاکر صاحب کی رہنمائی میں جب انجمن تعلیم ملّی کے اغراض و مقاصد متعین کیے گئے تو ان میں اشاعتِ علوم، علمی تحقیقات اور تعلیمی تجربوں کو بڑی

اہمیت دی گئی۔ لیکن مالی مشکلات کا سامنا ہوا تو تعلیمی سرگرمیاں محدود کرنی پڑیں۔ یوں تو تعلیم کے اُن بلند مقاصد کے پیشِ نظر جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، ذاکر صاحب نے یہ سوچا تھا کہ نرسری تعلیم کے مرحلے سے لے کر اعلا تعلیم کی منزل تک جدید تعلیمی و تحقیقی اصولوں کے مطابق اسکول اور کالج قائم کیے جائیں، اور تحقیقاتی ادارے بھی ہوں، ان کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شعبہ، ایک پبلشنگ ہاؤس، مطبع، ایک اعلا درجے کی لائبریری اور تعلیم بالغان کا مرکز ہو، استادوں کی ٹریننگ کے لیے بھی ایک مدرسہ منصوبے میں شامل تھا کہ شعبۂ تعلیم میں تحقیق و تجربے کے ساتھ ساتھ یہ نہایت ضروری تھا کہ اسکولوں کے لیے اچھے اساتذہ میسر آئیں جو قومی تعلیم کے مقاصد اور ضروریات کو سمجھتے ہوں، لیکن یہ سارے منصوبے اپنی تکمیل کے لیے سرمایہ بھی چاہتے تھے اور لائق اور یکسوئی و خلوص سے کام کرنے والے اساتذہ و کارکن بھی۔

مالی وسائل کی کمی اور ان کی فراہمی کے لیے مسلسل جدوجہد کی داستان بیان کی جا چکی ہے، دوسری طرف ملّی و قومی جذبے سے سرشار ایسے جو لوگ بھی مل جاتے، ان کے اس جذبے کو بھی جامعہ کا سرمایہ سمجھا جاتا، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ یہ لوگ سب ایک ہی طبیعت، یکساں صلاحیت اور حوصلے کے لوگ تھے، سخت غلط فہمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ ایسا انسانوں کی جماعت میں کبھی اور کہیں نہیں ہوتا، اور آج جبکہ ذاکر صاحب کے پرانے ساتھیوں میں سے صرف چند ہی رہ گئے ہیں جو اپنی شامِ زندگی کے آخری لمحات سے گزر رہے ہیں، اور اُن اساتذہ میں سے تو اب شاید کوئی بھی نہیں جو ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے دہلی آئے تھے، اپنی معلومات کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں اور ان سب کے خلوص اور ایثار کے لیے گہرا جذبۂ احترام رکھتے ہوئے، کہہ سکتا ہوں کہ ان میں کچھ لوگ غیر مستقل مزاج کے بھی رہے ہوں گے، کچھ ایسے ہوں گے جو بہت دور تک نہ دیکھ سکتے ہوں گے جبکہ ان میں وہ بھی تھے، اور ایسوں کی تعداد خاصی تھی جن میں جوشِ عمل کے ساتھ ایسی تخلیقی توانائی بھی تھی جو اپنے کرشمے دکھانے کے لیے بہرصورت بے تاب رہتی ہے۔ ذاکر صاحب

جرمنی سے جامعہ لوٹے تو گویا اُن کی اُس توانائی کو بروئے کار آنے کا موقع مل گیا' اور انھوں نے ان کی ذہنی و عملی رہنمائی میں تعلیم کے اعلا مقاصد کی راہ میں اپنے آپ کو کھپا دیا۔ لیکن رہنما کی بے مثال قیادت' اور خود ان لوگوں کی کام کی بے پناہ صلاحیت' شوق اور لگن مادی وسائل سے یکسر بے نیاز رہ کر پورے طور پر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی تھی۔

اس لیے کام کے پیمانے کو چھوٹا رکھنا پڑا اور جن کاموں کی طرف پہلے توجہ دی گئی' وہ تھے مدرسۂ ابتدائی' بالغوں کی تعلیم' مکتبہ جامعہ' اور اُردو اکاڈمی۔ ذاکر صاحب نے اپنے تعلیمی نظریات کے پیش نظر کام کا جو نقشا بنایا تھا' اس میں مدرسۂ ابتدائی کو اوّلیت اس لیے حاصل تھی کہ ثانوی اور اعلا تعلیم کی منزل میں طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کی جس طرح تربیت اور ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر جس نہج پر کرنی تھی' اُس کی بنیاد یہیں پڑنی تھی[1]۔ اسی لیے جیسے ہی ذاکر صاحب کو پتا چلا کہ عبدالمجید خواجہ پیامِ تعلیم کے نام سے ایک رسالہ' خاص طور پر بچوں کے لیے' نکالنے کے سخت آرزومند اور شروع میں کچھ مدّت کے لیے اس کے خرچ کا سارا بار اُٹھانے کے لیے تیار ہیں' انھوں نے اس کام کا آغاز کر دیا اور یہ رسالہ پندرہ روزہ اخبار کی شکل میں شائع ہونے لگا جس میں اسکول کے بچوں کے پڑھنے کے لیے اچھا خاصا مواد ہوتا تھا' یہ رسالہ بھی گویا ابتدائی تعلیم کے کام کو بہتر بنانے کا ایک وسیلہ تھا' اسی طرح مکتبہ جامعہ کے کام میں یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ وہ بچوں کے لیے جدید اصولِ تعلیم کے مطابق درسی اور غیر درسی کتابیں تیار کرائے اور انھیں طباعت کے اعلا معیار پر چھاپے جن سے بچوں میں مطالعہ کے شوق کے

۱۔ مدرسۂ ابتدائی میں تعلیم کیسے دی جاتی تھی اور اُس میں کیسے کیسے تعلیمی تجربے کیے گئے' جن میں ہاتھ کے کام اور منصوبی طریقۂ کار (پراجیکٹ میتھڈ) کو بنیادی حیثیت حاصل تھی' ان سب کی تفصیلات کے لیے دیکھیے جامعہ کی کہانی (مرتبہ: عبدالغفار مدھولی)۔ اسی کتاب میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے وفد کے بعض ممبروں کے تاثرات بھی ملیں گے جو دنیا کا دورہ کرتے ہوئے ۱۹۳۴ء میں ہندستان آئے تھے اور جنھوں نے اس مدرسے کے کام کی' بلکہ کل جامعہ کی' بہت تعریف کی تھی۔

ساتھ خوش ذوقی کا احساس بھی بیدار ہو۔

یہاں غالباً یہ بات بے محل نہ سمجھی جائے گی اگر ہم تھوڑی دیر رُک کر غور کرلیں کہ آخر ذاکر صاحب نے بچوں سے اپنی فطری محبت کے اظہار کی خاطر، اُن دنوں جب اُن کی مصروفیتیں گوناگوں اور بے پناہ تھیں، کیوں یہ ضروری سمجھا اور کیسے اتنا وقت نکالا کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے، مضامین لکھیں۔ وقت تو شاید انھوں نے خود نہیں نکالا؛ بلکہ ان کے تخلیقی ذہن کی قوت اظہار نے ان سے بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے لکھوائے کہ اس زمانے میں اُن کی گہری توجہ جامعہ کے ابتدائی تعلیم کے مدرسے اور بچوں کی ذہنی نشو و نما کی طرف تھی، ضروری انھوں نے اس لیے سمجھا کہ ہمارے ملک میں بچوں کے اچھے ادب کا فقدان تھا، بچوں کی کتابیں چھپتی بھی تھیں خراب، اور انداز بیان بھی وہی پُرانا تھا، ذاکر صاحب چونکہ اس کے قائل تھے کہ پہلے خود کرو، پھر کہو، انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس میدان میں بھی وہ بچوں کی تعلیم کا کام کرنے والوں کو راستہ دکھائیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے رقیہ ریحانہ کے قلمی نام سے لکھیں۔ ریحانہ ان کی چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ وہ اس بچی کو بہت چاہتے تھے، ۱۹۲۳ء میں چار سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ کہانیاں کتابی صورت میں جب ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں کے نام سے شائع ہوئیں، تو اس پر ذاکر صاحب نے بطور انتساب لکھا:

> "یہ کہانیاں بہت دن ہوئے، رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے انھیں نے سُنائی تھیں اور یہ کہہ کر سُنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سُنی ہیں مگر یاد نہیں کہ کب اور کہاں۔ میں نے ان سے پائی تھیں، اس لیے انھیں کے نام سے پہلے شائع کیں۔ پھر رقیہ ریحانہ ہمیشہ کو رخصت ہوگئیں اور میں یہ بھی نہ پوچھ پایا کہ میں نے جس طرح ان کہانیوں کو لکھا ہے وہ انھیں پسند بھی ہے یا نہیں لیکن لکھی چونکہ میرے ہاتھ سے

گئی تھیں اور لوگ اسے جانتے ہیں اس لیے اب انھیں اپنے ہی نام سے شائع کرتا ہوں. کس کس کو بتاؤں کہ رقیہ ریحانہ کون تھیں اور کہاں چلی گئیں[1]۔ سہل یہی ہے کہ کہانیوں کی ساری ذمّے داری اپنے سر لے لوں. کہانی اپنے کہنے والوں کی اچھائی بُرائی کو بے تکلفی سے اپنے اندر لے لیتی ہے۔ یہ کہانیاں آپ کو پسند آئیں تو سچ یہ ہے کہ ان کی ساری خوبی رقیہ ریحانہ کی دین ہے۔ اگر طبیعت کو نہ بھائیں تو سمجھیں کہ میرے بیان نے انھیں بگاڑ دیا ہے۔ مگر ایک بار پڑھ ضرور لیں۔ تھوڑی سی ہیں، زیادہ وقت ضائع نہ ہوگا۔

ان کہانیوں میں ذاکر صاحب نے اپنے تعلیمی مقاصد کے پیش نظر ایسے کرداروں کو جنم دیا جن میں انانیت، خود پسندی اور خود غرضی کے بجائے سادگی، بے ساختگی اور باہمی اعتماد اور بھروسا زیادہ نمایاں ہے۔ ان میں آزادی کی لگن اور قدر و قیمت کا احساس بھی بیدار ہے اور خود اعتمادی اور خود شناسی کا جوہر بھی ملتا ہے، غرض،

۱۔ رقیہ ریحانہ کا اُس وقت انتقال ہوا جب ذاکر صاحب مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے ایک جلسے میں سالانہ نتیجہ سُنانے کے بعد بچوں کو انعام اور مٹھائی تقسیم کر رہے تھے، اتنے میں ایک شخص نے آکر ان کے کان میں کچھ کہا جس سے ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ لیکن جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ یہ خبر رقیہ ریحانہ کی وفات کی تھی۔ جلسہ ختم ہوا تو وہ گھر گئے، اس وقت وہ تسلیم و رضا کا پیکر تھے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ وہ دیر سے کیوں آئے تو کہنے لگے کہ 'جلسے میں بچے بہت خوش تھے، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس خبر اور میری پریشانی سے ان کی خوشی میں کچھ خلل پڑے؛ پھر وہ خاموش ہو گئے اور ان کی کسی بات یا انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ جس بچّی سے انھیں اس قدر محبت تھی اُسے وہ منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے ہمیشہ کے لیے سلانے والے ہیں،' "مجھے کچھ دنوں بعد بیگم ذاکر حسین سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصے تک روزانہ صبح کو ان کا تکیہ بھیگا ہوا ملتا تھا۔ گویا بیگم صاحبہ کو بھی راتوں کو رونے کا حال صرف اس ذریعے سے معلوم ہوا۔" (دیکھیے مرمجیب، 'ڈاکٹر ذاکر حسین۔ اے بایوگرافی صفحہ ۶۰، اور سیدہ خورشید عالم، حوالۂ سابق، صفحہ ۹۶)

اخلاقی اور انسانی صفات کو بڑے موثر انداز میں، اور بات بات میں، اُبھارا گیا ہے تاکہ جو بچے ان کہانیوں کو پڑھیں ان کے دل میں اچھا انسان بننے کی آرزو چٹکیاں لینے لگے۔ ان کہانیوں کی فنی اور ادبی حیثیت پر کتاب کے اس حصے میں کچھ روشنی ڈالی جائے گی جس میں ذاکر صاحب کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہوگا۔ ہاں، اس موقع پر یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کہانیوں میں جن اخلاقی اقدار کو اُبھارا گیا ہے وہ ذاکر صاحب کی اپنی سیرت و شخصیت کا جزو بن گئی تھیں "کہانی اپنے کہنے والوں کی اچھائی برائی کو بے تکلفی سے اپنے اندر لے لیتی ہے۔"

تعلیم بالغان کا کام اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ان پڑھ بالغوں کو جن کی تعداد ملک میں اس وقت بہت زیادہ تھی، اگر آزادی کی قدر وقیمت، جنگ آزادی کی اہمیت اور اپنے بچوں کی تعلیمی ضرورت کا احساس نہ دلایا گیا تو ملک کی تعلیم و ترقی کا جو کام بھی کیا جائے گا وہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء کے وسط تک، اس میدان میں جو تجربے کیے گئے تھے، وہ اگرچہ نتیجے کے اعتبار سے بہت کامیاب نہیں کہے جا سکتے تھے، لیکن ان کا ایک نہایت ہی مفید نتیجہ یہ نکلا تھا کہ جامعہ والوں نے یہ سمجھ لیا کہ تعلیم بالغان کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو بالغوں کی تعلیم سے متعلق تجربے کرے، تعلیم کی اس شاخ کے جدید اصول اور نظریوں کو جانچے اور اپنے تجربے و تحقیق کے نتائج کو ملک میں اس طرح کا کام کرنے والوں تک پہنچائے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جامعہ میں ایک نیا شعبہ ادارۂ تعلیم و ترقی کے نام سے قائم کیا گیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی اس کے روح رواں تھے اور انھوں نے ذاکر صاحب کی مدد سے اس ادارے کو ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا کہ ملک میں جامعہ تعلیم کے اس میدان میں بھی رہنما قرار پائی۔ ذاکر صاحب کے تعلیمی فکر کو عمل میں لانے اور تعلیم سے محروم لوگوں کو تعلیم پائے ہوئے لوگوں سے قریب لا کر سماجی زندگی کو بہتر بنانے کا ایک محاذ یہ بھی تھا۔ ان کے دوست اور ساتھی شفیق صاحب کی قیادت میں جامعہ والوں نے اس محاذ پر بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

جامعہ میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف پہلے ہی سے تھا اور اس کا دارالاشاعت یعنی مکتبہ بھی پہلے سے قائم تھا، اور اسی کے اہتمام میں رسالہ جامعہ چھپتا تھا۔ جرمنی جانے سے پہلے ذاکر صاحب شعبۂ تصنیف و تالیف کے نگراں تھے۔ اب انھوں نے اس کی ازسرِ نو تنظیم کی، اس کا نام بدل کر اُردو اکاڈمی رکھا گیا، اور مکتبہ جامعہ کے نام اور رسالہ جامعہ کے معیار کو بہتر بنانے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا۔ اُردو اکادمی کی سرگرمیوں کو جن میں اعلا تعلیم کے طلبہ اور ملک میں تعلیم یافتہ طبقے کے لیے جو اُردو زبان سے واقف تھا، مختلف مضامین اور موضوعات پر نصابی و علمی کتابیں تیار کرانے کا کام خاص اہمیت کا حامل تھا، بڑی وسعت دی گئی، اور اسی کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا کہ وہ باہر سے ممتاز شخصیتوں کو مدعو کرکے توسیعی لیکچر دلوائے اور ان لیکچروں سے استفادہ کرنے والوں میں صرف اہلِ جامعہ ہی نہ ہوں بلکہ ان میں دہلی کے اہلِ علم اور سربرآوردہ لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ مکتبہ جامعہ اور پریس نے اُردو کتابوں کی اشاعت کا ایک معیار قائم کر دیا اور رسالہ جامعہ نے جلد ہی علمی و ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔[1]

غلامی کے اس دور میں جب جامعہ نئی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ اعلا تعلیم کے ایک ادارے کی حیثیت سے وجود میں آئی تھی، ملک کے نظامِ تعلیم کا سایہ تک اس پر نہ پڑ سکتا تھا، اور یہی اس کی انفرادیت تھی، دوسری طرف برطانوی حکومت یہ چاہتی تھی کہ جامعہ میں اعلا تعلیم کا کام ترقی نہ کرے اور جامعہ کالج کو کبھی اس کا موقع نہ ملے کہ اس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو، اور وہ فارغ ہو کر ملک میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں پھیلیں اور اپنے ان سیاسی و تہذیبی خیالات کو بڑے پیمانے پر پھیلائیں جن سے برطانوی اقتدار اور سامراجی مفاد کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسی لیے اس دور میں ملک کے

۱۔ اُردو اکادمی کے ناظم ڈاکٹر سید عابد حسین بنائے گئے۔ پریس کا کام پروفیسر محمد مجیب کے سپرد کیا گیا جنھوں نے جرمنی میں باقاعدہ پرنٹنگ کا کام سیکھا تھا۔ مکتبہ جامعہ کے ذمے دار حامد علی خاں مقرر ہوئے جن کی شخصیت بڑی متحرک اور جن میں کاروبار کی سمجھ بوجھ بہت تھی۔

نظامِ تعلیم نے جامعہ کالج کی سندیں منظور نہ کیں جب کہ اس کا معیارِ تعلیم اونچا اور اس کے اساتذہ کا علمی مرتبہ ملک کے اچھے سے اچھے کالجوں کے اساتذہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔[1] لیکن نوجوان محض لائق اساتذہ کی کشش سے جامعہ کالج میں کیسے داخلہ لے سکتے تھے! جامعہ کی سندیں اُن کے لیے ملازمت کی ضمانت نہ تھیں، اور نہ ہی جامعہ کے گریجویٹ ملک کی کسی اور یونی ورسٹی میں مزید اعلا تعلیم کے لیے داخل ہو سکتے تھے۔ اس لیے جامعہ کالج میں طلبہ کی تعداد بہت کم رہتی تھی۔ اور ذاکر صاحب، بہرحال، یہ چاہتے تھے کہ جامعہ کے تعلیمی و تہذیبی افکار، سماجی مقاصد اور سیاسی خیالات جو ایک طرح سے بیشتر اب انھیں کے افکار و خیالات تھے، ملک میں اور خاص طور پر مسلمانوں اور اُردو والوں میں پھیلیں اور ان کے باشعور عناصر ان خیالات اور مقاصد سے روشنی حاصل کر کے اسے ملک و ملت کی تاریک راہوں میں بکھیر دیں۔ ذاکر صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ مدرسۂ ابتدائی، مدرسۂ ثانوی[2] اور تعلیم بالغاں کے شعبے کے تعلیمی تجربوں کی ہماہمی میں بھی، اعلا تعلیم کے ادارے کی حیثیت سے جامعہ ملیہ کا نام کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے، اور اس کی واحد صورت یہی تھی کہ علمی کتابوں کی تیاری و طباعت، رسالہ جامعہ کی اشاعت اور اردو اکاڈمی کے اہتمام میں توسیعی خطبات کے ذریعے علم و دانش کو دور دور پھیلایا جائے اور عام لوگوں میں اس کے فروغ کی خواہش بیدار کی جائے، صحیح علم اور سچی دانش انھیں اقدار کی ترجمان ہیں جو بقول ذاکر صاحب اخلاقی سماج اور اخلاقی ریاست کی بنیاد ہیں۔ اس سلسلے میں وسائل کی کمی بڑی رکاوٹ تھی، لیکن پھر بھی خاصا کام ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے علمی حلقوں میں ایک ایسے اعلا

۱۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ آزادی کے پہلے میٹرک کا سرٹیفکٹ تو حکومت نے تسلیم کر لیا تھا، لیکن جامعہ کا انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے قابلِ تسلیم نہیں سمجھا گیا تھا۔

۲۔ مدرسۂ ثانوی میں تفویضی طریقۂ کار اور دوسرے تجربوں کے لیے دیکھیے عبدالغفار مدھولی کی کتاب جامعہ کی کہانی۔

تعلیمی ادارے کی حیثیت سے جامعہ کا اعتبار قائم ہوگیا کہ وہ علم کو پھیلانے اور تعلیم کے رشتے کو تہذیب و تمدن سے ملانے اور مضبوط کرنے میں دوسری یونی ورسٹیوں سے کہیں آگے ہے۔

ذاکر صاحب اپنے تعلیمی افکار، تہذیبی مقاصد اور اخلاقی قدار کو جامعہ کے طالب علموں میں، خواہ وہ اسکول کے بچے ہوں یا کالج کے نوجوان، اور ان طالب علموں کے وسیلے سے پوری جماعت میں پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، اور یہ کام وہ برجستہ اور اس قدر شگفتہ انداز میں کرتے تھے کہ ان کی باتیں سننے یا اُن کی تحریریں پڑھنے والوں کے دل میں جوش اور گرمی پیدا کر دیتی تھیں، نہ معلوم ملک کے کتنے لوگوں نے اِن کے خیالات سے اثر لیا ہوگا اور اُن کی زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہوگیا ہوگا۔ ہم نے ابھی ابھی جامعہ کالج کا کچھ تذکرہ کیا ہے۔ اِس کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں انجمن اتحاد (اسٹوڈنٹس یونین) اور رسالہ جوہر کو خاص حیثیت حاصل تھی۔ ۴۳-۱۹۴۲ء کے تعلیمی سال میں جوہر کے مدیر نے ذاکر صاحب سے اس کے لیے ایک پیغام کی درخواست کی اور ذاکر صاحب نے یہ پیغام دیا:

"جوہر کے پڑھنے والے کالج کے طلبہ سب کسی نہ کسی علم میں اعلا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کالج میں چند سال رہنے کا ظاہری مقصد ایک سند کا حاصل کر لینا ہے۔ وہ سند اس بات کی تصدیق کرے گی کہ آپ علم کی کسی نہ کسی شاخ میں دستگاہ رکھتے ہیں… لیکن وہ سند یہ نہ بتا سکے گی کہ آپ کو اس علم سے واقعی کوئی لگاؤ بھی ہے یا نہیں، اور اس سے ذہن کی جو تربیت ممکن ہے وہ بھی آپ کے حصے میں آئی ہے یا نہیں۔ کوشش کیجیے کہ کم سے کم آپ خود اس سند کے بین السطور میں یہ بھی درج پا سکیں کہ 'انھوں نے اس علم کے خزانے کی ایک کنجی بھی بنائی ہے جس سے اسے کھول سکتے اور فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ انھیں اس علم کی مملکت کا نقشہ پڑھنا بھی آتا ہے۔

یہ اس میں مختلف مسائل کی جگہ بھی متعین کر سکتے ہیں۔ یہ ذہنی کاہلی کی وجہ سے سوال کی تہ تک جانے سے نہیں اکتاتے اور بہتر دماغوں کی مدد سے اپنے خیال اور علم میں وضاحت پیدا کرنے کی سعی سے کتراتے نہیں۔'

"ایسا نہ ہو کہ آپ کو سند کے بین السطور میں کبھی یہ لکھا دکھائی دے کہ 'انھوں نے سند تو لے لی ہے۔۔۔ کتابوں کے خلاصے اور لیکچروں کے نوٹ انھیں حفظ ہیں مگر کتب خانے میں بٹھا دو تو حیرت سے دم بخود ہو جاتے ہیں' کوئی غیر مانوس نیا سوال سامنے آئے تو بزدلوں کی طرح راہ فرار ہی اختیار کرتے ہیں۔'

"چونکہ علم ترقی پذیر زندگی کا سہارا ہے اس لیے آپ کی سند سے کوئی یہ سمجھے کہ آپ زندگی کے میدان میں بھی علم کو اپنے ساتھ رکھیں گے تو چنداں بے جا نہ ہوگا کہ علم ہی سے آپ میں سوجھ بوجھ پیدا ہوگی' قوت فیصلہ میں توازن ہوگا' قرائن اور شہادتوں کو اچھی طرح جانچ سکیں گے' ہر سیاسی طلسم میں پھنس نہ جائیں گے' ہر مذہبی بازیگر کے پیچھے تالیاں بجاتے نہ پھریں گے' آدمیوں کو پرکھ سکیں گے اور سونے اور ملمع میں تمیز کرنا سیکھ جائیں گے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والے شعبدہ بازوں کی چالیں سمجھیں گے۔ قریب پر نظر ہوگی مگر دور کو بالکل نظر انداز نہ کریں گے۔ عاجلہ کی خاطر آخرہ کو نہ بھلا دیں گے۔

"کہیں یہ نہ ہو کہ آپ کی سند کے حاشیے پر ایک ایسی تحریر ہو جسے چاہے دوسرے پڑھ پائیں یا نہ پڑھ پائیں' آپ کبھی کبھی پڑھ سکیں اور اس میں لکھا ہو کہ 'یہ پڑھے لکھے نوجوان ضرور ہیں' مضمون بھی لکھتے ہیں' کتابیں لکھنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں' تقریر بھی چٹخے دار کر لیتے ہیں مگر خود غرضی میں کوتاہ اندیش ہیں' کوئی بات ان کے موافق ہو تو اسے جھٹ مان لیتے ہیں' جو ذرا ان کے خلاف پڑتی ہو اس کی کسی نہ کسی بہانے سے مخالفت کرتے ہیں۔ جماعتی معاملات میں بھی ان کی رائے ان کی غرض کی پابند ہوتی ہے۔ ہر نئے تجربے سے

ڈرتے ہیں کہ دیوانے ان پر اس کا کیا اثر ہو. بہتر دنیا کا خواب تک نہیں دیکھتے.
اس کو وجود میں لانے کے لیے جن اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے ان کے پیدا کرنے
کا تو ذکر ہی کیا ہے۔
"آپ کی سند میں یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی، اور اس سند کا لکھنا
آپ ہی کے ہاتھ میں ہے. آپ روز اسے لکھتے ہیں۔"[1]

اسی طرح ۴۴-۱۹۴۳ء کے تعلیمی سال میں عید کے موقع پر بچوں کا تعلیمی میلا ہوا
تو ذاکر صاحب نے بڑوں اور چھوٹوں سب کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی، وہ ہندی قومی
زندگی میں مسلمانوں کے اس اہم بالشان رول کی ترجمانی تھی جس کا خاکہ اُن کے ذہن میں
بالکل واضح تھا اور جسے عملی صورت میں دیکھنے کے وہ سخت آرزو مند تھے. اس تقریر کے
اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"دوستو اور عزیزو! ہماری چھوٹی سی تعلیم گاہ کے کام ابھی چھوٹے
چھوٹے ہی ہیں. تم میں خود بہت سے ابھی بہت چھوٹے ہیں لیکن جیسے تم روز
بروز بڑے ہوتے جاتے ہو ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ تعلیم گاہ بھی
بڑھے، جیسے تم پر روز بروز نئی ذمے داریاں بڑھتی جاتی ہیں خدا کرے اس
تعلیم گاہ کی ذمے داریاں بھی بڑھیں، اور یہ ان ذمے داریوں کو اُٹھانے
کی اہل بھی ثابت ہو۔
"یہ بے شک ابھی ایک چھوٹی سی اور کمزور سی تعلیم گاہ ہے لیکن
اس کے حوصلے کو پست نہ ہونے دو، یہ ہماری قومی زندگی کی تاریکی میں اُمید
کی ایک کرن ہے، کمزور سی کانپتی ہوئی کرن، اپنی محنت اور محبت، اپنے

---

۱. عبدالغفار مدھولی، حوالۂ سابق، صفحات ۲۱۲-۲۱۰

استقلال اور اپنی ہمت سے اسے آفتاب بنادو، جو زندگی کے سب شعبوں میں ہمیں روشنی بھی دے سکے اور گرمی بھی۔ اسے اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت کا ترجمان بنادو یعنی اپنی باعزت زندگی اور سربلندی کا ترجمان بنادو۔

"اس دھوکے میں نہ رہو کہ یہ سربلندی باتیں بنانے سے مل جائے گی یا سیاسی شطرنج کی کسی چال سے تمھاری ہو جائے گی۔ یہ نہ خیالی پلاؤ پکانے سے ملے گی نہ گالیاں دینے سے، اور یہ اگر ایسی ہی چیز ہے کہ یوں حاصل ہوتی ہے یا اگر اس کے حاصل ہونے کی شرط یہ ہے کہ اور سب ذلیل و خوار ہوں، ہمارے دست نگر ہوں اور ہم سب پر جبر و ظلم کر سکیں تو خدا ہمیں یہ سربلندی عطا نہ فرمائے۔

"ہمیں تو اپنی جماعت کے لیے وہ سربلندی مانگنی اور حاصل کرنی چاہیے جو اوروں سے بہتر خیال اور اوروں سے بہتر کاموں سے حاصل ہوتی ہے، جو پکّے یقین سے ملتی ہے، جو پیہم سعی و عمل سے ملتی ہے، جو محبت اور خدمت سے ملتی ہے۔ ہم اس ملک میں اپنے لیے سربلندی چاہتے ہیں، سرداری چاہتے ہیں، لیکن یہی خدمت کی سربلندی، ظلم و جبر کی سربلندی نہیں۔ ہم وہ سرداری چاہتے ہیں جو اس ملک کے سب باشندوں کے لیے رحمت بن کر ہمیں ملے، جو اس کے توہمات باطل، اس کے افکار فاسد، اس کی خود غرضیاں، اس کے ظلم، اس کے مفلسوں کی بپتا مٹانے میں سب سے آگے ہونے پر ہماری ہو۔"[۱]

ذاکر صاحب کی اس زمانے کی تقریروں کو، خواہ تقریر انھوں نے جامعہ میں کی ہو یا جامعہ سے باہر، غور سے پڑھیے تو ان میں تعلیمی نظریوں اور تعلیم کے عملی افادی

۱۔ ایضاً، صفحات ۲۴۳-۲۴۲

پہلوؤں کی بحثوں میں اس درد و کرب کی بھی ایک زیریں نو ملتی ہے جو ملک کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کا نتیجہ تھا' ذاکر صاحب عملی سیاست میں تو نہیں تھے لیکن گاندھی جی اور ملک کے دوسرے سیاسی رہنماؤں سے ان کے گہرے تعلقات تھے' جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک علامت تھی' ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ کا محبت اور اتحاد کا پیغام سارے ملک میں عام ہو جائے' کیونکہ اسی صورت میں تعلیم کا کام کرنے والے جو آزادی اور آزادی کے بعد ملک میں ایک اچھے اخلاقی سماج کے قیام کے اعلا مقصد کے لیے بنیادی و تعمیری کام کر رہے ہیں' اطمینان و سکون سے اس دیس میں ایک نئی دنیا اور ایک نئے انسان کی تخلیق کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ہوا کا رُخ کچھ اور ہے اور ملک میں ایک طبقے کی طرف سے نیشنلزم کی تعریف جس طرح کی جا رہی ہے اور یورپ سے درآمد کیے ہوئے نظریۂ قومیت کو ہندستان جیسے ملک پر جو مختلف مذہبوں' تہذیبوں اور زبانوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے' بے سوچے سمجھے جس جارحانہ انداز سے تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے' اس سے ملک کی سیاست کا مزاج بگڑے گا اور نتیجے میں ملک کے سبھی باسیوں کا نقصان یعنی ملک کا نقصان ہوگا۔

ذاکر صاحب کی حوصلہ مندی ملاحظہ کیجیے کہ اس صدی کے تیسرے دہے کی سیاسی فضا میں جب ہندستانی لیڈر زیادہ تر ایسے مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے جن سے آزادی کی لڑائی میں کوئی خاص تقویت ملنے کے بجائے رکاوٹ پیدا ہو سکتی تھی' اور خود جامعہ مالی مشکلات میں مبتلا تھی' انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ملک سے باہر کے بعض مہمان مقرروں کو مدعو کریں اور اُن سے جامعہ میں تقریریں کرائیں۔ ڈاکٹر انصاری نے نہ صرف یہ کہ ان کی تائید کی بلکہ یہ کہا کہ وہ خود مقررین کو دعوت دیں گے اور اپنے یہاں مہمان رکھیں گے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں حسین رؤف بے' ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر بہت وہبی اور ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم جامعہ کی دعوت پر ہندستان آئیں۔ یہ تینوں ترک شخصیتیں اس وقت دنیائے اسلام کی ممتاز شخصیتیں تھیں' خاص طور پر حسین رؤف بے اور

خالدہ ادیب خانم کی شخصیتیں ترکوں کی قومی جنگ میں اپنی بے خوف قوم پروری و وطن دوستی، ایثار و قربانی اور سامراج دشمنی کے سبب سارے عالم اسلام کی ہیرو بن گئی تھیں، ہندستان میں ان کی آمد ہندستان کی جنگ آزادی کے مجاہدوں کے لیے بڑی ہمت افزا تھی، اور یہاں کے بعض محب وطن شاعر، ادیب اور روشن خیال لوگ ان سے متأثر بھی ہوئے، لیکن عام طور پر ہندستانی سیاستداں اپنے ہی معاملات میں اُلجھے رہے۔ پھر بھی باہر سے آئے ان مہمان مقرروں کے خطبات سے جامعہ کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔

ساتواں باب

بنیادی قومی تعلیم

بنیادی قومی تعلیم کا منصوبہ ایک حوصلہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ اب یہ ماضی کا افسانہ ہے جو کئی رنگ میں لکھا گیا ہے، اور بار بار لکھا گیا ہے، مختلف لوگ، مختلف رائیں۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے خیالات کی روشنی میں ہندستان میں تعلیم کی تاریخ کے اس باب کو لکھا تھا اور وہی اس کے اصل شارح اور ترجمان بھی تھے۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ گاندھی جی نے کہ اُن کی پرجوش کوششوں سے ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تھی اور سماجی اصلاح کا بھی خاصا کام ہوا تھا، ۲/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ہریجن میں لکھا کہ "میں ۱۹۲۰ء میں تعلیم کے موجودہ نظام کے خلاف بڑے زور شور سے بولتا رہا تھا اور اب جبکہ مجھے سات کانگریسی صوبوں کے وزیروں کے اوپر، تھوڑا سا ہی سہی، اپنا اثر ڈالنے کا موقع ہاتھ آیا تو میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میرے اوپر یہ کہنے کے بعد کہ تعلیم کا موجودہ ڈھنگ بنیادی طور پر نیچے سے اوپر تک غلط ہے، جو ذمے داری آتی ہے اسے پورا کروں اور ان صفحات میں جس بات کے کہنے کی میں تھوڑی سی کوشش کرتا رہا تھا، وہ اب ایک تجلی کی صورت میں میرے اوپر وارد ہوئی ہے اور اس کی سچائی مجھے بے چین کیے دے رہی ہے . . .[1]" اس سلسلے میں انھوں نے ماہرین تعلیم کے غور و فکر کے لیے دو تجویزیں بھی

۱- Educational Reconstruction، ہندستانی تعلیمی سنگھ، سیواگرام، ۱۹۵۰ء (طبع پنجم)، صفحات ۲۸-۲۶

پیش کی تھیں اور یہ کہا تھا کہ رائج تعلیمی نظام سے متعلق وہ اپنے خیالات کو اس غور وفکر کے عمل میں خلل انداز نہ ہونے دیں۔[1]

۲۲، اکتوبر ۱۹۳۷ء کو وردھا میں گاندھی جی کے ایما پر نئی تعلیم سے متعلق ان کی تجویزوں پر غور کرنے کے لیے جو دیہی علاقوں کے لیے مفت، لازمی اور خود کفیل تعلیم سے متعلق تھی، ایک آل انڈیا نیشنل ایجوکیشن کانفرنس منعقد کی گئی جس میں تعلیم کے ماہرین اور کانگریسی وزیر شریک ہوئے۔ شریک ہونے والوں میں ذاکر صاحب بھی تھے۔[2] گاندھی جی نے افتتاحی تقریر کی اور وہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک، باوجود علالت اور کمزوری کے، بولتے رہے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے اپنے تعلیمی خیالات کی وضاحت کی اور کہا کہ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کی سطح تک تعلیم کا ایسا انتظام ہو جس میں ایک حرفے کی تعلیم ضرور شامل ہو۔ ابتدائی تعلیم کے لیے عام طور سے چار سال کی جو مدت رکھی گئی ہے، وہ بہت کم ہے۔ اسے بڑھا کر سات سال کر دینا چاہیے اور ابتدائی تعلیم میں ثانوی تعلیم شامل کر کے پوری مدت کے لیے ایک مربوط نصاب بنانا چاہیے، اس طرح تعلیم سے فارغ ہونے پر لڑکے کی معلومات قریب قریب اتنی ہوں جتنی کہ اس وقت میٹریکولیشن کے لیے درکار ہے، مگر یہ تعلیم خالی کتاب کے ذریعے سے نہ دینا چاہیے جیسے کہ آج کل ہوتا ہے، بلکہ نصاب کا مرکز کسی دستکاری/حرفے کو بنانا اور باقی تمام مضمون اسی کے ضمن میں پڑھانا چاہیے۔ گاندھی جی نے دیہی دستکاروں کی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ ہندستان کے دیہاتوں میں ہر جگہ اب بھی بہت سی صنعتیں نیم جان یا انتہائی پستی کی حالت میں موجود ہیں جن کی تعلیم دی جاسکتی ہے اور ان کی

۱۔ ایضاً۔

۲۔ اس کانفرنس کے منتظم شری شریمن نرائن تھے۔ انھوں نے غالباً ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد مجیب صاحب کو بتایا تھا کہ شروع میں مدعوین کی فہرست میں ذاکر صاحب کا نام نہیں تھا، لیکن بعد میں ان کی تجویز پر آپ کا اور ان کے ساتھ عابد صاحب اور مجیب صاحب کا نام اس میں شامل کیا گیا۔ (محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی صفحہ ۱۰۱)

اور چند تو ایسی چیزیں ہیں جو ہر وقت اور ہر جگہ کام آ سکتی ہیں اور اس کے دھندے ایسے ہیں کہ اس کو مرکز بنا کر تاریخ، معاشیات، ریاضی، جغرافیہ جیسے علم آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے اپنی اسکیم کے ضمن میں دوسری بات یہ کہی کہ اس کے مطابق جو مدرسے کھولے جائیں وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں یعنی حرفے کی تعلیم سے اتنا مال پیدا ہو کر اسے بیچنے سے ان کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ ہندستان جیسے غریب ملک میں تعلیم عام کرنے کا اور کوئی طریقہ ہے ہی نہیں۔ ہمارے وزیر اگر اس فکر میں رہے کہ آمدنی بڑھے تو تعلیم پھیلائیں، تو پھر تو انھیں بہت انتظار کرنا ہوگا۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعے سے نہیں ہوتی، ہاتھ کے کام سے ہوتی ہے۔ خالی دماغ سے کام لینا آدمی کی صفت نہیں ہے، شیطان کی صفت ہے۔ تعلیم کے معاملے میں ہم یورپ کی نقل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہاں گولے بارود کا راج ہے، اور روس بھی ہمارے لیے کوئی مثال نہیں اس لیے کہ ہم اہنسا کو مانتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے، لیکن ان کی دولت دوسری قوموں کا خون چوس کر حاصل کی جاتی ہے۔ ہمیں تو ایسی تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو ہماری معاشی حالت اور اخلاقی عقیدوں کے لیے مناسب ہوں۔

گاندھی جی نے اپنی تقریر ختم کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی رائے دیں، لیکن کانفرنس والوں پر اتنا اثر تھا اور عقیدت کے بوجھ سے وہ سب اس قدر دبے جا رہے تھے کہ کسی میں نظریں اٹھانے کا یارا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اتنے میں ذاکر صاحب ادھر اُدھر دیکھ کر اس طرح کھڑے ہوئے جیسے کہ وہ یا تو کسی چیلنج کا جواب دیں گے یا اُسے قبول کر لیں

۱۔ Educational Reconstruction، صفحات ۵۳-۴۵۔ اس کتاب میں وردھا کانفرنس کی مفصل روداد شامل ہے جو دلچسپ ہے۔ کانفرنس میں مجیب صاحب بھی شریک تھے۔ انھوں نے واپس آکر "وردھا کی تعلیمی کانفرنس" کے عنوان سے رسالہ جامعہ (دسمبر ۱۹۳۷ء) کے لیے ایک مضمون لکھا تھا۔ یہاں اس مضمون سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

گئے، اور ہوا یہی کہ انھوں نے چیلنج قبول کر لیا۔ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک نئی صورت دے رہے ہیں، صحیح نہیں ہے، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اسے صرف وہی لوگ پسند کریں گے جو اہنسا اور دیہی تہذیب پر یقین رکھتے ہیں۔ جو لوگ تعلیم کا کام کر رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بچی تعلیم صرف کام کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے، اور یہ کہ مختلف مضامین ہاتھ کے کام کے ذریعے پڑھائے جا سکتے ہیں، اس سے بحث نہیں کہ کوئی دیہی تہذیب کو مانتا ہے یا شہری تہذیب کو، عدم تشدد کو مانتا ہے یا تشدد کو، ہم جو معلم ہیں اس راز سے واقف ہیں کہ تیرہ برس کی عمر تک بچے چیزوں کو بنانے، بگاڑنے، توڑنے اور جوڑنے کا رجحان رکھتے ہیں اور یہی چاہتے بھی ہیں۔ فطرت اسی طرح اُن کی تربیت کرتی ہے۔ بچوں سے یہ کہنا کہ وہ کتاب لے کر ایک جگہ بیٹھ جائیں، اُن کے ساتھ تشدد کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے تعلیم کا کام کرنے والے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ تعلیم کے کام میں ہاتھ کے کسی کام کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ امریکہ میں اس کو پروجیکٹ میتھڈ (Project Method) اور روس میں کومپلیکس میتھڈ (Complex Method) کہتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے۔ تکلی کے ذریعے ہر علم نہیں سکھایا جا سکتا۔ تو کیا ہم انھیں نظر انداز کر دیں گے! نہیں، ہم دوسری دستکاریوں کے ذریعے وہ مضامین بچوں کو پڑھائیں گے۔

جہاں تک تعلیم کو خود کفیل بنانے کا تعلق تھا، ذاکر صاحب نے بتایا کہ یہ تجربہ ناکام ہو چکا ہے، امریکہ میں پروفیسر ڈیوی کا بھی ایسا ہی ایک منصوبہ تھا لیکن چند سال بعد انھیں اپنا اسکول بند کرنا پڑا۔ امریکہ مال دار ملک ہے۔ وہاں سرمایے کی کمی نہیں اور سرکاری امداد بھی وافر مل سکتی ہے، جب وہاں یہ تجربہ ناکام رہا تو ہمارے ملک میں جو غریب ہے یہ کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ ملک کے غریب ہونے کی وجہ سے زور دیں گے کہ ہمارے مدرسوں کا خود کفیل ہونا نہایت ضروری ہے۔ صحیح، لیکن یاد رکھیے کہ اس میں ایک خطرہ ہے، اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ معلم غلاموں کو ہانکنے والے

افسروں کی حیثیت اختیار کرلیں اور غریب بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں۔ ایسی صورت میں تو تکلی کتایوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگی' اور ہم اپنے ملک میں آپ ایک نئے روپ میں غلامی کی بنیاد ڈال رہے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ حکومت عام اور لازمی تعلیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی، اگر وہ اس کی ہمت کرے بھی تو جلد ہی اس کا دیوالہ نکل جائے گا' لیکن یہ صورت یقیناً قوم کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کرنے کے مقابلے میں لائق ترجیح ہوگی۔ تعلیم کی اس اسکیم کو ہم نافذ کریں تو اُن خطروں کی طرف سے ہوشیار رہیں جو اس کے نفاذ کے ساتھ وابستہ ہیں۔[1]

ذاکر صاحب کی تقریر کے بعد اور کئی تقریریں ہوئیں جن میں گاندھی جی سے عقیدت کا اظہار زیادہ تھا اور تعلیمی اقدار کا ذکر بہت کم' اور ذاکر صاحب کی باتوں کو لوگوں نے اس جوشِ عقیدت میں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی' ایک کے، ٹی، شاہ تھے جنھوں نے ذاکر صاحب کے موقف کی ایک حد تک تائید کی۔ نیز اپنے سوشلسٹ خیالات کے مطابق اور باتوں کے علاوہ اس پر زور دیا کہ حکومت کو ہی تعلیم کا سارا بوجھ اٹھانا چاہیے۔ لیکن ان کے "دخل در معقولات" پر گاندھی بھگتوں نے انھیں بھی تیز نظروں سے دیکھا۔ کوئی چوبیس سال بعد ذاکر صاحب نے جب وہ بہار کے گورنر تھے، بہار بیسک ٹیچرز کانفرنس (۱۹۶۱ء) میں اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے ان باتوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: "مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ دن جب انھوں (گاندھی جی) نے سیواگرام میں راشٹریہ شکشا سمیلن بلایا تھا، ۱۹۳۷ء میں، ٹھیک اس وقت جب ایسا لگ رہا تھا کہ راشٹریہ جیون پر ادھیکار جنتا کو ملنے والا ہے۔ شاسن کی باگ ہاتھ میں آنے والی ہے۔ وہ جو ایک بے کس بے بس سی جنتا کو محبت کی مار اور ہمت کی پچکار دے دے کر اس ادھیکار کی چوکھٹ تک لے آیا تھا' اسے اب یہ چنتا تھی کہ یہ ادھیکار برتا کیسے جائے گا' اچھائی کے لیے یا بُرائی کے لیے، اچھا سماج بنانے کے لیے

۱۔ Educational Reconstruction ' صفحات ۵۵۔۳۵

۲۔ ایضاً' صفحات ۵۸۔۵۵

یا بُرا ساج۔ اور اس کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ اچھے جیون کی نیو اچھی شکشا ہی پر سیدھی رکھی جا سکے گی۔ اس لئے وہ بیمار تھے، بہت کمزور ہو گئے تھے، ان کی ہر بات سے ایسا لگتا تھا کہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنا کام کر چکا۔ آزادی کے دروازے تک قوم کو پہنچا دیا۔ اب انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر جانا ہے، ان کو وہ گُر بتاتے جاؤ جس سے یہ اپنا کٹھن کام ٹھیک کر پائیں۔ ایسا سمجھ کر انھوں نے بنیادی شکشا کی دین ہمیں دی تھی، اپنی سب سے بڑی اور آخری دین سمجھ کر۔ دوستو، یہ بھولنے کی بات نہیں ہے۔

"ہاں یہ ضرور یاد رکھنے کی بات ہے، لیکن ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اور میں بس اس کارن بنیادی شکشا کو جنتا کے لیے اچھا اور ضروری مان لیں کہ گاندھی جی نے ایسا کہا تھا۔ خالی بھروسے پر مان لیں، شردھا کے کارن مان لیں، ایسا بے شک ہو سکتا ہے، ہوتا بھی آیا ہے اور دنیا میں بڑے بڑے کام شردھا سے ہوئے بھی ہیں، پر جو کام ہزاروں نہیں لاکھوں کام کرنے والوں پر پھیلنے والا ہو اسے خالی شردھا کے سہارے چلانے کی کوشش سپھل نہیں ہوتی۔ وہاں شردھا کے ساتھ سوجھ بوجھ اور سمجھ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

"میں آپ کو اپنا ہی قصہ کیوں نہ سُنا دوں۔ جب ۱۹۳۷ء کے اس راشٹریہ شکشا سمیلن میں جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں، میں بھی بلایا گیا اور وہاں گاندھی جی نے دھیمی دھیمی آواز میں اپنی بات کہی اور پھر لوگوں سے اس پر چرچا کرنے کو کہا تو سورگیہ کے۔ ٹی۔ شاہ نے کچھ باتیں ورودھ میں کہیں تو گاندھی بھگتوں کو یہ بات بہت بُری لگی اور انھوں نے بس یہی کہا کہ یہ گاندھی جی کا سجھاؤ ہے، ہمیں شردھا سے اسے ماننا چاہیے۔ بے شردھا کے یہ کام ہونے والا نہیں ہے۔ تو مجھے بھی جسے گاندھی جی کا سجھاؤ جی سے پسند تھا، یہ بات اچھی نہیں لگی، اور میں نے ان بھگتوں کو سمجھایا کہ ایسا نہیں کہ بات ایک گاندھی جی نے ہی کہی ہے، شکشا پر سوچنے والے بہت سے مدت سے اس ڈھنگ سے سوچتے رہے ہیں، کہیں کہیں کچھ کام بھی ہوا ہے، اسے سمجھنے اور پرکھنے میں لابھ ہی لابھ ہے، ورودھ کرنے والے کا مُنہ بند نہیں کرنا چاہیے، یا ان کی بات ماننی

چاہیے یا ان کا ٹھیک جواب دینا چاہیے' تو وہ لوگ جو میرے بڑے دوست تھے مجھ سے بھی کچھ بگڑے اور شاید سمجھا کر یہ بھی اُدھر یک ہے! میں نے کہا بھی کر ایسا لگتا ہے کہ وشواس سبھا میں میں ہی ایک بے وشواس ہوں۔ گاندھی جی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلی' پر وہ چُپ رہے۔ شام کو جب انھوں نے اپنے وچاروں کو پھیلا کر لکھنے اور اس پر رپورٹ دینے کے لیے ایک کمیٹی کے نام بھیجے تو مجھے اس کا ادھیکش بنا دیا اور مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ انھوں نے اس لیے کیا کہ میں نے سترودھا میں اپنی سمجھ کو گروی رکھنا ضروری نہیں جانا تھا۔ میں نے بہت بڑے آدمی دیکھے ہیں' پر میں نے ان میں کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بات پر ساتھی کیا چیلنے کی پوچھ گچھ' سوال جواب' جانچ پڑتال سے اتنا خوش ہوتا ہو جتنے گاندھی جی ہوتے تھے۔ جبھی تو لوگ ان سے لڑنے جاتے تھے اور ان کے کہے جانیں دینے کو تیار ہو جاتے تھے...

"ایک قصہ اور سُن لو' جب ہماری اس راشٹریہ شکشا سمتی نے اپنی رپورٹ لکھ کر پہلے پہل گاندھی جی کو دکھائی تو میں سمجھتا ہوں انھوں نے اس میں دو تین شبدوں سے زیادہ نہیں بدلے۔ پر یہ کہا کہ سات سال کی شکشا کا پورا پورا کاریہ کرم بنا کر اس کے ساتھ لگاؤ۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف سے کہا کہ ہم سے یہ ٹھیک نہ بنے گا۔ ہم میں سے کسی نے یہ سات سال کا پورا کام نہیں چلایا ہے۔ بولے' یہ تو کسی اور نے بھی نہیں کیا ہے اور کاریہ کرم کسی کو تو بنانا ہی ہوگا۔ تم اگر اس نئی شکشا کے مولیوں کو سمجھ گئے ہو تو تم ہی کیوں نہ بناؤ۔ ہم نے جیسے تیسے ان کا کام پورا کیا۔ رپورٹ کے ساتھ سات سال کا Syllabus بھی دیا۔ باپو کی چترائی کا پتا مجھے بعد کو لگا۔ ہماری اس کمیٹی نے تو اپنا سارا کام ۱۶۰۰ روپے سے کم کے خرچ میں کر ڈالا تھا جس میں وردھا اور دہلی کے بیچ تیسرے درجے کے ریل کے سفر کا خرچہ بھی شامل تھا! ہماری اس رپورٹ پر وچار کرنے کے لیے بھن بھن سرکاروں نے جو کمیٹیاں بنائیں ان پر ایک ایک پر لاکھوں کا خرچ ہوا۔ عجب نہیں کہ اس کا خرچ اکٹھا کیا جائے تو پچیس تیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ جائے۔ میں بھی ان میں سے کئی کمیٹیوں میں بلایا گیا۔ ہماری

رپورٹ کی کوئی بات نہیں تھی جس پر گھنٹوں، دنوں ودوانوں اور شکشا شاستریوں سے بحثیں نہ ہوتی ہوں۔ ہفتوں مہینوں میں جاکر سہمت ہونے کی نوبت آتی تھی۔ رپورٹ لکھی جاتی تھی، ہزار اونچ نیچ اس میں دکھائے جاتے تھے، جب سلیبس بنانے کی بات نکلتی تھی تو ہمارا بنایا ہوا سلیبس شبد شبد نقل کر دیا جاتا تھا۔ اس بکھیڑے میں پڑنے کی کسی کو فرصت کہاں ہوتی تھی![1]"

وردھا کی راشٹریہ شکشا سمیلن میں گاندھی جی کے خیالات کی روشنی میں ذاکر حسین کمیٹی کی مندرجہ ذیل تجویزوں کو منظور کیا گیا تھا۔ ان تجویزوں کو ذاکر صاحب نے اپنی شخصیت کے جادو سے کمیٹی کے دوسرے اراکین کو رام کر کے جدید انداز میں مرتب کیا تھا۔ تجویزیں یہ تھیں:

۱۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ پورے ملک میں سات سال تک تعلیم مفت اور لازمی تعلیم کے طور پر رائج کی جائے

۲۔ اس کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔

۳۔ یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس پوری مدت میں تعلیم کا محور کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ کا نفع بخش کام ہونا چاہیے اور دوسری تمام استعدادوں کی نشو و نما یا تربیت دینے کا سب کام، جہاں تک ممکن ہو، کسی ایسے خاص حرفے سے مربوط ہو جسے بچے کے ماحول کے مطابق منتخب کیا گیا ہو۔

۴۔ کانفرنس کو یہ تسلیم ہے کہ یہ نظام تعلیم رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائے گا کہ استادوں کی تنخواہوں کا خرچ خود نکال لے[2]

ذاکر صاحب کی صدارت میں جب نصاب کمیٹی نے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، گاندھی جی

۱۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر کا پورا مسودہ ان کے اپنے خط میں ہمارے سامنے ہے۔

۲۔ Educational Reconstruction، صفحات ۹۶ - ۹۸

کے خیالات کو تعلیمی تصورات اور جانی پہچانی تعلیمی اصطلاحوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کی معنویت کو اجاگر کیا اور اس طرح ایک تعلیمی صناع کی تراش خراش کے بعد (جب) وہ اس شکل میں قوم کے سامنے آئی تو فنی نقطۂ نظر سے اس پر جو بنیادی اعتراض کیے جا رہے تھے وہ بڑی حد تک بند ہوگئے، لیکن بعض اعتراض باوجود اس تمام کوشش کے جاری رہے... ان میں ایک اعتراض یہ تھا... کہ اس میں ہاتھ کے کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اس کو ابتدائی تعلیم کے ایوان میں مقام اعزاز دیا گیا تو مدرسے کارخانے بن کر رہ جائیں گے۔ تعلیم کے حقیقی اصولوں اور مقصدوں کو اسکیم کے اقتصادی اغراض پر قربان کردیا جائے گا، بچوں کی ذہنی تربیت ناممکن ہوجائے گی اور ہمارا نیا نظام تعلیم اقبال اور ٹیگور جیسے افراد پیدا نہ کرسکے گا۔[1] گاندھی جی کی نظر میں ہندستان کے وہ بے شمار گاؤں تھے جن میں ملک کی پوری آبادی کا کوئی اسّی فیصدی سے زیادہ حصہ رہتا تھا، اور انھیں میں تعلیم کی اشاعت کسی دیہی دستکاری کو محور بناکر کرنا مقصود تھا۔ تعلیم سے ان کی مُراد دیہی دستکاریوں کو سائنٹیفک ڈھنگ پر اختیار کیے جانے والے پیشوں کی ٹریننگ تھی، اور چونکہ دیہی قومی تعلیم کو خودکفیل ہونا تھا اس لیے حصول علم اصل مقصد نہ تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بنیادی تعلیم کی اسکیم کو ایک جدید نظام تعلیم تصور کرتے تھے۔ وہ شہری تہذیب میں بھی اسی طرح کھپ سکتی تھی جیسے دیہی تہذیب میں۔ ذاکر صاحب کو گاندھی جی سے عقیدت تھی اور اُن کا ذہن جدید تھا، بنیادی قومی تعلیم کے منصوبے کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں رائیں مختلف تھیں، ذاکر صاحب معاملے کی نزاکت کو سمجھتے تھے اور یہ انھیں کے تدبر کا اعجاز تھا کہ بنیادی قومی تعلیم کی کوئی بھی تعبیر اپنی کوئی مخصوص شکل اختیار نہ کرسکی، لیکن لوگوں کی ذہنی اُلجھنیں پھر بھی باقی رہیں۔

اس کا امکان تھا کہ اگر کانگریس کے تری پورہ اجلاس (۱۹۳۸ء) میں بنیادی

۱۔ غلام السیدین، 'آندھی میں چراغ'، انڈین اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۸۹۔ خواجہ غلام السیدین بنیادی قومی تعلیم کا نصاب تیار کرنے والی کمیٹی کے ممبر تھے۔

قومی تعلیم کی اسکیم کو باضابطہ منظور اور اختیار نہ کر لیا گیا ہوتا تو کانگریسی صوبوں کی بعض وزارتیں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے رد کر دیتیں، اور بعض التوا میں ڈال دیتیں۔ کانگریس کی منظوری کے بعد اب اس کی حیثیت ایک تعلیمی تحریک کی سی ہو گئی جس کو ماننا اور عمل میں لانا کانگریسی وزارتوں کی ذمّے داری تھی۔ اب یہ اسکیم قومیت کی علامت تھی۔ ذاکر صاحب اسکیم کے مصنف تھے، اس لیے انھیں مشورے اور بعض باتوں کی تشریح کے لیے موقع بے موقع ہر جگہ بلایا جاتا تھا۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کی سب کمیٹی ہو، صوبائی حکومتوں کی وزارت تعلیم اور محکمۂ تعلیم یا مشورہ طلب کرنے اور وضاحت چاہنے والوں کی ملاقاتیں، ذاکر صاحب ہر جگہ بنیادی قومی تعلیم کے مقاصد، اصولوں اور طریقۂ کار کی تشریح کرتے اور اپنے آپ کو خوب تھکاتے، صرف اس خیال سے کہ بنیادی تعلیم کا یہ تجربہ وسیع پیمانے پر کامیاب ہو جائے تو ایک بڑا قومی تعمیری کام انجام پا جائے۔

سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کی سب کمیٹی نے اور آگے چل کر خود بورڈ نے ذاکر صاحب کی پیش کی ہوئی بنیادی تعلیم کی اسکیم کو منظور کر لیا، مگر اس نے کچھ سوالات بھی اُٹھائے اور بنیادی تعلیم کی مدت میں بھی کچھ ردوبدل کیا۔[۱] انگریزی زبان سیکھنے کا مسئلہ بھی اہم تھا اور اس کے لیے بھی کوئی صورت پیدا کرنی تھی، اور خود ذاکر صاحب نے "یہ بات یقیناً محسوس کی ہوگی کہ انگریزی زبان کا سرے سے اخراج ایسی بات تھی جس پر اصرار کرنا دانشمندی نہیں ہے۔"[۱] ذاکر صاحب نے کوشش کی کہ اعتراضات و سوالات کا جواب دیں۔ ان کی یہ کوشش مختلف تقریروں اور تحریروں میں پھیلی ہوئی ہے۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ وردھا کی تعلیمی اسکیم کے بنیادی اصول معقول، ناقابلِ اعتراض اور صحیح تعلیمی فکر پر مبنی تھے۔

مارچ ۱۹۳۸ء کے رسالہ جامعہ میں ان کا ایک مضمون چھپا تھا، اس میں انھوں نے چند ایسے اعتراضوں کا جواب دیا تھا جو ان کے نزدیک واقعی تعلیمی نوعیت کے

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۱۱۱

تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بنیادی تعلیم کی رپورٹ کو بہت کم لوگوں نے پڑھا تھا، اسی لیے تعلیمی نقطۂ نظر سے تنقید کے بجائے شبہات کا اظہار زیادہ کیا جاتا تھا۔ اور بعض اعتراضوں کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ وہ محض اس لیے تھے کہ چونکہ "گاندھی جی نے حسبِ معمول سونے والوں کو ٹھنڈے پانی سے چھینٹے دے کر جگا دیا ہے (اس لیے) ان لوگوں کو جو شکایت ہے وہ اصل میں پانی سے نہیں بلکہ پانی پھینکنے والے سے ہے۔"[1] دستکاری کے ذریعے تعلیم دینے کی تجویز چونکہ گاندھی جی نے پیش کی تھی، اس لیے "جدیدیت" اور "ترقی پسندی" کے فریب میں مبتلا نقاد اسے طرح طرح کے معنی پہناتے تھے۔ ذاکر صاحب نے ایسے نقادوں سے کہا تھا کہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ تجویز کس کی طرف سے آئی ہے، بلکہ خود تجویز کو دیکھیں اور اس پر غور کریں۔ "باوجود قدامت پسند ہونے کے کبھی کبھی گاندھی جی 'جدید' چیزوں کی حمایت کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں۔ بچوں کو دستکاری یعنی باضابطہ اور بامقصد عمل کے ذریعے سے تعلیم دینا اصل میں کوئی جدید چیز نہیں، بلکہ بہت قدیم چیز ہے۔ ابتدا سے تعلیم اسی ڈھرّے پر چلتی رہی ہے۔ انفعالی کتابی تعلیم نوعِ انسانی کی تاریخ کا ایک ضمنی اور مختصر دَور ہے۔ تعلیم کے اصل اصول کو لوگ تھوڑے دنوں کے لیے بھول گئے تھے، اور اب وہ رفتہ رفتہ انھیں یاد آرہا ہے۔ تمام دنیا کے ترقی پسند مدرسوں میں اس پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کو جو ہندستان میں رائج ہے، دُنیا دقیانوسی اور فرسودہ سمجھ کر چھوڑ رہی ہے۔ گاندھی جی کی جدتِ فکر ہمارے جدت پسندوں سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ اگر یہ حضرات جو دورِ حاضر کے پرستار ہیں، جدید خیالات اور رجحانات سے واقف ہوتے تو وہ گاندھی جی کی وسعتِ نظر کی داد دیتے اور ان پر یہ شبہہ نہ کرتے کہ وہ انھیں اپنا عہدِ زرّیں کا تخیل قبول کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"[2]

۱۔ ذاکر حسین، "وردھا کی تعلیمی اسکیم"، جامعہ (مارچ ۱۹۳۸ء)، صفحہ ۲۲۵۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۶

وردھا کی تعلیمی اسکیم میں "تہذیبی تعلیم" کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، مفید دستکاری پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے، یہ تو محض مکانکی کام ہو کر رہ جائے گا' یہ تو بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بدترین صورت ہے، یہ کیا بات ہوئی کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے، ان تمام اعتراضوں کا جواب ذاکر صاحب نے اپنے اس مضمون میں دیا ہے اور ان اندیشوں اور خطروں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں جن کا اظہار کیا جا رہا تھا' اور لکھا ہے کہ "اگر ہمارے نقاد رپورٹ کو زیادہ غور سے پڑھتے تو وہ ہم پر یہ الزام نہ رکھتے کہ رپورٹ لکھنے والوں نے ان چیزوں سے لاپروائی برتی ہے۔ باوجود ان سب خطروں کے ہمیں یہ گوارا نہ ہوا کہ ان سے ڈر کر ہم اس طریقے کو چھوڑ دیں جس کے سوا بچوں کی تعلیم کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ خطرے ہر کام میں ہوتے ہیں اور انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسی سلامتی چاہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، اگرچہ اس میں بھی شبہہ ہے کہ اس طرح ہم سلامت رہ سکیں گے۔"[1]

وردھا کی تعلیمی اسکیم کے خلاف مسلم حلقوں میں جو ردِ عمل تھا' وہ محض سیاسی تھا' کسی کو اس کی فکر نہ تھی کہ وہ اس اسکیم کو فنی نقطۂ نظر سے جانچے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے شدید سیاسی اختلافات کے سبب مسلم معاشرے کی سیاسی فضا بڑی جذباتیت سے معمور تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ تھا کہ اس تعلیمی اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی، غضب یہ ہوا کہ سی، پی کے وزیر اعلا پنڈت روی شنکر شکلا نے خواہ مخواہ اپنے قائم کیے ہوئے اسکولوں کو 'ودیا مندر' کے نام سے موسوم کیا اور کہا کہ ودیا مندر اسکیم" مہاتما جی کی اسکیم کی متبادل نہیں بلکہ ان کی اسکیم کو شروع کرنے کے لیے زمین تیار کرنے کی خاطر ہے"[2] لیکن چونکہ لفظ 'مندر' ہندو کلچر کے

۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۸

۲۔ Educational Reconstruction، صفحہ ۸۰۔ اس کتاب میں ودیا مندر اسکیم کی وضاحت جو پنڈت شکلا کی طرف سے ہے، صفحات ۸۰۔۸۷، پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ایک مذہبی پہلو کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس لیے مسلمانوں کے فرقہ پرست سیاسی حلقوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے بنیادی قومی تعلیم ہی کے مسلم دشمن ہونے کا اعلان کردیا حالانکہ اس میں نہ صرف یہ کہ تعلیمات اسلامی کے خلاف کوئی چیز نہ تھی، بلکہ بقول مجیب صاحب "اگر (وہ لوگ جو اسے مسلم دشمن قرار دیتے تھے) اس کے نصاب پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرماتے تو دیکھتے کہ اسلام کی تعلیمات کو جتنا نمایاں مقام اس نصاب میں دیا گیا تھا، اتنا ابتدائی درجوں کے کسی دوسرے نصاب میں نہیں دیا گیا تھا، مگر یہ زحمت گوارا کرنے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔"[۱]

اب رہا یہ اعتراض کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی، تو ہمارا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کے تصور قومیت کے مطابق ہندستان جیسے ملک میں جو مختلف مذہبوں اور ثقافتوں کا گہوارہ تھا، ایک خاص عمر کے بچوں کے لیے جبری تعلیم کی کسی ایسی سرکاری اسکیم میں مذہبی تعلیم کی گنجایش نہ تو ممکن تھی اور نہ مناسب۔ اور سیاسی فرقہ واریت کے تقاضوں کو الگ رکھ کر، کوئی شخص اگر غیر جانب داری سے غور کرے تو وہ ذاکر صاحب کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کا ضرور قائل ہو جائے گا۔ اگر اصولاً یہ بات مان لی گئی ہوتی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کی ذمّے داری ہے تو مسلمان بچّوں کو دیہی علاقوں کے اسکولوں میں اسلام کی تعلیم دینے والے معلم نہ ملتے، اور اگر مل بھی جاتے تو وہ مسلمان ہونے سے زیادہ سرکاری ملازم ہوتے جن کے ہاتھ میں بقول ذاکر صاحب شاید اسلام محفوظ نہ ہوتا۔[۲] لیکن اس وقت کے ماحول میں جہاں مسلم لیگ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش میں مصروف تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے والے مسلمانوں پر اگر بھروسا کیا گیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے، بدقسمتی سے ذاکر صاحب کی بصیرت اور دور اندیشی کو ایک فریب تصور کیا گیا۔

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین ــ اے بایوگرافی، صفحہ ۱۱۲

۲۔ ایضاً

تعجب ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے بڑے عالم جو صاحب فکر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نظر بھی تھے، اس بات کی معقولیت کی قدر نہ کر سکے۔ سید صاحب مرحوم ذاکر صاحب کے بزرگ دوستوں میں تھے اور ان کے خلوص کی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے معارف (جولائی ۱۹۳۸ء) کے شذرات میں لکھا تھا کہ "ابتدائی تعلیم کی جو اسکیم وردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے، اس پر غور کرنے کے لیے شملہ میں ایک مرکزی کمیٹی بیٹھی تھی، اس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اعتراضوں کا جواب دیا جو اس اسکیم پر کیے جاتے ہیں، اسی سلسلے میں انھوں نے ایک فقرہ یہ بھی کہا: 'اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی گنجایش پوری رکھی گئی ہے، جس کا انتظام نہایت غور کے بعد طے کیا گیا ہے کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ ہو اور ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کرے۔ (ملت، دہلی)'۔ ہم کو اس اسکیم کے بانیوں کی اس کشادہ دلی سے بڑی خوشی ہوئی، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کی اہمیت تعلیم میں کیا رہ جاتی ہے! پھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس خارج از اوقات تعلیم کے مصارف کا بار کون اٹھائے گا۔ آخر اس دنیا میں دین کا یہ اچھوت پن کب تک قائم رہے گا۔"

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی اس وقت تعلیمی کم اور سیاسی زیادہ ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے اپنے دفتر میں وردھا اسکیم پر غور و فکر کے لیے ماہرین تعلیم کی ایک میٹنگ منعقد کی (اگست ۱۹۳۸ء) جس میں ذاکر صاحب بھی شریک تھے۔ "اسکیم کے خلاف جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے، اور اس کا بڑا سبب زبان سے متعلق یو۔پی، بہار اور سی۔پی کی حکومتوں کی پالیسی، سی۔پی میں پنڈت آر۔ایس۔ شکلا کے قائم کیے ہوئے ودیا مندر اور یہ عام شبہہ تھا کہ اکثریتی فرقہ مکمل طور پر سیکولر نظام تعلیم نافذ کر کے مسلمانوں کے تمدن کو مٹا دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔"[1]

۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۱۳

ذاکر صاحب کی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے کانفرنس کی اس کمیٹی سے یہ سفارش کرالی کہ وردھا اسکیم کے بنیادی اصول تسلیم کر لیے جائیں۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا اور اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے مذکورہ سفارش اپنی تنقیدی تقریر کے ساتھ پیش کی[۱]۔ انھوں نے اس عام اعتراض کو بھی دہرایا کہ وردھا اسکیم کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مذہبی تعلیم کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے[۲]۔ کانفرنس کے اجلاس میں جس وقت اس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی، بے انتہا ہنگامہ ہوا اور سیاسی نعرہ بازوں نے کھلی بیہودگی کا مظاہرہ کیا، بہرحال اکثریت سے کمیٹی کی سفارش منظور ہوگئی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پر ۱۹۳۸ء میں جب کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشاکش زوروں پر تھی، ایسے عناصر کا غلبہ تھا جو ملک کے تعمیری و تعلیمی کاموں کو بھی مسلم لیگی سیاست کی عینک سے دیکھتے تھے۔ یہ عناصر اور ان کے نمایندے ذاکر صاحب جیسے مخلص ماہر تعلیم کو بھی جسے مسلمانوں کی تعلیم سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ جس نے اپنی ساری توانائیاں اس کے لیے وقف کر رکھی تھیں، مطعون کرنے سے باز نہیں رہتے تھے، اور بقول رشید احمد صدیقی "وردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں اُن کو (ذاکر صاحب کو) جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے[۳]"۔ لیکن ان کی "بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب" کا اندازہ کیجیے کہ انھوں نے کانفرنس کی کمال یار جنگ کمیٹی کی جو وردھا اسکیم پر مفصل رپورٹ مرتب کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی، ہر طرح مدد کی جب بھی کمال یار جنگ ان سے مدد کے خواستگار ہوئے، اور یو۔پی گورنمنٹ کے سامنے کانفرنس کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں بھی ان کا سہارا بنے رہے[۴]۔

۱۔ اجلاس میں ذاکر صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں بمبئی میں مقیم تھے۔

۲۔ محمد امین زبیری، ضیائے حیات، کراچی، تاریخ ندارد، صفحات ۲۷۷-۲۷۶

۳۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحہ ۲۴

۴۔ ایضاً۔

زبان سے متعلق یوپی، بہار اور سی۔پی کی کانگریسی وزارتوں نے جو پالیسی اور طریقۂ کار اپنایا تھا، وہ واقعی قومی نقطۂ نظر کے مطابق نہیں تھا، خود گاندھی جی اسے سخت ناپسند کرتے تھے اور اسی لیے اس زمانے کے ہریجن میں انھوں نے 'ہندستانی' کے حق میں بار بار لکھا۔ مسلمانوں کے اس اعتراض کا جواب کہ وردھا اسکیم کے ذریعے اُردو زبان کو ختم کرنے کا ارادہ ہے، ذاکر صاحب کے پاس غالباً یہ ہوگا کہ چونکہ بنیادی اسکول کے حلقے میں ایسے چھوٹے چھوٹے علاقے بھی ہوں گے جہاں بچوں کی مادری زبانیں مختلف ہوں گی، اس لیے ملک کے بڑے حصّے میں، خصوصاً شمالی ہندستان میں، فارسی اور دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی 'ہندستانی' کو فروغ دیا جائے جو انشاء اللہ خاں انشا کی رانی کیتکی کی مقبول عام زبان ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ذاکر صاحب کی پوزیشن اس سلسلے میں تھی بہت نازک، اس لیے کہ اُس 'پاک' اُردو کے لیے جس کی اس وقت شورانگیز حمایت کی جارہی تھی اور اس 'شدھ' ہندی کے لیے جسے بعض کانگریسی حکومتیں عارضی اقتدار سے فائدہ اُٹھاکر عام جنتا پر لادنا چاہتی تھیں، ذاکر صاحب تعلیم کے اس بنیادی اصول کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرسکتے تھے کہ ابتدائی مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونی چاہیے۔ اور شمالی ہندستان کے وسیع علاقے میں (جسے اب ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے) گانْو کی عام زبان نہ تو 'پاک' اُردو تھی اور نہ 'شدھ' ہندی۔

اس اعتراض کا جواب کہ جب وردھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لیے گنجائش نہ تھی تو انھوں نے اس کی تائید کیوں کی، تو وقت نے بڑی وضاحت سے دے دیا ہے، اور ہم پہلے اس طرف اشارہ کرچکے ہیں۔ ہندستان کے نظام تعلیم میں سرکاری طور پر مذہبی تعلیم کے انتظام میں کیسے کیسے خطرے ہوسکتے تھے، اس کا اندازہ آج ہم کو اس لیے اور بھی ہوتا ہے کہ سیکولر جمہوری ہندستان میں جہاں سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا کوئی نصاب مقرر نہیں ہے، کس طرح ایک خاص مذہب کے عقائد اور ثقافت کو مختلف نصابی کتابوں کے ذریعے پھیلانے کی کوشش کی گئی اور کی جارہی ہے۔ ذاکر صاحب اصولاً کسی ایسے ملک کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم کے سرکاری انتظام کو غلط سمجھتے تھے، جہاں

مختلف مذہب اور ثقافت کے لوگ رہتے ہوں، اور عملاً یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اسی لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان جن کے یہاں بچوں کی مذہبی تعلیم نہایت ضروری ہے، خود مذہبی تعلیم کا ایک آزاد نظام قائم کریں اور اسے محنت اور توجہ سے چلائیں[1]۔ لیکن اس وقت کی مخالفت تو زیادہ تر محض مخالفت کی خاطر تھی، چنانچہ ان کی اس مناسب تجویز پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ جامعہ کے کاموں کے ساتھ وردھا اکیم کے تعلیمی نکات کی تشریح و توضیح کی تھکا دینے والی ذمّے داریوں نے ذاکر صاحب کی صحت پر بُرا اثر ڈالا، اور جب آنکھ کی تکلیف کے دوبارہ عود کر آنے کا اندیشہ پیدا ہوا تو وہ علاج کے لیے جون ۱۹۳۹ء میں جرمنی چلے گئے۔ لیکن ابھی وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ستمبر کے شروع میں جنگ چھڑ گئی اور انھیں ہندستان واپس آنا پڑا۔ اپنی واپسی پر ذاکر صاحب نے دیکھا کہ بنیادی تعلیم کا تجربہ سخت آزمائش میں مبتلا ہے۔ اس کی خاص وجہ تو یہ تھی کہ کانگریسی حکومتیں اور نہ تعلیم کے ذمّے دار اسے دیانتداری سے آزمانے کے لیے تیار تھے، اور جب جنگ شروع ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد صوبوں کی کانگریسی حکومتوں نے استعفا دے دیا تو اس کے لیے اور بھی کڑی آزمائش کا دور شروع ہو گیا۔

کانگریس کے اس فیصلے کی وجہ کہ کانگریسی وزارتیں خود استعفا دے دیں، خواہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن ذاکر صاحب کو اس سے اختلاف تھا[2]۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ یہ بحث کی جائے کہ ان کے اختلاف کا سبب کیا تھا، اور اگر فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہوتا یا ان کے مشورے کے مطابق ہوتا تو وہ کن حالات میں کانگریسی وزارتوں کے مستعفی

۱۔ آج یو۔پی میں دینی تعلیمی کونسل اور دوسری ریاستوں میں دوسری تنظیموں کے تحت مکتب اور مدرسے چلائے جا رہے ہیں اور ان کے مفید نتیجے نکل رہے ہیں۔

۲۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۱۲۶

ہوجانے کو پسند کرتے۔ ایک افسوسناک نتیجہ اس طرح کانگریس کے صوبائی وزارتوں سے دستبردار ہوجانے کا یہ ہوا کہ فرقہ پرستی کو کھلی چھوٹ مل گئی جو آخر کار ملک کے اتحاد کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ اگر اِدھر ہندو فرقہ پرست جماعتوں نے اپنی صفیں درست کرنا شروع کیں تو اُدھر مسلم فرقہ پرستی نے مسلم لیگ کی قیادت میں دو قومی نظریے کی اشاعت کی رفتار تیز تر کر دی، اور سات صوبوں میں وزارت سے دستبردار ہونے کے سبب کانگریس، فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے جس مضبوط موقف میں تھی، اس سے محروم ہوگئی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا وہ ریزولیوشن[1] جس کی رو سے صوبوں میں کانگریس کی حکومتوں نے استعفا دیا تھا، اتنا پیچیدہ اور مبہم تھا کہ اُس سے ذاکر صاحب جیسے ذہین و حسّاس لوگوں کو یہ اطمینان بھی نصیب نہیں تھا کہ کانگریس کی قیادت نے اس مرحلے میں کوئی صاف راستہ دکھایا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے وزارتیں چھوڑ دینے کا یہ فیصلہ جلدی اور گھبراہٹ میں کیا تھا، اور اس کے نتائج قومی سیاست کے حق میں کچھ اچھے نہ نکلے۔ مجیب صاحب نے ایک واقعہ گاندھی جی سے متعلق بھی اسی نوعیت کا قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے ایک موقع یاد ہے جب اپریل ۱۹۴۲ء میں ہندستانی تعلیمی سنگھ کے سالانہ جلسے کے بعد ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ جنگ کی خبریں اور واقعات ہر شخص کے دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور گاندھی جی نے ان کے اثرات کے بارے میں جو ہندستان پر مرتب ہونے والے تھے، کوئی بیتالیس منٹ تک گفتگو کی۔ جب ہم اپنی جائے قیام کی طرف لَوٹ رہے تھے تو ذاکر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ گاندھی جی نے جو کچھ کہا

---

۱. اس سلسلے میں وردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ۸ تا ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ء اور ۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اجلاسوں کی کارروائی اور تجویزیں ساتھ ساتھ پڑھنی چاہییں۔

ہے، اس سے آپ کچھ سمجھے؟ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ انھوں نے بھی یہی کہا، اور پھر ایک لمبا سانس لے کر بولے: "خدا جانے اب کیا ہونے والا ہے" گاندھی جی اس وقت گہرے شک و شبہے اور سخت بے یقینی کی کیفیت میں تھے اور اُن کی گفتگو اُن کی داخلی اُلجھنوں کی پورے طور پر آئینہ دار تھی۔ اور یہ صورت تھی 'ہندستان چھوڑ دو' کی تحریک شروع کرنے کے فیصلے سے کچھ ہی پہلے۔"

(محمد مجیب، 'ڈاکٹر ذاکر حسین، اے بایوگرافی' صفحہ ۱۲۷، حاشیہ)

ذاکر صاحب ہندستانی تعلیمی سنگھ کے صدر تھے اور اسی حیثیت سے انھیں اس پر بھی نظر رکھنی پڑتی تھی کہ ملک میں بنیادی تعلیم کے کام کی رفتار کیا ہے، لیکن ۱۹۴۰ء سے لے کر جب لاہور میں پاکستان کے مطالبے کی تجویز پاس ہوئی، ۱۹۴۷ء تک جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی، ملک کی سیاست ایسے نشیب و فراز سے گزرتی رہی کہ اس سے ہر تعمیری کام متاثر ہوا۔ ۲۲-۲۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو ہندستانی تعلیمی سنگھ کی ایک میٹنگ پٹنہ میں ہوئی تھی۔ اس میں گاندھی جی اور ذاکر صاحب میں جو گفتگو ہوئی، وہ اس پوری صورت حال اور اُس وقت کی گاندھی جی اور ذاکر صاحب کی ذہنی کیفیت کی بڑی اچھی ترجمان ہے۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی کو جب یہ بتایا کہ "(مشکل یہ ہے کہ) ہمارے اسکولوں کے لڑکے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کے لیے فیکٹریوں اور ملوں کی طرف دیکھتے ہیں" تو گاندھی جی کو کچھ تعجب ہوا اور کچھ دُکھ بھی، اور انھوں نے کہا کہ "تم صحیح کہتے ہو، جب پوری فضا پر مل کا کپڑا چھایا ہوا ہے اور ہمارے وزیروں کو بھی ملیں قائم کرنے سے دلچسپی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب تو راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے عقیدے کے مطابق زندہ رہنے کے لیے جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں ... ہمیں وزیروں کو قائل کرنا چاہیے اور اپنی شکست تسلیم نہیں کرنی چاہیے۔ کانگریس نے تعلیمی سنگھ قائم کیا لیکن اس نے کبھی اس میں دلچسپی نہیں لی۔ یہی سلوک چرخہ سنگھ کے ساتھ بھی اس کا

رہا۔ آج ایسے اداروں اور کاموں کی کون پروا کرتا ہے۔ جب کانگریس والوں کے پاس پیسا کم تھا اور کچھ تجربہ تھا تو وہ تعمیری پروگراموں کی طرف بھی کچھ توجہ کرتے تھے، اور اس میں شبہہ نہیں کہ انھوں نے کچھ تعمیری کام کیے بھی۔ بہرحال، آج تو ان کے قبضے میں پوری حکومت ہے، اور ابھی اس اقتدار کو وہ ہضم نہیں کر پائے ہیں جو حکومت نے انھیں بخشا ہے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔

"ذاکر حسین: وزرا ہمارے تعلیمی نظریے سے متفق نہیں ہیں . . . اب یا تو آپ حکومت اور سنگھ کے درمیان رابطہ بن جائیں، یا پھر ہم آزاد ہو کر اپنا کام کریں۔

گاندھی جی: اب میرا وہ اثر نہیں رہا جو پہلے تھا . . . ویسے میں جواہر لال وغیرہ سے باتیں کر رہا ہوں . . . میری دعا ہے کہ یا تو خدا مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے یا میری باتوں میں وہ طاقت دے کہ عوام اور ان کے نمایندوں دونوں میں ان سے اعتقاد پیدا ہو . . . تم لوگ نئی تعلیم کا کام چھوڑ دو اگر تمھارا خیال ہو کہ اس سے کچھ ہونے کا نہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب آپ کا کام ختم ہو گیا، اب تک اہنسا پر عمل کیا گیا ہے، لیکن وقت آگیا ہے کہ آپ رخصت ہو جائیں۔ اب وہ میری کچھ نہ سنیں گے۔

ذاکر حسین: کانگریس کو چاہیے تھا کہ وہ تعلیمی سنگھ سے متعلق اپنی پالیسی وزیروں کو بتاتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا . . . میں مولانا صاحب کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ سنگھ سے ملیں گے . . . کانگریس نے اس میں کچھ نہیں کیا۔"[1]

۱۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بنیادی قومی تعلیم کے سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی اپنے اپنے ذہنی تحفظات رکھتے تھے، خاص طور پر پنڈت نہرو کا طرزِ فکر اس سے بالکل میل نہ کھاتا تھا۔ لیکن یہ لوگ کھل کر اس سلسلے میں گاندھی جی سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے، خاص طور پر جب کانگریس نے اسے مان لیا تھا۔ ہاں، وہ اس کے لیے پُرجوش نہیں ہو سکتے تھے۔

"گاندھی جی: کانگریس والے پہلے ہی آپ کو بلا سکتے تھے۔ مسٹر سارجنٹ[1] کام کریں تو وہ آپ کی رہنمائی میں کام کریں۔ درحقیقت میں نے ان لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ ذاکر صاحب کو بلائیں اور ان سے مشورہ کے بعد کام کا نقشا بنائیں۔

"ذاکر حسین: بس ذرا سی کوشش اور توجہ سے یہ ہو سکتا تھا لیکن ان لوگوں نے کوشش ہی نہیں کی۔

"گاندھی جی: آج کانگریس کی پوری مشینری ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو رہی ہے لوگ اسے محسوس نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کا احساس ہے"[2]

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کو اُن فرقہ پرست قوتوں نے جو یہ کہنے لگی تھیں کہ اب انھیں اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے، شہید کر دیا۔ اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد ذاکر صاحب نے ہندستانی تعلیمی سنگھ کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ یہ گویا ایک طرح سے بنیادی تعلیم کی مہم سے ان کی علاحدگی تھی۔ پھر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر چلے گئے، اس کے بعد گورنر، نائب صدر جمہوریۂ ہند اور صدر جمہوریہ بنے۔ لیکن اس عرصے میں جب بھی ان کو موقع ملا یا ان سے بنیادی تعلیم سے متعلق کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے بڑی صفائی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں پٹیل میموریل لیکچر[3]، نئی دہلی، بیسک اسکول ٹیچرز کانفرنس[4] بہار، اور تمل ناڈ بیسک ایجوکیشن کانفرنس[5]

۱۔ اُس وقت حکومت ہند کے تعلیمی مشیر

۲۔ Collected Works of Mahatma Gandhi (Vol. LXXXVII, 1947, pp.328-333)

۳۔ ذاکر صاحب کے یہ لیکچر ۱۲، ۱۳، اور ۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ہوئے تھے۔

۴۔ اس کانفرنس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی۔

۵۔ یہ کانفرنس ۲۴ اگست ۱۹۶۴ء کو ہوئی تھی جب ذاکر صاحب جمہوریۂ ہند کے نائب صدر تھے۔ اس کانفرنس کے روح رواں ذاکر صاحب کے عزیز دوست شری جی۔ راما چندرن تھے۔

مدراس، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ذاکر صاحب نے تقریب ایک ہی بات کہی تھی اور وہ بات یہ تھی کہ وہ بنیادی تعلیم کی اصل اسکیم کو اصولاً صحیح اور قابل عمل سمجھتے تھے، اور انھوں نے خود اس کے اصولوں پر کامیابی کے ساتھ عمل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے پٹیل میموریل لیکچر کے موقع پر ایک خاتون کے سوال کے جواب میں کہ "اگر بنیادی تعلیم ناکام ثابت ہوئی ہے تو اُسے فوراً ختم کیوں نہ کر دیا جائے"، بنیادی تعلیم کی مہم کی سرگذشت کا جو خلاصہ پیش کیا تھا، وہی اُن کی جنچی تلی رائے تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"... جو تھوڑا بہت علم مجھے ملک میں اس اسکیم کے وسیع پیمانے پر ابتدائی نظام تعلیم کے طور پر چلانے کے بارے میں ہے اس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثر صورتوں میں اس کو کما حقہٗ آزمایا نہیں گیا۔ اس کے بنیادی تصورات کی کافی تشریح نہیں کی گئی، ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو تیاری ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی، اور اکثر صورتوں میں ان حضرات نے، جو اس اسکیم کو چلانے کے ذمے دار تھے، اس مستعدی، محنت اور یکسوئی کے ساتھ کام نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔ عموماً مدرّسوں اور انسپکٹروں کو مناسب ٹریننگ نہیں دی گئی۔ بنیادی تعلیم کے مدرسوں اور دوسرے مدرسوں کو ساتھ ساتھ چلانے سے یہ ظاہر ہو گیا یا کم سے کم لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ ارباب حل و عقد جو تعلیمی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں ابھی تک حیص بیص کی حالت میں ہیں۔ اکثر جگہ بنیادی تعلیم کے مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں، ہائی اسکولوں اور یونی ورسٹیوں میں مناسب اور واضح تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہمت شکن خیال پیدا ہو گیا کہ بیسک اسکول ہماری تعلیم کے پُرسکون سمندر میں ایک شورانگیز طوفان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عوامل تھے جن کی وجہ سے بنیادی تعلیم کا تجربہ، جیسا ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا۔ ایک ایسی تعلیمی اسکیم کے بارے میں جو اتنی دوررس اہمیت رکھتی ہو اور اس قدر معقول تعلیمی، نفسیاتی اور سماجی بنیادوں پر قائم ہو، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ تجربہ کیے بغیر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناکام رہی۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سلسلے میں سرے سے کچھ کیا ہی نہیں گیا۔ کرنے والے اچھی خاصی کوشش کر رہے ہیں اور جوں جوں لوگوں کے خیالات واضح ہوتے جائیں گے اور تعصب دور ہوتا جائے گا اور زیادہ کریں گے اور امید ہے کہ ان کی یہ کوشش زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوگی، مگر بہرحال تعلیم ایک ایسا پودا ہے جو بہت دیر میں نشوونما پاتا ہے۔ جن خاتون نے یہ سوال کیا ہے انھیں بے صبری سے کام لے کر اسے فوراً اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اس بات کو یاد رکھیں تو مناسب ہوگا کہ ہم اب تک تعلیم کی کھیتی کو ان خس و خاشاک سے بھی پاک نہیں کر سکے ہیں جن کے بارے میں یہ مُسلّم ہے کہ وہ صحت مند پودوں کی حیثیت سے ناکام رہے ہیں۔ جی نہیں! بنیادی تعلیم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ناکام رہی۔ وہ تو ابھی اسی کی راہ دیکھ رہی ہے کہ اسے خلوص اور دیانت داری سے آزمایا جائے۔"[1]

بہار اور تمل ناڈو کی کانفرنسوں میں اسی طرح کی بات کہتے ہوئے ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بنیادی تعلیم کے اصولوں کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں اور اگر ہمارے ملک نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک جمہوری فلاحی ریاست بن کر رہے گا تو وہ دن دور نہیں جب ملک میں ہر جگہ اچھے اور سچے بیسک اسکول نظر آئیں گے، اب بھی میرا یہی خیال ہے۔

۱۔ ذاکر حسین، ہندستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم، صفحات ۸۴-۸۲

آٹھواں باب

سچّی مذہبیت، سچّی قومیت

ذاکر صاحب ایک مذہبی انسان تھے اور اپنے مذہب کے احکام کی پابندی بھی کرتے تھے. لیکن وہ اپنی مذہبیت کی نہ تو نمائش کرتے تھے اور نہ مذہب کے نام پر لوگوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کرتے تھے، انھیں خود احتسابی سے فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ دوسروں کے ایمان و اعمال کے مدوجزر کا حساب رکھتے جیسا کہ ہمارے مذہبی طبقے میں بعض لوگ خود اپنے جہاں سے بے خبر ہو کر سارے جہان کی مذہبیت کا جائزہ لیتے رہنے کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں[1]. ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے، جامعہ کے لیے مالیات فراہم کرنے کی ذمّے داری بھی انھیں کی تھی. لیکن اس ذمّے داری کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے کبھی مذہب کے نام پر مسلمانوں سے چندے کی اپیل نہیں کی، انھوں نے سرمایے کی اپیل کی تو ہمیشہ جامعہ کے کام کی تعلیمی و تمدنی افادیت ہی کے نام پر کی جس میں جدید تعلیمی اصول اور مفید تعلیمی تجربوں کا خاص ذکر ہوتا تھا.

---

۱. دیکھیے راقم الحروف کا مضمون "الفتِ موج و کنار" جو ماجد میاں اور ذاکر صاحب کی مکاتبت کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے. (اسلام اور عصرِ جدید، جنوری، اپریل ۱۹۸۰ء، جامعہ ملیہ، نئی دہلی، صفحات ۵۹-۷.

قرآن کریم کی تلاوت ذاکر صاحب پابندی سے کرتے تھے، اور سمجھ کر کرتے تھے، اور درحقیقت یہی اُن کی اخلاقی و روحانی توانائی کا سرچشمہ تھا۔ اُن کی نہ معلوم کتنی تقریروں میں قرآنی آیات اور احکامات کے معنی ومفہوم اس طرح برجستہ آگئے ہیں کہ انھیں پڑھیے تو اگر قرآن سے شغف رہا ہے تو ذہن متعلقہ آیات واحکامات کی طرف فوراً منتقل ہوجائے گا۔ وہ جامعہ کو ایک اسلامی ادارہ سمجھتے تھے اور دوسروں کو بھی یہی بتاتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں اپنی ایک تقریر میں، جو جامعہ کے اس جلسے میں ہوئی تھی جس میں لوگ جامعہ کے مقاصد پر گفتگو کر رہے تھے، ذاکر صاحب نے کہا تھا: "جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد ہندستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد دین اسلام اور تمدن اسلام ہے۔ دین اسلام سے مراد وہ دین ہے جو غیر اللہ کی عبادت سے نجات دلاتا ہے۔ ایک خدا کی عبادت کا پابند کرتا ہے اور اس طرح ایک عالمگیر برادری کی بنیاد ڈالتا ہے۔ تمدن اسلام سے مراد وہ روایات ہیں جو آنحضرتؐ نے نمونے کے طور پر ہمارے لیے قائم کی ہیں۔ ماحول کی رعایت سے اس بڑے مقصد میں چند اور مقاصد بھی شامل ہوجاتے ہیں... آزادی کی خواہش اور اُردو کی خدمت۔"[1]

اسی طرح یہ اقتباسات دیکھیے۔ ان میں سے ایک ۱۹۲۹ء کی ذاکر صاحب کی اس تحریر کا ہے جس میں انھوں نے پیام تعلیم والوں کی درخواست پر بچوں کے لیے جامعہ کے نشان (مونو) کی تشریح کی تھی اور دوسرا ۱۹۴۴ء کی اس تقریر کا ہے جو تعلیمی میلے کے موقع پر پرچم کشائی کی تقریب میں انھوں نے کی تھی۔ جامعہ کے نشان سے متعلق انھوں نے لکھا تھا:

"جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے؟ دیکھو، اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے، اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل

[illegible]

بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی 'اللہ اکبر' کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے۔ یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راہ بتاتا ہے، اس لیے کہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے، جس نے اس کے آگے سر جھکایا اس نے سچی زندگی کا پتا پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے 'عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ'۔ یہ کتاب قرآن پاک ہے۔ اسی سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کس طرح نیکی کرکے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب امیر کا فرق مٹاکر، رنگ روپ کی تمیز ہٹاکر، آقا اور غلام کی تقسیمیں مٹاکر، اس کے بندے، اچھے سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی، اور اسی کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے، اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کردیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں کو مٹادیا اور اس میں خدا کے بندوں کی سچی برادری قائم کی۔

"اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں، یہ کیا؟ یہ اس دیس کا نشان ہیں جہاں خدا کا یہ آخری پیام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس میں یوں تو کچھ اُگتا نہ تھا، پر جہاں دینِ الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑی، جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں ان کے لیے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا اور پھول بوٹا نام کو نہ تھا، ہدایت کے چشمے اُبل پڑے جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہوگئیں، پھر تم ظاہری حالات کو دیکھ کر کیوں تھڑدلے ہوتے ہو۔

"سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ'، یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے، اسی طرح

یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے، انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہوگی ...[۱]

جامعہ کے پرچم کو بانیانِ جامعہ کی آرزوؤں اور تمناؤں کا عَلَم قرار دیتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں انھیں پورا کرنے کی جدوجہد میں "جامعہ کو مسلمانوں کا ایسا مرکز بنانا ہے جہاں سب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر یقین رکھتے ہوں" بظاہر جامعہ کا یہ پرچم کپڑے کا ایک کم قیمت ٹکڑا ہے لیکن یہ اُن خیالات، افکار، مقاصد اور حوصلوں کی وجہ سے بے بہا ہے جن کا یہ ترجمان ہے۔ پھر اس گہری حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے جو تمدنِ اسلامی بلکہ ہر اعلا تمدن کی حقیقت ہے، اور جس سے زندگی میں حُسن پیدا ہوتا ہے، انھوں نے کہا:

"یہ (پرچم) ترجمان ہے اس حقیقت کا کہ زندگی ہلکے پھلکے، میٹھے میٹھے لفظوں سے نہیں بنتی بلکہ پُرخلوص عمل سے بنتی ہے۔ زندگی نفع نقصان کا بہی کھاتہ نہیں بلکہ چند عزائم کے لیے جان کھپانے کا ایک موقع ہے۔ وہ دُھرا جس پر زندگی گھومتی ہے، رنج و راحت کا دُھرا نہیں بلکہ ترقیِ منزل، ارتقا و انحطاط کا دُھرا ہے۔ یہ پرچم باتوں کے مقابلے میں کام کا، تساہل کی جگہ سعیِ پیہم کا، آرام طلبی کی جگہ جفاکشی کا پرچم ہے۔ بیماری کے مقابلے میں تندرستی کا، کمزوری کے مقابلے میں مضبوطی کا، گندگی کے مقابلے میں صفائی کا، بدنمائی کی جگہ حُسن کا پرچم ہے جسم کی تندرستی کا بھی اور روح اور ذہن کی دُرستی کا بھی، جسم کی مضبوطی کا بھی اور عزم و یقین کے ثبات کا بھی، جسم کی صفائی کا بھی اور روح کی ہم آہنگی کا بھی ... اگر ہم تم اپنے ارادوں سے، اپنے کام

۱۔ ایضاً، صفحات ۲۶۹-۲۶۸

سے، اپنی ثابت قدمی سے، اسے ان سب (چیزوں) کا علَم بنا سکیں تو
کپڑے کا یہ حقیر سا ٹکڑا دُنیا کی سب دولتوں سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا
اور ہمارے لیے اس ملک میں باعزت زندگی کا پرچم بن جائے گا۔[1]

اوپر کے اقتباسات میں قرآن کریم کی کئی آیتوں کی گونج صاف سُنائی دیتی ہے لیکن ذاکر صاحب نے مکتبی واعظوں اور مقررین کا روایتی اندازِ بیان اختیار نہیں کیا کہ براہ راست پہلے آیاتِ قرآنی تلاوت کرتے، پھر عربی قواعد کے مطابق ان کا لفظی ترجمہ اُردو میں کرتے اور بعد میں "مدرسہ" کی ٹکسالی زبان میں تفسیر بیان کرتے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اب روایتی لب و لہجے میں وہ تاثیر باقی نہیں رہ گئی تھی جو کبھی پہلے تھی کہ قرآن کریم کی آیات پڑھی گئیں اور اہل ایمان کے قلوب لرز اُٹھے۔ اب تو اکثر خود واعظ اور مقرر کے دل اس کیفیت سے عاری تھے۔ اس کے علاوہ ان کے سامعین میں ہر عقیدہ و خیال کے لوگ ہوتے تھے۔ اس لیے ذاکر صاحب نے راست اندازِ بیان اختیار کیا اور روایتی طرز پر قرآن و احادیث کا حوالہ دیے بغیر، لیکن قرآن و حدیث کو دل و دماغ میں رکھتے ہوئے، ان کی عالمگیر سچائیوں کو بیان کیا اور اس طرح خود اپنی مذہبیت کو بھی ایک پُراثر اور دلنشیں لہجہ دیا کہ ہر وہ شخص جو اُن کی تقریر سُنتا یا ان کی تحریر پڑھتا، خواہ اس کا مذہب اور اس کی ثقافت کچھ بھی ہو، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

ایسا نہیں ہے کہ ذاکر صاحب کبھی مذہبی مسائل پر گفتگو نہ کرتے ہوں۔ لیکن اس سلسلے میں بھی اُن کا اپنا الگ رنگ تھا، اسی لیے "زاہدانِ تنگ نظر" انھیں پکا مسلمان نہیں سمجھتے تھے اور "منکرانِ ظلمت پسند" ان کی تلاوت قرآن کی پابندی اور روزے نماز کے احکامات کی بجا آوری کو دیکھ کر انھیں ایک راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتے تھے، اور ان کا اپنا رنگ یہ تھا:

۱۔ ایضاً، صفحات ۳۶۱-۳۶۰

"مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب ہم دونوں اس کوشش میں مصروف تھے کہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں تو انھوں نے قرآن کی ایک آیت[1] پڑھی جس میں اہلِ ایمان کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ وہ صابر، مخلص اور صادق، اطاعت گزار، صاحبِ انکسار، اور نیکی کی راہ میں خرچ کرنے والے اور اخیرِ شب میں (اٹھ اٹھ کر) اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔ اور مومن کی اس آخری صفت یعنی مستغفرین بالاسحار پر خاص زور دیا۔ اب اس سے مجھے خود نتیجہ نکالنا تھا۔"[2]

"بیشتر ذاکر صاحب میرے (مذہبی) سوالوں کا جواب نہ دیتے یا کسی صوفی کا کوئی قصہ سنا دیتے جو میرے سوال کا جواب سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرید کا قصہ سنایا جس کی موجودگی میں اس کے پیر نے کسی درخت کے بارے میں کہا کہ اس کی مسواک بہت اچھی ہوتی ہے۔ مرید نے اس قسم کے درخت کی تلاش شروع کی۔ معلوم ہوا کہ پانچ چھ میل پر ایسا ایک درخت ہے۔ وہ رات کو دو تین بجے اٹھ کر جاتا اور روز اپنے پیر کے لیے ایک تازہ مسواک کاٹ کر لے آتا۔ یہ وہ برسوں تک کرتا رہا اور پیر کو خبر نہ ہوئی۔"[3]

"... رفتہ رفتہ میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اُن (ذاکر صاحب) کا اصل منشا اپنے نفس کو اس گھمنڈ سے پاک رکھنا ہے جو نیک عمل کا ایک نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ان کے دل میں خدا کا وہ خوف تھا جو وارداتِ قلبی سے پیدا

۱۔ قرآن، ۳: ۱۷

۲۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین ـــ اے بایوگرافی، صفحہ ۹۸

۳۔ محمد مجیب، "ذاکر صاحب"، مجیب صاحب، احوال و افکار، صفحات ۲۴۸ ـ ۲۴۷

ہوتا ہے اور یہ خوف ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا۔ اپنی زبان سے شاید ہی کبھی انھوں نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہو، میرے لیے اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ دوسروں کا دل دکھانے سے بہت ڈرتے تھے۔[1]

ذاکر صاحب کی مذہبیت کا یہ آہنگ جمالی آخر تک نہ صرف باقی رہا بلکہ اس کا سوز و ساز اور دلنواز ہوگیا۔ ان کی مذہبیت کے اس آہنگ اور اس کیفیت کی مثالیں ان کی مختلف تحریروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ مذہبیت کا یہ آہنگ انھیں صوفی بزرگ حسن شاہؒ کی عارفانہ نظر، حکیم اجمل خاںؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا محمد الیاسؒ کی زندگیوں کے اخلاص و ایثار کے اثر اور صوفیہ کے 'حال و قال' کی نحر سے ملا تھا جو اُن کے ملفوظات کا خاص موضوع ہے۔ اس میں بلاشبہ گاندھی جی کے مذہبی انداز فکر اور تلاش حق کی راہ میں ان کے تجربوں کی داستان کو بھی بڑا دخل تھا، ان تجربوں میں ایک خیال اور تجربہ اہنسا کا بھی تھا، اور بلاشبہ ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے اس خیال و تجربے میں صوفیہ کے روحانی تجربوں کی ایک جھلک دیکھی ہوگی جبھی تو انھوں نے اہنسا کی جو تعریف کی ہے اس میں اخلاقی و سماجی سطح پر صوفیہ کی تعلیمات کی گونج صاف سُنائی دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہمارے غلامی کے نتیجے میں بگڑے ہوئے اور کھوکھلے شبدوں کے اُلجھاوؤں میں پھنسے ہوئے دماغ نے اہنسا کو بھی ایک گورکھ دھندا بنادیا ہے، اہنسا کا اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ملیریا کے مچھروں کو مارا جائے یا نہ مارا جائے یا جب کوئی تمھارے بھائی کو تمھارے سامنے ذبح کرے تو اس کو روکو یا نہ روکو، جو لوگ ہر بڑے سے بڑے میدان میں بھی حاشیے ہی پر رہنا، ہر اکھاڑے کی منڈیروں ہی پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں، انھیں یہ سوال مبارک ہو، اہنسا کا راستہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں محبت کا راستہ ہے، برداشت کرنے کی قوت کا راستہ ہے، آدمیت کے احترام اور

۱۔ ایضاً، صفحات ۲۴۹-۲۴۸

انسانیت کے آدرش کا راستہ ہے، آدمی کو آدمی کے ظلم سے بچانے کا راستہ ہے، سہارا دینے، سہارا لینے کا راستہ ہے، سماجی ناانصافیوں کو مٹانے کا راستہ ہے، سیوا کا راستہ ہے، بھائی کو بھائی سے ملانے کا راستہ ہے، دشمن کو دوست بنانے کا راستہ ہے، سچ پر بھروسے کا راستہ ہے، امن کا، صلح و آشتی کا راستہ ہے۔"[1]

ذاکر صاحب گاندھی جی کی مذہبیت کے اس پہلو سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے جو براہ راست انسانوں کی سیرت پر اپنا اثر ڈالتی ہے، اس بات کا اعتراف وہ مناسب موقعوں پر کھل کر کرتے تھے اور اپنے تنگ نظر اور کٹر ہم مذہبوں کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اپنی اکہترویں سالگرہ والی تقریر میں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ذاکر صاحب نے گاندھی جی کی خدمت میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

"ترک موالات کی تحریک سے اس کے تعلیمی شعبے میں وابستہ ہونے کے ساتھ اور اس سے پہلے مجھ پر سیاسی دنیا کی بعض غیر معمولی شخصیتوں کا اثر پڑا جن میں سب سے اوپر تو گاندھی جی کا نام لیتا ہوں کہ ان کی وجہ سے میں نے زندگی کا وہ اہم فیصلہ کیا تھا جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں[2]۔ گاندھی جی کا معاملہ کچھ عجب ہے۔ ان کے اثر میں جو لوگ آئے ان میں سے اکثر کو ایسا لگتا

۱- ذاکر حسین، "گاندھی جی کا راستہ"، ماہنامہ جامعہ، نومبر ۱۹۶۷ء

۲- اسی تقریر کا اقتباس: "تعلیم سے پوری طرح فارغ ہونے سے پہلے ترک موالات کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ اس تحریک نے مجھے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے پر آمادہ کیا، اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی عمر کا بڑا حصہ قومی تعلیم کے کام میں صرف کر دوں گا اور جہاں تک ہو سکے گا اپنی زندگی کو درویشانہ رکھوں گا۔ اس عزم کے پورا کرنے میں نوجوانوں کی ایک باہمت جماعت نے مجھے ایسا سہارا دیا کہ آج آنکھیں اس قسم کی رفاقت کی مثالیں ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں۔"

تھا کہ گاندھی جی کو سب سے زیادہ عزیز میں ہوں۔ جس سے بات کرتے تھے تو یوں کہ اس وقت دنیا کا اور خیال ان کے ذہن کے حواشی میں بھی نہیں۔ دکھ درد کی اطلاع ہو جاتی تو اس طرح تڑپ جاتے اور یوں دریافت حال کرتے جیسے ان کے سینے میں کوئی تکلیف ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا کرتا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ یہ اپنی توجہ سے مجھے اپنے کاموں کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ بسا اوقات میری بساط سے زیادہ مشکل کام مجھے دیتے اور میں نے دیکھا کہ انھیں کر کے میرا اخلاقی قد خود میری نظروں میں کچھ اونچا ہو گیا۔ مردم سازی کا کام جس وسیع پیمانے پر گاندھی جی نے ہمارے زمانے میں کیا اور کسی نے نہیں کیا، افسوس کہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس کام کا چلن ہی بند ہو گیا۔"

ذاکر صاحب ایک معلّم تھے، وہ ایک ایسے معلّم تھے جو 'مردم سازی' اور 'آدم گری' کو معلمی کا بنیادی کام تصور کرتے تھے، اس لحاظ سے دیکھیے تو معلّم کا یہ کام پیغمبرانہ کام ہے، اور اسی لیے ہمارے صوفیہ کی زندگیوں کا یہی وہ جوہر تھا جسے وہ اپنے مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعے اور چمکاتے تھے، اور اپنا جگر خوں کر کے، چشم دل میں وہ نظر پیدا کرتے تھے کہ جس پر پڑتی تھی اس کی پوری زندگی بدل جاتی تھی۔ سچی مذہبیت کا یہی وہ آہنگ جمالی ہے جو روح کے مضراب سے پھوٹتا ہے اور ساری تفریقی حد بندیوں کو توڑتا ہوا پوری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ انسان دوستی اور دل کی دردمندی کی وہ آباد دنیا جس پر اقدار عالیہ مطلقہ کا سایہ ہوتا ہے، اس کی بنا شاید ایسی ہی زندگیوں میں پڑتی ہے۔ ذاکر صاحب نے صوفیہ کی دلکش زندگیوں کی اس خصوصیت سے بہت اثر لیا تھا۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"شخصیت کی تعمیر کے کام کو جس اہتمام، جس انہماک، جس خلوص اور جس شیفتگی سے اکابر صوفیہ نے انجام دیا اور جس وسیع پیمانے پر اس کام کے

> انجام دینے میں لوگوں کی مدد اور رہنمائی کی اس کی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے، ان کے کارناموں سے، ان کے مجاہدوں، ان کی خدمتوں، ان کی تعلیمی وتربیتی کوششوں سے واقفیت آج بھی تعمیرِ شخصیت کے دشوار کام میں مُؤثر معاونت کر سکتی ہے[1]۔

ذاکر صاحب کی مذہبیت کا یہ جمالی رنگ، جو ایک لحاظ سے اخلاقی شخصیت کا خاص رنگ ہوتا ہے، بھرپور طور پر اس تقریر میں ملتا ہے جو انھوں نے ۱۰ ستمبر ۱۹۶۲ء کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس کے موقع پر حضرتؒ کے دربار میں کی تھی۔ اُس وقت وہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر تھے، اور 'ستارۂ بلندی' پوری آب و تاب پر تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ تقریر میں وہ 'اضطراب[2]' بھی عیاں تھا جو اقدارِ روحانی کی چاکری کی کبھی نہ ختم ہونے والی آرزو کا رہینِ منت ہوتا ہے، اُس موقع پر سب سے پہلے انھیں یاد آئی حضرت سلطان المشائخ کی روحانی و اخلاقی شخصیت کی اس حکمرانی کی جس کا سکّہ خاص وعام ہر شخص کے دل وجان پر چلتا تھا، پھر انھوں نے بتایا کہ اس اثر و قبولِ عام کا راز یہ تھا کہ دہلی کے اس بے تاج کے سلطان نے اپنی ذات میں پورے طور پر اقدارِ عالیہ کو جاری وساری کر لیا تھا جن کا سرچشمہ صفاتِ الٰہیہ یعنی اسمائے حُسنیٰ ہیں، یہ صفات سب کی سب حُسن وخیر، عدل وصداقت، محبت وشفقت، رحم وربوبیت ہیں۔ انھیں اقدار کی چاکری آپ کی زندگی کا مقصود تھا، اور خلق اللہ پر شفقتِ تامّہ آپ کا دائمی سوز جو آپ کو نہایت درجہ محبوب تھا۔

اس کے بعد ذاکر صاحب کو زندگی کی وہ تلخ حقیقت یاد آئی کہ سخاوت شفقت اور تواضع کی ان صفتوں کے ہوتے ہوئے بھی جو دریا، آفتاب اور زمین کی خصوصیتیں

۱۔ خلیق احمد نظامی، 'تاریخ مشائخ چشت'، ادارۂ ادبیات دلّی، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۳

۲۔ مولانا روم نے ایسے اضطراب کو 'اصطرلابِ اسرارِ خدا' اور حافظ نے 'آتشِ دل' کہا ہے۔

ہیں اور جن کا ذکر خواجہ غریب نوازؒ کے ایک مشہور ملفوظ میں ملتا ہے: "دین اور مذہب کا فرق لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے کی طرف سے بند کر دیتا ہے، مذہب جوڑنے کی جگہ توڑنے، لانے کی جگہ جدا کرنے لگتا ہے۔"[1] لیکن پھر اُن کی منظرِ تصور نے حضرت نظام الدین اولیاء کی ذاتِ گرامی کی شانِ جمال کو دیکھا جن کی "تعلیم و ارشاد کی خصوصیت روحانی قدروں کا تحفظ، ہمدردی اور انسان دوستی تھی۔ جب آپؒ نے ارشاد فرمایا: 'ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے' اور آپ کے دلدادہ عاشق اور چہیتے محبوب خسرو نے (ان کی روح پاک پر خدا کی رحمتیں ہوں) فوراً دوسرا مصرع عرض کر دیا کہ 'ما قبلہ راست کردیم برطرف کج کلاہے' تو یہ خالی مصرع لگانا نہ تھا بلکہ اس میں شاعر کے اس ایمان و یقین کا اعلان تھا کہ جو بات آپ نے فرمائی ہے، جس رواداری کی طرف آپ کا تلقینی اشارہ ہے، آپ کی ذاتِ اقدس خود اس کا علَم ہے اس لیے مرشدِ دلنواز و کج کلاہ کی پیروی ہی اس قدر کی تکمیل کی ضامن ہے۔"[2]

لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ذاکر صاحب کی مذہبیت میں جلالی آہنگ بالکل مفقود تھا۔ اور اس کی گونج ۱۹۴۷ء سے پہلے اُن کی کئی تقریروں میں سُنائی دیتی ہے: خاص طور پر یہ آہنگ ہمیں اُن کے اس خطبے میں ملتا ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جوبلی میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو دیا گیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے کسی بھی تعلیمی نظام کی تشکیل کے لیے یہ ضروری قرار دیا تھا کہ جماعت کا کوئی نہ کوئی تمدنی نصب العین ضرور ہونا چاہیے اور یہ بتایا تھا کہ نصب العین کے تعین کے بعد ہی اس کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع کا تعین ممکن ہو سکتا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے دھاردار طنزیہ لہجے میں جس سے وہ اسی وقت کام لیتے تھے جب انھیں کاری ضرب لگانی ہوتی تھی، کہا تھا کہ کون کہتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید تعلیم کوئی نصب العین نہیں رکھتی، یہ ایک نصب العین رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اعلا اور متوسط طبقے کے افراد، جتنا بھی ممکن ہو، اپنا پیٹ پال لیں اور

۱۔ ذاکر حسین، "محبت، خدمت اور اقدارِ روحانی کی چاکری"، اسلام اور عصرِ جدید، جنوری۔اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۱۹۸

۲۔ ایضاً، صفحات ۱۹۹-۱۹۸

تھوڑی بہت دُنیا بھی کما لیں،" "قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل ڈالنے نہ پائے، معاشرت بدلی جائے، اپنی پُرانی معاشرت بُری ہے اور بُری اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے... مذہب کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، ضرور قائم رکھا جائے، مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو اور 'ترقی' کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر، کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ اُبھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ 'ترقی یافتہ' اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے، البتہ عقائد و عبادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت، اور ہاں احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورار عقل ہیں، عقلی بحثیں اور فلسفہ و حکمت سے تطابق کی کوششیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں۔

"اس نصب العین کے حصول کے لیے جو نظام تعلیم کار آمد ہو سکتا تھا وہ وجود میں آگیا، بہت کچھ دوسروں کی مدد سے، کچھ کچھ اپنی کوشش سے... ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے اور اُن میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا، ان کو دیکھیے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی؟ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ آدمی کی زندگی کا جو خلاصہ کیا ہے کہ "بی۔اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے"، کیا وہ ہمارے ان ملّی اداروں پر بھی صادق نہیں آتا؟ ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں؟ کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور انفادی مجموعہ ہے۔ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں۔

"مگر یہ رونا اپنے نظامِ تعلیم کا نہیں، اپنی قومی زندگی کا رونا ہے... شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے... ہمیں اپنی ملت کے انسانی اور ملی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان پھر آنے لگا ہے اور کانوں اور دلوں تک شُھداءُ علی النّاس کے مرتبے اور ذمے داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں بار پانے لگی ہیں۔ ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھیں اُٹھانے لگے ہیں جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اسے بامقصد اور بامعنی بناتی اور کل زندگی اور کل کائنات میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے اور ایک ایسی دُنیا، جو نسل، وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لیے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرمانروائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ جو ایک اُمّی نبیؐ نے دُنیا کو سُنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملّت اسلامیہ اس تقدیر، اس موقعے اور اس ذمے داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟"[۱]

اس کے بعد اپنے تعلیمی افکار کی روشنی میں تعلیم کے نئے نظام اور نئے مدرسوں کا ایک خاکہ پیش کرتے ہوئے، ذاکر صاحب نے کہا: "ہمارے یہ مدرسے بے شک اسلامی مدرسے ہوں گے اور اسلامی نصب العین ہی ان کے سامنے ہوگا مگر اس نصب العین کی کوئی تنگ اور غلط تعبیر ان مدرسوں کو فرقہ پروری اور جماعتی خود غرضی کا مرکز نہ بنانے پائے گی اور بے جا تعصب ان کی نظر سے اس نکتے کو چھپا نہ سکے گا کہ اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحات ۴۶-۴۳

اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے. چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے اِرد گِرد، ان کے اپنے گھر میں، غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے. یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی. یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنّت نشان کہتی تھی، پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بےکس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزّاق و کریم، حیّ و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے، بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود، محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبّہ سا معلوم ہوتا ہے۔"[1]

اسلام اور قومیت

ذاکر صاحب ایک مذہبی انسان تھے، ذاکر صاحب ایک نیشنلسٹ مسلمان تھے، اور انھیں کبھی، زندگی کے کسی مرحلے میں بھی، قومیت اور اسلام میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا۔ اسلامی تصورحیات پر ان کا ایمان تھا اور ان کا یہ پکّا عقیدہ تھا کہ اسلام کے بنیادی اصول اس عہد جدید میں بھی اتنے ہی سچّے اور قابلِ عمل ہیں جیسے کہ وہ

۱۔ ایضاً، ۵۷-۵۶

اسلام کے قرنِ اول میں تھے' لیکن عقل' وجدان اور زمانے کے نئے مطالبوں کا تقاضا ہے کہ ان اصولوں کو آج کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر نئے اسلوب میں پیش کیا جائے۔
جس زمانے میں ذاکر صاحب کے سیاسی شعور کی بیداری کی ابتدا تھی' اُس وقت ہندستان میں قومیت کے مسئلے نے وہ صورت اختیار نہیں کی تھی جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران اس مسئلے نے اختیار کی۔ ذاکر صاحب جرمنی سے واپس آئے تو ملک کی سیاسی فضا وہ نہ تھی جسے چھوڑ کر وہ گئے تھے' تین چار سال کے اندر ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ حکیم اجمل خاں جیسا طبیب حاذق "بیمار" کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت سے مایوس ہو کر کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ "بیمار" ہندو مسلم اتحاد تھا جسے شُدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کا مرض ایسا لگا کہ آج تک یہ بیمار چلا آرہا ہے،

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

یہی ہندو مسلم اتحاد جو خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں خوب توانا اور صحتمند تھا' اُس کو نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) سے متعلق اختلافِ رائے کی چوٹوں نے اور بھی کمزور اور لاغر کر دیا تھا' اور جرمنی سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ذاکر صاحب کو محسوس ہوا کہ ہمارے یہاں مسئلۂ قومیت (نیشنلزم) کی تشریح اب 'وصل' کے بجائے 'فصل' کے خطوط پر کی جا رہی ہے۔
ذاکر صاحب کو اپنے بچپن اور طالب علمی کے دور میں جن تمدنی عناصر نے متاثر کیا تھا ان میں اردو اور خاص طور پر فارسی شعر و ادب کے تہذیبی پہلوؤں[1] کے علاوہ ہند اسلامی

۱۔ دیکھیے نگارِ معنی (ذاکر صاحب کی بیاضِ اشعارِ فارسی سے انتخاب)' مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی' نئی دہلی' ۱۹۸۰ء' صفحات ۴۷-۵۴' (ذاکر صاحب اور فارسی شاعری) — مرتب نے صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے: "ذاکر صاحب کی زندگی میں اولین دو دہوں کی اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ اس مدت میں ان کی ذہانت و فراست اور فطری صلاحیت نے ہند اسلامی تہذیب کی ان اقدار کے حسن و جمال سے تب و تاب اخذ کیا جو اُس وقت کے ماحول میں مسلمانوں کے متوسط طبقے میں رچی بسی ہوئی تھیں اور جن کا صدیوں علیٰ قدرِ مراتب شخصیتوں کی سیرت سازی میں نمایاں حصہ رہا تھا۔ ان اقدار کے تحفظ' تسلسل' تبلیغ و اشاعت اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا ایک اہم اور بہت ہی موثر وسیلہ فارسی شعر و ادب بھی تھا۔۔۔"

تہذیب کی ترجمان شخصیتوں کے وہ زندہ نمونے بھی تھے جن کا ذکر پہلے مختلف موقعوں پر ہوچکا ہے، اقبال کی شاعری اور فکر نے بھی انھیں متاثر کیا تھا جس میں تمدن اسلامی کے آفاقی عناصر خاص طور پر نمایاں تھے اور عمل پر زور تھا، اور پھر گاندھی جی کی شخصیت تھی جن کی مذہبیت اور قومیت سے اس وقت وہ غائبانہ طور پر بہت زیادہ متاثر تھے۔ جرمنی میں پروفیسر ورنر زومبارٹ کے اثر سے وہ اشتراکیت کی طرف تو دیکھنے لگے جس کا ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد دنیا میں بڑا چرچا تھا، لیکن یورپی لبرل ازم کی بہترین روایات جن سے وہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں روشناس ہوچکے تھے، انھوں نے پوری طرح جذب کیں، انگریزی ادبیات سے بھی وہ علی گڑھ میں واقف ہوچکے تھے اور جرمنی میں جرمن ادب کا بھی خاصا اثر انھوں نے قبول کیا۔ ان تمام اثرات کا مجموعی نتیجہ جب ان کی گہری دانشوری کی چھلنی میں چھن کر نکلا تو مذہب اور مذہبیت، تہذیب اور قومیت کے مسئلوں کو، ہندستان کی تاریخ اور اس کے خاص حالات میں، انھوں نے سچائی اور حقیقت پسندی سے دیکھا اور سمجھا۔ اسی لیے ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی انھوں نے خدا اور رسولؐ سے اپنا ناتہ نہیں توڑا، مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے بھی ماضی سے اور فکر میں 'جدید' ہوتے ہوئے بھی 'قدیم' سے اپنا تعلق نہیں ختم کیا، وہ آخر تک جس طرح کھرے نیشنلسٹ رہے اسی طرح پکے مسلمان بھی رہے۔

ایک دانشور، ایک معلّم، ایک جمہوریت پسند، ایک انسان دوست، اقدارِ عالیہ کے خادم اور اپنی تاریخی بصیرت کے طفیل تہذیب و تمدن کا ایک عالمی نقطۂ نظر رکھنے والے ایک مردِ حق پرست کی حیثیت سے ذاکر صاحب کا سیاسی عقیدہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ قوم کی ترقی کے لیے جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا موقع ملنا چاہیے، انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہندستانی تہذیب ایک مشترک کارنامہ ہے۔

اپنی ایک انگریزی تقریر میں، جو غالباً ابھی تک کہیں چھپی نہیں ہے اور جو ہمارے

قومیت کے موضوع پر کچھ صاف صاف باتیں کی تھیں۔ انھوں نے ہندستان کی ہیئت اجتماعی میں مسلمانوں کے مقام کو قانون ساز اسمبلیوں اور ملازمتوں میں عددی تناسب یا ان کے لیے جداگانہ انتخاب اور سیٹوں کے تحفظ کے مطالبے کی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ وقتی معاملے اگرچہ اہم تھے لیکن ان کے نزدیک ملک کی ہیئت اجتماعی کی ساخت اور اس میں مسلمانوں کی حیثیت ان سے زیادہ اہم اور مستقل نوعیت کے معاملے تھے۔ انھوں نے اپنے سامعین سے کہا تھا کہ وہ ہندستان میں مسلمانوں کے مسئلے کو اولین اہمیت کا تمدنی مسئلہ تصور کرتے ہیں[1]۔

اس تقریر میں ذاکر صاحب نے مشرق اور مغرب کے تمدنوں کے غیر متوازن ارتقا کی مختصر داستان سناتے ہوئے بتایا کہ ہندستان میں ان دونوں کا ملاپ ہوا ہے اور ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے جس میں نوع انسانی کے مستقبل کے لیے بے پناہ امکانات ہیں۔ لیکن ہندستان اور اسلام کا تعلق اس سے کہیں زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا ہے کیوں کہ تمدنی اعتبار سے یہ زیادہ بارآور اور نتیجہ خیز رہا ہے۔ ہندستان 'مشرقی ٹائپ' یعنی بے نفس، تنہائی پسند، روحانی، انفعالی اور نرم رَو ٹائپ کا نمایندہ تھا۔ ہندستان میں اسلام کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ پہلی بار تمدن کے ایک ایسے ٹائپ سے جو 'مغربی ٹائپ' سے یعنی محنت کوش، مستعد و فعّال اور شجاعانہ اثبات و اقدام والے ٹائپ سے کافی مشابہ تھا، ہندستان کا موثر اور نتیجہ خیز ربط قائم ہو رہا تھا، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ تمدن کا یہ نیا ٹائپ اس لحاظ سے مشرقی تھا کہ بنیادی طور پر یہ مذہبی و روحانی تھا اور اس کے لیے مذہب ہی کل اقدار کا سرچشمہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کریم میں یہ جو مسلمانوں کو 'اُمت وسطیٰ' کہا گیا ہے تو کیا عجب اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہو، اور مسلمانوں کی یہی خصوصیت تھی جس کے سبب ہندستان میں ان کی آمد سے دوررس تمدنی نتیجے ظاہر

۱۔ تقریر طویل ہے، اس لیے اس کی تلخیص بھی مختصر نہ ہوگی۔ لیکن مسئلۂ قومیت پر چونکہ ذاکر صاحب کی یہ تقریر اُن کے سیاسی عقیدے کی ترجمان ہے، اس لیے ہم اختصار سے کام بھی نہیں لینا چاہتے۔

ہوئے۔ مشکل ہی سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہوگا جو اس تاریخی حقیقت کی شہادت نہ دیتا ہو۔

اس کے بعد ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں ایک ایک کر کے ہندستانی زندگی کے ان تمام گوشوں کی نشاندہی کی جہاں مسلمانوں کا تمدنی اثر واضح طور پر نمایاں ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان یہاں آئے تو انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا جب کہ ان کے بعد آنے والی انگریز قوم نے ہندستان کو کبھی اپنا وطن نہیں سمجھا اور تمدنی اعتبار سے خالص 'مغربی ٹائپ' ہونے کی وجہ سے انگریز اُس تمدن سے' باوجود قریب دو صدیوں کے ربط و تعلق کے' بالکل الگ رہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں ساتھ رہ کر تعمیر کیا تھا' اور اب جب کہ انگریزوں کا سیاسی اقتدار کمزور ہو چلا ہے' اور رفتہ رفتہ اس کی شدت اور کم ہوتی جائے گی' ہمارے ملک کی ہیئت اجتماعی کو ایک بہتر ٹائپ کی طرف نشو و نما اور ترقی کے لیے جو اس کا مقدر معلوم ہوتی ہے' ایک مضبوط' فعال' شجیع' لیکن ساتھ ہی ایک مذہبی اور اخلاقی عنصر کی ضرورت ہوگی' اور میرا یقین ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اس عنصر کو مسلمان ہی فراہم کریں گے۔

یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ جیسے جیسے ہندستان کو قومی خود ارادیت کی ذمے داریاں سونپی جا رہی ہیں' ہندستانی مسلمانوں میں بھی جو تھکے ہارے عرصے سے گہری نیند سو رہے تھے' بیداری کے کچھ آثار نظر آنے لگے ہیں' لیکن ذاکر صاحب نے کہا کہ اس بیداری کے مظاہر جس طرح سامنے آئے ہیں' افسوس ہے کہ اس سے بہت سے ذہنوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے' مثلاً ہندستانی مسلمانوں نے وسیع پیمانے پر عالم اسلام کے مذہبی احیاء کے ساتھ پوری شدت جذبات سے اپنی فطری ہمدردی کا اظہار کیا' معقول اور نتیجہ خیز اصولوں کے مطابق اس کی تعلیمی اصلاح و تنظیم کی کوششوں کو سراہا اور اس کے سیاسی مطالبوں کی تائید کی۔ مسلمانوں کی بیداری کے ان مظاہر نے سمجھ دار اور نیک نیت لوگوں کو بھی مسلمانوں سے متعلق شک و شبہہ میں مبتلا کر دیا ہے' وہ انھیں ہندستانی قومیت کی نشو و نما کی راہ کا روڑا سمجھتے ہیں' یعنی ملک کی سیاسی ترقی میں ایک بھاری رکاوٹ۔

کے سمجھ دار اور نیک نیت نقاد بھی کبھی فراموش نہیں کرتے، اور انھوں نے اپنے خاص اسلوب میں کہا کہ امید ہے کہ وہ انھیں کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ان نقادوں کے نزدیک مسلمان کا قصور یہ تھا:

۱. وہ جسے وہ مسلمانوں کی پین اسلامزم کہتے ہیں۔
۲. اُس کا اصرار کہ وہ شعوری طور پر اور علانیہ اپنے دین پر قائم رہے گا۔
۳. اُس کی مضطربانہ آرزو کہ وہ اپنے ان دو قصوروں کو اپنے مخصوص نظام تعلیم کے ذریعے مستحکم کرے گا۔
۴. اس کا یہ مطالبہ کہ سیاسی حقوق و اختیارات کے توسط سے وہ اپنے ملی تشخص کو باقی رکھے گا۔

ذاکر صاحب نے اپنی اس تقریر میں دلائل کے ساتھ مسلمانوں سے متعلق ان تمام غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا۔ انھوں نے کہا کہ عالم اسلام سے ہندستان کے مسلمانوں کا ہمدردی کا جذبہ اُن حوصلوں اور جذبات کی وجہ سے ہے جنھیں مشترک اخلاقی و روحانی مقاصد کے حصول کے لیے جو سرتاسر انسانی اور آفاقی ہیں خود اسلام مسلمانوں کے دل میں پیدا کرتا ہے، اگر یہ پین اسلامزم ہے تو یہ وہ سیاسی پین اسلامزم نہیں ہے جسے سامراج کے ہمدردوں نے ایک ہوّا بنا دیا ہے۔ میں مسلمانوں کے ان نقادوں سے، بڑے احترام کے ساتھ، پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ایک مخصوص علاقے سے تنگ اور محدود محبت جس کے سرسامی اور وحشیانہ مظاہر کا دُنیا کو خوب تجربہ ہو چکا ہے، انسانی گروہوں کے لیے زیادہ مناسب اور مفید ہے؟ اسلام نہ تو رنگ و نسل کے امتیاز کو معتبر سمجھتا ہے اور نہ جغرافیائی حدود ہی کے کسی تقدس کو تسلیم کرتا ہے۔ زندگی میں اتحاد و اشتراک کے لیے اس کے اصول، ضروری نہیں ہے کہ دوسرے اور اصولوں اور آدرشوں کی ضد ہوں۔

مسلمان جس ملک میں بھی گئے اُسے اپنا وطن بنا لیا اور ان کی حب الوطنی اس ملک کے دوسرے باشندوں سے کسی طرح کم نہ رہی، سیاسی شعور کے ساتھ اچھی شہری زندگی کے ارتقا میں انھوں نے کھُل کر حصّہ لیا۔ اسلام ایسی سرگرمیوں میں حائل

نہیں ہوتا۔ ملاقائی حب الوطنی، اگر یہ جارحانہ نہیں ہے، اُس مذہب کی اخلاقی و روحانی وسعت فکر و نظر سے قطعی اَنمیل اور بے جوڑ نہیں ہے جو عام اخوت انسانی کا حامی اور مبلغ ہے اور جس نے رنگ و خون کے تعصبات و امتیازات کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ یہ جو مسلمان ایسی قومیت اور حب الوطنی کا قائل نہیں جس کی رو سے نسلی امتیاز کے نظریے کو فروغ ملے اور جو اپنے ہی خول میں بند رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کو محض اپنے ماحول کی پیداوار نہیں سمجھتا، اس کے لیے زندگی کرنا کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں بلکہ ایک مقدس فریضہ اور میثاق ہے۔

ذاکر صاحب کو اس کی خوشی اور اطمینان تھا کہ ملک کے بہترین دماغ اُس حب الوطنی کے حق میں نہیں ہیں جس کا اظہار آج عام طور پر اس غیر اخلاقی فقرے سے کیا جاتا ہے: "میرا ملک، غلط یا صحیح"۔ ہندستان کے بہترین اذہان جن کی نمایندگی گاندھی، ٹیگور اور اقبال جیسے لوگ کرتے ہیں، 'ملک' کو جو ایک جغرافیائی تصور ہے کسی قدرِ مطلق کا مرتبہ نہیں دیتے اور اسے انسانی زندگی کے اعلا اقدار اور مقاصد کا خادم تصور کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں ہندستانی قوم پرستوں کا ایک ٹائپ وہ ہے جو اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ہندستان کے سچے سپوت وہی کہے جائیں گے جو اپنے مذہب کو خیرباد کہہ دیں۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ یہ بات نہایت احمقانہ ہے، اور نہ صرف ہندستانی مسلمانوں بلکہ ہندستانی ہندوؤں، ہندستانی عیسائیوں، ہندستانی سکھوں اور پارسیوں سب کو بیک آواز اور اصرار کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ سچی قومیت کے لیے یہ شرط کسی طرح بھی معقول نہیں کہی جا سکتی۔ وہ لوگ تاریخی شعور سے عاری تھے اور ہیں جن کا خیال تھا اور جو اَب بھی سمجھتے ہیں کہ مغرب کے افکار و خیالات ہندستان کے باشندوں کی روحانی زندگی میں بم کا کام کریں گے اور قدیم عقائد و تصورات خاک ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ لوگ اس عظیم سچائی سے ناواقف ہیں کہ جب ہندستانی سماج کے سیاسی ادارے مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے، تو یہ مذہب ہی تھا جس نے اس سماج کو مکمل تباہی اور انتشار سے بچایا تھا، اور اب جب کہ سیاسی اداروں میں جان پڑ رہی ہے۔ ایک فعال قوت کی حیثیت سے

سماج اور سیاست پر مذہب کا اثر ایک بار پھر محسوس کیا جارہا ہے۔ جدید ہندستان کی یہ حقیقت بڑی گہری اہمیت کی حامل ہے۔ اب اس کے بعد اس بحث کو ختم کر دینا چاہیے کہ ہندستان کی نیشنلزم لازمی طور پر غیر مذہبی آزاد خیالی کی پروردہ ہوگی اور اسے قوت ملے گی ہندستانی قوم میں مذہبی عقائد کے الجھاؤوں، ان کے انحطاط اور بالآخر ان کے فنا ہوجانے سے۔ موجودہ صورت حال میں تو یہی دکھائی پڑتا ہے کہ ہندستانی نیشنلزم فطری طور پر ہندستان کے مذہبی شعور اور روحانی ضمیر ہی کی گود میں نشو و نما حاصل کرے گی، اور ہندستانی قوم مختلف مذہبی فرقوں سے مل کر بنے گی جو باہم متحد ہوکر سیکولر مقاصد کے لیے جدوجہد کریں گے۔ ڈاکر صاحب نے زور دے کر کہا کہ ہندستانی نیشنلزم کا سرچشمہ اگر اہل ہند کے مذاہب کے علاوہ کہیں اور ہوگا تو وہ ہندستانی نیشنلزم نہ ہوگی، کچھ اور ہوگی۔

ہندستان کے نئے تعلیم یافتہ طبقے نے جس کا سیاسی شعور ابھی نیا نیا ہے اور جو یورپ کے سیاسی فکر و عمل کے بارے میں بڑا پُرجوش نظر آتا ہے، غیر شعوری طور پر ہندستانی عوام کی قدیم وفاداریوں کو مضروب و مجروح اور اقلیتوں کو خوفزدہ کردیا ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے شبہات اور اختلافات رونما ہورہے ہیں۔ اسی کا ایک شاخسانہ ہندو مسلم مسئلہ بھی ہے۔ لیکن دوسری طرف بڑھتی ہوئی سیاسی سوجھ بوجھ نے سنجیدہ اور مخلص لوگوں کے خیالات میں توازن بھی پیدا کیا ہے، اور یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ مشترک سیکولر مقاصد مختلف مذاہب کے سچے فیضان ہی کی مدد سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوسکتا ہے اگر ان لوگوں میں جنھیں اپنے فرقے سے زیادہ محبت ہے، رواداری کا یہ مزاج پیدا ہوجائے، اور وہ اپنے مذہب کو سیاسی بازیگری کا آلۂ کار بنانے کے بجائے سماجی کاموں میں اس کے مفید اثرات سے کام لیں تاکہ لوگوں کی زندگیوں میں خلوص پیدا ہو، زندگی کے مقاصد واضح ہوں اور اُن کا ذہنی افق وسیع ہو۔ زندگی کی گہری حقیقتیں خود اس کی متقاضی ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اسی منزل کی طرف رہنمائی کررہی ہیں، بس یہ چھوٹا آدمی ذرا اپنی جارح خود پسندی کو قابو میں رکھے

اور ان حقیقتوں کی راہ میں اپنی جھوٹی ادعائیت کو نہ آنے دے۔ اس کے بعد ہم امید کر سکتے ہیں کو تھوڑی سی انسانی شرافت، مروت اور سخاوت سے جدید ہندستان کا سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کوئی کسی سے اصرار نہیں کرے گا کہ اگر ہندستانی قومیت میں شریک ہونا ہے تو وہ پہلے اپنے دین دھرم کو چھوڑ دے۔ اور اس بات سے کہ ہندستانی مسلمانوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے پر اصرار ہے، دوسرے مذاہب کو ساتھ ساتھ زندہ اور باقی رہنے اور ہندستان کی عام زندگی کو متمول اور ثمردار بنانے میں بڑا سہارا ملے گا۔

اب اگر اپنے مذہب پر قائم رہنے پر مسلمانوں کا اصرار اور دوسرے ملکوں میں اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی کا اظہار غیر معقول اور سچی ہندستانی قومیت کی نشوونما کے لیے مُضر نہیں ہیں، تو پھر اپنی جماعتی خصوصیات کو باقی رکھنے اور انھیں مستحکم بنانے کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہی اُن کی جماعتی خصوصیتیں ہی انھیں ہندستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنا سکیں گی۔ ایک جداگانہ شخصیت و حیثیت کے لیے ان کے سیاسی مطالبوں کے سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ یہ بات صحیح نہ ہو۔ مسلمانوں کے موجودہ سیاسی رجحان سے متعلق میں اس وقت کچھ کہنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے نزدیک ان کے کچھ مطالبے معقول ہیں اور کچھ نہیں۔ لیکن معقول یا غیر معقول، میں انھیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور محسوس کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں خود اعتمادی ہو جو یقیناً انھیں جلد ہی دوبارہ حاصل ہو جائے گی تو وہ بھی انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔

ذاکر صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کو جن کی جماعتی زندگی کی بنیاد ہی ایک تصور یا تصورات کی ایک ترکیب پر ہے، دوسروں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ شعور ہونا چاہیے کہ ادارے، خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، کسی داخلی حقیقت کے خارجی مظاہر ہوتے ہیں جسم فنا ہو جاتے ہیں، اور روح باقی رہتی ہے۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ آئین کی دفعات، سیاسی بازیگری کی چالیں اور اداروں کی ظاہری تبدیلیاں کسی ایسے فرقے کے اطمینان کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں جسے قومی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے، اس لیے کہ اگر مسلمان

زندگی میں اپنے مشن کے وفادار نہ رہے اور باقی سب اُن کے حق میں بدل دیا گیا تو تنگ نظر خود غرضیوں اور جھوٹے فخر و مباہات کی چٹانوں سے ٹکرا کر سب کچھ پاش پاش ہو جائے گا۔

جمہوریت میں بھی جہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح شمار کرنے کا رجحان ہوتا ہے، طاقت صرف تعداد میں نہیں ہوتی' اور جمہوریت بھی 'کُل' کی فلاح و بہبود کی طرف سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں نہیں بند کرے سکتی۔ اپنی ذہانت و فراست سے، اپنے کردار سے اور زندگی میں اپنے مشن سے وفادار رہ کر مسلمان اپنے ملک کے مقدرات کی تشکیل میں ایک ناگزیر عامل بن سکتے ہیں۔ ہندستان میں آیندہ جس طرز کی بھی حکومت قائم ہو' متحد' مضبوط' ذہین اور تاریخ میں اپنے کارناموں اور اپنی تقدیر سے باخبر سات کروڑ انسانوں کی جماعت ایک موثر قوت ہوگی۔

انھوں نے توجہ دلائی کہ ہندستانی نیشنلسٹ کو ہندستانی مسلمانوں کے سلسلے میں ذرا صبر سے کام لینا چاہیے۔ اگر اُن کی قدر و قیمت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا گیا تو وہ ہماری قومی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ثابت ہوں گے۔ وقتی کش کش اور اختلافات کے سبب ہمت نہیں چھوڑ دینی چاہیے۔ ترقی پسند قومیت کی راہ نغمہ و ساز کی پُرسکون راہ نہیں ہے۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہم ایک تعمیری عمل کی مشکلات سے گزر رہے ہیں' اس میں ہمیں بڑی سوجھ بوجھ سے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور وسائل کو کام میں لانا ہوگا' کیونکہ اس عمل کی راہ خود ایسی ہے کہ اس میں رقابتوں' غلط فہمیوں اور کبھی کبھی دیدہ و دانستہ غلط ترجمانیوں سے رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہے یہ کرنے کا کام' اور اس کا صحیح رُخ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گہرے عقیدے اور پُرسکون یقین کے ساتھ، طنز، طعن اور دشنام کی پروا کیے بغیر' اپنی جد و جہد جاری رکھی جائے۔

اب جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ ان کا مرض احساس کمتری ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہونے سے ان میں پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن انھیں ماضی میں اپنے تہذیبی کارناموں' اپنی شان دار مذہبی و روحانی روایات اور مستقبل

ہیں اپنے تہذیبی رول کے نتیجہ خیز امکانات کا بھی احساس ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غلط اندیش نیشنلزم کے بعض مطالبات جارح اور غیر پسندیدہ ہیں، لیکن ملک و قوم کی بھلائی کے لیے جو ہم سب کا مقصود اصلی ہے، مسلمان سب کچھ چھوڑ کر بے عملی کی زندگی پر مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اُن میں یہ حوصلہ ہے کہ وہ محب وطن ہندستانی بن کر رہیں اور ایک ایسی قوم کی تعمیر میں حصہ لیں جس کا وہ ایک باشعور اور فعال عنصر ہوں۔ وہ اچھے ہندستانی ہوں گے، اچھے مسلمان ہوں گے اور نہ تو اپنے ہندستانی ہونے پر شرمائیں گے اور نہ مسلمان ہونے پر۔ مذہب ان کے لیے ایک تھکا دینے والا بوجھ نہ ہوگا ایک ذمے داری ہوگی، معذوری کا بہانہ نہ ہوگا ایک امتیاز ہوگا۔ جو لوگ اپنے انقلابی منصوبے کی راہ میں انھیں ایک تکلیف دہ رکاوٹ تصور کرتے ہیں، اُن کی مخالفت سے مسلمانوں میں مزید توانائی، یقین اور خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ جب تک کہ اپنے مقاصد اور مشن کے نیک اور بابرکت ہونے پر اُن کا اعتقاد قائم ہے اور جوش اور جذباتیت کی رَو میں وہ اندھا اور شک و شبہہ کی چوٹ سے لنگڑا لولا نہیں ہو جاتا، اس وقت تک انھیں کسی کا کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں، وہ چیز جو اہمیت رکھتی ہے، ان کا اعتقاد و اخلاص ہے، اور وہ دل جسے جذباتیت کی کمزوری اور نفرت کی بیماری نے ناکارہ نہ کر دیا ہو۔

ذاکر صاحب کے انھیں خیالات کی گونج ان کے کاشی ودیاپیٹھ (جلسۂ تقسیم اسناد ۱۷؍ اگست ۱۹۳۵ء) والے خطبے میں بھی ملتی ہے جس میں انھوں نے قومی تعلیم کے مسئلے کو موضوعِ سخن بنایا تھا اور کہا تھا کہ ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، اس لیے کہ ہمارا ملک مختلف مذہبوں، ثقافتوں، بولیوں اور رسم و رواج کا گہوارہ ہے، اور قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ کیا وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے والوں کے ولولے میں ان تاریخی حقیقتوں اور تعلیم کے صحیح اصُولوں کو نظر انداز

۱۔ مثلاً ایک اصول یہ کہ ثقافتی تفرقوں کو تسلیم کیا جائے اور انھیں "اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی ترقی چیزوں سے تعلیم کا کام لیں اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی راہیں نکالیں"۔

کردیں گے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ذاکر صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا ہندستان کا قومی نظامِ تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؟" انھوں نے کہا کہ "آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرینِ تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں، کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے[1]۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں وہ خیالات[2] پیش کیے جو کوئی پانچ برس بعد ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے رام گڑھ کے (۱۹۴۰ء) خطبے میں ان کی اپنی مخصوص آواز اور اسلوب میں ملتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے اندازِ بیان میں یہ خیالات مئے دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور سچی قومیت کی ایک خوبصورت تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کے خطبے کے درج ذیل ٹکڑے یوں تو اُن پر لکھنے والوں نے بارہا نقل کیے ہیں اور باخبر حلقوں میں معروف ہیں، لیکن ضروری ہے کہ ان کی سوانح حیات میں بھی یہ محفوظ ہو جائیں۔ انھوں نے کہا تھا:

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحہ ۲۴

۲۔ اس انگریزی تقریر میں جس کی اردو تلخیص پچھلے صفحات میں آپ کی نظر سے گزر چکی ہے، ذاکر صاحب نے یہ خیالات بڑی وضاحت سے اور مدلل طور پر پیش کیے تھے۔

جہاں تعصّب، خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی، اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ اُن کا حوصلہ ہے کہ اچھے مُسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں اچھے ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر اُنگلی اُٹھائے۔ ہندستان میں ان کا دین بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمّے داری ان پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہوں گے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے شاید بھی بھلائے جا چکے ہوں گے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خوددار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے، مقابلے پر اصرار کرتے ہوں گے، اس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام میں ان کی تمدنی چیزوں کو پورا پورا دخل ہو اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی دانشمند ہندستانی حکومت ان کے

اس مطالبے کو پورا کر کے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کرے گی[1]۔"

ذاکر صاحب، ڈاکٹر انصاری کے روحانی جانشین

ہندستانی قومیت سے متعلق یہی انداز فکر مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن تمام نیشنلسٹ مسلمانوں کا تھا جو غور و فکر کی صلاحیت رکھتے تھے اور اِن قائدین سے متاثر تھے۔ اور متحدہ قومیت کے اسی نظریے کا فروغ، سچی اسلامیت کی اشاعت کے ساتھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری جامعہ ملیہ کے امیر جامعہ تھے۔ ملک کی قومی سیاست میں مولانا آزاد کی طرح ایک کھرے نیشنلسٹ اور سچے مسلمان کی حیثیت سے اُن کا اعتبار قائم تھا۔ کانگریس میں جو عناصر سچے قوم پرست، متحدہ قومیت کے حامی اور متوازن فکر کے حامل تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جنگ آزادی کے ہر مرحلے میں گاندھی جی اُن سے مشورہ کرتے تھے اور حکیم صاحب کی وفات کے بعد تو کانگریس کے ہر معاملے میں، اور خاص طور پر ہندو مُسلم اتحاد کے مسئلے پر، گاندھی جی انھیں کی طرف دیکھتے تھے۔ ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کو جب اُن کا اچانک انتقال ہو گیا تو گاندھی جی کو ایسا صدمہ ہوا جیسے کہ ان کا حقیقی بھائی جو اُن کا دست و بازو رہ چکا ہو، دُنیا سے اُٹھ گیا ہو۔ ان کی وفات پر گاندھی جی نے ذاکر صاحب اور زہرہ انصاری وغیرہ کو جو تعزیتی خطوط لکھے تھے وہ ان کے جذبات کے ترجمان ہیں اور ان کی تحریروں کے متعلقہ مجموعے میں چھپ چکے ہیں[2]۔

۱۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحات ۲۶-۲۵

۲۔ دیکھیے Collected Works of Mahatma Gandhi, (Vol. LXII, 1935-36, p.390)

گاندھی جی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک بڑا مرکز سمجھتے تھے اور اس کے روشن مستقبل کی طرف سے پُر امید تھے۔ انھوں نے اوکھلے میں جامعہ کی عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کے موقع پر ذاکر صاحب کو اپنے ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں لکھا تھا:

"یہ ایک عظیم خیال ہے کہ جامعہ کی عمارتوں کا سنگ بنیاد ایک بچے کے ہاتھوں رکھا جائے۔ میں اس خیال کے انوکھے پن پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ کا مستقبل روشن ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا پودا ایک بڑا اور چھتنار درخت بن جائے گا۔۔۲"

ڈاکٹر انصاری کا انتقال (۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) ہوا تھا تو گاندھی جی نے اپنے ۱۱ مئی ۱۹۳۶ء کے خط میں ذاکر صاحب کو صبر و رضا کی تلقین کی تھی اور اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جامعہ کے لیے یہ ایک کڑے امتحان کا وقت ہے۳۔ دو ہی ہفتے بعد ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو گاندھی جی نے ذاکر صاحب کو ایک طویل خط لکھا جو ڈاکٹر انصاری کی وفات کے سبب اُن کی ذہنی اُلجھن اور پریشانی کا آئینہ دار تھا۴۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "... گذشتہ تین دن سے میں اپنے ذہن میں صرف تمھارے نام ایک خط کا خاکہ

۱۔ یکم مارچ ۱۹۳۵ء کی اس تقریب میں خالدہ ادیب خانم بھی شریک تھیں اور سنگ بنیاد رکھنے کی رسم جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے عبدالعزیز نے چند اور بچوں کی مدد سے انجام دی تھی۔ خالدہ ادیب خانم نے ایک نہایت موثر تقریر بھی کی تھی۔

۲۔ Collected Works of Mahatma Gandhi Vol. LX, 1934-35, p.244)

۳۔ اس کا حوالہ صفحہ ۲۹۴ پر گزر چکا ہے۔

۴۔ Collected Works of Mahatma Gandhi (Vol. LXII, 1935-36, p.441)

بناتا رہا ہوں۔ مجھے یکے بعد دیگرے شعیب[1]، خواجہ[2] اور پھر ایک خود فراموشی کی حالت میں شروانی[3] کا خیال آیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ عظیم شخص اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور بھی مسلمان ہیں جنھیں میں جانتا ہوں، لیکن اس وقت تو یہی نام میرے سامنے آئے۔

"لیکن میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی میرے لیے ڈاکٹر انصاری کی مانند جو رفتہ رفتہ میرے لیے بے خطا رہنما بن گئے تھے، نہیں ہو سکتا۔ اس میں صلاحیت کا سوال نہیں ہے۔ یہ درحقیقت اعتبار اور بھروسے کا مسئلہ ہے۔

"اس وقت جب کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں، میرا احساس یہ ہے کہ جو بات میں پوچھنا چاہتا ہوں، وہ صرف تمھیں سے پوچھوں۔ وہ بات جو میں پوچھنا چاہتا تھا اور اب بھی پوچھنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ کیا تم ہندو مسلم مسئلے کے سلسلے میں میرے لیے وہ بن سکتے ہو جو ڈاکٹر انصاری تھے . . . کیا تم اس سلسلے میں ڈاکٹر انصاری کا جانشین بننا پسند کرو گے؟ جواب لکھتے وقت یہ نہ خیال کرو کہ سماج میں تمھارا مرتبہ کیا ہے۔ اگر تم میں خود اعتمادی ہے تو 'ہاں' کہو، اگر نہیں ہے تو منع کر دو۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔ میں تم سے جتنا واقف ہوں اور تم سے جس قدر محبت کرتا ہوں، اس میں کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

"تم میرے رہنما بنو یا نہ بنو، مہربانی کر کے میرے اس سوال کا جواب ضرور دو جو میں نے دوسروں کے علاوہ ڈاکٹر انصاری سے بھی اپنے آخری خط میں پوچھا تھا کہ کیا صوبہ سرحد کی حکومت کا یہ فیصلہ صحیح اور مناسب ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں کی لڑکیوں کے اسکول کو گرانٹ اس بنا پر نہ دی جائے کہ ان میں گرمکھی اور ہندی ذریعۂ تعلیم ہے؟ مہینوں سے مجھ پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں، ابھی تک میں اسے ٹالتا رہا ہوں۔ لیکن یہ مسئلہ اصول کا اور اہم نتائج کا حامل ہے۔ میں نے اس سلسلے

۱۔ شعیب قریشی ۲۔ عبدالمجید خواجہ

۳۔ تصدق احمد خاں شروانی (م ۱۹۳۵ء)

میں صاحبزادہ سرعبدالقیوم کو بھی لکھا۔ ان کا جواب تکلیف دہ ہے۔ اپنی رائے دینے سے پہلے، اگر چاہو تو تمھیں ان کے خط کی ایک نقل بھیجی جا سکتی ہے۔

تمھیں نہیں معلوم کہ مجیب نے ہندی۔ ہندستانی مسئلے پر اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے تم متفق ہو کہ نہیں[1]۔ میں چاہوں گا کہ تم، مجیب، عاقل[2] اور دوسرے احباب میرے ان دو مضامین کو پڑھ لیں جو ہریجن[3] میں شائع ہوئے ہیں اور اگر ان سے تم لوگوں کو اطمینان نہیں ہوتا تو میری خواہش ہوگی کہ ہم لوگ آپس میں مسئلے کے ہر پہلو پر تبادلۂ خیال کرلیں، خواہ ہریجن کے توسط سے یا نجی طور پر۔ مجھے تو اختلافِ رائے کا کوئی ایسا سبب نظر نہیں آتا، لیکن اگر ہے تو ہمیں اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔۔۔"

ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے مذکورہ بالا خط کا جواب یقیناً بڑے غور و فکر کے بعد دیا ہوگا کیونکہ ان کے جیسے حق پرست اور آزادانہ سوچنے والے شخص کے لیے یہ ایک بڑی ذمے داری تھی جو وہ لے رہے تھے۔ افسوس کہ اُن کا یہ خط ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا، البتہ اُن کے خط کا جو جواب گاندھی جی نے ۹ر جولائی ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا، وہ ہمیں مل گیا

۱۔ "مجیب صاحب کا ایک تاریخی خط" (جامعہ، مجیب نمبر، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء، صفحات ۱۶۲-۱۵۴)۔ مجیب صاحب نے اس مسئلے پر کہ ہندستان کی قومی زبان کیسی ہو اور اس کا نام ہندستانی ہو، ہندی ساہتیہ سمیلن کے ۱۵راپریل ۳۵ء کے اجلاس اندور کی تحریک پر جو بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنا تھا اس کے بعض ممبروں اور اس کے رسالے ہنس کے رویوں اور خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ مجیب صاحب کا اس سلسلے میں جو موقف تھا وہی جامعہ والوں اور ذاکر صاحب کا بھی تھا۔ گاندھی جی نے مجیب صاحب کے اسی خط کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط پریشد کے جلسے میں جو ناگپور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس کے ساتھ ہوا تھا اور جس کی صدارت گاندھی جی نے کی تھی، پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

۲۔ پروفیسر محمد عاقل، جامعہ کے استاد اور ذاکر صاحب کے ساتھی جو بحمداللہ ابھی حیات ہیں۔ انھوں نے پریشد کے جلسے میں جامعہ کی نمایندگی کی تھی۔

۳۔ ہریجن بابتہ ۹ر اور ۱۲ر مئی ۱۹۳۶ء

ملے، جس سے گاندھی جی کے اطمینان اور خوشی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اب ذاکر صاحب کو ملکی معاملات کے ایک خاص پہلو سے متعلق بابائے قوم اور بڑی حد تک ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے رہنما کے مشیر ہونے کا اعزاز اور مشکل کام مل رہا تھا۔ اس میں اگر اُن کی شخصیت کی قومی حیثیت کا اعتراف تھا تو ان کی آزاد شخصیت کے لیے ایک سخت آزمایش بھی تھی۔ گاندھی جی نے لکھا تھا کہ "مائی ڈیر ذاکر، ... ، یہ جو تم نے کھلے دل سے، فیاضی کے ساتھ، پورے طور پر میری تجویز کو منظور کر لیا ہے، تو اس سے میری ایک سخت تشویش دور ہوگئی ہے۔ یہ آگ بجھانے کی ان بالٹیوں کی مانند ہے جو ہمیشہ بھری رکھی جاتی ہیں، خواہ انھیں کبھی بھی استعمال کرنے کی نوبت نہ آئے۔ ان سے یہ بھروسا رہتا ہے کہ اگر آگ لگی تو ان بالٹیوں کی مدد سے اسے فوراً بجھایا جاسکے گا۔ ڈاکٹر انصاری نے بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دیا۔ اب میرے لیے تمھاری حیثیت وہی ہوگئی ہے۔ (اس سلسلے میں) ڈاکٹر انصاری کی خدمات سے مستفید ہونے کی ضرورت کبھی کبھی ہی پڑتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ میں تمھیں بھی زیادہ زحمت نہ دوں اور تمھارا زیادہ وقت نہ لوں۔ لیکن یہ بات کہ نازک موقعوں پر ہمیشہ تمھارا مشورہ مجھے حاصل رہے گا، میرے لیے بڑے اطمینان کی ہے۔"

اس خط میں سرحد کے سر عبدالقیوم سے خط و کتابت، ہندی۔ ہندستانی مسئلہ اور اس سلسلے میں مجیب صاحب کے خط کا ایک بار پھر ذکر کیا گیا تھا، اور گاندھی جی نے

۱۔ یہ خط ہمیں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے پروفیسر بمل پرشاد صاحب کی عنایت سے ملا ہے۔ اس کے ساتھ کئی اور خط بھی ذاکر صاحب کے نام گاندھی جی کے ملے ہیں جن کے اقتباسات اگلے صفحات میں ملیں گے۔ عجیب بات ہے کہ یہ خطوط کراچی کی قائدِ اعظم اکیڈمی میں قائدِ اعظم کے کاغذات کی فائل کی زینت ہیں۔ نہ معلوم یہ قائدِ اعظم کے کاغذات میں کیسے پہنچے۔ پروفیسر بمل پرشاد صاحب اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہیں سے وہ یہ انمول چیزیں لائے تھے۔ انھوں نے یہ سُن کر کہ میں ذاکر صاحب کی سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں، بڑی فراخدلی سے ان خطوط کی نقلیں مجھے عنایت کردیں۔ اس کے لیے میں ان کا صد درجہ ممنون ہوں۔

زبان کے مسئلے پر قدرے تفصیل سے اپنے موقف کی وضاحت کی تھی اور لکھا تھا کہ "ہاں، ایک بات ضرور ہے جس پر میں اصرار کروں گا۔ تم اور مجھ جیسے لوگ انتہا پسندوں کو بھی نظر انداز کر دینے کے موقف میں نہیں ہیں، یعنی ہم لوگ (ان کے معاملے میں) کوئی سخت رویہ نہیں اختیار کر سکتے۔۔۔"

گاندھی جی ذاکر صاحب کے نام اپنے خطوط کے آخر میں عام طور پر محبت اور خیرسگالی کے گہرے جذبے کے ساتھ باپو لکھتے تھے، اور ان میں انتہائی شفقت کے الفاظ بھی ہوتے تھے۔ کسی مسئلے پر ذاکر صاحب کی رائے معلوم کرنا چاہتے تو اس سے بھی محبت و احترام کا اظہار ہوتا۔ اس میں گاندھی جی کی بڑائی تو تھی ہی لیکن اس سے خود ذاکر صاحب کی شخصیت کے وزن اور اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے ۷ رجون ۱۹۳۷ء کے خط میں گاندھی جی نے لکھا تھا: "یہ خط میں تمھیں لکھ رہا ہوں اس احساس کے ساتھ کہ تم ڈاکٹر انصاری کے روحانی جانشین ہو۔" پھر اس میں بمبئی کے ہندو مسلم فساد کا ذکر تھا جو اسی زمانے میں ہوا تھا اور گاندھی جی اس طرح کے بار بار فرقہ وارانہ فسادوں سے بہت پریشان تھے، خاص طور پر اس وقت بمبئی کا جو فساد ہوا تھا وہ اُن کے نزدیک بس فساد برائے فساد تھا اور بظاہر کوئی خاص سبب اس کا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا تھا کہ "انھیں روکنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کیا تم کوئی تدبیر سوچ سکتے ہو؟ معاملہ سیاسی معاہدوں سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔" اس کے بعد گاندھی جی نے لکھا تھا کہ فسادات سے زیادہ وہ اس اُردو تنازعہ سے دُکھی اور پریشان تھے جو مدراس کے ایک وزیر کے بیان اور حکومت بہار کے ایک سرکلر کے سبب اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حکومت بہار کے سرکلر کی رو سے بہار کے دو ڈویژن میں اُردو اور ہندی دونوں رسم خط کا جاننا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا تھا کہ اگر انھوں نے "اس معاملے پر غور و فکر نہیں کیا ہے، تو غور و فکر کریں اور مجھے مشورہ دیں۔" دونوں سے متعلق وہ ذاکر صاحب کے تاثرات و خیالات سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ وہ کانگریس کی مسلم عوام سے رابطہ قائم کرنے کی تحریک (Muslim Mass Contact) سے متعلق بھی ذاکر صاحب کی رائے جاننا

چاہتے تھے۔

ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے اس خط کا جواب بڑی تفصیل سے دیا جس کے مسودے کی زیروکس نقل، جو قائد اعظم اکیڈمی (کراچی) میں قائد اعظم کے کاغذات کے فائل میں محفوظ ہے، ہمارے سامنے ہے۔[۱] گاندھی جی نے ذاکر صاحب کے اس جواب کی نقل ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کو بھیجی تھی اور انھیں لکھا تھا:

"اِس خط کے ساتھ تمھیں ذاکر کے خط کی نقل بھیج رہا ہوں جو انھوں نے میرے اس خط کے جواب میں لکھا ہے جس میں میں نے بمبئی کے حالیہ فساد اور منحوس ہندی۔اُردو تنازعہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس خط کے نیچے تلے شمولات سے جو بڑے غور و فکر کے بعد لکھا گیا ہے، تمھیں بھی آگاہ کروں۔"[۲]

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ذاکر صاحب کے اس خط سے، نظری اور عملی دونوں سطح پر، ان کی سیاسی بصیرت کا بہت کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہی سیاسی بصیرت جس کی کئی جھلکیاں ہم نے ابھی ان کی انگریزی تقریر کی تلخیص و ترجمے میں دیکھی تھیں۔[۳] ذاکر صاحب میں ایک کامیاب سیاسی لیڈر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں اور سیاسی زندگی کی کشش

---

۱. اس کے لیے بھی راقم الحروف پروفیسر بمل پرشاد صاحب کا شکر گزار ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے اس خط میں طویل ہوجانے کی معذرت اس طرح کی ہے: "خط کے طویل ہوجانے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں چونکہ آپ کو بہت کم لکھتا ہوں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ (میری اس گستاخی کو) معاف فرمائیں گے کہ میں نے آپ کا اتنا زیادہ وقت لیا۔"

۲- Collected Works of Mahatma Gandhi (Vol. LXV, 1937, pp. 445-446)

۳. دیکھیے اس کتاب کے صفحات ۳۰۱-۲۹۳

کبھی کبھی اُن کا دامن اپنی طرف کھینچتی بھی تھی، خاص طور پر اس وقت جب وہ دیکھتے کہ لوگ معاملات کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پا رہے ہیں اور کام صحیح اصولوں کے مطابق سلیقے سے نہیں ہو رہا ہے۔ ذاکر صاحب سیاست میں اخلاقی اصولوں کی بنیادی قدر و قیمت کا احترام چاہتے تھے، اور سیاسی تدبر کے معنی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ محض سیاسی داؤ پیچ میں مہارت کو عملی سیاست میں کامیابی کا معیار تصور کیا جائے۔ انھوں نے گاندھی جی کے ۷ رجون ۱۹۴۷ء کے خط کے جواب میں جو خط لکھا تھا اس سے اُن کے سیاسی معیاروں کو بھی سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، گاندھی جی چونکہ خود سیاست میں اخلاقی اصولوں کی اہمیت پر زور دیتے تھے، اس لیے وہ ذاکر صاحب کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے اس تاثر میں انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی شریک کرنا چاہا، مقصد غالباً یہ تھا کہ متعلقہ مسئلوں میں ذاکر صاحب کی سُجھائی ہوئی راہ پر چلنے کی کوشش کی جائے ذیل میں ذاکر صاحب کے خط کا آزاد ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا:

"ان دنوں ہمارے یہاں گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ میں اس عرصے میں زیادہ تر دہلی سے باہر رہا، واپسی پر آپ کا خط ملا۔

"میں کانپ اُٹھتا ہوں جب آپ مجھے ڈاکٹر انصاری کا روحانی جانشین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ میں کانپ اُٹھتا ہوں، اس لیے کہ جس ذمّے داری کے انجام دینے کی آپ مجھے دعوت دیتے ہیں وہ بہت بڑی ہے، اور میں ایک عجیب قسم کی افسردگی کے احساس سے اس لیے بھی کانپ اُٹھتا ہوں کہ کاش ڈاکٹر انصاری کا جانشین کوئی ایسا شخص ہوتا جو واقعی اس کا اہل ہوتا!

"آپ نے مجھ سے ہندو مسلم فسادات سے متعلق دریافت کیا ہے۔ میرا خیال ہے، اور ہمیشہ سے یہی میرا خیال ہے کہ ہم لفظ 'مذہبی' کا خواہ کیسا ہی خراب مفہوم اپنے سامنے کیوں نہ رکھیں، اصلاً ان فسادات کی شاذ و نادر ہی کوئی مذہبی وجہ ہوتی ہے۔ ان کا منصوبہ تیار کرنے یا انھیں شروع کرانے میں ایسے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے جن کے

مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں، اور ان کی اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں عوام کے مذہبی تعصبات سے جن کا دور دور تک کوئی واسطہ ان لوگوں کی شرانگیز اور بُری نیتوں سے نہیں ہوتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندازے ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں، اور اس بات سے پتا چلتا ہے کہ مختلف فرقوں کے مابین ہمہ وقت بے اعتباری اور شک و شبہہ کی ایک فضا قائم ہے جس سے کسی وقت بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ فسادات کے شروع کرانے والوں کے مقاصد اقتصادی یا سیاسی ہوتے ہیں اور بے اعتباری کی فضا جس سے وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں بنیادی طور پر نفسیاتی ہوتی ہے۔ پہلی صورت سے نبٹنے کے لیے ضروری ہے کہ اختیار اور طاقت سے موثر اور غیر جانبدارانہ طور پر کام لیا جائے۔ غیر جانبدارانہ اس طور پر کہ کسی کو اس کی غیر جانبداری پر شبہہ کے سایے کا بھی احساس نہ ہو، ورنہ اس سے نفسیاتی لحاظ سے بے اعتمادی کی فضا اور گہری اور بوجھل ہو جائے گی۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگ اِس وقت جو فیصلے کرنے والے ہیں ان کا نتیجہ شاید یہ ہو کہ اختیار و طاقت کانگریس کے ہاتھوں میں آجائے۔ دوسری صورت حال کا مقابلہ صرف اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ دونوں فرقوں کے ممتاز افراد اپنے عام طریقۂ کار سے ہٹ کر اس طرح مسلسل کوشش اور کام کریں جس سے شکوک و شبہات دور ہوں اور لوگوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اعتماد پیدا ہو۔ میں جان بوجھ کر 'اپنے عام طریقۂ کار سے ہٹ کر' کام کرنے کی بات کہہ رہا ہوں، کیونکہ صرف صحیح ہونا ہی کافی نہیں ہے، (کسی کے طرزِ فکر کا) صحیح ہونا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ اس سے نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہیں کھُل جائیں گی۔

"بہرحال، ہمیں معمول کے طریقے سے ہٹ کر یہ کام کرنا چاہیے۔ ہر شخص اپنے چھوٹے سے حلقے میں یہ کر سکتا ہے، لیکن بڑے پیمانے پر اور موثر انداز میں زیادہ لوگ یہ کام کریں، ایسا ہونا سرِدست ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمانوں میں خان عبدالغفار خاں صاحب کے علاوہ اور مجھے کوئی نظر نہیں آتا، اور ہاں، مولانا ابوالکلام آزاد بھی موجودہ گوشہ نشینی کے باوجود جن کا اثر اب بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ لوگ صرف اسی صورت میں یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں جب ان کے عمل سے یہ ظاہر ہو کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور

ان کی جائز مانگوں میں یہ بھی شریک ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ بعض بہت اچھے نیشنلسٹ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اپنی کمیونٹی سے الگ تھلگ کر لیا ہے، اس لیے گہری نفسیاتی اُلجھنوں کو سلجھانے کے کام میں وہ کچھ زیادہ موثر نہیں ثابت ہو سکتے۔ ان کی 'نیشنلزم' پر کوئی اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا، لیکن ان کی دانشمندی محل نظر ہے۔ مسلمانوں کے سچّے خادم رہ کر ہی وہ قوم کی کوئی موثر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ میں اِس دُہری وفاداری کے تقاضوں کو (خوش اسلوبی سے) نبھانے کی مشکلات سے واقف ہوں اور اُن لوگوں کی افسوسناک حالت سے ہمدردی رکھتا ہوں جو مسئلہ کو سادہ و آسان سمجھ کر اس سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

"ایک اخلاقی ہستی کی حیثیت سے اس طرح کے اختلافات، تضادات اور ان کی کشاکش انسان کا مقدر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق ہی اس طرح کی ہے کہ وہ اپنا توازن کھوئے اور پھر اسے دریافت کرے ... میں نے ذرا تفصیل سے یہ لکھا ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ Muslim Mass Contact کی تحریک بھی اس نکتے کو نظر انداز کر دے سکتی ہے۔ کانگریس کے مسلمان کارکنوں کو عام مسلمانوں کا اعتماد ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو پھر یہ کہا جائے گا کہ وہ پیدائشی مسلمان ہیں اور دیانتداری سے اپنی کمیونٹی کی مخصوص باتوں، عقیدوں اور طور طریقوں کو مٹانا چاہتے ہیں۔

"میں اُس خیال کی قدر کرتا ہوں جو Muslim Mass Contact کے پیچھے ہے، لیکن مجھے اس کے طریقۂ کار سے سخت اختلاف ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اشتراک و تعاون سے مُراد باہم دو فرقوں کا اشتراک و تعاون ہے، اس سے مُراد یہ نہیں ہے کہ دونوں فرقوں کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ پھر میرا خیال یہ بھی ہے کہ کانگریس کو خواہ مخواہ ان لوگوں کو ناراض نہیں کرنا چاہیے جو بظاہر مسلمانوں کے 'لیڈر' ہیں۔ یہ طریقۂ کار غلط ہے خواہ ان 'لیڈروں' کی زیادہ اہمیت اور ان سے بھلائی کی زیادہ امید نہ ہو۔ بھلائی کر سکنے کی ان کی صلاحیت کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے، لیکن ان میں نقصان پہنچانے کی صلاحیت ضرور ہے۔ خیر کا اثر رفتہ رفتہ ہوتا ہے اور شر آگ کی طرح بھڑک اُٹھتا ہے۔ صدیوں کے صبر آزما نشیب و فراز سے گزر کر خیر کے

ہاتھوں جو کچھ وجود میں آتا ہے اسے ماچس کی ایک تیلی ایک لمحہ میں تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مسلمانوں کے 'لیڈروں' کو خواہ مخواہ ناراض کر کے ہم انھیں اس بے اعتمادی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیں گے جو بڑی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اور مجھے تعجب نہ ہوگا اگر آیندہ انتخابات کے موقع پر جن میں کانگریس کے کچھ مُسلم سیٹوں کے جیتنے کا امکان ہے، الیکشن کے بخار کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ فساد کا لاوا پھوٹ پڑے۔ کوئی بھی رضامندی سے اقتدار دوسرے کو نہیں سونپتا، بے اصولے تو اور بھی نہیں۔ لیکن اگر کانگریس ان لوگوں کو بے ضرورت ناراض نہیں کرتی، تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ وہ پہلے ہی سے ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے ہیں اور انھیں ہتھیار ڈال دینا چاہیے۔ اس وقفے میں تلخی اور ہنگامہ خیزی کم سے کم ہو، اس کا بہت کچھ انحصار کانگریس کے لیڈروں کی دانشمندی اور تدبر پر منحصر ہے۔ ان لیڈروں کا فرض ہے کہ ہر قیمت پر مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو دور کریں۔ یہ بات میں ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نیشنلسٹ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ مسلم کمیونٹی کا رویہ مخالفانہ ہو یا مسلم کمیونٹی غیر مطمئن ہو تو ہم یہ اُمید نہیں کر سکتے کہ ایک متحدہ ہندستانی قوم کی تعمیر ہو سکے گی۔ غیر مسلموں میں صرف آپ اور پنڈت جواہر لال جی ہیں جن کی شخصیت میں اب بھی سحر آفرینی کی وہ صلاحیت ہے جو شبہہ کو اعتبار میں تحلیل کر دیتی ہے۔

'چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا جواہر لال جی کا اپنا خاص انداز ہے۔ انسانوں کی ایک جماعت ہے جو وجودِ انسانی سے متعلق ایک ہمہ جہت طرزِ فکر رکھتی ہے، اس کی پسند اور ناپسند، اس کا فکر اور اس کے عقائد اس کے اپنے ہیں، یعنی جامع انداز میں کہیں تو گویا اس کا اپنا مذہب ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے، لیکن جواہر لال جی اس 'اہمیت' کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے جو مسئلہ کو نہایت سادہ اور آسان بنا دینے کا انداز فکر ہے، فوری طور پر کچھ اچھے نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے وسیع پیمانے پر اس مسئلے کو حل کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ آپ مذہبی آدمی ہیں اور

اس حیثیت سے آپ ہی ایک شخص ہیں جو یہ کرشمہ دکھا سکتے ہیں۔ آپ پہلے ایسا کر چکے ہیں۔ بلاشبہ پچھلے چند برسوں میں حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ بظاہر اب اس کا موقع نہیں دکھائی دیتا، لیکن مجھ میں کہیں امید کی یہ کرن موجود ہے کہ آپ اب بھی یہ کرشمہ کاری کر سکتے ہیں۔ اس کے بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ کیوں میں ایسا سمجھتا ہوں۔ یہ تو اعتماد اور یقین کا معاملہ ہے۔ ملک کے حالات کے سبب، جیسے کہ وہ ہیں، آپ کیسے کرب میں مبتلا ہیں، اس کا اندازہ کر سکتا ہوں، لیکن ایک قوم کی روح کے تمام حسن و جمال کے کسی ایک ذات میں مجسم ہو جانے کی قیمت درد و کرب کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے! اور چونکہ آپ کی ذات ایسی ہی ہے، اس لیے یہ امید بھی کچھ ایسی بے جا نہیں کہ آپ (قوم کی) اس روح کے انتشار میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے — مقصد اتنا بلند ہے کہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔

آپ نے ہندی اور اُردو سے متعلق مدراس اور بہار سرکلر کے بارے میں میری رائے پوچھی ہے۔ مدراس کے بارے میں اب تک مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ بہار سے متعلق میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ میں نے بعض اخباروں میں پڑھا ہے، اور اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ بہار کے وزیر تعلیم نے ان اضلاع میں جہاں عدالتوں میں اب تک صرف ہندی ہی رائج تھی، اردو کے استعمال کی بھی اجازت دے دی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے صحیح قدم اُٹھایا ہے۔ مجھے تو یہ امید ہے کہ تمام صوبوں میں کانگریس کے ہر وزیر کی طرف سے یہ اعلانِ عام کر دیا جائے گا کہ تمام سرکاری دفتروں میں اُردو اور ہندی رسم خط کے استعمال کی اجازت ہے۔ کیونکہ متعلقہ علاقے میں یا تو کوئی ایسا شہری نہ ہوگا جو اُردو رسم خط استعمال کرنا چاہتا ہو، اور ایسی صورت میں اس اعلان کی کوئی اہمیت ہوگی نہ اس سے کوئی اُلجھن میں مبتلا ہوگا یا پھر یہ ہوگا کہ کچھ شہری یا محض ایک شہری اُردو رسم خط استعمال کرنے

زباں کے ارتقا کے حق میں بھی مہلک ہوگا اگر ہم نے ایسے شہریوں کو اِس سہولت سے محروم رکھا۔ اس سلسلے میں اخراجات اور انتظامی مشکلات کی بات لائی جا سکتی ہے۔ لیکن، جب قوم کے فرقوں میں سے جن سے مل کر قوم بنی ہے، دو سب سے بڑے فرقوں کے باہمی تعلقات کا اہم مسئلہ درپیش ہو تو اخراجات اور مشکلات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اُردو رسم خط کے استعمال کے حق کو تسلیم نہ کرنا مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے نزدیک اُردو دشمنی متصور ہوگی اور غیر مسلموں کی خاصی بڑی تعداد بھی اسے سخت ناپسند کرے گی۔ نہیں، باپوجی! زبان اور رسم خط کے مسئلے کے سلسلے میں ہمیں کانگریس کے اس موقف پر دیانت داری سے جمے رہنا چاہیے جو وہ پہلے طے کر چکی ہے ؛۔ ہندستانی مشترک زبان اور اُردو اور دیوناگری دونوں سرکاری طور پر تسلیم شدہ رسم خط۔ ضرورت ہو تو اس موقف کی حمایت حماقت کی حد تک بھی کرنی چاہیے، کیونکہ ایسے دو فرقوں میں جو ایک طرح سے اخوت کے رشتے میں منسلک ہیں، باہم بے اعتمادی کی صورت کے مقابلے میں یہ حماقت کہیں بہتر ہوگی . . ."

قومی زبان کا مسئلہ — 'ہندستانی'

یہی زمانہ ہے جب بعض صوبوں میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں، لوگ جوش میں تھے اور یہ احساس عام تھا کہ ہم مکمل آزادی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ہماری قومی زندگی میں یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ لیکن یہ نیا دور طرح طرح کے مسئلے بھی سامنے لا رہا تھا، اور ہندو اور مسلم فرقہ پرست ذہنیتیں ان مسئلوں کو اور بھی پیچیدہ بنا رہی تھیں۔ انھیں میں ایک اہم مسئلہ زبان کا مسئلہ بھی تھا، پچھلے صفحات میں اس سلسلے میں گاندھی جی کے نام مجیب صاحب کے ایک خط کا ذکر ہو چکا ہے، اور خود ذاکر صاحب کے نام گاندھی جی کے خطوں میں بھی اس مسئلے کا ذکر ملتا ہے۔ اُس وقت ہندی ساہتیہ سمیلن اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے جلسوں میں بعض تقریروں اور کارروائیوں

سے بھی فضا خراب ہو رہی تھی۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سکریٹری مولوی عبدالحق سخت ناراض اور پریشان تھے، اور خود گاندھی جی فرقہ داری تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی سے بہت فکرمند تھے۔ انھیں حالات میں انجمن ترقی اُردو صوبہ بہار کے سکریٹری قاضی عبدالودود کے اصرار پر ۲۰ اور ۲۹ اگست ۱۹۳۷ء کو اُردو والوں کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں زعمائے اُردو زبان و ادب کی خاصی تعداد شریک تھی۔ اس کانفرنس کی مفصل روداد مجیب صاحب کے قلم سے جو اس میں جامعہ کے نمایندے کی حیثیت سے شریک تھے، ماہنامہ جامعہ (اکتوبر، ۱۹۳۷ء) میں چھپی تھی جس سے قاضی عبدالودود کی دلچسپ شخصیت پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے، اور اس بات پر بھی کہ آیندہ اُردو ہندی۔ ہندستانی کا لسانی مسئلہ کیا رُخ اختیار کرنے والا تھا۔

اسی کانفرنس کے سلسلے میں ذاکر صاحب نے عابد صاحب کو ایک خط میں لکھا تھا:[1]

> "مولوی عبدالحق صاحب پٹنہ میں ایک اُردو کانفرنس کر رہے ہیں۔ مسئلہ بے شک اہم ہے۔ مگر میرا گمان ہے کہ مولوی صاحب کے مشیر قاضی عبدالودود صاحب بہت Reactionary بزرگ ہیں اور ان کے پیش نظر اُردو کے علاوہ خود اپنی اُستادی بھی ہے۔ مجھے بلایا تھا مگر بوجوہ جانے سے معذور تھا، اس لیے مجیب صاحب کو بھیج دیا ہے، مگر مولوی صاحب میرے نہ جانے پر ناخوش ضرور ہوں گے۔ میں نے بابو راجیندر پرشاد کو اس کانفرنس سے متعلق لکھا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ مولوی صاحب سے مل کر کوئی معقول راہ نکل آئے۔ ڈاکٹر محمود کو بھی لکھا ہے اور مہاتما جی کو بھی کہ وہ راجیندر بابو کو لکھیں۔ سیدین صاحب غالباً پٹنہ گئے ہوں گے۔ ان کے وہاں جانے سے اُمید ہوتی ہے کہ مولوی صاحب صرف "جہاد" نہ کریں گے بلکہ کوئی عملی صورت اُردو کو بچانے کی نکال سکیں گے۔"

۱۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے، لیکن یہ لکھا گیا ہوگا اگست، ۱۹۳۷ء میں کانفرنس کے انعقاد کے دو ایک روز پہلے۔ (متعلقہ فائل، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

اسی سلسلے میں ذاکر صاحب نے گاندھی جی کو جو خط لکھا تھا، اُس کا جواب انھوں نے ۲۷ر اگست ۱۹۳۷ء کو لکھا:

"مجھے کل آپ کا خط ملا، اس لیے میں نے راجیندر بابو کو تار بھیجا کر وہ کانفرنس میں شرکت کریں اور مولوی عبدالحق صاحب سے ملیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ناگپور نے انھیں اس قدر پریشان کر دیا۔ ابھی تک مجھے ان کی ناراضگی کا سبب نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجیب کو پٹنہ بھیجا ہے۔ مجھے لکھو کہ وہاں کیا ہوا۔"[۱]

تفصیل کا تو یہ موقع نہیں، لیکن مسلمانوں میں مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت اور کانگریس میں دائیں بازو کے بعض با اثر ہندوؤں کی کھلی فرقہ پرست ذہنیت کے سبب عام سیاسی فضا کے ساتھ ساتھ تعلیمی و لسانی مسئلے بھی محض جذباتی ہو کر رہ گئے تھے، یا یوں کہیے کہ وہ بھی فرقہ واریت کا شکار ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب اُس ہندی زبان کے عائد کیے جانے کے سخت خلاف تھے جو گاندھی جی کے تصور کی قومی زبان بننے والی زبان نہ تھی۔ گاندھی جی کی طرح ذاکر صاحب بھی اُردو۔ہندی لسانی قضیے کا حل "ہندستانی" کے فروغ میں دیکھتے تھے اور اس کے لیے پورے طور پر کوشاں تھے۔ اپنی ایک تقریر میں جو ۲۳ر فروری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی تھی، انھوں نے اپنے سامعین سے ہندستانی میں گفتگو کر کے بتایا تھا کہ ہندستانی کیسی زبان ہے، اور کہا تھا کہ "ہندستانی وہ ہے جو میں آپ سے بول رہا ہوں... اچھی ہندستانی کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ نہ اُردو والا اس میں عیب نکال سکے نہ ہندی والا اس پر کہیں انگلی دھر سکے"۔ انھوں نے کہا تھا کہ "اُردو۔ہندی۔ہندستانی کا جھگڑا کچھ اس ڈھنگ سے چل رہا ہے اور لوگ اس کے سلجھانے میں وہ وہ الجھاؤ ڈال

۱- Collected Works of Mahatma Gandhi (Vol.LXVI,1937-38, p.76)

رہے ہیں کہ سیدھی سادی بات کھٹائی میں پڑگئی ہے۔" ملک میں ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ زبان کو شُدھی اور شُدھ ہونا چاہیے' اس کے لیے تحریکیں چلا رہے تھے اور شمالی ہندستان کے جن صوبوں میں کانگریس کی حکومت تھی' وہاں تو بڑے بھونڈے ڈھنگ سے اس پر عمل بھی ہونے لگا تھا۔ گاندھی جی اس صورت حال سے خوش نہ تھے اور ذکر حسنا دیکھ رہے تھے کہ زبان کا یہ جھگڑا اُن لوگوں کا اٹھایا ہوا ہے جو ہندستانی قومیت کا صحیح تصور نہیں رکھتے' اور اس لیے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد بلکہ پورے ملک کے اتحاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں چونکہ اُن کا ذہن صاف تھا اور متحدہ ہندستانی قومیت کے بارے میں ان کا خیال انصاف' حقیقت اور تاریخی بصیرت پر مبنی تھا' اس لیے انھوں نے زبان کو شُدھی اور شُدھ بنانے کی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے صاف صاف کہا:

"میں آپ کو سچ سچ بتاؤں کہ زبان کو شُدھ بنانے کی اس کوشش نے ہی ہندی اُردو کا جھگڑا چھیڑا ہے نہیں تو پہلے لوگ اُردو ہندی کا فرق بھی نہ جانتے تھے۔ اُردو کے اچھے اچھے لکھنے والوں نے اپنی زبان کو ہندی بتایا ہے۔ وہ تو جب سے اس ملی جلی زبان میں سے عربی فارسی کے لفظوں کو نکال نکال کر سنسکرت لفظ لکھے جانے لگے تو دو الگ الگ زبانیں بننے لگیں۔ ہندی والے شُدھ ہندی لکھنے لگے۔ اردو والے عربی فارسی کے بے جوڑ لفظ بھی زبان میں لانے لگے۔ مگر اُردو والے پورا پورا جواب دیتے تو کیسے دیتے۔ وہ دو دن کی لڑائی میں اپنا صدیوں کا کام کیسے مٹا دیں۔ انھوں نے اپنی زبان کے لیے ہندستانی ڈھانچہ اپنایا ہے۔ ہندستانی گرامر پر چلتے ہیں۔ لفظوں کا دیس اور نسل اور مذہب دیکھ دیکھ کر ان سے گھنیانا انھیں نہیں آتا۔ پھر بھی نہ جانے غصے میں یا کیوں ان کے کچھ لکھنے والے بھی جوڑ بے جوڑ عربی فارسی کے لفظ لکھ مارتے ہیں...

"لیکن زبان کو شُدھ کرنے کی یہ کوشش جس سے اُردو ہندی کا جھگڑا نکلا آخر کیوں کی جا رہی ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس میں کوئی غلطی ہو تو جتانی چاہیے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ جب قوموں کو اپنے آپے کا دھیان ہو چلتا ہے تو وہ ہر ہر چیز میں چاہتی ہیں کہ ان کی اپنی ہو اور پرایا اس میں کچھ نہ رہے۔ کچھ بُرائی

چیزوں سے انھیں دُکھ پہنچتا ہے اس لیے وہ ہر چیز سے جس پر پُرانی ہونے کا ذرا بھی شبہہ ہو سکے بے زار ہوتی ہیں۔ جلدی میں وہ یہ نہیں سوچتیں کہ کچھ پرائے اپنے ہو چکے اور کچھ پرائے ہی ہیں۔ کچھ پرائی چیزوں سے زندگی تنگ ہوتی ہے۔ کچھ پرائی چیزوں نے زندگی کو آگے بڑھایا ہے۔ باہر سے کچھ ہوائیں ایسی آتی ہیں جن سے زندگی کی کھیتی مُرجھا جاتی ہے تو کچھ ایسی بھی آتی ہیں جن سے مُرجھائی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ دونوں کو ایک جاننا اور ان کے فرق کو نہ سمجھنا بڑی ہی بھول اور نادانی ہے۔ ہندستانی زبان میں جو لوگ پُرانے لفظ ڈھونڈتے اور انھیں نکالنے کی فکر کرتے ہیں وہ اسی بھول میں پڑے ہوئے ہیں۔ جس ہوا سے ہمارے دیس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے اور جن کی باس سے اس کی ہوائیں آج تک بسی ہوئی ہیں وہ اسے جھلستی لُو کا ایک جھونکا جانتے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہ کہوں، جو لوگ ہندستانی زبان سے عربی فارسی کے بول چُن چُن کر نکالنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے جو چیزیں بنی ہیں وہ پاک نہیں۔ ان میں سے پردیسی میل کچیل نکال باہر کرنا چاہیے۔ شاید وہ جانتے نہیں کہ یہ میل کچیل ہماری زندگی کے رونگٹے رونگٹے میں بھر گیا ہے۔ انھیں اُردو ہی میں سے عربی لفظ نکالنے نہ ہوں گے تلسی داس، سورداس اور کبیر داس کی زبان کو بھی شُدھ کرنا ہوگا۔ یہ ایسی ہی کوشش ہوگی جیسے کوئی سر پھرا گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑا انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہے۔ اور یہ کوشش یہیں رُکے گی کیوں! پھر ہر چھوٹی چھوٹی ٹولی کا دیس بھی الگ ہوگا۔ زبان بھی الگ الگ ہوگی۔ راجدھانی بھی الگ الگ۔ ہماری تاریخ کے کولھو کا بیل جہاں سے چلا تھا پھر وہیں پہنچ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کرنے والے یہ بھی کر ڈالیں۔ دوسرے کو چڑھانے کے لیے کہیں کہیں اپنی ناک کاٹ لینے کا حال بھی سنا ہے اور دیوانگی میں تو لوگ آپ اپنے گلے پر چھری پھیر لیتے ہیں۔ مگر جسے ہندستان کے بسنے والوں کی سمجھ پر ذرا بھی بھروسا ہوگا وہ یہ نہیں مان سکتا کہ ایک قوم کی قوم ایسی دیوانی ہو جائے گی۔"

دیوناگری اور فارسی رسم خط میں لکھی جانے والی اور آسانی سے سمجھ میں آنے

والی 'ہندستانی' کو قومی زبان بنانے کے لیے گاندھی جی نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جدوجہد کی، لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ذاکر صاحب نے ان کی شہادت (۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء) کے بعد بھی کچھ دنوں تک یہ مہم جاری رکھی لیکن جب ہندستان کی دستور ساز اسمبلی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ہندستان کی قومی زبان دیوناگری رسم خط میں ہندی ہوگی تو گویا سرکاری طور پر 'ہندستانی' کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غیر سرکاری سطح پر آخر کیوں ہندستانی کو اپنی موت آپ مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا؟

۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب نے دکشن بھارت ہندستانی پرچار سبھا کے تقسیم اسناد کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے "ہندستانی" کے بارے میں قریب قریب وہی باتیں دہرائی تھیں جو انھوں نے ۱۹۳۹ء کی اپنی ریڈیائی تقریر میں کہی تھیں۔ انھوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے باریک اور پیچدار خیالوں اور دولت اور طاقت والوں کی معاشی اور سیاسی خود غرضیوں کی وجہ سے ہندستان کے عام نواسیوں کے ظاہری فرق کو جو بڑھاوا ملا تھا اور جسے بدیسی حکومت نے اپنی مصلحت سے اور گہرا کر دیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسی سب کے نتیجے میں "دیش کے دو ٹکڑے ہو گئے اور یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہ ہو جائیں۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "اگر آپ اس ڈر کو مٹانا چاہتے ہیں تو ان کھاڑیوں کو جو ایک دوسرے کی بھاشا نہ جاننے کے کارن پرانتوں کی جنتا کے بیچ میں ہے، 'ہندستانی کے دوارا پاٹ دیجیے۔" ذاکر صاحب کو "ہندستانی بھاشا میں ہندستان کی اصل روح کی جھلک" دکھائی دیتی تھی، انھوں نے اس موقع پر جنوبی ہندستان والوں سے شمالی ہندستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اتر میں دھرم کے نام پر ایسے بھیانک جھگڑے ہو رہے ہیں جن سے دیش کی ساری زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے، یہاں تک کہ بھاشا کے میدان میں بھی لڑائی چھڑ گئی ہے۔ ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اردو ہندی کی لڑائی میں 'ہندستانی' ماری جائے۔ جو اردو کے کئی پرانتوں کی ماتر بھاشا ہے (اور) جسے آپ راشٹر بھاشا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوں تو مجھے آشا ہے کہ کرودھ کی یہ آگ جو دیش کی بانٹ سے بھڑک

اُٹھی ہے تھوڑے دنوں میں دب جائے گی اور ہم سمجھ سے کام لے کر بھاشا کے سوال کو فرقہ داری درشٹی سے نہیں بلکہ قومی درشٹی سے حل کرسکیں گے۔۔۔"

اب اگر "ہندستانی" ہندستان کی قومی روح کی ترجمان تھی اور وہی مختلف خیال اور عقیدے کے گروہوں کے بیچ کی خلیج کو پاٹ سکتی تھی تو لوگوں کا یہ سوال بظاہر صحیح ہوگا کہ کیوں رفتہ رفتہ "ہندستانی" کے پُرجوش حامی بھی اس لڑائی میں پیچھے ہٹتے گئے؛ آج شُدھ ہندی کی اشاعت سے ملک کی سالمیت کو جو خطرہ پیدا ہوگیا ہے، وہ وہی ہے جس سے ذاکر صاحب نے ۱۹۴۰ء میں قوم کو متنبہ کیا تھا۔ سوال کرنے والے کہیں گے کہ ہم مانتے ہیں کہ دستور کی رو سے دیوناگری خط میں ہندی کے قومی زبان بن جانے کے معنی یہ تھے کہ شُدھ ہندی والے اپنے مقصد میں کامیاب تھے، اور اب ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ ہندستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد جیسے کھرے نیشنلسٹ اور عظیم قومی رہنما کو بھی اپنی "بے پناہ شخصیت" کی مدافعت میں پارلیمنٹ میں ایک سخت تقریر کرنی پڑی تھی[1] لیکن اُس وقت کوئی "مردِ درویش" ایسا سامنے نہ آیا جو اس

۱۔ دستور ساز اسمبلی میں ہندستان کی قومی زبان کے مسئلے پر جب بحث ہوئی تھی تو مولانا آزاد ہندستانی کے حق میں تھے۔ پرشوتم داس ٹنڈن نے مولانا کے اس موقف کا حوالہ دیتے ہوئے یہ الزام لگایا تھا کہ "ایجوکیشن منسٹر اب بھی جو کام کر رہے ہیں، جو کچھ مدد دے رہے ہیں وہ ہندی کے لیے نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہندستانی کے لیے دے رہے ہیں۔۔۔" مولانا آزاد نے اس کا مسکت جواب دیا تھا۔ ٹنڈن جی نے ایک شکایت یہ کی تھی کہ وزارت تعلیم نے شبلی اکاڈمی (اعظم گڑھ) کو جو ساٹھ ہزار روپے کی نان ریکرنگ گرانٹ دی ہے تو اس سے اسلامک کلچر کی ترقی مقصود ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ "یہ جو انھوں نے اس کی شکایت کی تو کیا اس وجہ سے کہ ان کو ہندی کی محبت ہے؛ نہیں۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ کوئی دوسری زبان آگے بڑھے۔ یہ جذبہ کام کر رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اپنا قد اونچا کرلیجیے لیکن آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہوجائے۔۔۔ اگر ہندی کی ترقی کے راستے میں کوئی (باقی اگلے صفحہ پر)

لسانی عصبیت اور تنگ نظری کی ہوا کے رستے میں 'ہندستانی' کا چراغ جلائے رکھنے کا عزم کرتا۔ اس کے برخلاف ہوا یہ کہ اردو اور ہندی والے ایک بار پھر حسبِ معمول اپنی اپنی ڈگر پر چلنے لگے، بلکہ بہت سے اردو والے بھی غالباً جمہوری ہندستان کی انتظامیہ کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے رفتہ رفتہ اپنی پبلک تقریروں اور تحریروں کو ہندی کے جوڑ بے جوڑ اور کٹھن شبدوں سے بوجھل بنانے لگے۔ عجیب ہیں اُس جمہوریت کے تقاضے بھی جس میں بندوں کو صرف گنتے ہیں، اور اکثریت کا جبر ایک سیاسی قدر بن جاتا ہے!

(سلسلہ صفحۂ گذشتہ) رکاوٹ ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ وہ اُس طرح کے دماغوں کی رکاوٹ ہے"۔ اس کے بعد مولانا نے کہا کہ ۱۹۰۷ء سے لے کر جب وہ بنگال کی انقلابی پارٹی میں شریک ہوئے تھے "آج تک میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے"، اب نہ انھیں کوئی غرض ہے اور نہ خواہش، اور جس کے دل میں غرض نہیں ہوتی وہ "بے پناہ ہو جاتا ہے۔۔" اور "بے پناہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی"۔ پھر انھوں نے صاف صاف کہا کہ "ہندستان پر، ملک پر جو مصیبت آئی، ٹو نیشن تھیوری اور پاکستان بنانے کا پوائنٹ آف ویو، اور پھر پاکستان کا بننا۔ اس مصیبت کی جتنی ذمے داری گمراہ مسلمانوں پر اور مسلم لیگ پر ہے اتنی ہی ذمے داری اُس طرح کے دماغوں پر بھی ہے"۔

(پارلیمنٹری ڈیبیٹس، ہاؤس آف پیپل، ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء)

نواں باب

تخریب کے مرحلے، تعمیر کے حوصلے

پچھلے صفحات میں ہم نے ذاکر صاحب کے نظریۂ قومیت کو وضاحت سے بیان کیا ہے جس چیز کو وہ سچی مذہبیت سمجھتے تھے اس پر بھی ہم کچھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ کوئی دس سال جامعہ کے کاموں کے ساتھ بنیادی قومی تعلیم کی مہم میں مشغول رہے لیکن سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ تھا بڑا پُرآشوب، اس دَور کی ملکی سیاست میں ہندو مسلم مسئلہ نے بڑی نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ مسلم لیگ کی طرف مسلمان تیزی سے کھنچے جارہے تھے اور وہ یہ پروپیگنڈہ کررہی تھی کہ کانگریس مسلمانوں کی دشمن ہے۔ ذاکر صاحب نے چونکہ بنیادی قومی تعلیم میں اپنے آپ کو جھونک دیا تھا' اس لیے مسلم لیگ والوں کا یہ خیال بن گیا تھا کہ وہ پکے کانگریسی ہیں اور وہ کانگریس کی ہر بات کی، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط' تائید ہی کریں گے' اور اُن کے یا مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کرسکیں گے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں پاکستان ریزولیشن کے بعد تو 'مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ' والی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کی مذہبیت اور اسلامیت کے لیے مسلم لیگ کا یہ پیمانہ بہت ہی چھوٹا' تنگ اور محدود تھا۔ اس کی پہنائی کی سمائی اس تنگی میں کہاں ہوسکتی تھی!

اور ایسے میں جامعہ کو فرقہ وارانہ سیاست سے محفوظ بھی رکھنا تھا۔ یہ گویا ذاکر صاحب

کی فراست و تدبر کا امتحان تھا۔ وہ نیشنلسٹ مسلمان تھے اور مسلم لیگ کی 'توڑنے' اور فصل' پیدا کرنے والی سیاست سے بہت دور۔ وہ اس صورت حال پر بہت مضطرب تھے کہ ہندستانی قوم کی ہیئت اجتماعی کے ایک ناگزیر عنصر ہونے کے باوجود مسلم کمیونٹی کے مسئلے کو فراخ دلی، وسیع النظری، دانشمندی اور سیاسی تدبر سے حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ انھوں نے گاندھی جی اور پنڈت جواہرلال نہرو کی توجہ ہندستانی سیاست کے اس اہم مسئلے کی طرف بار بار مبذول بھی کرائی۔ لیکن اگر ایک طرف فرقہ واریت کے دیو نفرت و تعصب کے پجاریوں نے جنھیں برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں سے شہ ملتی تھی، مفاہمت کی ہر کوشش کو ناکام بنادیا، تو دوسری طرف ۱۹۳۷ء میں صوبوں کے انتخابات میں کانگریس کی کامیابی نے کانگریس کے بعض اہم لوگوں کو بڑی حد تک اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد کانگریس کے ساتھ ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی کہ ایک طرح کی آئیڈیلزم ان کی فطرت ثانیہ تھی، یہ رائے تھی کہ ملک کا اصل مسئلہ سیاسی اور معاشی ہے۔ فرقہ واریت تو ایک ضمنی چیز ہے یا فرقہ واری مسئلے ایسے ہیں کہ وہ قومی تحریک کے سیاسی و معاشی مسائل کے حل ہو جانے کے بعد خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو کے خطوط اور بیانات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اور Muslim Mass Contact کی تحریک اور مسلمانوں کے مسلم لیگی لیڈروں کے رد عمل کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں[1]۔ بہرحال ہندو مسلم مسئلہ روز بروز اور پیچیدہ ہوتا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا قلبی اضطراب انھیں اُکساتا ہوگا کہ وہ خاص اس مقصد کے لیے عملی سیاست کے میدان میں کود پڑیں، لیکن ان کے اندر جو معلّم تھا اور ان کے سامنے جو تعلیمی مقاصد تھے، وہ انھیں ایسا کرنے سے روکتے ہوں گے، اور بالآخر جیت ہوئی ہوگی (اور جیسا کہ معلوم ہے ہوئی) معلّم کو۔ پھر بھی ایک مضطرب اور دردمند دل رکھنے والے معلّم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۳۹ء

Selected Works of Jawaharlal Nehru, V.8, "The Congress and Muslims" -۱

میں گاندھی جی اور پنڈت جواہرلال نہرو کے سامنے کچھ تجویزیں رکھیں[1]۔ افسوس کہ اس وقت صورت حال کچھ ایسی بگڑی کہ کسی خاص پیش رفت کی امید نہ رہی[2]۔

قومی سیاست اور مُعلّم کا رول

اب اس کے بعد مُعلّم یہی کر سکتا تھا کہ جب بھی موقع ملے اپنے درد آشنا دل کے داغ لوگوں کو دکھائے، سیاسی قائدین کو ہوشمندی اور تدبر کی دعوت دے اور سیاسی سطح کی باتوں کو چھوڑ کر مفید سماجی کاموں میں معاشرتی لحاظ سے، جہاں تک ممکن ہو، سب کے ساتھ تعاون کرے۔ بنیادی تعلیم کی اُس کانفرنس میں جو جامعہ میں ہوئی تھی (۱۹۴۱ء) ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کی معرفت ذاکر صاحب نے تمام سیاسی رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے...[3]" سماجی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے جس بات اور جس اقدام کو انھوں نے صحیح سمجھا اُسے برملا کہا اور گاندھی جی سے عقیدت رکھتے اور قومی تحریک کی ایک مشہور و معروف شخصیت ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اینگلو عربک کالج دہلی کے معاملات میں

۱۔ گاندھی جی اور پنڈت جی کے نام وہ خطوط جن میں یہ تجویزیں ہوں گی، ہمیں دستیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن ذاکر صاحب اور مہادیو دیسائی کے نام پنڈت جی کے خطوط مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء اور ۴ دسمبر ۱۹۳۹ء سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے خطوط کس نوعیت کے ہوں گے۔ دیکھیے Selected Works of Jawaharlal Nehru, Vol. 10, pp. 378, 389

۲۔ یہ زمانہ وہ ہے جب صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے استعفا دے دیا تھا۔ ان کے خلاف مسلمانوں پر "مظالم" کی ایک رپورٹ (بعض صوبوں میں، مثلاً یو۔پی، بہار وغیرہ) مسلم لیگ نے تیار کرائی تھی اور غالباً مسٹر محمد علی جناح کے ذہن میں "یوم نجات" منانے کا خیال پرورش پا رہا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ لیگی سیاست کا رُخ اس وقت کیا تھا۔

۳۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر کا متعلقہ اقتباس کتاب کے چھٹے باب میں ملاحظہ کیجیے۔

اس کی گورننگ باڈی (مجلس انتظامیہ) کے وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ساتھ جو پریسیڈنٹ اور مسٹر محمد علی جناح کے دست راست تھے، پورا تعاون کیا[1]۔ حالانکہ انھیں مسلم لیگ کے سیاسی مقاصد اور اس سے زیادہ ان مقاصد کو پیش کرنے کے طور طریقے سے شدید اختلاف تھا۔ زاہد حسین جو اس وقت دہلی کے چیف کمشنر کے مشیر مالیات تھے، کالج کی مجلس انتظامیہ کے خازن تھے۔ لیاقت علی خاں اور زاہد حسین دونوں کو تعلیم سے اور کالج کے تعلیمی و انتظامی مسائل سے جن میں باہم ایک خاص ربط ہوتا ہے، کوئی دلچسپی نہیں تھی، انھیں تو بس اس سے دلچسپی تھی کہ کالج چونکہ مسلم ادارہ تھا اس لیے اس میں مسلم لیگ کا اثر ہونا چاہیے اور اسی لیے انھوں نے یہ عہدے قبول بھی کیے تھے۔ انھیں، بہر حال، ذاکر صاحب کی تعلیمی و انتظامی سمجھ بوجھ پر پورا اعتماد تھا اور انھیں کے مشورے سے وہ کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح اینگلو عربک کالج عملاً ذاکر صاحب ہی کی ذمّے داری تھی۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں اینگلو عربک کالج کے تمام ریکارڈ برباد اور ضائع ہو گئے۔ وہ دستیاب ہوتے تو آج پتا چلتا کہ اُس دَور میں ذاکر صاحب نے کالج کو کس طرح چلایا اور کیا کیا جتن کر کے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ہاں، ہم اس سے بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شہر دہلی میں انگریز حکام اور سر برآوردہ ہندو مسلمان شہری سبھی ان کا احترام کرتے تھے، نوجوان طالب علموں کے دلوں میں، خواہ وہ کسی کالج کے ہوں، ان کے لیے بڑی محبّت اور عزّت تھی، اور جب سر ماریس گائر دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ذاکر صاحب کو ان کا احترام بھی ملا اور بھرپور اشتراک و تعاون بھی۔ اسی زمانے میں طالب علموں کی تنظیموں نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور انھوں نے آگرہ اور سری نگر کے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاسوں کی

۱۔ ذاکر صاحب ۱۹۴۲ء میں اینگلو عربک کالج کی مجلس انتظامیہ کے رُکن اور وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔

صدارت بھی کی۔[1]

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی اور اس برصغیر کے ایک حصے میں خونیں فسادات ہوئے تو دہلی کے مسلمانوں پر بھی مصیبت آئی اور ان کی ایک بڑی تعداد پاکستان کو سدھاری اور بہت سے لوگ دہلی چھوڑ کر آس پاس کے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں چلے گئے، مسلم لیگ کی قیادت بھی رخصت ہوئی اور اینگلو عربک کالج مہینوں بند رہا۔ اینگلو عربک کالج اینڈ اسکولس سوسائٹی نام کی ایک رجسٹرڈ سوسائٹی تھی جو کالج اور کئی اسکولوں کو چلاتی تھی، ملک کی تقسیم کے نتیجے میں اس کی تمام منقولہ و غیر منقولہ املاک ۴ر جون ۱۹۴۸ء کے گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ کی رو سے Evacuee Property قرار دی گئی تھیں، اب ذاکر صاحب کے سامنے ان املاک کو واگزار کرانے کا مسئلہ تھا۔ سوسائٹی کے اس وقت کے صدر مسٹر ڈی۔ ایم ملک کراچی جا کر بس گئے تھے۔ ذاکر صاحب کی ایما پر مرزا محمود بیگ کراچی گئے اور وہاں سے مسٹر ملک کی ایک تحریر لائے (مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۴۸ء) جس کی رو سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مستقل طور پر سوسائٹی کی ساری املاک اور واجبات منتقل کیے گئے تھے اور ذاکر صاحب کو جامعہ کی جانب سے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان سب کا چارج دیا گیا تھا۔ مسٹر ملک نے مذکورہ بالا سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے جس کے ہنگامی حالات کے اختیارات میں اس طرح کی منتقلی بھی شامل تھی، یہ ضابطے کی تحریر دی تھی۔ چنانچہ جون ۱۹۴۹ء میں بڑی کوششوں کے بعد کسٹوڈین کے قبضے سے سوسائٹی کی املاک کا انخلا عمل میں آیا اور ذاکر صاحب کی توجہ اور اثر سے اس کے کالج[2] اور اسکول وغیرہ کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔ گویا مسلم لیگ کے بگاڑے ہوئے کام کو بنانے کی ذمے داری

۱۔ ذاکر صاحب کے ان اجلاسوں کے خطبات ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں ذاکر صاحب نے نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے بڑی قابل قدر باتیں کہی تھیں۔ لیکن طالب علموں کی تنظیموں کے مقاصد زیادہ تر سیاسی تھے، اور ذاکر صاحب اسے جانتے بھی تھے۔ اس لیے جیسے ہی یہ اندازہ ہوا کہ لڑائی میں اتحادیوں کی جیت ہوگی، یہ تنظیمیں بھی غیر متحرک ہو گئیں۔

۲۔ اب اس کالج کا نام ذاکر حسین کالج ہے۔

اب اُن نیشنلسٹ مسلمانوں کی قرار پائی جنھیں مسلم لیگ والے عام طور پر مسلمان سمجھنے میں بھی پس و پیش کرتے تھے۔

کانگریس میں "دیش بھگتوں" کا ایک طبقہ وہ تھا جو ہندستانی قومیت کے معنی یہ سمجھتا تھا کہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنی شناخت اور خصوصیتوں کو باقی رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، ایک طبقہ وہ تھا جس کا قومیت کا تصور باہر سے درآمد کیا ہوا تھا اور جس کی وطنیت کا مفہوم یہ تھا کہ ہر صورت میں وطن کی پوجا ہی اصل قدر ہے، خواہ کبھی کبھی اس سے اعلا اخلاقی قدروں کا خون ہی کیوں نہ ہوتا ہو، اور ایک طبقہ وہ بھی تھا جس کا جھکاؤ سوشلزم کی طرف تھا۔ اس کے نزدیک اُس وقت ملک کا اصل مسئلہ سیاسی اور معاشی تھا۔ وہ ملک میں مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے وجود کا منکر نہیں تھا، لیکن ان کے مسئلوں کو ثانوی حیثیت کے مسئلے تصور کرتا تھا جو بہت بڑی حد تک سیاسی و معاشی تبدیلیوں کے ساتھ خود بخود حل ہو جانے والے تھے۔ ذاکر صاحب کی نیشنلزم اِن تینوں طبقوں میں پوری طرح کہیں بھی نہ کھپتی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو پہلی کُل سندھ تعلیمی کانفرنس (کراچی) میں انھوں نے اپنے صدارتی خطبے کے ذریعے اس خیال کا بڑی بلند آہنگی سے اعلان کیا کہ وہ ایسے اسکولوں کا خیر مقدم کریں گے جو کسی مذہبی فرقے یا تہذیبی جماعت سے وابستہ ہوں۔ انھوں نے اہل سندھ سے کہا کہ وہ "اپنے ملّا اسکولوں (مسلم اسکولوں) کو جو ایک بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں مستحکم بنائیں اور اس کی پروا نہ کریں کہ اس طرح کے فرقہ واری اسکولوں کو لوگ... اصولاً غلط اور عملاً مضرت رساں بتاتے ہیں۔ اگر کسی جگہ ایک خاص فرقے کے بچّے ہوں اور ان کے اسکول اپنے بچّوں کی تعلیم کے سلسلے میں اس فرقے کی بعض تہذیبی اشیاء کو استعمال کرنا چاہتے ہوں، تو وہ اسکول محض اس وجہ سے خراب اسکول نہیں کہے جا سکتے۔" اس کے بعد انھوں نے بچّوں کی سیرت سازی کے کام میں ایسے اسکولوں کی افادیت بتائی اور کہا کہ فرقہ واری یا جماعتی امتیازات کو خیرباد کہہ دینے کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت قومیت کے ایک ایسے تصور کا مطالبہ ہے جو تہذیبی رنگارنگی کو ختم کر دینے کا خواہاں ہے۔ "یہ مطالبہ نامناسب اور غیر دانشمندانہ

ہے اور اسے اس ملک کے لوگ کبھی نہیں مانیں گے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گویا جمہوریت میں شہریوں کو اپنی انفرادیت سے محروم ہو جانا چاہیے، کسی مشترک تہذیبی یا سماجی مقصد کے لیے انجمنیں نہیں بننی چاہییں اور وفاداری اور اطاعت اگر کی جائے تو صرف اس دیوتا کی کی جائے جو دیوتاؤں میں سب سے زیادہ غیر ذی شعور اور غیر مستقل ہے، یعنی 'اکثریت'۔"[1]

بچوں کا گھر، دریا گنج، دہلی

دہلی کی سماجی، تعلیمی اور علمی سرگرمیوں میں بھی ذاکر صاحب کی بڑی مانگ اور مان دان تھی۔ ایک ماہر تعلیم اور دانشور کی حیثیت سے حکومتی طلقے میں بھی ان کی بڑی قدر کی جاتی تھی، عام خیال یہ تھا کہ ذاکر صاحب جس انجمن یا تنظیم سے بھی وابستہ ہوں گے اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔ ۱۹۴۳ء میں چیف کمشنر دہلی نے انھیں سُنّی مجلس اوقاف کا رکن نامزد کیا۔ اوقاف منشائے واقف کے مطابق کارِ خیر کے لیے اللہ کے نام سے ہوتے ہیں، پھر وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہ جاتے، متولیوں اور منتظموں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ان اوقاف کا انتظام دیانت داری سے کریں گے، لیکن انسان، بہرحال انسان ہے، ان میں سے اکثر اللہ کے معاملے میں بہت بے خوف ہوتے ہیں۔ صدیوں سے صورت حال یہی رہی ہے کہ لوگ عموماً مالِ اوقاف کے سلسلے میں دیانت دار نہیں ہوتے۔ حافظ شیرازی نے عہدِ وسطیٰ کے ایران میں اوقاف کی غارت گری اور اس سے متعلق اپنے عہد کے لوگوں کی بیباکی اور بے خوفی سے متاثر ہو کر یہ جو کہا تھا کہ

فقیہہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مَے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

تو بس یوں ہی نہیں کہا تھا، اس شاعر نے، درحقیقت، اپنے زمانے کے سماجی و اخلاقی

۱۔ ذاکر حسین، "خطبۂ صدارت"، دی فرسٹ آل سندھ ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، یکم جنوری ۱۹۴۲ء، لطیفی پریس، دہلی، صفحات ۱۷-۱۶

حالات کے ایک خاص پہلو کی صحیح صحیح عکاسی کی تھی۔

ذاکر صاحب نے ۱۰ رجنوری ۱۹۴۷ء کو سنّی مجلس اوقاف' دہلی' کی انتظامی خرابیوں اور مالی بدعنوانیوں کی تحقیقات کی جو رپورٹ پیش کی تھی[1] اس کے چند صفحات وقت کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچے ہیں۔ انھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے حافظ کے عہد کے مسلم معاشرے کی جو عام اخلاقی حالت رہی ہوگی' بیسویں صدی میں ہندستان کے مسلم سماج کی بھی تقریب قریب وہی حالت ہے' اور ممکن ہے کہ اس سے بدتر ہو۔ رپورٹ میں اوقاف کے حسابات' املاک (زمینیں اور مکانات)' مساجد اور یتیم خانوں وغیرہ کی زبوں حالی کے ایک اجمالی جائزے کے ساتھ بددیانتیوں کی چند ہلا دینے والی مثالیں بھی دی گئی ہیں اور پھر کچھ تعمیری سفارشات ہیں' اس کے بعد لکھا ہے کہ

"میں مزید واقعات بیان کر کے آپ کا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا جو کچھ بیان کیا ہے اس سے آپ کو خرابیوں کی نوعیت اور ان کی سنگینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان حالات میں سچ یہ ہے کہ جو سفارشیں میں نے کی ہیں وہ بہت نرم معلوم ہوں گی۔ ہمارے کارکنوں میں سے بعض اس سے بہت سخت سلوک کے مستحق ہیں جو میں نے تجویز کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم آیندہ مجلس اوقاف کے کاموں کے دُرست کرنے میں پوری توجہ کریں اور اپنی ساری قوت اس اصلاح میں صرف کریں اور پچھلی بے عنوانیوں کی چھان بین میں مزید وقت نہ لگائیں تو شاید تعمیری اعتبار سے مفید تر ہوگا۔"

دریا گنج (دہلی) میں ایک یتیم خانہ تھا۔ اس کا انتظام مجلس اوقاف کے ذمّے تھا۔

۱۔ رپورٹ کے شروع کے چار صفحات غائب ہیں۔ مجلس اوقاف نے غالباً مجلس کے عملے کی کارکردگی اور اوقاف کی جائدادوں کی عمومی حالت کا جائزہ لینے اور اپنی سفارشات پیش کرنے کا کام انھیں سونپا تھا۔ رپورٹ کا جو حصہ ہمارے سامنے ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام میں انھوں نے کتنی محنت کی ہوگی۔

ذاکر صاحب نے اس پر خاص توجہ دی۔ ذاکر صاحب پر خود یتیمی کا دور گزرا تھا اور انھیں ایک یتیم کے درد و الم اور حسرت و یاس کی گہرائیوں کا ذاتی تجربہ تھا' اور یوں بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں خاص طور پر درد کی دولت اور دل کے سوز و گداز کی قابل رشک برکت سے نوازا تھا۔ اسی لیے جب یتیم خانے کی اصلاح و ترقی کے لیے مجلس اوقاف کی ایک کمیٹی کی طرف سے انھیں سفارشات مرتب کرنے کا موقع ملا تو مسودہ میں انھوں نے چند ایسی تجویزیں پیش کیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان کا دل اُن بچّوں کے لیے کتنی گہری ہمدردی اور محبت سے معمور تھا جنھیں حالات نے پستی، بیکسی اور کس مپرسی کی سخت اور سنگین حالت میں پہنچا دیا تھا۔ تجویز کیا گیا تھا:

۱۔ اس ادارے کو یتیم خانہ نہیں کہنا چاہیے۔ 'بچّوں کا گھر' اس کے لیے زیادہ موزوں نام ہوگا۔

۲۔ اس ادارے کے منتظم ہر ممکن کوشش کریں کہ بچّوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس بات کا دھیان رکھیں کہ ان کے دماغ سے یہ احساس بالکل جاتا رہے کہ وہ یتیم ہیں۔

۳۔ اس مقصد کے لیے بچوں کے کھانے اور کپڑوں کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ لوگوں کے گھروں پر کھانا کھانے کے لیے بچّوں کو نہیں بھیجنا چاہیے' ان کو دوسروں کا اُترن پہننے کے لیے نہیں دینا چاہیے۔ اُن کو جو کپڑے پہننے کے لیے دیے جائیں وہ ایسے نہ سلوائے جائیں جن سے کسی طرح بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ یتیم ہیں۔ ان کو چندہ جمع کرنے کے لیے باہر نہ بھیجا جائے کہ چونکہ وہ یتیم ہیں اس لیے چندے کے مستحق ہیں۔[1]

۱۔ محمد مجیب، 'ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ اے بایوگرافی'، صفحہ ۱۳۳۔ دریا گنج میں 'بچّوں کا گھر' آج بھی یتیم بچّوں کی خدمت کررہا ہے۔ اتفاق سے ذاکر صاحب کو ایسے نگراں اور کارکن مل گئے تھے جنھوں نے جی جان سے اس ادارے کو بے لوث خدمت کا ایک نشان بنا دیا۔ ذاکر صاحب جب تک زندہ رہے اس میں دلچسپی لیتے اور اس کے منتظموں کی ہمّت بڑھاتے رہے۔

آج دہلی میں جب بھی کہیں دریا گنج کے بچوں کے اِس گھر کا ذکر آتا ہے تو بے جھجک لوگوں کی زبانوں پر ذاکر صاحب کا نام آجاتا ہے۔ اسلامی اخلاقیات میں یتیموں کی دستگیری کرنا اور ان کے آنسوؤں کا پوچھنا ایک الوہی قدر ہے، جو لوگ اس قدر کے خدمت گزار ہوتے ہیں ان کا شمار اللہ کے مقرب اور محبوب بندوں میں ہوتا ہے۔ ایسے بندوں کی یادوں دلوں میں محفوظ رہتی ہے اور زبانوں پر تعریف و تحسین کے لفظوں کے ساتھ ان کا نام آتا رہتا ہے۔

معاشی موضوعات۔ ترجمے اور لیکچر

۴۵-۱۹۴۴ء کے تعلیمی سال میں دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گائر کی دعوت پر ذاکر صاحب نے کیکا بھائی پریم چند ریڈرشپ لیکچرز دیے جو ۱۹۴۸ء میں Capitalism: An Essay in Understanding کے عنوان سے شائع ہوئے۔[1] یوں تو یہ لیکچرز بیشتر ان کے استاد پروفیسر زومبارٹ کی فکر و تحقیق کی ترجمانی کرتے معلوم ہوتے ہیں لیکن مقرر کے مفکرانہ اسلوب اور خطیبانہ رنگ نے انھیں اتنا دلنشین بنا دیا ہے کہ ان کے مطالعے سے معاشی تبدیلیوں اور ترقیوں کے مسئلے ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ فہم ہو جاتے ہیں جنھیں معاشیات سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اس سے انقباض ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل دسویں لیکچر کے آخر میں ذاکر صاحب نے سرمایہ داری نظام کے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ اس کے مستقبل سے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا، پھر بھی یہ طے ہے کہ سرمایہ داری خود اپنے قلعوں میں اب اتنی متحرک، آزاد اور جارح نہ ہوگی جیسی کہ پہلے تھی۔ ریاست کی بڑھتی ہوئی مداخلت کو اب یہ روک

۱- Capitalism کے عنوان سے ذاکر صاحب کا ایک لیکچر ۱۹۳۳ء میں شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، میں بھی ہوا تھا۔ یہ لیکچر ۲۶ فلسکیپ صفحے پر ٹائپ ہے اور ان کے کاغذات میں ملا ہے۔ اس کے اہم نکات دہلی یونی ورسٹی کے بعض لیکچر میں کم و بیش اسی اسلوب میں ملتے ہیں۔

نہیں سکتی؛ سماجی شعور کی موجودہ بیداری معاشی نظام کو بے لگام نہ ہونے دے گی۔ اب یہ ممکن ہے کہ معاشی زندگی کی تنظیم کوآپریٹو یا اجتماعی بنیادوں پر ہو سکے۔ لیکن منصوبہ بند سماجی معاشیات میں بھی سرمایہ داری کے ذہن کی کارفرمائی ذرائع پیداوار کے انتخاب میں Rationalism کے اصول پر عمل کی صورت میں جاری رہے گی۔

ذاکر صاحب نے مستقبل میں جدید مغربی سرمایہ داری کی ہیئت میں مذکورہ تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایشیائی سرمایہ داری کے ابھرتے ہوئے آثار کی طرف توجہ دلائی اور پیش گوئی کی کہ میرے خیال کے مطابق اس میں ہندستان کا ایک بڑا رول ہوگا۔ اس سرمایہ داری کی اگرچہ اپنی ایک خاص انفرادیت ہوگی، لیکن یہ مغربی سرمایہ داری سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگی۔ وہ طاقتیں جن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس رجحان کو روکیں گی، زیادہ مضبوط نہ ہوں گی، ان کے مقابلے میں سرمایہ دار زیادہ باہمت، دوربیں اور کارکردگی میں حوصلہ مند ہوگا۔ بظاہر وہ ریاست کے ضابطوں کی پابندی کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن کیا ہمیں اس پر حیرت ہوگی کہ وہ ریاست کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کا منصوبہ بھی بنا رہا ہے۔ نہیں، میں ایسا نہیں سوچتا کہ یہ ایشیائی اور ہندستانی سرمایہ داری مغربی سرمایہ داری سے کچھ زیادہ مختلف ہوگی۔ بہرحال ہمیں بھی پورے چکّر سے گزرنا ہوگا، اور جب یہاں بھی سرمایہ داری اپنی جزوی دوڑ پوری کرلے گی، تو اجتماعی ضمیر آگے بڑھے گا، لیکن کامیابی اسے اسی وقت ہوگی جب اونچی سطح پر معاشی زندگی کو برقرار رکھنے کے مواقع یقینی ہوں اور نجی منافع کی معاشیات کے منصوبہ بند سماجی معاشیات میں تبدیل ہو جانے کے لیے جدوجہد کی جائے ــــــ ذاکر صاحب دراصل حقیقی منصوبہ بند سوشلسٹ طرز کی معاشیات کے حق میں تھے۔

کینن اور فریڈرک لسٹ کی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں معاشی ادبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ انھیں بھی ذاکر صاحب نے اپنے خاص اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش سے بڑا دلنشیں بنا دیا ہے۔ کینن کی کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لسٹ کی کتاب کا ترجمہ جس کا جرمن نام Das Natürliche System der politischen Ökonomie ہے،

معاشیات قومی کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں لاہور سے چھپا تھا[1]۔ اس کے تعارفی صفحات (۱۰-ب) میں ذاکر صاحب نے لکھا تھا، "اس کے مصنف نے شدید علالت اور آلام روزگار سے تنگ آکر جون ۱۹۴۶ء میں خودکشی کر لی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جس جرمن قومی معیشت کی تعمیر میں اس کا حصہ شاید اور کسی سے کم نہ تھا، وہ بھی قیادت عالم کے جُوے میں اپنے وجود قومی کی بازی لگا کر ہار چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے بھی خودکشی کر لی۔ پھر یہ کتاب کیوں شائع کی جا رہی ہے؟ اس لیے کہ انسانی زندگی کے اکثر مسائل مختتم طور پر حل نہیں ہوتے۔ بار بار نیا روپ لے کر سامنے آتے ہیں اور دعوتِ تلاش دیتے ہیں... معاشی نظم کی از سرِ نو ترتیب کا سوال دنیا کے سامنے ہے... ساتھ ہی نئی قومیں جو زندگی کی دوڑ میں اوروں سے پیچھے تھیں اب عالمی تعمیرات سے آگے بڑھنے کا حوصلہ کر رہی ہیں، اپنی معیشتوں کو مضبوط کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن آزاد تجارت کے پرانے خیال کے ساتھ آزاد معیشت کا جو خیال تھا وہ اب کسی کو بھاتا نظر نہیں آتا۔ ریاست اور معیشت کے تعلق کے باب میں اہلِ عمل اور اہلِ فکر دونوں ہی کا رجحان ریاست کی مداخلت کی حمایت میں معلوم ہوتا ہے۔"

اس دور کے معاشیین لسٹ کے خلاق ذہن کے معترف ہیں، اور اگرچہ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، لیکن اس کے بعض نظریے آج بھی قابلِ قدر ہیں، اور تیسری دنیا کی معیشت میں جو تجربے ہو رہے ہیں، اُن میں اِن کے اثرات خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ درحقیقت "اس کتاب نے معاشیین پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اس کے بعض نظریات مقبولِ عام نظریات میں شامل ہو گئے ہیں اور آج اس کتاب کو پڑھتے وقت ان خیالات کی جدت ہمیں محسوس تک نہیں ہو پاتی۔"[2]

۱۔ یعنی دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے فوراً بعد۔

۲۔ اولاد احمد صدیقی، "ذاکر حسین ایک معاشی کی حیثیت سے"، اردو ادب (ذاکر نمبر) انجمن ترقی اردو ہند، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۷۵

دہلی یونی ورسٹی کے لیکچرز لکھنے میں ذاکر صاحب نے اپنی طبیعت کی افتاد کا پورا لحاظ رکھا تھا، یعنی وہ انھیں ترتیب دینے اور لکھنے کا کام حسبِ معمول ٹالتے رہے اور جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی سر پر آن پہنچی تو ٹائپسٹ بلایا گیا۔ وہ لیکچر لکھتے جاتے اور وہ ان کے پاس بیٹھا ٹائپ کرتا جاتا، اس حالت میں کہ ان کے فکرمند دوست وہاں کھڑے یا بیٹھے ہیں اور ان کی گھبراہٹ میں اور اضافہ کر رہے ہیں۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ وہ آخر کے چند صفحات چھوڑ کر چلے گئے، جنھیں ٹائپ کرنے کے بعد انھیں اس وقت پہنچایا گیا جب وہ لیکچر دے رہے تھے۔[1] یہی صورت کم و بیش بارہ سال پہلے ۱۹۳۲ء میں پیش آئی تھی جب انھیں الٰہ آباد جاکر ہندستانی اکیڈمی میں "معاشیات ــ مقصد اور منہاج" کے موضوع پر لیکچر دینے تھے۔ وہ آخر وقت تک ٹالتے رہے، ہاں، اس دوران اس موضوع پر وہ برابر سوچتے اور اپنے احباب سے تبادلۂ خیال کرتے رہے تھے۔ جب سفر میں دو تین دن رہ گئے تو لکھنے بیٹھے اور مسلسل کوئی اڑتالیس گھنٹے، کھانے اور سونے کے مختصر وقفے کو چھوڑ کر، لکھتے رہے،[2] اور اگر کچھ رہ گیا ہوگا تو اُسے انھوں نے یقیناً ٹرین میں پورا کیا ہوگا۔ ذاکر صاحب کے اِن اُردو لیکچروں کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۲ء ہی میں چھپ گیا تھا۔ یہ لیکچر ذاکر صاحب کے اسلوب کے بہترین ترجمان ہیں جس میں علم و ادب دونوں کو خطابت کی ایک ہلکی آنچ کی مدد سے اس طرح جوڑا گیا ہے جیسے صلابت، نزاکت سے گلے مل رہی ہو اور ذہن کو اپنی دلآویزی سے معمور کر رہی ہو۔

پُرآشوب سیاست اور ذاکر صاحب کا پیغام

ذاکر صاحب عملی سیاست کے مردِ میدان نہ تھے، اور تقسیم ملک سے پہلے کی فضا

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین ــ اے بایوگرافی، صفحہ ۷۷

۲۔ ایضاً، صفحہ ۶۲۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی کے موقع پر اپنا وہ معرکۃ الآرا خطبہ بھی ایسے ہی ایک عالم میں لکھا تھا جسے سن کر بڑے بڑے عالموں اور دانشوروں کے دلوں کی جو اُس وقت وہاں موجود تھے، عجیب کیفیت تھی اور نہ معلوم کتنوں کی آنکھوں میں اس کیفیت نے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

سرتاسر سیاسی تھی۔ کانگریس میں تو اُن کی شخصیت کو اہم مقام حاصل ہی تھا، مسلم لیگ والے بھی اُن کے خلوص اور نیک نیتی کے قائل اور قدرداں تھے اور جیسا کہ ابھی ہم نے دیکھا تعلیمی و سماجی معاملات میں ان کے مشوروں کا احترام کرتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی گفت و شنید کا ایک واسطہ ہو سکتے تھے، لیکن اس وقت کے ضد و ہٹ دھرمی، شک و شبہہ اور نعرے بازی کے ماحول میں سیاسی معاملات میں ایک معلم کے خلوص و جذبۂ خیر سگالی سے کام لینے کی کسے فرصت تھی، بلکہ اس زمانے میں تو سیاسی جماعتوں کا ہر شخص اس قدر حساس یا جذباتی ہو گیا تھا کہ اگر ذاکر صاحب کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب لانے اور ہندو مسلم مسئلے کے کسی معقول حل کے لیے خود اقدام کرتے تو اپنے خیالات کے اظہار میں آزادی نہ محسوس کرتے کیونکہ وہاں تو معقول بات سننے کے لیے کوئی تیار نہ تھا، اُلٹا یہ ہوتا کہ خود ان کا سیاسی موقف مشتبہ قرار دے دیا جاتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جب وہ ٹرین میں کہیں جا رہے تھے، ایک مسافر نے جو مسلمان تھا، بغیر یہ بتائے ہوئے کہ وہ صحافی ہے، ذاکر صاحب سے گفتگو شروع کر دی، اور پھر مسلم لیگ کے اخبار ڈان (۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء) میں اس گفتگو سے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ذاکر صاحب مطالبۂ پاکستان کے حق میں ہیں۔ گاندھی جی کو جب یہ خبر ملی تو سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے ۱۸ر اکتوبر کو انھیں تار بھیجا:

"Express Telegram **Poona,Oct.18,1945**

"'Dawn' of Thirteenth contains reported conversat-ion with you. I have denied truth statement before friends. I would like you to give your version before you leave. Hope you are well."

۱۔ ذاکر صاحب انھیں دنوں میں یونسکو کی ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے۔ راجکماری امرت کور بھی اس ہندوستانی وفد کی ممبر تھیں۔

گاندھی جی کی ذہنی پریشانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسی دن انھوں نے انھیں ایک خط بھی لکھا کہ

"آج ہی میں نے ایک تار بھیجا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ سکتا کہ تم نے ایسی بات کہی ہوگی، بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو، بہتر ہوگا اگر تم نے جو کچھ کہا ہے اس سے متعلق ایک بیان شائع کرا دو۔"[1]

انھوں نے راجکماری امرت کور کو بھی لکھا جو اس وقت دہلی میں تھیں کہ ذاکر صاحب سے مل کر معلوم کریں کہ اس رپورٹ کی حقیقت کیا ہے۔[2] انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ذاکر صاحب سے متعلق اس طرح کی کسی بات کا وہ خود یقین نہیں کر سکتے لیکن معلوم ضرور کر لینا چاہیے۔ ڈان کی رپورٹ میں کہا گیا تھا:

"ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگرچہ... مطالبۂ پاکستان سودے بازی کے جوابی حملے کے طور پر پیش کیا گیا تھا، لیکن اب یہ حقیقی مطالبہ بن گیا ہے۔ کانگریس کے لیے اب یہی ایک راستہ ہے کہ وہ مطالبۂ پاکستان کو مان لے اور ہندستان کی آزادی کی جنگ میں مسلمانوں سے مل کر ایک متحدہ محاذ بنائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ ہندوؤں میں مسٹر گاندھی ہی ایسے شخص ہیں جن سے کچھ بہتری کی اُمید ہو سکتی ہے، لیکن اگر وہ اس مطالبے کو مان لیں... تو ہندوؤں کی اکثریت اس پر رضامند نہ ہوگی۔"[3]

۱۔ Collected Works of Mahatma Gandhi, (Vol. Lxxxi, 1945, p.373)

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً، حاشیہ نمبر ا

ذاکر صاحب نے اس رپورٹ کی تردید کی[1]۔ راجکماری سے بھی انھوں نے یہ کہا کہ وہ مطالبۂ پاکستان کے حامی نہیں ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے خلاف کوئی ایسی بات کہتے۔ بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب کے اپنے کچھ سوچے سمجھے اور گہرے معتقدات تھے، لیکن اس کے باوجود اُن میں عصبیت اور کٹڑپن نہ تھا۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ آخر کیوں مطالبۂ پاکستان جیسے اہم ترین مسئلے پر ہمیشہ ایسی فضا میں گفتگو کی جاتی ہے جو شبہے، بے اعتمادی، خوف اور ذاتی عناد سے زہر آلود ہوتی ہے، آخر کیوں اس شخص پر جو اس کی حمایت میں کچھ کہتا ہے، خواہ یہ محض بحث و مباحثے اور تبادلۂ خیال ہی کے سلسلے میں کیوں نہ ہو، غدارِ قوم ہونے کا الزام لگایا جائے، اور اس شخص پر جو محض بحث ہی کی خاطر اس مطالبے کو غلط اور بے نتیجہ بتاتا ہے، مسلم دشمن ہونے کا الزام عاید کیا جائے۔ ویسے اُن کی اپنی طبیعت کا رجحان جس کے اظہار نہ کرنے پر خود انھیں قابو نہ تھا، وہی تھا جسے انھوں نے نادان، شریر اور ناقابلِ اصلاح بچّے کے بارے میں 'اچھا اُستاد' کے موضوع پر اپنی ایک ریڈیو تقریر[2] کے آخر میں اس طرح ظاہر کیا تھا:

'اور (ایسے) بچّے کی طرف سے جب ساری دُنیا مایوس ہو جاتی ہے
تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے — ایک اس کی ماں
اور دوسرا اچھا اُستاد' [3]

۱۹۴۶ء میں عام انتخابات کے بعد جب مرکز میں عارضی ملکی حکومت قائم کرنے کا مسئلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے سامنے آیا تو کانگریس نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو اس میں شامل کرنا چاہا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود

۱۔ ایضاً۔ ۲۔ یہ ریڈیو تقریر ۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کو نشر ہوئی تھی۔

۳۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۱۳۵

لارڈ ویول کے ذہن میں ذاکر صاحب کا نام آیا اور پھر لارڈ ویول سے جو اس وقت گورنر جنرل اور وائسرائے ہند تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کی اس سلسلے میں گفتگو بھی ہوئی۔[1] ۱۸ جون ۱۹۴۶ء کو مسٹر محمد علی جناح سے اپنی ملاقات کے دوران لارڈ ویول نے انھیں کانگریس کے اس خیال سے مطلع کیا۔ مسٹر جناح کو یہ بات پسند نہ آئی، اور انھیں کچھ غصہ بھی آیا ہوگا، کیونکہ اسی رات انھوں نے لارڈ ویول کو یہ خط لکھا:

"۱۸ جون ۱۹۴۶ء

ڈیر لارڈ ویول،

آج شام کو ملاقات کے دوران آپ نے مجھے بتایا کہ کانگریس نے اونچی ذات کے ایک ہندو کے بجائے ڈاکٹر ذاکر حسین کو عارضی حکومت میں شامل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے، اگرچہ آپ کو اُمید ہے کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہے گی۔

"میں نے آپ پر واضح کر دیا ہے کہ اس تبدیلی کے خلاف مسلم ہندستان کا ردعمل نہایت سخت ہوگا۔ اور اگر آپ نے کسی غیر مسلم لیگی مسلمان کو (عارضی حکومت کے لیے) نامزد کیا، تو مسلم لیگ کو یہ بات ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی۔

(دستخط) محمد علی جناح"[2]

ذاکر صاحب کو مسٹر جناح کے غم و غصے کا علم ضرور ہوا ہوگا، اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے وہ بہر قیمت جامعہ ملیہ کو اس وقت کی ہوشمندی اور تدبر سے عاری جذباتی سیاست سے

۱- Selected Works of Jawaharlal Nehru, (Vol.15,pp.217-218)

۲- Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, edited by Sharifuddin Peerzada, Karachi, 1987, pp.353-354

محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی میں تھی جہاں مسلم لیگ کا بڑا زور تھا اور اس وقت جامعہ میں "مسلم ہندستان" کے ایسے طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی جو مسلم لیگی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ذاکر صاحب کو ہمہ وقت اس کی فکر تھی کہ مسلمانوں کا یہ قومی ادارہ جسے انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بیس برس پہلے ختم ہونے سے بچایا تھا اور پھر سب نے مل کر اور مصیبتیں جھیل کر اپنے خون جگر سے اسے پروان چڑھایا تھا، کہیں اس وقت کی سیاسی جذباتیت کی زد میں آکر برباد نہ ہو جائے! اسی خیال سے اور پھر اس لیے بھی کہ وہ کوئی ایسے سیاسی "لیڈر" نہ تھے کہ وزارت ملے، خواہ جامعہ جیسے تعلیمی ادارے کا کچھ بھی حشر ہو جو ان اخلاقی، انسانی اور تہذیبی قدروں کا ایک نشان بن گئی تھی جن سے عمل میں حُسن اور زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے غالباً یہ شرط رکھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی متفقہ رائے سے ہی وہ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کے سیاسی حالات میں یہ ناممکن تھا، اور اسی لیے ذاکر صاحب نے عارضی حکومت میں وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[1] اُس زمانے میں یہ بات بھی مشہور تھی (لیکن اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے) کہ مولانا آزاد کو ذاکر صاحب کی یہ شرط کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک مفکر معلم کی حیثیت سے قومی سیاست میں ذاکر صاحب کا جو موقف تھا، مولانا آزاد عملی سیاست میں ایک Committed کانگریسی کی حیثیت سے اس کی پوری قدر نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے اسی موقف کے سبب پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی بعض معاملات میں ذاکر صاحب کو اختلاف تھا۔ ذاکر صاحب غالباً اُن لوگوں میں تھے جو اسے ترجیح دیتے کہ ملک کی تقسیم نہ ہو، خواہ آزادی کچھ دن اور نہ ملے۔ وہ بہرحال یہ چاہتے تھے، اور اسی لیے انھوں نے یہ شرط لگائی تھی، کہ چھوٹے ہی پیمانے پر اور محدود دائرے ہی میں سہی انھیں اتحاد اور مفاہمت کے لیے کام کرنے کا موقع حاصل رہے۔

اور جامعہ کی جوبلی (نومبر ۱۹۴۶ء) کے موقع پر انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے ممتاز رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی کر دیا اور ان سے وہ دردمندانہ اپیل کی جو اگرچہ ملک میں اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا کرنے کی آخری اور ناکام اپیل تھی، لیکن ایک معلم کی سرگذشت کی وہ منزل ضرور تھی جو سود و زیاں کے اندیشوں اور آس و یاس کے پیمانوں سے ماورا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو ۱۹۴۶ء کی وہ تلخ سیاسی فضا یاد ہے جب کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین مفاہمت کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی، کلکتہ کا کشت و خون ہو چکا تھا، اور اس کے ردِعمل میں بمبئی، نواکھالی، بہار اور پنجاب خونیں فسادات اور انسانیت سوز واقعات کی زد میں آچکے تھے، وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا اور تہذیب و انسانیت عافیت کے گوشے تلاش کرتی پھرتی تھی، اُن حالات میں ذاکر صاحب کی اس دردمندانہ اپیل کی قدر و قیمت کا وہ لوگ آج بھی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں، اور آج وہ نوجوان بھی اِس سے، اگر توفیق الٰہی شاملِ حال ہو، متاثر ہو سکتے ہیں کہ ملک میں اب بھی وہ طاقتیں موجود ہی نہیں بلکہ زور پکڑ چکی ہیں، اور فرقہ وارانہ فسادات سے اپنی غذا حاصل کرتی ہیں جنھیں محبت کے بجائے نفرت، اتحاد کے بجائے انتشار، سنگم کے بجائے سنگھرش زیادہ مرغوب ہے۔ ذاکر صاحب نے ملک کے چوٹی کے ہندو مسلم رہنماؤں سے اپیل کی تھی:

"آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے، بڑے ہی دُکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطحِ اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے ......

میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے ؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے ؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے ؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں۔ لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے زیادہ سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا ، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے ؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھایئے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اِس قوم یا اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھدنے نہ دیجیے۔"

ایک مخلص اور کھرے نیشنلسٹ مسلمان اور ایک قومی درس گاہ کے سربراہ ہونے کے ناتے جس کا وظیفہ، سیاسی و تہذیبی ہندو مسلم اتحاد تھا، ذاکر صاحب کو نہ معلوم کیا کیا جتن کر کے جوبلی کے خاص جلسے (۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء) میں مسٹر جناح اور مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں وغیرہ کو ایک ساتھ بٹھانے میں کامیابی ہوئی ہوگی۔ جامعہ کی جوبلی کو ۱۹۴۵ء میں ہونا تھا کہ اس کے قیام کو پچیس سال اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ہو گئے تھے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر اسے ملتوی کرنا پڑا، نومبر ۱۹۴۶ء میں اس کے التوا کے تو قوی تر اسباب مہیا تھے، ملک کے حالات بہت خراب تھے، بہت کشت و خون ہو چکا تھا، اور بہت کچھ ہونے والا تھا، انتشار و تخریب کی طاقتیں پوری قوت سے سرگرم تھیں [illegible]

کیسے باہر کے مہمان آئیں گے، غیر یقینی حالات میں سفر کی صعوبتیں کون برداشت کرے گا پھر کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی قلت اور کمیابی اور مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام دہلی کے ایک ایسے علاقے میں کرنا جہاں بجلی نہیں تھی، پانی نہیں تھا، ایسے میں جوبلی کا جشن اور وہ بھی ذاکر صاحب کے حوصلے اور ہمت کے مطابق خاصے بڑے پیمانے پر! حالات بالکل اس کے لیے سازگار نہ تھے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کچھ تو اپنی شخصیت اور ذاتی تعلقات سے کام لے کر اور کچھ مومنین کے دلوں میں تشویق پیدا کر کے، وقت کی اہم شخصیتوں کو (ان کے سیاسی خیالات سے قطع نظر)، جن میں علما و صلحا بھی تھے، سیاستداں اور دانشور بھی تھے، دوسری درس گاہوں کے اساتذہ اور طالب علم بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی تھے، والیانِ ریاست اور امرا بھی تھے، جامعہ نگر کی بستی میں کھینچ بلایا تھا — اور یہ سب اس امید میں کہ جامعہ جیسی قومی و ملّی درس گاہ میں جہاں کی فضا اتحاد و محبت کے نغمے سے معمور تھی، اگر ملک و قوم کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر، دلوں کے جوڑنے کے لیے مختلف الخیال رہنماؤں کو جمع کیا جائے اور اُن سے صلح و آشتی اور مل کر کام کرنے کی اپیل کی جائے تو شاید ملک کو بربادی اور قومی اتحاد کو انتشار سے بچایا جا سکے۔

جوبلی کے موقع پر جامعہ کے کام، اس کے شیخ اور اُس کے ساتھیوں کے صبر و استقلال، اور ہمت و عزیمت کے اعتراف اور خراجِ عقیدت کے طور پر ہندستان اور ہندستان کے باہر کے ماہرینِ تعلیم اور پبلک لائف کی ممتاز شخصیتوں کے جو پیغامات آئے، وہ ایک کتابچے کی صورت میں چھپ چکے ہیں، انھیں پڑھیے تو خیال آتا ہے کہ دنیا اچھے کام اور اچھے خیال کو پسند کرتی ہے، یہ اور بات ہے کہ وقتی طور پر بُرے خیالات غالب آجائیں اور ہر طرف اندھیرا دکھائی دے۔ لیکن اندھیرا بہت بڑھ جائے تو صبح کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، وہ انسان جو حالات کی اندھیاریوں میں بھی پُر اُمید رہتا ہے، حالات کو سدھارنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب بھی ایک ایسے ہی حوصلہ مند اور پُر اُمید انسان تھے جشن جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے اپنے ذمے یہ کام رکھا تھا کہ وہ ممتاز مہمانوں

کا خیر مقدم کریں اور ان کے ساتھ رہ کر انھیں جامعہ کے کام دکھائیں اور سمجھائیں۔ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو مختلف موقعوں پر تقریریں کرنی پڑیں۔ یہ سب برجستہ اور پُر مغز تقریریں تھیں اور ان سب کا نچوڑ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو وہ پہلے کہہ چکے تھے، اُن کی اس لکھی ہوئی تقریر میں تھا جو غالباً ان کی زندگی کی سب سے زیادہ فصیح، دلگداز اور پُر اثر تقریر تھی۔ ان کے دائیں اور بائیں وہ لوگ بیٹھے تھے جن کے ہاتھ میں اس وقت ہندستان کے عوام کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ انھوں نے ایک ایسے معلّم کی حیثیت سے تقریر کی جس نے بیس سال سے زیادہ کام کیا تھا اور مصیبتیں جھیلی تھیں اور جسے اپنے اور تمام سچے معلّموں کی امیدوں کی بربادی کا خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ ان کی تقریر نے بہت سی آنکھوں کو پُرنم بنا دیا اور، اگر لوگ عادتاً ذاتی اغراض کی قربان گاہ پر اپنی فطری نیکی اور فیاضی کی بھینٹ چڑھانے کے خوگر نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ رویوں اور رجحانات میں ایسا تغیر پیدا ہو جاتا جو ہندستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا۔[1]

جالندھر — زندگی اور موت کا مرحلہ

لیکن اب ذاکر صاحب بہت تھک چکے تھے، وہ روزمرہ کے معمولات پورے کرتے تھے، دفتر آتے تھے، سفر کرتے تھے، کمیٹیوں کی میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے، مگر طبیعت میں وہ نشاط کی کیفیت نہ تھی۔ وہ اگرچہ اس بات کو سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں وہ بیمار بھی تھے۔ ذیابیطس کا مرض عود کر آیا تھا اور وہ کمزور ہو گئے تھے۔ انھیں کچھ دنوں کے لیے آرام کی ضرورت تھی، اور وہ خود بھی آرام و سکون کے لیے کہیں جانا چاہتے تھے، لیکن پروگرام نہیں بن پا رہا تھا۔ آخر کار یوم آزادی اور عید کا جشن مناکر انھوں نے کشمیر جانے کا ارادہ کر لیا۔ اب کشمیر کے اس سفر کی روداد خود ذاکر صاحب کے الفاظ میں سُنیے۔ روداد کیا ہے، زندگی سے موت تک کے سفر اور مرنے

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۱۳۷

سے پہلی زندگی کی طرف واپس آنے کی داستان ہے۔ ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے معلوم کرنے پر ذاکر صاحب نے اس داستان کو اس طرح قلمبند کیا تھا:[1]

راج بھون، پٹنہ

۲۲/اپریل ۱۹۵۹ء

مخدوم محترم، السلام علیکم

گرامی نامہ کئی روز ہوئے مل گیا تھا، جواب میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں، ۱۹۴۷ء میں جالندھر اسٹیشن پر جو گزری اس کا حال کیا لکھوں۔ مختصر یہ کہ قیدِ حیات سے رہائی کی ایک صورت نکلی تھی وہ بھی یوں ہی گزر گئی! تاریخیں مجھے یاد نہیں رہتیں، لیکن غالباً اگست کا مہینا تھا۔ ۱۵/ یا ۱۶/ کو اعلانِ آزادی کے بعد میں نے کشمیر کے سفر کا قصد کیا۔ کئی ہفتے سے بیمار بیمار سا تھا۔ کام میں جی نہ لگتا تھا، نیند نہ آتی تھی۔ طبی مشیروں نے کہا کہ کچھ دن مکمل آرام کرو۔ آرام کیسے کرتا اور کہاں کرتا۔ کئی دوستوں نے انتظام کر دینے کو کہا مگر جی انھیں تکلیف دینے کو نہ چاہا۔ آخر میں ایک دوست نے لکھا کہ کشمیر میں ایک کشتی کا انتظام کر لیا ہے۔ ایک ملازم کو اگر ساتھ لے آؤ تو پھر کوئی آدم زاد کشتی میں نہ پہنچ پائے گا۔ یہ اس لیے کہ میں اپنی بیماری میں کچھ مردم بیزار ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک ملازم کو ساتھ لیا اور کشمیر کے قصد سے نکل کھڑا ہوا۔ دہلی کے اسٹیشن پر پہنچا تو دیکھا کہ کچھ سناٹا سا ہے۔ مجھے پہنچانے ایک دوست جامعہ سے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے اِدھر اُدھر پوچھ کر مجھ سے آ کر کہا گاڑی سنا ہے کہ جالندھر سے آگے نہیں جائے گی۔ آگے گڑبڑ ہے۔ میں نے کہا جالندھر ہی میں دو چار روز قیام کر لوں گا۔ وہاں بھی دو ایک جاننے والے ہیں۔ ان غریب نے اصرار نہ کیا اور گاڑی چل دی۔ گاڑی خالی تھی۔

۱۔ ذاکر صاحب کا یہ خط علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ یونی ورسٹی اور لائبریری کے شکریے کے ساتھ اسے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔

میں نے بستر کر لیا اور ایک کتاب نکال لی، لیٹ کر پڑھنے لگا۔ اسی میں شاید سو گیا۔
وقت دن کا تھا۔ لدھیانہ کے قریب ڈبے میں کچھ لوگ آئے۔ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے۔ مسلح
تھے۔ آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے، جو مجھے اکھڑی اکھڑی لگیں۔ ایک اسٹیشن پر پاس
کے ایک ڈبے سے ایک مسلمان واقف میرے پاس آئے۔ وہ جالندھر جا رہے تھے۔ سرکاری
ملازم تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان جانے سے پہلے اپنے گھر جا رہے تھے۔ بندۂ خدا اس
قدر پیے ہوئے تھا کہ باتوں سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر وہ میرے پاس آ بیٹھے۔ جب معلوم
ہوا کہ کشمیر جا رہا ہوں تو بولے کہ "جالندھر سے آگے کیسے جاؤ گے۔ جالندھر میں اتر لینا،
میرے ساتھ ٹھہرنا۔ والدہ اُرد کی دال لاجواب پکاتی ہیں۔ وہ آپ کو کھلواؤں گا اور مسلم
لیگ کے صدر کو بھی بلاؤں گا۔ آپ دونوں کا مباحثہ ہوگا اور ہم مزے سے سنیں گے۔" مجھے
ان کے اس پروگرام سے کچھ زیادہ خوشی نہ ہوئی، گفتگو سن کر ایک ہندو مسافر نے کہا
کہ آپ کشمیر جانا چاہتے ہیں تو لدھیانہ میں گاڑی بدل لیں۔ وہاں سے فیروز پور کی طرف سے
ابھی گاڑی جاتی ہے۔ لدھیانہ آیا تو میں اپنے ڈبے سے اترا۔ اسٹیشن کا رنگ کچھ عجیب تھا،
خاصا مجمع، لوگ پریشان اور سراسیمہ، اکثر کے پاس پستول، باقی کی کمر میں تلواریں۔ میں اتر
کر پل پر ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے دفتر گیا۔ پوچھنے پر کہ وہ فیروز پور والی گاڑی کب ملے گی،
اس بندۂ خدا نے بڑی بے پروائی سے کہا "وہ گاڑی تو آج سے بند ہے، جالندھر چلے جاؤ،
وہاں تمھارا انتظام ہو جائے گا۔" اس آدمی کو یقیناً معلوم تھا کہ جالندھر میں کیا ہو رہا ہے
اور جالندھر اسٹیشن پر مسلمان کس طرح قتل کیے جا رہے ہیں۔ بعد کو سمجھ میں آیا کہ اس نے
"انتظام" کا لفظ خاص معنوں میں بولا تھا۔ میں مایوس گاڑی پر لوٹ آیا۔ وہ دوست
اپنے ڈبے کے سامنے کھڑے کچھ پی رہے تھے، فوراً میری طرف لپکے اور فرمایا کہ طبیعت
کچھ خراب ہے، دست ہو رہے ہیں، اس لیے دوا پینے گیا تھا۔ اب دیکھا کہ ان کے ساتھ
ان کا ایک لڑکا بھی ہے، کوئی بارہ برس کا۔ لڑکے کو اپنی جگہ پر چھوڑ وہ میرے پاس آ گئے، اور
اور نہ جانے کیا کیا بکتے رہے کہ اتنے میں جالندھر آ گیا۔ پلیٹ فارم بالکل خالی
نظر آیا اور اس پر فوج کے سپاہی تابعض دکھائی دیے۔ ہم لوگ اترے تو میرے

ان پر حواس رفیق نے کہا کہ ہو نہ ہو ہڑتال ہے۔ میں جاتا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس میرا دوست ہے اور قریب ہی رہتا ہے، اس کی موٹر منگاتا ہوں، یہیں ٹھہریئے۔ میں وہیں سامان کے پاس کھڑا رہا۔ میرے پاس میرا ملازم تھا اور ان رفیق کا لڑکا۔ ایک ہی دو منٹ گزرے ہوئے گزرے تھے کہ ہمارے قریب کچھ فاصلے پر ۵-۷ آدمی جمع ہو گئے۔ کچھ پہلوان نما بڑی بڑی مونچھیں، پنجابی وضع کی لنگی باندھے اور ننگے سر۔ چند منٹ انھوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا پھر میری طرف بڑھے کہ چلیے ہم سامان لے چلیں۔ میں نے کہا میرے ساتھی باہر گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے تو چلیں گے۔ میں اپنی سادہ دلی میں سمجھا کہ قلیوں کی ہڑتال ہے اس لیے یہ شاید سیوا سمتی کے رضاکار ہیں۔ مسافروں کی مدد کے لیے آگئے ہیں۔ میرے یہ کہنے پر وہ ٹھٹک گئے، مگر چند لمحوں ہی میں ان کے سردار نے کہا "سامان چکو" جس کے معنی غالباً ہیں سامان اُٹھاؤ۔ یہ پنجابی لغت اس وقت ذہن نشین ہوا تھا اور اب تک یاد ہے! چنانچہ سامان اُٹھالیا اور دروازے کی طرف بڑھنے ہی کو تھے کہ میرے رفیق لوٹ آئے اور بولے "یہ سامان کہاں لے جا رہے ہو۔ باہر تو غضب ہے، گاڑی ملی نہیں۔ ٹیلیفون کٹ گیا ہے"۔ سردار نے بڑے اعتماد سے کہا "سامان تو جائے گا"۔ میرے مدہوش رفیق نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ مجھے ان کی یہ حرکت بہت بُری لگی۔ مگر اس سے آنکھوں کے پردے ہٹ گئے۔ فوراً اس نے ایک بڑا چاقو نکالا اور فوجیوں سے کہا کیا دیکھتے ہو۔ دو فوجیوں نے اپنی بندوقیں میرے رفیق کے سینے پر تان دیں۔ سردار نے اپنا چاقو پھر کمر میں کھونس لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ہم تو قیدی ہیں اور یہ فوج اسی سردار کے حکم پر چلتی ہے۔ اب سامان تیز تیز آگے جا رہا، اور ہم آہستہ آہستہ اس حلقے میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ سردار نے میرے قریب آکر کہا جو روپیا پاس ہو دے دو۔ میں نے کہا "روپیا میرے پاس نہیں۔ جو ہے بکس میں ہے"۔ اس نے کہا "بکس تو قابو کر لیا ہے"۔ یہ راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں اور قدم آہستہ آہستہ مقتل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے سامان والے تو غائب ہو گئے، صرف یہ جلوس رہ گیا۔ دروازہ کوئی بہت دور نہ تھا۔ ہوگا، ۱۰ گز فاصلے پر۔ مگر ایسا معلوم ہوا کہ

بڑی مسافت طے کرلی ہے۔ جلوس دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ ایک ہندو صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور چلا کر کہا "ڈاکٹر صاحب، آپ کہاں جارہے ہیں؟" میں نے کہا "باہر جارہا ہوں، سامان تو گیا" انھوں نے کہا "باہر تو قیامت ہے، آپ ادھر آئیے" اور بلا مبالغہ مجھے اس قطار میں سے گھسیٹ لیا اور اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں جو سامنے ہی تھا لے گئے۔ اسٹیشن ماسٹر ایک سکھ صاحب تھے، ان ہندو دوست نے ان سے بتایا کہ یہ فلاں آدمی ہیں، مگر اس بندۂ خدا نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مگر کندن لال کپور نے مجھے آفس کی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود باہر گئے۔ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ دو سکھ ملنگ دودھاری تیغ لیے ہوئے آفس کے دروازے پر آکھڑے ہوئے۔ ایک ایک طرف ایک دوسری طرف، اور جب میری آنکھ ان سے مل جاتی مجھے اشارہ کرتے کہ باہر آؤ، مگر میں "بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے"۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ کپور صاحب کسی سکھ فوجی افسر سے گھبرا گھبرا کر باتیں کر رہے ہیں۔ پھر یہ دونوں دفتر میں آئے۔ افسر نے مجھ سے کہا "ڈاکٹر صاحب، میرے ساتھ آئیے"۔ میں فوج کے سپاہیوں کا رویہ چند منٹ پہلے دیکھ چکا تھا۔ میں سمجھا کہ اب یہ اس کام کو باضابطہ طور پر انجام دینے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے دو ایک جملے ہی کہے تھے کہ میں سمجھ گیا کہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا ملازم، میرے ایک ساتھی اور ان کا لڑکا اور میرا سامان اگر مل جائے تو اچھا ہو۔ انھوں نے دو سکھ سپاہیوں کو میرے پاس میری حفاظت کے لیے کھڑا کیا اور خود اِدھر اُدھر دوڑے دوڑے پھرے۔ تینوں ساتھیوں کو لے آئے اور آکر کہا کہ سامان کو اب میں نہیں ڈھونڈوں گا۔ اس میں آپ کے لیے خطرہ ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ لے جاؤں۔ میں نے کہا بسم اللہ۔ اب وہ ہم ہم کے قافلے کو ساتھ لے کر باہر چلے۔ باہر کی رونق کا کیا کہنا۔ سیکڑوں مسلح آدمی جمع تھے۔ ایک شخص سفید وردی میں تھا جیسے ان کا سردار ہو۔ لاریوں میں لکڑیاں لدی کھڑی تھیں تاکہ لاشوں کو ساتھ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ جگہ جگہ انگاروں اور راکھ کے ڈھیر تھے۔ اس مجمع کا ایک حصہ ہماری طرف بڑھا، آگے آگے وہ سفید پوش سردار۔ ہمارے مہربان کپتان گردھیان سنگھ نے اپنی اسٹن گن

سنبھالی اور مجمع سے کہا قریب نہ آنا۔ لوگ رک گئے۔ البتہ اس سردار نے گفتگو جاری رکھی اور کہا "آپ انھیں یہاں لینے کیوں آئے"۔ انھوں نے کہا کہ "میں لینے نہیں آیا تھا۔ میں ایک دوسرے کام سے آیا تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو میں نے انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔" اس نے کہا "انھیں ہمیں دے دیجیے"۔ انھوں نے کہا "تمھیں شرم نہیں آتی، تم سکھ ہو اور ایک سکھ سے کہہ رہے ہو کہ ان شریف آدمیوں کو دھکا دو"۔ اس نے کہا "اچھا تو آپ اپنا وعدہ پورا کر دیجیے۔ انھیں آگے شہر میں چوراہے پر چھوڑ دیجیے"۔ انھوں نے کہا "میرا جہاں جی چاہے گا چھوڑوں گا"۔ یہ گفتگو کرتے کرتے وہ ہمیں ساتھ لیے اپنی اسٹیشن ویگن کے پاس پہنچ گئے۔ ہمیں اس میں بٹھایا اور خود اس سردار کو اپنے ساتھ لے جاکر اس کے ساتھیوں تک پہنچادیا۔ اس وقفے میں ویگن کے شوفر نے جو ایک بلوچی مسلمان تھا مجھ سے کہا "یہ آدمی ٹھیک ہے، آپ کو دھوکا نہیں دے گا"۔ شاید خوف میں حواس کند ہو جاتے ہیں یا کیا، میں سب کچھ سن اور سمجھ رہا تھا لیکن کچھ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ گردھیان سنگھ دوڑ کر واپس آئے اور شوفر سے کہا "چلو، تیز چلو"۔ اب جو گاڑی چلی تو وہ ہمارے رفیق جن کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور ایسے سہم گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے بھی زیادہ بے حس ہیں، بولنے لگے "ادھر کہاں لیے جاتے ہو، میرا گھر تو دوسری طرف ہے، میری ماں نہ معلوم کس حال میں ہوگی، موٹر کو ادھر موڑ لو"۔ گردھیان سنگھ نے کہا "بھائی صاحب، میں آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ میں ان ڈاکٹر صاحب کو لے کر جا رہا ہوں۔ آپ ساتھ چلتے ہیں تو چلیے۔ ورنہ یہیں سڑک پر اتار دوں گا"۔ بولے "اتار دو، اتار دو"۔ میں نے روکا اور لڑکے سے کہا کہ انھیں اترنے نہ دینا۔ کچھ دور چلے تھے کہ رفیق پھر چونکے "یہاں تو اتار دو۔ یہ تو میرے دوست کا گھر ہے"۔ گردھیان سنگھ گھر کو پہچانتے تھے۔ وہ مسٹر بیدی کا گھر تھا جو جالندھر میں سشن جج تھے۔ کہا اچھا اتر جاؤ۔ لڑکے سے میں نے کہا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ لڑکا نہیں اترا۔ وہ لڑکے کو چھوڑ چل کھڑے ہوئے۔ یہ بیدی صاحب کے پچھواڑے اترے تھے۔ گردھیان سنگھ نے مجھ سے کہا "نہ معلوم یہ اللہ کا بندہ بیدی صاحب تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ یہاں تو ادھر کھڑکیوں میں سے لوگ گولیاں چلا رہے ہیں" اور موٹر

لے کر وہ گاڑی بیدی صاحب کے دروازے پر لے گیا۔ رفیق وہاں پہنچ چکے تھے اور میرا حال بیان کر رہے تھے۔ بیدی صاحب مجھے جانتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ بھی آئے تھے اور تفصیل سے سب کام کو دیکھا تھا۔ وہ گاڑی کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے اور مجھ سے کہا "آپ یہیں ٹھہریے"۔ گردھیان سنگھ نے کہا "بیدی صاحب، دوستی تو ٹھیک ہے۔ آپ کے پاس حفاظت کا سامان بھی ہے؟" انھوں نے کہا "میرے پاس فوج کا ایک دستہ ہے۔ یہ یہاں محفوظ رہیں گے"۔ گردھیان سنگھ نے مجھے، لڑکے اور ملازم کو وہاں اُتار دیا اور اور ہم سے رخصت ہو گئے۔ بیدی صاحب اور ان کی بیوی نے بہت خاطر کی اور کہا جب تک آپ ہمارے یہاں رہیے، وغیرہ وغیرہ۔ حضرت رفیق نے اب تو بہت ہی شور مچایا کہ مجھے گھر پہنچوائیے۔ بیدی صاحب نے تین فوجی سپاہیوں کو ساتھ کر کے اپنی گاڑی میں انھیں گھر بھیجا۔ ان کا لڑکا میرے ساتھ ہی رہا۔ بیدی صاحب کو جانتا تھا۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ اس بچے کو کہاں لے جاؤ گے۔ بیدی صاحب کی چھت پر سے عجیب ہولناک مناظر دیکھے۔ ہر طرف جلتے ہوئے مکان، ان کے قریب ہی بڑی بڑی کوٹھیاں جل رہی تھیں۔ بیدی صاحب دل سے شرمندہ اور رنجیدہ تھے مگر کہتے تھے کریں کیا۔ پاس ہی ایک کوٹھی تھی۔ کہا "اس میں پولیس کا افسر ہے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ پرسوں لاہور سے آیا ہے۔ اس کے بھائی کو وہاں قتل کر دیا گیا۔ اس کا سب مال و اسباب لوٹ لیا اور یہاں بالکل ننگا مادر زاد پہنچا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے چارج لیا۔ اب یہ ان جلتے ہوئے مکانوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے آتشبازی ہو"۔ یہ سب دیکھنے کے بعد میرے غبی ذہن نے سمجھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب بیدی صاحب نے صبح پھر کہا کہ جب تک چاہیے یہاں رہیے تو میں نے کہا "بیدی صاحب، اگر کسی طرح ممکن ہو تو مجھے دہلی واپس کرا دیجیے"۔ انھوں نے کہا "تو پھر جلدی کرنا چاہیے، آج ہی واپسی ہو تو ٹھیک ورنہ نہ معلوم راستے کا کیا حال ہو"۔ میں نے کہا "ہاں، میں واپس جاؤں گا"۔ بیدی صاحب نے فوجی سپاہیوں کے ساتھ مجھے جالندھر چھاؤنی پر (شہر پر نہیں، جہاں ایک دن پہلے ایک دلچسپ کام ناتمام رہ گیا تھا) پہنچوایا۔ ٹکٹ کے پیسے میرے ملازم کے پاس نکل آئے، اس لیے ان سے لینا نہ پڑے۔ گاڑی

میں بیٹھ گیا۔ جب تک گاڑی چل نہیں وہ سپاہی دروازے پر پہرہ دیتے رہے۔ بالآخر گاڑی چلی۔ ساری گاڑی ان لوگوں سے بھری تھی جو لاہور اور نواح سے لُٹ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی باتیں سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ کسی کی بہن ماری گئی، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کی بیوی بھگالے گئے۔ میں سُنتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ یہ مجھے مار کیوں نہیں ڈالتے۔ گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے لاہور سے بھاگنے سے پہلے پروفیسر برج نرائن بھی قتل ہو چکے تھے۔ یہ معاشیات کے مشہور پروفیسر تھے۔ پاکستان کے حامی تھے اور مجھے ان سے شخصی نیاز حاصل تھا۔ بڑے نیک دل اور لائق آدمی تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ لوگ مجھے برج نرائن کے بدلے میں ماردیں تو میرے پاس تو کوئی معقول وجہ شکایت بھی نہ ہوگی۔ لدھیانہ گاڑی پہنچی تو وہاں اسٹیشن پر ایک قیامت برپا تھی۔ مار دھاڑ تو نہ تھی لیکن ایسی وحشت اور ایسی نفسا نفسی کہ الاماں۔ چند منٹ بعد میرے ملازم نے آکر میرے کان میں کہا "میاں، وہ لوگ جو کل جالندھر میں ملے تھے وہ یہاں پلیٹ فارم پر ہیں اور آپ کو دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں"۔ میں نے سوچا شاید کل کا غیر مکمل کام آج پورا کریں! لیکن ہماری گاڑی کھڑی ہی تھی کہ دہلی کی طرف سے گاڑی پہنچی اور وہ لوگ اس میں بیٹھ کر جالندھر کی طرف چلے گئے۔ غالباً یہیں لدھیانہ میں ٹرین کو دیکھ لیتے تھے اور نظر میں مسلمان مسافروں کو کرلیتے تھے۔ پھر جالندھر پر ان کا استقبال کرتے، سامان "چکاتے" اور باہر لے جاکر "انتظام" کرتے تھے۔ خیر، وہ تو چلے گئے لیکن ہماری گاڑی کوئی گھنٹہ بھر وہیں کھڑی رہی۔ معلوم ہوا کہ آگے راستے میں گاڑیاں لُٹ رہی ہیں، اس لیے اسٹیشن ماسٹر نے انبالہ سے فوج بلائی ہے۔ جب تک وہ نہ آجائے گی گاڑی نہ چلے گی۔ یہ ایک گھنٹہ کیا عرض کروں کتنا طویل تھا۔ چاروں طرف لوگ رو رو کر اپنا دکھڑا کہہ رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کسی کو دیکھ لیتے تو چلّا کر بُلاتے اور پوچھتے ہماری ماں کہاں رہ گئی، بہن پر کیا گزری، بھائی بھاگ پایا کہ نہیں، اور اپنے سوالوں کے عجیب درد انگیز جواب پاتے۔ اتنے میں ایک نوجوان باہر سے میرے ڈبے میں آیا اور میرے پاس آکر پوچھا "آپ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں؟" میں نے سمجھا طلبی آئی۔ میں نے کہا "جی ہاں"۔ اس نے جھک کر میرے

قدم چھوئے۔ میں نے کہا "بھائی، یہ کیا کرتے ہیں آپ"۔ بولا "آپ تو میرے اُستاد ہیں"۔ میں نے کہا "میں نے پہچانا نہیں"۔ کہا "جی ہاں، آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتا ہوں، آپ میرے اُستاد کے اُستاد ہیں، میں سوریہ کنت شاستری جی کا شاگرد ہوں۔ وہ آپ کے شاگرد ہیں۔ اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے تھے"۔ پھر بولا "آپ نے غضب کیا، آپ اس ٹرین سے سفر کر رہے ہیں، یہ تو سب پنجاب کے نکالے ہوئے لوگ ہیں"۔ میں نے کہا "بھائی دہلی جاتا ہے اور یہی ٹرین وہاں جاتی ہے، کل جالندھر آیا تھا، آج واپس جاتا ہوں"۔ اس نے دریافت کرنے پر اپنا حال سُنایا۔ ایک کالج میں لکچرر تھا۔ اس کا مکان لُٹ گیا تھا، سامان میں صرف ایک بنڈل ہاتھ میں لے کر بھاگا تھا اور بنڈل امتحان کی کاپیوں کا تھا۔ اس کی محبت اور ہمدردی کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ افسوس کہ اب اس کا نام یاد نہیں، نہ کبھی اس نے بعد میں اپنا احسان جتایا۔ وہاں میرے پاس اپنے دو ساتھیوں کو بٹھا گیا اور کہا کہ "آپ ٹرین سے نہ اُتریں، جو ضرورت ہو ان لوگوں سے کہیں، یہ سب کام کریں گے۔ کھانا پانی جس چیز کی ضرورت ہو یہ اُتر کر لادیں گے۔ گاڑی نہ جانے کب تک کھڑی رہے اور پلیٹ فارم کا کچھ ٹھیک نہیں"۔ ان دونوں جوانوں میں ایک چھبرا(؟) نامی آج کل دہلی کے سرکاری دفتر میں کام کرتا ہے اور مجھ سے برابر ملتا رہتا ہے۔ خدا خدا کرکے گاڑی چلی اور ہم دہلی پہنچے۔ میں اور میرا ملازم اور اس کے ہاتھ میں ایک خالی حیدرآبادی بٹی اور "شامل بدصنا"۔

خط بہت طویل ہوگیا۔ لیکن آپ نے نہ جانے کس تعلق خاطر سے یہ سوال کیا تھا، مجمل جواب لکھنے کو جی نہ چاہا، جب یہ واقعہ یاد آتا ہے یا کوئی یاد دلاتا ہے تو اپنی کند ذہنی پر تعجب ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں افسوس نہیں ہوتا۔ شاید کند ذہنی سے لوگوں پر بھروسا کرنا ذہانت سے ان پر شبہہ کرنے کی بہ نسبت مجھے زیادہ مرغوب ہے۔ واپسی پر دہلی میں جو دیکھا اس کے سامنے جالندھر کس شمار قطار میں تھا۔ کمینہ پن، بربریت اور سفاکی کے عجب مظاہر دیکھے۔ لیکن ہوتے ہوتے سب کے نقش مٹتے جاتے ہیں۔ یاد ہے تو یہ کہ ایک اجنبی ہندو، کپور صاحب، کسی سے سُن کر کہ میں کون ہوں،

ایک اجنبی سکھ افسر نے کپور صاحب سے سُن کر، میری جان بچانے کے لیے اپنے کو خطرے میں ڈالا، بیدی صاحب جنھوں نے بھائیوں کی طرح اپنے ساتھ رکھا، اور اس شاگرد اور اس کے رفیقوں نے سفر میں ساتھ دیا۔ اپنی جان کے بچنے پر نہیں کہہ سکتا کہ خوش ہوں یا شرمندہ۔ دوبارہ یہ نعمت دی گئی اور اس سے کچھ کام نہ لیا، اس پر ندامت ہی زیادہ ہے۔ دُعا فرمائیے کہ جو باقی ہے وہ ٹھیک کٹے اور خاتمہ بالخیر ہو۔

میں نے یہ روداد ذاتی طور پر آپ کے لیے لکھ دی ہے۔ اسے اپنے ہی تک رکھیں تو اچھا ہو۔ امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا، والسّلام

نیاز مند
ذاکر حسین"

ذاکر صاحب دہلی اسٹیشن پر ۳ بجے صبح پہنچے۔ انھوں نے منظور کو (جو اس سفر میں ذاکر صاحب کے ساتھ تھے) اسٹاف کار کو منگوانے کے لیے فون کرنے سے منع کر دیا کیونکہ اس سے جامعہ میں بلا وجہ پریشانی ہوتی۔ وہ ویٹنگ روم گئے کہ شاید وہاں بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ سب کمرے بھرے ہوئے تھے۔ دربان نے کہا کہ وہ برآمدے میں اپنا بستر بچھالیں لیکن ذاکر صاحب کے پاس بستر ہی کہاں تھا۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ کیا کوئی سستا سا ہوٹل وہاں کہیں قریب ہے۔ دربان نے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا۔ ذاکر صاحب وہاں گئے اور انھیں کوٹھری دے دی گئی جس میں نہ پنکھا تھا نہ روشن دان۔ انھوں نے منظور سے کہا کہ چھت پر دیکھو کہ کوئی جگہ ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ وہاں جگہ ہی نہیں بلکہ ایک چارپائی بھی ہے۔ جب وہ منظور کے ساتھ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ساری چھت پر بکریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ منظور نے ان سب کو ایک طرف ہانک دیا اور ذاکر صاحب چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے اوکھلا جانے والی پہلی بس پکڑی اور ٹرمنس پر اُتر گئے اور اپنے گھر کو اس طرح کھیتوں سے ہو کر چلے کہ راستے میں کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔"[1]

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ اے بایوگرافی، صفحہ ۱۴۳

اسی دن یا دوسرے روز وہ وزیرِ اعظم اور وزیرِ داخلہ سے ملے، اور جو کچھ ان پر گزری تھی اور جو کچھ انھوں نے جالندھر میں دیکھا تھا اس سے انھیں مطلع کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تک پنڈت نہرو کو پنجاب کی صورت حال سے کچھ زیادہ باخبر نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ وہ ذاکر صاحب کی روداد سن کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے دوسرے دن وہ ہوائی جہاز سے جالندھر پہنچے اور پھر تو سب کو معلوم ہو گیا کہ وہاں کیسا المیہ واقع ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ لیکن تشدّد اور مصائب اتنے بڑھ گئے تھے کہ کسی ایک واقعے کا دیرپا اثر قائم نہیں رہ سکتا تھا، اور اب تو خود دہلی اس کی زد میں تھی، مصائب و آلام اور مظلوم، برباد اور دلوں اور جسموں کی جراحتوں سے چُور چُور انسانوں کے جذبات و احساسات کا ایک سیلاب تھا جو دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا اور جس پر کسی طرح قابو نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا۔

صبحِ آزادی کا داغ داغ اُجالا

طویل شبِ غلامی کے بعد آزادی کی صبح کا اُجالا کتنا داغ داغ تھا، اس کی ایک دلدوز جھلک ہم نے ذاکر صاحب کے خط میں ابھی دیکھی۔ بیگم انیس قدوائی کی کتاب[1] آزادی کی چھاؤں میں اس "شب گزیدہ سحر" کو کئی رنگ میں پیش کرتی ہے جن میں کئی خونیں ہیں اور کئی ایسے جو حالات کی اس ہولناکی میں بھی اُمید دلاتی تھیں کہ انسان ابھی مرا نہیں ہے، انسانیت زندہ ہے۔

ذاکر صاحب جب جالندھر سے بچ کر دہلی واپس آئے تو وہ وزیرِ اعظم پنڈت نہرو وغیرہ کو پنجاب کی صورت حال سے باخبر کرنے کے بعد چند دنوں کے لیے جامعہ نگر میں مجیب صاحب کے مکان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ منظور پیچھے کے دروازے سے ان کے لیے کھانا اور ناشتہ لے جاتے۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ذاکر صاحب کی یہ گوشہ نشینی کیا آرام کے لیے تھی جس سے وہ محروم رہے تھے؟ لیکن جن حالات سے وہ گزرے تھے ان کا تجربہ ایسا روح فرسا

۱۔ قومی ایکتا ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

تھا کہ آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا! تو پھر کیا یہ گوشہ نشینی جگر لخت لخت کو جمع کرنے کے لیے تھی، یا اُن خوابوں کے ماتم کے لیے تھی جو بکھر گئے تھے؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ جو ان کی امیدوں، حوصلوں اور ارادوں کا مرئی پیکر تھی، وہ بھی منتشر ہوتی نظر آتی تھی، کیا مجیب صاحب کے مکان میں دھیان گیان کا یہ مرحلہ، کسی پیمانے پر بھی، اسے انتشار و تباہی سے محفوظ رکھنے کی تدبیروں پر غور و فکر کے لیے تھا یا پنجاب کے حالات کے پیشِ نظر دہلی کے مسلمانوں کی بربادی کے اندیشوں، مسلمانوں کی آیندہ کی مشکلوں، اس ملک میں اسلام، گنگا جمنی ہندو مسلم تمدن اور پھر پوری قومی زندگی کو پیش آنے والے خطروں کے تجزیے اور ایسے میں جو کچھ بچ سکے اسے بچا لینے کے عزم و ارادے کے لیے تھا؟ —— ان تمام سوالوں کا جواب ذاکر صاحب ہی دے سکتے تھے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جب دہلی میں آتش و خون کا سلسلہ شروع ہوا تو ذاکر صاحب اپنے 'حجرہ' سے نکل آئے اور پھر انھوں نے ہمت اور عزیمت کی ایک مثال قائم کر دی۔ وہی نیشنلسٹ مسلمان، عارضی حکومت کی کابینہ میں جس کو شامل کرنے کی تجویز ابھی کوئی ایک سال پہلے 'مسلم انڈیا' کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، آج 'مسلم انڈیا' کے قافلوں کے لُٹے پٹے خیموں کی جلی ہوئی طنابیں اس عزم کے ساتھ جمع کر رہا تھا کہ ان کے قافلے کو ایک بار پھر جادہ پیما ہونا تھا: اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

جامعہ ملیہ کے وہ شعبے جو ابھی قرول باغ ہی میں تھے، آتش و خون کی زد میں تھے۔ اس کے ایک کارکن کام آچکے تھے اور شفیق الرحمٰن قدوائی اور حامد علی خاں قتل ہوتے ہوتے بال بال بچے تھے۔ ادھر جامعہ نگر کے آس پاس گانوؤں میں باہر سے آنے والوں نے منظم طور پر قتل و غارتگری شروع کر دی تھی۔ شہر میں مسلم محلوں اور علاقوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا ذکر اب اس لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کچھ مرقوم ہو چکا ہے۔ اُن بُرے دنوں میں ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو جانے، شہرِ دہلی اور ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ میں اپنے

۱۔ دیکھیے بیگم انیس قدوائی کی کتاب 'آزادی کی چھاؤں میں'۔ اس میں ایک باب ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ سے متعلق ہے۔ یہ کیمپ ذاکر صاحب کی نگرانی میں جامعہ والے چلا رہے تھے۔

ساتھیوں کی مدد سے مسلمانوں کی خدمت کرنے اکسٹنڈ ین جے۔ ایم۔ بولو پرابھو کے مشیر کی حیثیت سے مکمل غیر جانب داری کا ایک ریکارڈ قائم کرتے، اور پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے زخم خوردہ دلوں کو ہاتھ میں لینے کے سلسلے میں جو کچھ کیا، اس کی داستان بھی بہت طویل ہے۔ ہاں، ان دنوں انھوں نے جو تقریریں کیں، جس ہمت اور جوانمردی سے کام کیا اور ان کی شخصیت اور اقدامی صلاحیت کے جو جوہر دیکھنے میں آئے، اس سب سے ایک بندۂ مومن کی دلآویز تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ بندۂ مومن اگر ایک طرف مصاف زندگی میں فولاد کی صورت صلابت واستقامت کی مثال ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کا دل زخموں سے چُور اور آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہوتی ہیں کہ ابھی انسان اپنی وحشت پر قابو نہیں حاصل کرسکا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی کے حالات ہی ایسے تھے کہ عام انسان ایک گہری بے یقینی اور بے پناہ خوف وہراس میں مبتلا تھا۔ جامعہ میں بھی یہی کیفیت تھی ـــ بے بسی کا سکوت اور خوف کا سناٹا ـــ ذاکر صاحب نے ۲؍اکتوبر کو گاندھی جی کے جنم دن کے موقع پر جامعہ والوں کی چھوٹی سی جماعت کو خطاب کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال کی طرف سے مشین گنوں کی آواز آرہی تھی، جنوب کی طرف سے مسلح بلوائیوں کا خطرہ تھا، مشرق کی طرف سے ستائے ہوئے سہمے ہوئے دیہاتی آآکر جامعہ میں پناہ لے رہے تھے اور مغرب کی طرف ہمایوں کے مقبرے کا اور وہاں سے پاکستان کا راستہ کھُلا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو جامعہ سے گاندھی جی کے گہرے تعلق اور اُن دنوں کی یاد دلائی جب گاندھی جی مسلمانوں کے سچے دوست اور محسن سمجھے جاتے تھے، پھر اس زمانے کا ذکر کیا جب مسلمانوں کے نئے دوست اور محسن پیدا ہوگئے، جنھوں نے ان کو بتایا کہ گاندھی تمھارا نمبر ایک دشمن ہے۔" یہ جھوٹ اس قدر پھیلا کہ مسلمانوں کے دلوں کے دروازے گاندھی جی پر بند ہوگئے، مگر گاندھی جی کے دل کا دروازہ ان کے لیے ہمیشہ کھُلا رہا . . ."

ذاکر صاحب نے کہا: "آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا سچا پکا دلی دوست ایک ہی ہے جو آپ کا پشت پناہ اور سینہ سپر ہے۔ آج مسلمان گاندھی جی کو مان گئے ہیں، اس لیے

کہ مسلمان اور چاہے جو کچھ ہوں، احسان فراموش ہرگز نہیں ہیں"۔

ذاکر صاحب نے دہلی میں فسادات کو روکنے اور امن و امان کی بحالی کے لیے گاندھی جی کی کوششوں اور حکومت وقت کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ گاندھی جی کی آواز اثر کرکے رہے گی، حکومت کو حالات پر قابو حاصل ہوگا، وحشت اور بربریت کے دن جلد ہی بیت جائیں گے اور ہندستان جو اتنا گر گیا ہے ایک بار پھر اُٹھے گا اور دنیا کی قومیں، پوری انسانیت ہندستانی قوم کے مصلح گاندھی جی پر فخر کرے گی۔ انھوں نے اہل جامعہ کو بتایا کہ "کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک دم سے یہ قیامت ٹوٹ پڑے گی، فسادات کے پہلے ریلے نے اچانک آلیا" لیکن اب حکومت سنبھل گئی ہے اور پوری قوت سے اس فتنے کا سر کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں سچائی کی پوری قوت کے ساتھ کہا:

"مگر آپ لوگ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ خطرہ ابھی سر پر منڈلا رہا ہے اور جو کچھ اب تک ہوا ہے اس سے بھی بدتر حالات پیش آسکتے ہیں۔ یہ آگ سارے ملک میں پھیل سکتی ہے، اپنے کو دھوکے میں نہ رکھیے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو بے فکری کا اطمینان دلایا جائے۔ میں آپ کو وہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں جو خطرے کا پورا احساس رکھنے کے باوجود ہوتا ہے ... قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقعے آتے ہیں، یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمایش کا ہوتا ہے۔ اب آپکے سامنے یہ سوال ہے کہ اپ اس آزمایش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ... پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے، جو جانا چاہے شوق سے جائے، مگر یاد رکھیے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی۔ کتنے ہوں گے جو راستے میں مارے جائیں گے۔ کتنے ریل کے بند ڈبوں میں گھٹ کر مرجائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ اس آزمایش سے گزرنے کا ہو تو پھر یہاں ڈٹ جایئے۔ یہ یاد رکھیے کہ بہت ممکن ہے کہ آپ مار ڈالے جائیں، لیکن آپ کا یہ قتل رایگاں نہیں جائے گا۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن پر قاتل شرماتے ہیں اور

مقتول فخر کرتے ہیں۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں، بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو سنبھال لیتے ہیں، گری ہوئی قوموں کو اُٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اگر ایسے مقتولوں میں شامل ہو جائیں تو وہ کام کر جائیں گے جو پچھلے سب کاموں پر بھاری ہوگا۔

"جو لوگ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں ان کے لیے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی جس کو غلط رہنمائی نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے، آپ کے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے! کیا عجب ہے؟ خدا آپ ہی کے ہاتھ سے مسلمانوں کی تنظیم کا کام لے جس کی بنا خدا کے خوف اور خلق خدا کی محبت، وطن کی وفاداری اور اہل وطن کی خدمت پر استوار ہو! اور کچھ نہ سہی تو آپ اپنی مثال سے اس وقت دہلی کے لوگوں کی ہمت بندھائیں گے۔ اب بھی جو مسلمان اپنے اپنے محلوں میں ڈٹے ہوئے ہیں وہ بھاگنے والوں سے زیادہ آرام میں ہیں۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے دہلی بچ جائے گی۔ آپ اس کے بچانے میں حصہ لیجیے..."[1]

ادھر ذاکر صاحب نے ساتھیوں میں ایک جوش، ہمت اور امید پیدا کی، اور اُدھر ان کی شخصیت کی وجہ سے وزیر اعظم اور دہلی ایڈمنسٹریشن نے جامعہ ملیہ اور اوکھلا گانو کی حفاظت کا خاص خیال رکھا، ایک رات خود دہلی کے ڈپٹی کمشنر جامعہ آئے اور تقریباً ایک درجن بندوقوں کے لائسنس تقسیم کیے۔ ایک دن کوئی آدھی رات کو وزیر اعظم خود پہنچے، حفاظتی انتظامات کا معائنہ کیا اور اس وقت گئے جب رات ختم ہونے والی تھی۔ جنرل کیری اپا نے مدراس رجمنٹ کا ایک دستہ جامعہ نگر کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ گاندھی جی نے ۹ ستمبر کی صبح کو دہلی اسٹیشن پر پہنچتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا: کیا ذاکر حسین خیریت سے ہیں؟ کیا جامعہ ملیہ محفوظ ہے؟ دوسرے دن وہ اپنے اطمینان کی خاطر

۱۔ ذاکر حسین، "قرار یا فرار" نئی روشنی (جامعہ نگر، نئی دہلی)، ۲۴ جون ۱۹۴۸ء

جامعہ آئے![1]

بھائیو، دوستو، ساتھیو!

دہلی کی آبادی میں روز افزوں تعداد میں جسم و جان کی گہری جراحتوں کے ساتھ پناہ گزینوں کا ایک نیا عنصر شامل ہو رہا تھا۔ ان پر جو کچھ بیتی تھی اس نے اُن کے دلوں میں مسلمانوں سے نفرت اور انتقام کے جذبے کا لاوا بھر دیا تھا۔ ضرورت تھی کہ انھیں نہ صرف مادی اعتبار سے بلکہ جذباتی لحاظ سے بھی "بسایا" جائے۔ ستمبر کے مہینے میں جب دہلی کے حالات بہت خراب تھے، لوگ لُٹ رہے تھے، لوگ بھاگ رہے تھے، شریف خانماں برباد تھے، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ صدیوں سے ساتھ ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر رہے تھے، ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی اور دہلی ایک بہت بڑی قتل گاہ بن چکی تھی، اس وقت ذاکر صاحب نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ تقریر کیا تھی ایک نالۂ دردناک تھا، ایک دلِ دردمند کی پکار تھی، ایک چشمِ گریاں کے آنسو تھے۔ ذاکر صاحب نے روتے ہوئے دل سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو صدیوں کی دوستی کا واسطہ دیتے ہوئے اخوت، محبت اور آشتی کا پیغام دیا تھا:

"بھائیو، دوستو، ساتھیو! میں نے یہ تینوں لفظ جان بوجھ کر بولے ہیں۔ آدمی کو آدمی کا بھائی قدرت بناتی ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ایک دیس میں پیدا کیا ہے۔ اسی مٹی سے ہم سب بنے ہیں، اسی کی مٹی میں ہم سب ملتے رہے ہیں، اسی میں پلے بڑھے ہیں اور اسی میں مرتے، جلتے، گڑتے ہیں ... ہم نے تم نے، سب نے اس کے ہر آرام اور اس کے ہر دکھ میں ایک سا حصہ پایا ہے ... قدرت نے جو رشتہ جوڑا ہے اُسے توڑنے پر کیوں تلے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. Lxxxix, August 1, 1947----Nov.10, 1947,p.169 اور ٹنڈلکر، مہاتما، جلد ۸، صفحہ ۱۳۷۔

ہو سکے ہو!

"ہاں، تم شاید کہو کہ آدمی خالی قدرت کا حصہ نہیں، پتھر نہیں، پودا نہیں، جانور نہیں ہے کہ قدرت نے جو بنادیا وہی رہے۔ یہ آدمی ہے۔ اپنی دُنیا آپ ہی بناتا اور بگاڑتا ہے، تو یہ بالکل سچ ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمھیں دوست کہہ کر پکارا ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ہی ایک دیس میں پیدا کر کے بھائی نہیں بنایا ہے، بلکہ ہم اپنی خوشی سے مل جل کر صدیوں ساتھ رہے ہیں، غم شادی میں ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں۔ آپس میں سلوک کیے ہیں، ایک دوسرے کے عیبوں سے چشم پوشی کی ہے، ہنر ڈھونڈے ہیں، سیکھے ہیں، سکھائے ہیں، ایک نے اپنی کمی دوسرے سے پوری کی ہے، ایک دوسرے کو برتا ہے، پرکھا ہے، سمجھا ہے، محبت کی ہے، وفاداری کی سب رسمیں نباہی ہیں، ایک دوسرے کے جان و دل میں دخیل رہے ہیں، غلامی کی لمبی اندھیری رات کو اسی ٹمٹماتے دیے کے سہارے کاٹ کر سحر کی ہے۔ آزادی کا روشن سورج نکلتے ہی کیوں دل پلٹے جاتے ہیں، کیوں نگاہیں بدلی جارہی ہیں۔ دوستو! دوستی کی رسمیں نباہو، دوستوں کو دشمن نہ بناؤ۔ کسی عارضی جنون میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو۔ مجنونوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے، دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو۔ دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہے اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ محبت، بھروسے اور یقین سے کام لو اور دیکھو کہ اس میں یہ پودا کیسا لہلہاتا ہے اور اس پر وفا کے پھول کھل کر کس طرح اپنی خوشبو سے کینہ اور کپٹ کی گندی فضا کو مہکا دیتے ہیں اور اپنی شفاف خوش رنگی سے شک و شبہے کے گدلے پن کو کیسے کاٹ دیتے ہیں۔ بھائیو! دوست بنو، دوستی کے حق ادا کرو، دوستی کے تقاضے پورے کرو اور پورے کراؤ۔"

ستمبر ۱۹۴۷ء کی نفرت اور عداوت کی اس گھناؤنی فضا میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو اخوت اور دوستی کی طرف بلانے کے بعد ذاکر صاحب نے یاد دلایا کہ ہم سب ساتھی ہیں اور ہم سب کے ساتھ ساتھ مل جل کر کوشش اور محنت کرنے ہی سے غلامی

نے زمانے کی اکٹھا کی ہوئی برائیاں، کمزوریاں، اور خرابیاں دور ہوں گی، اور کہا کہ "ساتھیو! کیسا بڑا کام ہے، کیسا کٹھن، پر کیسا پیارا کام! جن زندگیوں کو اس پیارے کام میں کھپانا ہے انھیں نفرت کی تلوار سے ہلاک کرتے ہو... کیسی نادانی ہے، کیسی ناسمجھی ہے، کیسا جنون ہے؟ ساتھیو! اب سب سے پہلا کام یہی ہے کہ اس نادانی کو دور کرو، اس ناسمجھی کو ہٹاؤ، جنون کا ہاتھ پکڑلو۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے انسان کی طبیعت کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ سب یہ سُن کر کہہ اُٹھیں گے کہ "ہم مجنون نہیں ہیں، مجنون کوئی اور ہے، ہم تو جنون کا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہاں! اگر تم بدلہ بھی لے رہے ہو تو جنون کا بدلہ جنون سے لے رہے ہو اور یہ خود جنون کی علامت ہے۔ بدنصیب ہے بدنصیب، وہ آدمی، اور بدبخت ہے بدبخت، وہ قوم جو اپنے پُن کی ترازو کسی اور کے پاپ کو بنائے، جو کسی اور کی بداعمالی کو اپنے عمل کا معیار قرار دے۔ بُرائی کی نقل کرنے سے کبھی اچھائی پیدا نہیں ہوئی ہے، گناہ کی پیروی کر کے کوئی ثواب کی منزل تک نہیں پہنچا ہے۔

"بھائیو، دوستو، ساتھیو! مسلم، ہندو، سکھ! سب اپنے اپنے سینے پر ہاتھ دھرو اور سوچو، اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دو تو تم کو پتا ملے گا کہ گناہ ہم سب نے کیا ہے۔ جی بھر کر گناہ، جی بھر کر ظلم، ہم میں سے کسی کو شرم سے آنکھ اُٹھانے کا یارا نہیں۔ گناہ کے پیالے کی تلچھٹ تک ہم سب نے چاٹ ڈالی ہے۔ تب ہی تو سب کے غم کا پیمانہ بھی لبریز ہے۔ اس غم کو غصّے میں نہ بدلو۔ شرماؤ، شرماؤ اور توبہ کرو، سب کے سب، شرماؤ، توبہ کرو... اپنی انسانیت کو بچاؤ... تہذیب اور انسانیت اور شرافت کی وہ ساری پونجی جو ہم نے غلامی کی گھٹا ٹوپ رات میں نفاق کی آگوں سے، خود غرضی کے طوفانوں سے بچا کر نکالی تھی اسے آزادی کی پَو پھٹتے وقت خاک میں ملاتے ہو؟ ایسا نہ کرو، اسے بچاؤ اور تہیہ کرو کہ اپنی زندگی کو اس پیارے کام میں کھپا دو گے جس کی ذمے داری آزادی نے تمھارے کاندھوں پر رکھی ہے، اور یاد رہے کہ اس کام کو نفرت کی گندگی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور دلوں سے کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے

لیے ضرورت ہے محبت کی، بھروسے اور یقین کی۔"

فسادات میں کچھ کمی ہوئی اور حالات قدرے بہتر ہوئے تو جامعہ نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس نے پناہ گزیں بچوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ شہر میں شفیق صاحب نے باڑہ ہندو راؤ اور پڑوس کے پناہ گزیں بچوں، جوانوں اور بڑے بوڑھوں اور مسلمان بچوں، جوانوں اور بڑے بوڑھوں کو ایک کمیونٹی سینٹر[1] میں جو وہاں قائم کیا جا چکا تھا، مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ سب آئیں، ایک دوسرے سے ملیں اور ساتھ بیٹھ کر کچھ کھائیں پئیں تاکہ محبت و دوستی کی فضا بنے اور دلوں سے نفرت، خوف اور دہشت دور ہو۔ ذاکر صاحب کی ریڈیائی تقریر کی یہ عملی شکل تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے اُسے کرتے بھی تھے، حالات خواہ سازگار ہوں یا ناسازگار۔ وہ ناساز کو سازگار بنانے کے گُر سے واقف تھے۔

گاندھی جی کا برت اور شہادت

دہلی میں امن و امان کی بحالی اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے خالص اخلاقی سطح پر گاندھی جی جو کوششیں کر رہے تھے اس کا آخری مرحلہ ان کا وہ برت تھا جس نے پوری قوم کے ضمیر میں اپنی خطاکاریوں کا احساس بیدار کر دیا تھا۔ ایوانِ حکومت، دہلی کے محلوں کے مقامی باشندوں اور پناہ گزینوں کی آبادیوں، غرض سب جگہ پچھتاوے اور ندامت کی ایک فضا تھی۔ برت کے پہلے ہی دن ۱۳ جنوری (۱۹۴۸ء) کو ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے برت کے سلسلے میں ایک بیان دیا جو درحقیقت ملک کے سبھی صاحب ضمیر انسانوں کے دل کی آواز تھی۔ بیان میں مخاطب گاندھی جی تھے اور کہا گیا تھا:

> "اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آپ کی رہنما آپ کی بصیرت ہے، اور آپ نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے دلوں کی تطہیر کے لیے صحیح وقت پر پکارا ہے۔

۱۔ بعد میں یہ کمیونٹی سینٹر شفیق میموریل اسکول بن گیا جو اب بھی چل رہا ہے۔

خدا نے آپ کو وہ استقامت اور اعتماد بخشا ہے جس کا اثر ہوکر رہتا ہے اور وہ یقین و ایمان عطا کیا ہے جو ناسازگار حالات میں بھی متزلزل نہیں ہوسکتا۔ خدا آپ کے ساتھ ہے، آپ ضرور کامیاب ہوں گے اور ہم ہیں کہ شرم سے گڑے جاتے ہیں کہ آزاد ہندستان کے پاس آپ کو دینے کے لیے تلخی، مصیبت اور پریشانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے . . . خدا کرے آپ اُس اعلاتر آزادی کی طرف رہنمائی کے لیے زندہ رہیں جس کے لیے آپ نے عمر بھر جدوجہد کی ہے، اور ہماری تمام ناعاقبت اندیشیوں اور بداعمالیوں کے باوجود، آپ اب بھی ہمیں اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر کسی چیز سے ہماری قلب ماہیت ہوسکتی ہے، تو وہ آپ کا یہ اعتماد و یقین ہے کہ آخرکار ہماری بنیادی اخلاقی خوبیاں اپنا اثر دکھا کر رہیں گی۔[1]

گاندھی جی نے حکومت کے ذمے داروں، مختلف فرقوں کے رہناؤں اور سماجی کارکنوں کے اصرار اور یقین دہانی پر چند روز کے بعد اپنا برت توڑ دیا، ان کے برت کا اخلاقی اثر ہوا تھا۔ اور حالات سدھرنے لگے تھے، لیکن کہیں دور فرقہ واریت کا عفریت طے کیے بیٹھا تھا کہ وہ گاندھی جی کی جان کی قربانی سے کم پر راضی نہ ہوگا۔ وہ چل کر دہلی آیا اور ۳۰ جنوری کو ان کی پرارتھنا میٹنگ میں ناتھورام گوڈسے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ گاندھی جی کو ناتھورام نے قتل کیا تھا، اور اسی رات پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے ملک کی فضا کے پیشِ نظر دانشمندی سے کام لیتے ہوئے ریڈیو پر اعلان کر دیا کہ باپو کا قاتل ایک ہندو ہے، صبح ہوتے ہوتے محسوس ہوا کہ ملک کی فضا بدل گئی ہے، قوم کا ضمیر بیدار ہوگیا ہے، دل بدل رہے ہیں، دماغ بدل رہے ہیں۔ فرقہ واریت کے عفریت نے سچائی کے نشان کو مٹانا چاہا تھا، نشان تو مٹ گیا لیکن

۱۔ پیارے لال، ' Mahatma Gandhi - The Last phase ' جلد دوم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۲،

سچائی اور زیادہ نکھر کر سامنے آگئی۔ گاندھی جی کے خون نے وہ کام کیا جو حکومت کی پوری طاقت بھی نہ کر سکی تھی۔ کبھی کبھی سچے اور نیک انسانوں کی جان کی قربانی نئی زندگی کا پیغام بن جاتی ہے۔ "بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں" ؎

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

ذاکر صاحب پر اس خونیں حادثے کا بہت اثر ہوا۔ لیکن انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اس زمانے میں انھوں نے جو تقریریں کیں اُن سے اگر ایک طرف ان کے گہرے غم و اندوہ کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کے اس احساس کا بھی کہ مرنے والے نے جاتے جاتے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے اور ایک خلش بن کر عرصے تک وہ ملک کے اچھے لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گا۔

سچائی اور انصاف کی راہ میں گاندھی جی کے اس "زندگی بخش" قتل کے تھوڑے ہی دن بعد ذاکر صاحب نے دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا (مدراس) کے جلسۂ تقسیم اسناد میں گاندھی جی کو خراجِ عقیدت و محبت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ساری عمر نیکی، سچائی اور انصاف کے لیے اس طرح جدوجہد کی، اور اہنسا کے اصولوں کے مطابق کی، کہ دنیا سے اُٹھنے سے پہلے خدا کا یہ بندہ "ہماری قوم ہی کی نہیں ساری انسانیت کے ضمیر کی آواز بن گیا، بے لاگ، بے میل، کڑوی، ستانے والی، بے کل رکھنے والی مگر جی میں گھر کرنے والی آواز — بڑی بھول میں ہے وہ جو سمجھتا ہے کہ یہ آواز چُپ ہو گئی ہے، نہیں یہ ہماری قومی زندگی کے رونگٹے رونگٹے میں بس گئی ہے۔ سچ کے راستے پر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں گے تو یہ ہمیں للکارے گی، ظلم کے لیے جب کبھی ہمارے ہاتھ اُٹھیں گے تو یہ ان کو روکے گی، ہم ضرور کبھی کبھی اس آواز کو دبانا چاہیں گے، اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر اس کے سننے سے بچیں گے مگر یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی، یہ کانٹا بن کر ہمارے دل میں کھٹکے گی، ہماری نیند حرام کر دے گی، اور اپنے کو سُنوا کر منوا کر رہے گی۔ اور اگر

۱۔ دیکھیے ذاکر صاحب کی تقریر، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۸ء بمقام جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

کہیں ہم نے اسے دبا دیا' ہمارے کان اس کے لیے بہرے ہوگئے تو ہم چاہے کچھ اور بن جائیں' دنیا میں ایک اچھی' سچی' نیک قوم نہ بن سکیں گے۔ خدا نہ کرے ہم کبھی اس آواز کو دبا سکیں"۔[1]

"نورِ اُمید"

ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک رجائیت پسند انسان تھے' ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں ہم نے انھیں ایک متحرک اور رجائی شخصیت کے روپ میں دیکھا' گاندھی جی کے قتل جیسے سنگین حادثے نے بھی انسان کی فطری نیکی پر ان کے اعتماد کو متزلزل نہیں کیا۔ دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی پوری تقریر جس کا ایک اقتباس ابھی نقل کیا گیا ہے' پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ اُن کی رجائیت ان کی عزیمت کا ہی ایک ناگزیر حصہ تھی۔ ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء کو انھوں نے 'بیمارستان لاکولین' جنیوا' سے عابد صاحب کو ایک خط لکھا تھا' جہاں ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ عابد صاحب نے اس خط کو اپنے اخبار نئی روشنی میں "نورِ اُمید" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔[2] اس خط میں بھی رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ اسی عالم میں لکھتے ہیں :

"... جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اُٹھا سکتا ہوں۔ اس کی دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا' وہ اس وقت کام

۱۔ ہندی رسم الخط میں یہ پوری تقریر ذاکر حسین لائبریری' جامعہ ملیہ اسلامیہ' میں موجود ہے۔

۲۔ جنوری۔ اپریل ۱۹۸۷ء کے اسلام اور عصر جدید (جامعہ ملیہ اسلامیہ' نئی دہلی) میں ہم نے نئی روشنی سے پورے خط کو نقل کیا ہے۔

آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور۔

''... نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اُٹھتے ہیں۔[1] مایوس کُن سے مایوس کُن خیال آتا ہے مگر ٹھہرتا نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کہ حالات کا، میرے اپنے ذاتی اور وطن کے عمومی حالات کا تقاضا یاس افزا ہونا چاہیے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا، عابد صاحب، ان پچھلے بارہ دن میں[2] جاگتے میں مجھے کبھی ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات، میری بند آنکھیں برابر کُرے کو روشن پاتی ہیں ... اس کی علمی وجہ مجھے نہیں معلوم، نہ اس کے پتا چلانے کی مجھے فکر ہے۔ آپ سے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ حالات کی تاریکی میں میرے دل کا بھی یہی حال ہے، اس لیے کہ اس امید کی وجہ بھی مجھے صحیح معلوم نہیں۔ عرفی کا شعر وجہ نہیں بتلاتا لیکن کیفیت کی صحیح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

دلم بہ کوئے تو باصد ہزار نومیدی
بہ ایں خوشست کہ امیدوار می گذرد

''مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گزر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ کے میرے جیسے کمزور ہاتھ مل کر کریں گے، اور ایک صالح، عادل سماج بنانے کی کٹھن مہم سر کرنے کی کوشش ہی میں ہم سب کو اپنی شخصیت کو ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس مہم میں راہ نما روشنی کی ہر قدم پر ضرورت ہوگی، جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ روشنی مہیا کرے۔ جی کہتا ہے کہ

۱۔ عابد صاحب نے ذاکر صاحب کو لکھا تھا کہ شاید ۱۶ جون (۱۹۶۸ء) کو نئی روشنی کا پہلا شمارہ نکل آئے۔ اسی کے سلسلے میں انھوں نے لکھا تھا کہ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ ان خیالات میں سے ذاکر صاحب نے بعض کا اپنے خط میں ذکر بھی کیا تھا۔

۲۔ یہ خط آپریشن کے بارھویں دن لکھا گیا تھا۔

یہ ایسا کر سکے گا۔ آپ نے اس کا نام "نئی روشنی" خوب رکھا ہے۔ میری دوری اور بے بسی سے یہ نہ سمجھیے کہ اس دیے کی لَو کو روشن رکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو گھلانے سے بچ نکلوں گا۔"

نئے حالات میں بے اطمینانی

۱۶ر فروری ۱۹۴۸ء کو ذاکر صاحب نے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ خط ہمیں نہیں مل سکا۔ پنڈت جی نے اس خط کا اسی دن جواب لکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مراسلت دستی ہوئی تھی۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے اپنے خط میں گاندھی جی، جامعہ اور پھر دونوں کے گہرے تعلق کا ذکر کیا تھا اور غالباً یہ بھی لکھا ہوگا کہ آزاد ہندستان میں جامعہ جیسے ادارے کی بقا اور ترقی کیوں ضروری ہے، شاید یہ اُمید بھی ظاہر کی ہو کہ حکومت کو از خود اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ہاں، یقیناً براہِ راست انھوں نے کسی گرانٹ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہوگا۔ پنڈت جی نے لکھا کہ "کیا آپ کو مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جامعہ مجھے دل سے عزیز ہے اور اس نے جو کام کیے ہیں ان کی قدر و منزلت میری نگاہ میں بہت ہے؟" اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی جامعہ سے کس قدر قریب تھے، پھر کچھ فلسفیانہ باتیں لکھی ہیں۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کہ آیا حکومت اس کی کوئی مدد کرے گی یا نہیں۔[1]

۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسے میں جامعہ کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے آخر میں انجمن سے یہ درخواست کی کہ اب انھیں شیخ الجامعہ کے عہدے کے لیے دوبارہ منتخب کیا جائے۔ انھوں نے رپورٹ میں اپنے

Selected Works of Jawaharlal Nehru (Second series, V.5, pp. 560-551) -1

اس وقت کے احساسات کو اس طرح بیان کیا تھا،

"جوبلی کے بعد سے جامعہ میں نئے شعبے قائم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس کی ذمے داری مجھ پر تھی، میں اعتراف جرم کرتا ہوں۔ موجودہ حالات میں، اور خاص طور پر اسٹاف اور جگہ کی کمی کی وجہ سے، کوئی توسیع ممکن نہیں نظر آتی۔ جہاں تک اسٹاف کا تعلق ہے، اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ موجودہ تنخواہوں پر ضروری اور مطلوبہ قابلیت کے لوگ مل جائیں، خواہ کچھ نقصان اٹھاکر کسی بڑے مقصد کے لیے کام کرنے کی کتنی ہی خواہش ان میں کیوں نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب ہماری برادری نئے لوگوں کو قبول کرنے اور انھیں اپنا بنا لینے کی صلاحیت سے محروم ہوتی جارہی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہو کہ برادری کے موجودہ اراکین میں ماضی میں اپنی قربانیوں کی بنا پر احساس برتری پیدا ہوگیا ہے یا اس وجہ سے کہ ان میں اس ادارے کے مستقبل کے بارے میں معروضی طور پر سوچنے کی اہلیت نہیں ہے۔۔۔

"اپنی پچیس سال کی پرانی عادت کی وجہ سے مجھے قدرتی طور پر حکومت کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے گریز ہے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی چاہتے ہیں کہ اسٹاف کی تنخواہوں میں اضافے کے لیے حکومت سے امداد کی درخواست کی جائے، اور حکومت کے بعض ذمّے دار افسر اس درخواست پر غور کرنے کے لیے آمادہ بھی ہیں، تو میں نے مولانا آزاد سے مشورہ کیا اور وزارت تعلیم کو لکھا۔۔۔ لیکن قریب ایک سال کا عرصہ بیت گیا اور اب تک کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ شاید حکومت کے کام ایسے ہی کیے جاتے ہیں، شاید حکومت میں میرا کوئی اثر نہیں ہے، شاید معاملے کی پیروی میں میری طرف سے کوتاہی ہوئی ہے۔۔۔

"آخر میں ایک ذاتی درخواست پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔۔۔ میں بڑی محدود صلاحیتوں کا آدمی ہوں، اور جامعہ ملیہ کے مستقبل سے متعلق اپنے نوجوان ساتھیوں کے عزائم کے مقابلے میں انھیں ناکافی پاتا ہوں۔ اس کے علاوہ حالات نے مجھے اور دوسرے

کاموں میں بھی اُلجھا دیا ہے . . . اور بعض اسباب کی بنا پر میں ان کو کرتے رہنا چاہتا ہوں . . . ابھی تک مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ باہر جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بالواسطہ جامعہ ہی کی خدمت ہے ۔ بہر حال، اگر اس وجہ سے میں براہ راست جامعہ کے کاموں پر اپنی پوری توجہ اور توانائی نہ صرف کر سکا، تو پھر اس کا مفید نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ لوگ جامعہ سے میرے اختیاری یا غیر اختیاری قطع تعلق کے لیے تیار ہو جاتے جو جامعہ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے ۔ اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ میری جامعہ سے باہر کی مصروفیتوں کے سبب لوگوں میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ میری صاف گوئی سے تعمیری غور و فکر کی راہ کھل جائے . . ."[1]

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد اس کا کوئی سوال نہیں تھا کہ جامعہ کو مناسب استعداد کے ایسے کارکن مل جائیں جو جامعہ کے گُن کے ہوں اور تھوڑا بہت نقصان کا سودا کر کے جامعہ کی خدمت کریں ۔ تقسیم نے سب کچھ انتشار کی نذر کر دیا تھا، پھر وسائل کی بھی ضرورت تھی، اور یہ کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت اور وزارت تعلیم میں مولانا آزاد کی موجودگی سے بھی حکومت کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ جامعہ ملیہ کو سرکاری امداد ملی، مگر کئی برس بعد، اور بڑی پیروی اور دقتوں کے بعد ۔ ۱۹۴۶ء میں ذاکر صاحب وزیر اعظم کے پاس گئے تھے اور سلور جوبلی کے موقع پر خاصی بڑی رقم ملی تھی، ۱۹۴۸ء میں بھی جامعہ کو حکومت سے امداد ضرور ملتی اگر ذاکر صاحب اس کے لیے وزیر اعظم سے ملاقات کرتے ۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں وہ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے ۔ جامعہ جنگ آزادی کا تعلیمی محاذ تھی جس کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں تھیں ۔ آزاد ہندستان کی قومی حکومت کے ذمے دار اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ ذاکر صاحب اور جامعہ والوں نے اس محاذ پر کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں ۔ وہ اس کا اعتراف

---

۱ ۔ محمد مجیب، 'ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ اے بایوگرافی'، صفحات ۱۵۰-۱۴۹

ذکر کرتے تھے لیکن بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنے طور پر جامعہ کو دینے کے لیے حکومت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ غالباً برطانوی ہندستان کی بیوروکریسی کے طریقۂ کار کی بعض بُری روایات کو اب بھی جاری رکھا جانے والا تھا، شاید قومی حکومت ابھی سنبھل نہیں پائی تھی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں یہ خیال بھی کارفرما ہو کہ آزادی کے بعد تو ساری دانش گاہیں قومی ہو گئی ہیں، اب جامعہ کی کیا خصوصیت ہے، ہاں، ماضی میں اس کے کام اور کارکنوں کے ایثار کا محض ذکر ہی اس کا انعام ہے۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کے انجمن کے جلسے نے ذاکر صاحب کی یہ درخواست منظور نہیں کی کہ آیندہ انھیں شیخ الجامعہ نہ منتخب کیا جائے۔ انجمن نے انھیں آیندہ پانچ سال کے لیے (دسمبر ۱۹۴۸ء سے) پھر شیخ الجامعہ مقرر کیا اور فیصلہ کیا کہ چونکہ ان کی قومی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں اور جامعہ سے ان کا وابستہ رہنا بھی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے، اس لیے ایک نیا عہدہ نائب شیخ الجامعہ کا قائم کیا جاتا ہے اور شیخ الجامعہ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنا نائب مقرر کرے۔ بعد میں ذاکر صاحب نے مجیب صاحب کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۰ر نومبر ۵۳ ۱۹ء کے انجمن کے جلسے میں مجیب صاحب شیخ الجامعہ، عبدالمجید خواجہ صاحب امیر جامعہ منتخب ہوئے اور ایک نیا عہدہ نائب امیر جامعہ کا قائم کرنا تجویز کیا گیا۔ بعد میں جامعہ کی مجلس منتظمہ اور انجمن کی ضروری کارروائیوں کے بعد اس عہدے پر ذاکر صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۶۲ء میں جب خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا تو ذاکر صاحب امیر جامعہ منتخب ہوئے اور اپنی وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔

دسواں باب

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

(۱۹۴۸ — ۱۹۵۶)

یہ بات اب کچھ پیش پا افتادہ سی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ آزادی سے پہلے آٹھ دس سال مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ پر کیسے گزرے تھے، اور پھر آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد وہاں کی حالت کیا تھی! بس یہ سمجھ لیجیے کہ نشہ اتر چکا تھا، خمار باقی تھا اور لوگ اعضا شکنی میں مبتلا تھے، یا غالب کی زبان میں کہیں تو صورت یہ تھی کہ شب میں خرامِ ساقی کا جو لطف اور صدائے چنگ کا جو ذوق بزم پر چھایا ہوا تھا، اب صبحدم نہ اُن کا سُرور و شور باقی رہ گیا تھا اور نہ جوش و خروش، ہر طرف ایک مہیب سناٹا، خوف و ہراس کی ایک فضا جس میں یونی ورسٹی کے در و دیوار ساکت کھڑے بزم رفتہ کے ہنگامہ ہائے شوق کا سوگ مناتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ایسے میں نہ معلوم دہلی میں کہاں اور کس نے پہلے پہل یہ خیال ظاہر کیا کہ اب ذاکر صاحب کو جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ جانا چاہیے۔ بہرحال، پنڈت نہرو اور ان سے زیادہ مولانا آزاد کی یہ خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلر شپ قبول کر لیں، اور اُسے جمہوری قومی زندگی کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کا ایک ایسا ادارہ بنا دیں جس پر سیکولر ہندستان کو فخر ہو، اور جو نئے ہندستان میں مسلم نوجوانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے۔ ذاکر صاحب کو پہلے مرحلے میں یقیناً اس تجویز کے قبول کرنے میں تامل ہوا ہوگا،

جامعہ ملیہ کو جس کی تعمیر میں ان کے عہد شباب کی ساری توانائیاں صرف ہوئی تھیں، اس طرح بے سہارا یکایک چھوڑ دینے کا خیال انھیں کچھ عجیب سا لگا ہوگا۔ لیکن پھر یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی تو اب اور بھی بے سہارا ہے۔ قافلہ جا چکا ہے اور جلی ہوئی لکڑیاں اور راکھ کے ڈھیر چھوڑ گیا ہے۔ بے سہاروں کو سہارا دینا یوں تو ذاکر صاحب کی طبیعت ثانیہ تھی، لیکن یہاں تو اپنی مادر درس گاہ کا معاملہ تھا، بھلا اس کی حالت زار سے وہ کیوں متاثر نہ ہوتے۔ پھر یقیناً انھوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ آزاد ہندستان میں علی گڑھ کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کا کام دراصل جامعہ ہی کے قومی کام کی ایک بڑے پیمانے پر توسیع ہوگی، اور قومی زندگی میں مسلمانوں کا اعتبار اور وقار قائم کرنے کا ایک اور موقع ملے گا۔ قومی زندگی جس سے حالات نے برسوں عام مسلمانوں کو گریزاں رکھا تھا، بالآخر وہ اس مشکل اور وسیع ترملّی اور قومی خدمت کے لیے تیار ہو گئے، حالات کی اندھیاریوں میں روشنی کی تلاش کے لیے یہ ایک سخت چیلنج تھا، "مجاہد" ذاکر حسین نے اسے قبول کرلیا۔ شرط یہ رکھی کہ وہ حکومت کے نمایندے بن کر علی گڑھ نہ جائیں گے، اور چاہیں گے کہ یونی ورسٹی کی کورٹ متفقہ طور پر ان کا انتخاب کرے۔ اس کا انتظام کیا گیا[1]۔ ۸ر نومبر ۱۹۴۸ء کو یونی ورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں نواب محمد اسمٰعیل خاں نے وائس چانسلری سے اپنا استعفا پیش کیا اور خود ذاکر صاحب کا نام یہ کہہ کر اس عہدے کے لیے تجویز کیا کہ اب ذاکر صاحب ہی یونی ورسٹی کو سنبھال سکتے ہیں۔ کورٹ نے اُن کا استعفا منظور کیا اور متفقہ طور پر

۱۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس "انتظام" میں حکومت ہند کی وزارت داخلہ اور وزارت تعلیم کا خاص اور اہم حصہ تھا۔ سر محمد یامین خاں نے نامۂ اعمال (آئینۂ ادب، لاہور، جلد دوم، ۱۹۷۰ء صفحات ۲۳-۱۴۲۲) میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔ اور صرف اس قدر صحیح ہے کہ مولانا آزاد کے یہاں نواب اسمٰعیل خاں اور ذاکر صاحب کی ملاقات اس سلسلے میں ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ایک موقع پر اس ملاقات کا ذکر کیا اور کہا کہ جب میں مولانا آزاد کے یہاں طلب کردہ پہنچا تو دیکھا کہ نواب صاحب وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ موصوف نے مجھ سے فرمایا کہ "ذاکر صاحب، یونی ورسٹی کو آپ ہی سنبھالیے، اب مجھ سے نہیں سنبھلتی۔"

ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔ دو دن بعد انھوں نے نئے عہدے کا چارج لے لیا ۲۹ نومبر ۱۹۵۱ء کو نئے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ایکٹ ' (۱۹۵۱ء) کے تحت انھیں دوبارہ چھ سال کے لیے وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

جامعہ والوں کا تاثر

جامعہ والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء والی میٹنگ کے بعد یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ اب "سودائے محبت" کو کسی "تازہ ویرانے" کی تلاش ہے، لیکن غالباً وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انھیں اس قدر جلد اور اچانک ذاکر صاحب کو الوداع کہنا پڑے گا اور جب یہ گھڑی آ ہی پہنچی تو ان کو عجیب و غریب ذہنی و جذباتی کیفیتوں کا تجربہ ہوا۔ اس کا بہت کچھ اندازہ اس رخصتی ایڈریس[1] سے ہوتا ہے جو انھیں ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو جامعہ کے اسٹاف کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ اس ایڈریس کے چند اقتباس درج ذیل ہیں :

"جناب شیخ الجامعہ صاحب! آج ہم جامعہ کے لوگ اپنے آپ کو جس جذبے سے معمور پاتے ہیں وہ بڑی متضاد کیفیات کا حامل ہے۔ کل تک آپ صرف ہمارے وائس چانسلر تھے، لیکن اب آپ مسلم یونی ورسٹی کے بھی وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ اب صرف ہم ہی آپ کو اپنا نہیں کہہ سکتے، وہ بھی ہمارے برابر آپ کو اپنا کہہ سکتے ہیں۔ اس نئی صورت حال کا ہم کیا مطلب سمجھیں؟ اس پر ہم خوش ہوں یا افسوس کریں؟ یہ سوال ہے جو ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اٹھتا ہے، لیکن اس کا کوئی قطعی جواب ہم نہیں دے پاتے۔

"اس میں شک نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کو ایک نہایت قریبی رشتے میں منسلک رکھنے میں آپ کی ذاتی کشش کو غیر معمولی دخل رہا ہے جس طرح چراغ کے گرد پروانے،

۱۔ راقم الحروف، ڈاکٹر محمد اکرام خاں (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا شکر گزار ہے۔ یہ ایڈریس انھوں نے اپنے کاغذات سے نکال کر عنایت کیا۔

مقناطیس کے گرد لوہے کے ریزے اکٹھے ہوجاتے ہیں اسی طرح آپ کی دلفریب شخصیت نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اب علی گڑھ میں آپ کی مصروفیتیں اتنی زیادہ رہیں گی کہ جامعہ کے لیے آپ بہت کم وقت نکال سکیں گے، اور جو لوگ آپ کی وجہ سے کھنچ کر جامعہ آیا کرتے تھے وہ اب علی گڑھ جانے لگیں گے۔

"اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہم نے آپ کی جتنی قدر کرنی چاہیے تھی اتنی نہیں کی... یہ بھی ظاہر ہے کہ ہماری یہ امید کہ آپ صرف ہمارے بن کر رہیں گے خام خیالی پر مبنی تھی، لیکن ہم نے کچھ اس طرح اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھا کہ اب اپنے دل کو اس حقیقت سے مانوس کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ آپ اب صرف ہمارے نہیں ہیں، مسلم یونی ورسٹی کے بھی ہیں، سارے ہندستان کے بلکہ ساری دنیا کے ہیں — بہرحال ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ آپ ہماری طرف سے مسلم یونی ورسٹی میں اسی تحریک کو پورا کرنے گئے ہیں جو کوئی پچھلے تیس سال سے ہماری آپ کی مشترک تحریک تھی، یعنی مسلم یونیورسٹی کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے...

"علی گڑھ کالج کا جن لوگوں نے مقاطعہ کیا تھا وہ اسے روح آزادی سے معمور دیکھنا چاہتے تھے۔ جب وہاں انھیں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی... (پھر) علی گڑھ کالج یونی ورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا اور... (رفتہ رفتہ) ملکی اور قومی آزادی کے دھارے سے دور ہٹتا چلا گیا اور رجعت پسندی، انتشار اور تقسیم کی قوتوں کا اڈا بن گیا، اور جامعہ ملیہ باوجود اپنے تمام پُرخلوص اور نیک ارادوں اور قومی تمناؤں اور رجحانوں کے مسلمانوں کو مسلم یونی ورسٹی کی غلط رہنمائی سے محفوظ نہیں رکھ سکی، اور اس لحاظ سے اپنے قومی مشن میں کامیاب نہیں ہوئی... ہم امید پر زندگی کے ایام گزار رہے تھے، البتہ آپ نے ذاتی طور پر ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں سے خراج عقیدت وصول کیا، اپنا اور جامعہ کا اعتبار قائم کیا اور جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ساری دنیا کو جامعہ کے وجود اور اس کے پیغام سے روشناس کرا دیا۔ لیکن اس کے بعد ملک کی تقسیم ہوگئی، اور فضا ایسی بگڑی کہ جامعہ ملیہ کو ایک علاحدہ یونی ورسٹی بنانا تو خیر دور کی بات ہے، بچی بنائی

مسلم یونی ورسٹی کی زندگی خطرے میں پڑگئی۔ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ قومی قوتوں اور وسائل کو مجتمع کیا جائے، باہمی رقابت اور حریفانہ مقابلے کی جگہ تعاون اور اشتراکِ عمل سے کام کیا جائے۔ مصلحت کا تقاضا اسی میں نظر آنے لگا کہ مسلمانوں کی دو بالمقابل یونی ورسٹیاں قائم کرنے کا خیال دل سے نکال دیا جائے اور ایک مشترک یونی ورسٹی کے ذریعے آزاد ہندستان میں آزادی کی اسلامی تعبیر کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس کام کو انجام دینے کے لیے آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص نہ ہوسکتا تھا۔۔۔

"اب کہ آپ جامعہ ملیہ اور مسلم یونی ورسٹی دونوں کے وائس چانسلر ہیں، ہمیں امید ہے کہ ان دونوں اداروں کی اس طرح تنظیم فرمائیں گے کہ ان میں باہمی انحصار اور باہمی اشتراک کا رشتہ قائم کیا جاسکے، تاکہ ان کے مشترک وسائل سے قوم کی تعمیری جدوجہد کے لیے خاطرخواہ کام کیا جاسکے۔

"اس وقت جامعہ ملیہ والوں اور مسلم یونی ورسٹی والوں پر اکبر کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔ انھیں کشتی نہیں ملتی، اُنھیں ساحل نہیں ملتا
امید ہے کہ آپ مسلم یونی ورسٹی کی کشتی کو ساحل کی راہ دکھائیں گے اور جامعہ ملیہ کے لیے کشتی بہم پہنچائیں گے۔"

جامعہ ملیہ کے اساتذہ کی طرف سے دیے گئے اس رخصتی ایڈریس میں عقیدت و محبت کے جذبے کے ساتھ یہ جو دبے دبے شکایتی لب و لہجے کا ایک ہلکا سا تیکھا پن بھی ملتا ہے، وہ ایک لحاظ سے بالکل فطری تھا، اس لیے کہ جامعہ والوں کو یہ اُمید تھی کہ آزاد ہندستان میں قومی حکومت کے ذمّے داروں سے ذاکر صاحب کے قریبی تعلقات کی وجہ سے جامعہ اور جامعہ والوں کے دن پھریں گے، کام کا پیمانہ بڑھے گا، اور مالی مشکلات کا سامنا نہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کے لیے رختِ سفر باندھا تو انھیں ایک دھچکا سا لگا۔ عمر بھر کے ایسے رفیق و رہنما سے اس طرح یکایک بچھڑ جانا، ان کے لیے ایک سخت مرحلہ تھا۔

علی گڑھ — ایک آرزو

لیکن ذاکر صاحب، صاحب نظر تھے۔ ان کی چشم بصیرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کی عمومی زندگی میں علی گڑھ کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے مستقبل کی امیدوں کا مرکز بھی ہے، اسے بچا لیا گیا، اور اسے صحیح رُخ پر ڈال دیا گیا تو آزاد ہندستان میں "نیا علی گڑھ" مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا محور بن سکتا ہے۔ یہ گویا ایک وسیع پیمانے پر وہی کام ہوگا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۰ء سے کر رہی تھی — تو پھر کیوں ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے اس اہم موڑ پر ملک و ملت کے اس عظیم اور ہمت طلب لیکن ضروری اور دلکش کام کا موقع کھو دیا جائے! — اور ذاکر صاحب نے اپنے اس خیال اور احساس کو علی گڑھ میں مختلف موقعوں پر بیان بھی کیا، چنانچہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے کہا:

"مجھے دکھائی دیتا ہے کہ ہندستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارے کا ایک بہت اہم مقام ہے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ ملیہ کے کام کو چھوڑ کر جس کے ساتھ میری ساری ذہنی اور روحانی نشو و نما وابستہ تھی علی گڑھ نہ آتا۔ میں آنے اور ٹھہرنے پر صرف اس لیے اپنے کو راضی کر سکا کہ مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقع ہے —— 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست'—— وہ کام ہندستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کتنا دلکش کام! یہ مختلف تمدنی اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکانے اور ایک حسین و

جمیل کُل کی تشکیل میں مدد دے ۔ ۔ ۔ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندستانی زندگی کو صالح زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب' یہ ان پر ذمے داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؛ بہت بڑا کام ہے' بہت اہم کام ہے۔"[1]

اور اگست ۱۹۵۲ء میں انھوں نے فرمایا:

"میری پوری زندگی علی گڑھ سے وابستہ رہی ہے۔ یہیں پڑھا لکھا اور انسان بنا اور اب اسی کی خدمت کر رہا ہوں۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہاں سے نکالا بھی گیا ۔ ۔ ۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے جامعہ کے کام کو سنبھالا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی علی گڑھ ہی کا کام تھا۔ میں نے کبھی علی گڑھ اور جامعہ کو علاحدہ نہیں سمجھا۔ وہ علی گڑھ کی اصلاح کی تحریک تھی ۔ ۔ ۔ اب یہاں بھی اسی مقصد سے اور اس کو ایک اہم قومی خدمت سمجھ کر کر رہا ہوں۔ علی گڑھ میں قومی کردار پیدا کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو لوگ اس کام کو انجام دیں گے' ان کا نام محسنوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس فہرست میں میرا نام بھی ہو۔"[2]

۱۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۴۔ (۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر جس میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد خصوصی مہمان تھے، مسلم یونی ورسٹی کی سالانہ رپورٹ کا ایک اقتباس)

۲۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، حیات ذاکر حسین، مکتبہ برہان' دہلی' اپریل ۱۹۶۹ء' صفحہ ۱۸۹ (۱ر اگست ۱۹۵۲ء کو وقار الملک ہال کے ڈنر کے موقع پر ذاکر صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس)

تو اس طرح، ذاکر صاحب علی گڑھ ملک و قوم کی تعمیر کا ایک گہرا جذبہ، ایک آرزو لے کر گئے تھے، اور ۱۹۵۶ء میں ٹرم ختم ہونے سے پہلے انھوں نے جب وہاں کی وائس چانسلرشپ سے استعفا دیا تو زبان حال سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے:

راہِ محبت میں ہے کون کس کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو

لیکن قبل اس کے کہ ہم 'وصل و فراق' کی یہ داستان بیان کریں، یہیں اس کا ذکر بھی کر دیں کہ اس وقت وائس چانسلر کی ذمے داریوں کے ساتھ ان کی اور مصروفیتیں کیا تھیں۔ ۱۹۴۵ء سے ہی وہ انڈین کونسل آف ورلڈ افیرز کے ممبر چلے آ رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اس کے وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے انھوں نے چینی ثقافتی مشن کا دہلی میں استقبال کیا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں وہ انڈین یونیورسٹیز کمیشن کے رکن نامزد ہوئے اور اگست ۱۹۴۹ء تک جب کہ اس کمیشن کی رپورٹ پیش کی گئی، وہ اس کام میں بے حد مصروف رہے۔ ۳ اپریل ۱۹۵۲ء کو وہ راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے۔ اسی سال وہ پریس کمیشن کے ممبر بھی بنائے گئے اور ۱۹۵۴ء تک اس کے ممبر رہے۔ پھر وہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ ورلڈ یونی ورسٹی سروس کا کام دوسری نوعیت کا تھا اور غالباً اور کئی دوسرے کاموں کی بہ نسبت ان کی طبیعت کے عین مطابق تھا۔ ۱۹۵۰ء میں انھیں اس کی نیشنل کمیٹی کا چیرمین منتخب کیا گیا۔ ورلڈ یونی ورسٹی سروس کی کمیٹیاں بہت سی یونی ورسٹیوں میں قائم کی گئیں، طالب علموں کے لیے مستقل قدر و قیمت کے کئی مفید منصوبے بنے اور تکمیل کو پہنچے، اور 'دنیا ایک ہے'، اس عالمی تصور کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہندستان اور دوسرے ملکوں میں بین الاقوامی سمینار منعقد کیے گئے۔ ذاکر صاحب ہندستان کے نمایندے کی حیثیت سے تین بار یورپ گئے اور ۱۹۵۶ء میں ہلسنکی میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں وہ ورلڈ یونی ورسٹی سروس کی انٹرنیشنل کمیٹی کے چیرمین منتخب ہوئے، اس لیے کہ وہی ایک ایسے شخص تھے جن پر 'مشرق و مغرب' کا

اتفاق ہو سکتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں جب وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے، تو انھوں نے اس سے استعفا دے دیا۔ اس دوران وہ یونسکو ایگزیکٹیو بورڈ کے بھی ممبر تھے۔

روسی شاعر ٹیوٹیف نے روس کے بارے میں کہا تھا: "روس ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتا، اور نہ تو اس کی اصل حقیقت کا عام معیاروں سے کوئی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس کی اپنی ایک الگ بات ہے، اور اس پر صرف ایمان ہی لایا جاسکتا ہے۔" مجیب صاحب نے اپنی کتاب میں روسی شاعر کا یہ شعر لکھ کر کہا ہے کہ علی گڑھ والوں کا علی گڑھ سے متعلق بھی کچھ یہی خیال ہے، اور ذاکر صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ مجیب صاحب چونکہ خود علیگ نہ تھے، اس لیے وہ علی گڑھ کے لیے ذاکر صاحب کی 'بیتابیِ جاں' کی پوری طرح کبھی قدر نہ کر سکے تھے، اور اب جب کہ ذاکر صاحب وہاں وائس چانسلر ہو کر جا رہے تھے، مجیب صاحب سے نہ رہا گیا اور انھوں نے آگاہ کیا کہ اگر علی گڑھ وہ اس اُمید کے ساتھ جا رہے ہیں کہ وہاں اُنھیں خوشی اور بے غرضی کے ساتھ کوئی مفید اور نتیجہ خیز اشتراک و تعاون ملے گا تو ہو سکتا ہے کہ انھیں مایوسی ہو۔[۱]

—— اور ہمارا خیال ہے کہ مجیب صاحب کی یہ بات[۲] بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی!

قلب کا دورہ

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں کہ ابھی ذاکر صاحب کو علی گڑھ گئے ہوئے پورے ایک سال

۱۔ محمد مجیب، 'ڈاکٹر ذاکر حسین ـــ اے بایوگرافی'، صفحات ۱۵۷ - ۱۵۶

۲۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ "میری اس بات سے ذاکر صاحب کے چہرے سے تکلیف اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوا اور انھوں نے کہا کہ انھیں یقین ہے کہ علی گڑھ میں انھیں کام کے بڑے مواقع ملیں گے، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کہہ تو رہے ہیں، لیکن کچھ ایسے اعتماد اور جوش سے نہیں کہہ رہے ہیں۔"

[illegible]

بھی نہیں ہوئے تھے، ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا۔ انھیں ناگپور یونی ورسٹی کے لیے کچھ لیکچر تیار کرنے تھے اور جیسی کہ ان کی عادت تھی، وہ اس کام کو برابر ٹالتے رہے، یہاں تک کہ لیکچر کی تاریخیں بہت قریب آگئیں۔ ملنے والوں سے بچ کر لکھنے کی غرض سے وہ رشید صاحب کے مکان میں 'پناہ گزیں' ہو گئے۔ "ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آئے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں ٹھہر گئے۔ میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی۔ سوا اس کے کہ موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔۔۔ چاہا کہ اِدھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا: 'قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آخری وقت ہے۔ چاہا کہ آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے۔ جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ آپ بھی آتے ہی ہوں گے!' ذاکر صاحب کے اس اطمینانِ قلب پر دم بخود رہ گیا ۔۔۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گزر گئے سوا زندگی کے آخری حادثے کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گزرتی ہو۔۔۔ ہمیشہ اسی لطف اور شگفتہ روئی سے گفتگو کی جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں۔۔۔ کا سامنا اور علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ۔۔۔ لیکن دونوں آزمائشیں وہ اس طرح جھیل لے گئے جیسے 'اک موجِ خوں وہ بھی'!"[۱]

ذاکر صاحب یوں تو چھ ہفتے کے بعد اچھے ہو گئے لیکن قلب کی اس بیماری (CORONARY THROMBOSIS) کے دوبارہ حملے اور ذیابیطس کے پرانے مرض کے بڑھ جانے کے اندیشے کی وجہ سے وہ مجبور تھے کہ ڈاکٹروں کے طبی مشوروں اور ہدایتوں اور اپنے خاص خدمتگار اور تیماردار اسحٰق کی کڑی نگرانی کو قبول کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ پابندیاں ان کو سخت ناگوار ہوں گی۔ اب وہ اپنی مرضی سے نہ کام کر سکتے تھے، نہ کھا پی سکتے تھے اور نہ اپنے طور پر رہ سکتے تھے۔

۱۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحہ ۷۶

علی گڑھ — ایک روایت

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے کاموں سے انھیں ہمیشہ گہری دلچسپی رہی، نہ صرف اس لیے کہ وہ ان کی مادر درس گاہ تھی بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی ایک تعلیمی، علمی اور تہذیبی روایت تھی، ایک ایسی روایت جو ۱۸۵۷ء کے بعد اس ملک میں عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تمام تمناؤں اور حوصلوں سے عبارت تھی۔ وہ مدتوں یونی ورسٹی کی کورٹ، مجلس منتظمہ، مجلس تعلیمی اور شعبہ اقتصادیات کے ممبر رہے، اور اس حیثیت سے وہ اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر یونی ورسٹی کی تعلیمی و علمی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین آغاز کار ہی سے CLIQUE کے بنیادی رکن تھے[1] اور اس لحاظ سے وہ یونی ورسٹی کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو اصلاح پسندوں کی ہر بات کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتی تھی اور اپنی نگاہ وائسرائے بہادر کی جنبش چشم و ابرو پر جمائے رکھتی تھی۔ ذاکر صاحب مسلم یونی ورسٹی کی فلاح و بہبود کے لیے اس وقت بھی بے چین رہے جب یونی ورسٹی مسلم لیگ کے اثر میں آگئی تھی، اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی کاوشوں کے نتیجے میں وہ یونی ورسٹی کورٹ کی رکنیت سے محروم ہو گئے تھے۔ پھر وہ وقت آیا جب یونی ورسٹی کا بڑے سے بڑا اولڈ بوائے جو مسلم لیگ کی سیاست کا ہمنوا نہ تھا، یونیورسٹی کے احاطے میں کہیں کسی جلسے میں تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ ذاکر صاحب بھی جو یونی ورسٹی کے فرزندوں میں بہت اونچے مقام پر فائز تھے، اس سے مستثنا نہ تھے[2]۔

۱۔ CLIQUE سے متعلق کتاب کے تیسرے باب میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

۲۔ اگست ۱۹۵۲ء میں سر سید ہال کے ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں "میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے اس ادارے سے بغاوت کی تھی، ہم اس ادارے کو جیسا دیکھنا چاہتے تھے، ہم اس کا جو اصل مقصد سمجھتے تھے، اُسے یہاں کے کارکن ماننے کے لیے تیار نہ تھے ... میں نے ستائیس سال جامعہ کا کام صرف اسی لیے جان لگا کر کیا ہے کہ اسے بھی میں علی گڑھ کا (باقی اگلے صفحہ پر)

'روایت' کی حفاظت

لیکن، آزادی اور تقسیم ملک کے بعد جب علی گڑھ بے بسی اور خطرے کی زد میں تھا اور یونی ورسٹی کے بعض سربر آوردہ حضرات اخلاقی اعتبار سے اپنے آپ کو اتنا کمزور محسوس کرنے لگے تھے کہ ان میں سے ایک نے تو یو' پی کے چیف منسٹر کے سامنے یہ تجویز پیش کردی کہ "وہ اس یونی ورسٹی کو کلیتاً حکومت کے تصرف میں لے لیں"[1] تو ذاکر صاحب ہی تنہا اس کے اہل تھے کہ وہ علی گڑھ جائیں اور صرف "ایک درس گاہ کو نہیں بلکہ ایک تہذیب کو تباہ ہونے اور ایک روایت کو رسوا ہونے سے" بچالیں۔[2]

اور رشید صاحب نے لکھا، سچ اور بلا مبالغہ لکھا، اور نہ معلوم کتنوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا کہ " ذاکر صاحب علی گڑھ آگئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی: 'یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور'۔ عندلیب باغ حجاز کی دعا پہنچی: 'گل کلی ہو تری گرمیِ نوائے گداز' اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اس کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں جس کو اقبال نے آغوشِ مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ

(سلسلۂ گزشتہ صفحہ) کام بھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہم علی گڑھ واپس جائیں گے اور اسے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنائیں گے ___ شاید آپ کو معلوم ہو کہ آٹھ نو برس کا زمانہ میرے اوپر ایسا بھی گزرا ہے جب میں علی گڑھ کے لیے اجنبی اور غیر تھا۔ میں یہاں کی جس یونین کا وائس پریسیڈنٹ تھا اس میں بول نہ سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل پر کیا نہ گزرتی ہوگی لیکن زمانہ بدلا اور مجھے علی گڑھ آنے کا موقع ملا..." (مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء، صفحات ۲-۱)

۱۔ رشید احمد صدیقی، 'ہمارے ذاکر صاحب'، صفحہ ۱۲۷۔ اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت "دہلی کے بعض نیم سرکاری اکابر کی طرف سے یہ پیشکش عام تھی کہ ... یونی ورسٹی حکومت ہند کے حوالے کردی جائے"۔

۲۔ رشید احمد صدیقی، 'آشفتہ بیانی میری'، صفحہ ۷۵

دلکش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید، ایک نئی زندگی کا طلوع اور ایک نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا۔ شکستہ بال، دل گرفتہ اور پابستہ مُرغانِ چمن فرطِ مسرّت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔

سَلامٌ علیٰ نجد و مَن حلّ فی نجد"[1]

ذاکر صاحب علی گڑھ گئے، لیکن وہ جس "روایت" کو بچانے اور جس "نئے علی گڑھ" کو بنانے کے ارادے سے گئے تھے، وہ خاصا مشکل کام تھا، دیر طلب کام تھا، ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہ تھا، پتا مارنے کا کام تھا۔ آزادی سے چند سال پہلے علی گڑھ جس علاحدگی پسندانہ سیاست کا مرکز بن گیا تھا، اس کو بہانہ بنا کر تعصب و تخریب کے وہ تمام عناصر جو اس فرقے سے بغض و عناد رکھتے تھے جس کی آرزوؤں اور حوصلوں کی یہ یونیورسٹی علامت بن گئی تھی، خواہ اس بغض و عناد کے اسباب کچھ بھی ہوں، آزادی کے بعد اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ غیر محتاط قومی اخبارات اور غیر ذمّے دار پبلک پلیٹ فارم دونوں کو مسلم یونی ورسٹی اور اس کے استادوں اور طالب علموں کو بدنام و مطعون کرنے اور ان کو غدار قرار دینے میں ایک لذت محسوس ہونے لگی۔ اس سلسلے میں ایک خاص واقعہ جو قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ جب ۱۹۵۰-۵۱ء میں علی گڑھ کو بدنام کرنے کا سلسلہ اپنے عروج پر تھا، اچاریہ ونوبا بھاوے یونی ورسٹی میں تشریف لائے، ذاکر صاحب نے اسٹریچی ہال میں اُن کے استقبال کا انتظام کیا، اور پھر انھیں گواہ بنا کر "جن تیوروں کے ساتھ اور جن الفاظ میں یونی ورسٹی کے ناقدین و معاندین کی خبر لی اور انھیں پھٹکارا وہ صرف ذاکر صاحب ہی کر سکتے تھے، کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی"[2]۔ اور اس واقعہ کا ذکر رشید صاحب نے ان الفاظ میں کیا، "ہم میں سے بہتوں کو وہ دن یاد ہوگا جب مہاتما ونوبا بھاوے کا اسٹریچی ہال میں خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے خلاف جھوٹی خبریں بھیجنے اور پھیلانے والوں کو ڈانٹا تھا اور کس سچائی سے اور کیسے وقار

۱۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحہ ۸۳۔

۲۔ ریاض الرحمٰن شروانی کا مضمون خدا بخش لائبریری جرنل میں، نمبر ۲۱-۲۲-۲۳، (۱۹۸۲ء)، صفحہ ۱۹۶۔

سے، کتنے کھرے الفاظ اور مؤدب و لہجے میں یونی ورسٹی کی پوزیشن واضح کی تھی! ذاکر صاحب پروہ جلال، وہا شئے وزیا بھادے کی پرتقدس و تمکیں موجودگی، ہال کے چپّے چپّے کا طلبہ، اساتذہ اور شہر کے اکابر سے بھرا ہونا، موقع و زمانے کی نزاکت، مجمع پر سکوت کی ایک پُراسرار کیفیت، مختصر یہ کہ گذشتہ ۳۵-۳۶ سال میں اسٹریچی ہال میں ایسی میٹنگ کم سے کم میری نظر سے نہ گزری تھی۔ اس تقریر کے بعد پھر جب تک ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے اپنی علاحدگی کا اعلان نہیں کر دیا، اشرار و انفار کی زبان و قلم کے فتنوں سے ہم اور ہماری یونی ورسٹی نہ صرف محفوظ رہی بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اساتذہ اور طلبہ کے بارے میں تحسین و تہنیت ہی کے کلمے سُنے گئے۔ ذاکر صاحب کے اس احسان، خدمت یا کارنامے کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس ادارے کی ناکسی و نامرادی کے وہ دن دیکھ چکے ہیں۔"[1]

۱۰ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی موجودگی میں یونی ورسٹی کی سالانہ رپورٹ میں ذاکر صاحبؒ نے ۱۹۴۸ء میں یونی ورسٹی کی زبوں حالی اور اپنی ذمّے داریوں کا ذکر کرتے ہوئے، "نئے علی گڑھ" کی تعمیر کے کام میں یونی ورسٹی کو بدنام کرنے والوں اور ان کی دروغ بافیوں سے پیدا ہونے والی مشکلوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"اس کام میں تنگ نظر اور تیرہ دروں نکتہ چیں عام طور پر بڑی مشکلیں پیدا کر دیتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی میں فرقہ وارانہ کشاکش کی یاد سے ان تنگ دل، کوتہ اندیش لوگوں کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنی غیر ہمدردانہ غلط بیانیوں کو لوگوں سے باور کرالیں۔ عام پبلک، ہمارے اخبارات، ہمارے ناکافی معلومات رکھنے والے پبلک کارکن ہمارے متعلق ہر بُری چیز کو صحیح مان لینے پر کچھ آمادہ سے رہتے ہیں۔ اس آمادگی کی وجہ میں

۱۔ رشید احمد صدیقی، "یاد یار مہرباں آید ہمی"، مسلم یونیورسٹی گزٹ (ذاکر نمبر)، ۲۲ر فروری، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۲۴

سمجھتا ہوں، مگر سمجھنے کی وجہ سے اسے دُرست نہیں مان سکتا۔ ایک ہندستانی کی حیثیت سے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس غیر صالح طرزِ فکر کو اس نامراد کوشش میں ناکام بناؤں کہ وہ وفادار مسلمان شہریوں کو یہ محسوس کرائے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی ہیں۔ اس سے بڑی مایوسی اور شکستہ دلی پیدا ہوتی ہے جو تمام قوائے عمل کو شل کر دیتی ہے۔ یہ نہ مسلمانوں کے لیے اچھا ہے نہ ہمارے ملک کے لیے۔

"ہمارے ملک کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے۔ ایک اچھی قومی زندگی کی تعمیر کا کام... ضرورت ہے کہ قوت کا ایک ایک شمہّ خوشی خوشی اس کام میں لگا دیا جائے۔ علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔"[1]

اسی سالانہ رپورٹ میں ذاکر صاحب نے اس اطمینان کا بھی اظہار کیا کہ یونیورسٹی "جو بڑی مشکلات کے چکر میں پڑ گئی تھی، اس گرداب سے نکل گئی ہے"، اور حکومت ہند کے تعاون کا شکریہ ادا کیا کہ اگر مالیات اور عام صورت حال کے معاملے میں اس کی ہمدردی حاصل نہ ہوتی تو مشکلات سے "صحیح سلامت نکلنا بہت دشوار تھا۔" لیکن ذاکر صاحب کو یہ احساس بھی تھا کہ اب ان کی صحت ویسی نہیں رہی تھی جیسے پہلے تھی، خاص طور پر ۱۹۴۹ء کے قلب کے دورے کے بعد تو یہ احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ علی گڑھ میں اس وقت تک جتنا انھوں نے کیا تھا، اس سے بہت زیادہ کرنا چاہتے تھے، اور بعد کے برسوں میں بہت کچھ کیا بھی، پھر بھی کام دیر طلب تھا اور بقول ان کے زندگی کا رہٹ بہت جلد جلد رل رہا تھا، اس لیے ان میں ایک بے صبری سی تھی۔ بے صبری اس سست رفتاری

۱۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء، صفحات ۵-۲

پچاس سے یونی ورسٹی اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی تھی، عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب[1]۔

ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور طریقۂ کار

دسمبر ۱۹۵۱ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ذاکر صاحب نے جہاں اپنی اس بے صبری کا اظہار کیا تھا، وہیں گزشتہ تین سال کے کاموں کے مفصل ذکر کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اساتذہ و طلبہ سب نے مل کر صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کیا، جس سے ان میں اعتماد پیدا ہوا اور "جہاں تک میں دیکھ اور سمجھ سکتا ہوں اسے (ادارہ کو) پھر ترقی کے راستے پر پہنچا دیا[2]"۔

اس رپورٹ کو پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے حالات کی دقتوں اور قلب کی شدید بیماری کے باوجود، تعلیمی شعبوں کی تنظیم اور تحقیقی کاموں کی توسیع میں کیسی دور بینی اور حوصلہ مندی سے کام لیا ہوگا۔ رپورٹ میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کس شعبے میں کون سے نئے کام ہو رہے ہیں، طلبہ کی تعداد میں کس تناسب سے برابر اضافہ ہوتا رہا ہے، اور کس طرح مختلف شعبوں میں تحقیق کے ساتھ زندگی اور علم کے دوسرے گوشوں سے آشنا کرنے کی تدبیریں تلاش کی جا رہی ہیں[3]۔ علی گڑھ میں بھی ذاکر صاحب کے کام کا وہی انداز تھا جو جامعہ میں تھا، یعنی کام اچھا ہے اور کرنے کا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ایسے موقع پر وہ چادر دیکھ کر پاؤں نہ پھیلاتے، کہتے کہ پاؤں پھیلانے کی ضرورت ہے تو پھیلا دینا چاہیے، چادر خود بخود لمبی ہو جائے گی۔ رپورٹ میں ذاکر صاحب نے نئے تدریسی عملے کے تقرّرات اور تعمیرات کے منصوبے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "۱۹۴۷ء سے یونی ورسٹی کی مالی حالت برابر ناقابل اطمینان رہی ہے۔ نومبر سنہ ۱۹۴۷ء

---

۱. ایضاً، صفحہ ۴

۲. مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء، صفحات ۶-۱

۳. ایضاً۔

اور دسمبر سنہ ۴۸ کے درمیانی زمانے میں یونی ورسٹی کو ساڑھے سات لاکھ کے تمسکات بیچنے پڑے تھے اور اس رقم کے علاوہ بعد میں برابر خاصی بڑی بڑی رقمیں سودی قرض پر لینی پڑیں۔ کل قرض جو ہمیں ادا کرنا ہے تقریباً ، لاکھ ہے، اور موجودہ مالی سال کے ختم تک یہ رقم کچھ بڑھ ہی جائے گی۔"

قرض کی رقم بڑھ جائے، ذاکر صاحب کو یہ منظور تھا، لیکن یہ منظور نہ تھا کہ پیسے کی کمی کی وجہ سے یونی ورسٹی کی کارکردگی اور تعلیم کا معیار متاثر ہو۔ ۱۹۴۹ء کی بات ہے، یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں خازن نے ۱۹۵۰ء-۱۹۴۹ء کا بجٹ پیش کیا جو بڑے خسارے کا تھا۔ نتیجتاً اخراجات کے کم کیے جانے کی تجویزیں آنے لگیں۔ "جب سب اپنی اپنی کہہ چکے، تو ذاکر صاحب نے جواب تک خاموش بیٹھے تھے، اُٹھ کر کہا کہ یونی ورسٹی کا معیار گراکر قومی کردار میں پستی اور مایوسی پیدا کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم اپنا معیار نہ گرائیں اور ختم ہو جائیں۔ ختم اگر ہمیں ہونا ہی ہے تو عزت و آبرو کے ساتھ تو ہوں۔ حکومت اگر گرانٹ نہیں دے گی، یونی ورسٹی بند ہو جائے گی۔ بند ہو جائے گی تو ہو جائے مگر پستی میں گرنا اور سسک سسک کر فنا ہونا ہمیں گوارا نہیں۔"[1] اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس حوصلہ افزا

۱۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، حوالۂ سابق، صفحات ۱۷۴-۱۷۳۔ یونی ورسٹی کی فنانس کمیٹی کی میٹنگوں میں جہاں وزارت تعلیم اور یو۔جی۔سی کے نمایندے پورے اختیارات کے ساتھ موجود ہوتے تھے، ذاکر صاحب کبھی اپنی شخصیت کے جمال اور کبھی اس کے جلال سے کام لیتے تھے اور جیسی اور جتنی گرانٹ چاہتے تھے منظور کرا لیتے تھے۔ حاجی عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے جو اس وقت یونی ورسٹی کے خازن تھے، بیان فرمایا کہ فنانس کمیٹی کی ایک میٹنگ میں یو۔جی۔سی کے نمایندے کا اصرار تھا کہ طلبہ کی فیس میں اضافہ کیا جائے۔ ذاکر صاحب اُس وقت اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طلبہ پر یہ ایک بار ہوگا۔ لیکن جب اس کا اصرار بہت بڑھا تو ذاکر صاحب نے کہا: "بہت اچھا، فیس بڑھا دیجیے۔ طلبہ کی طرف سے احتجاج ہوگا تو پھر ان پر گولی چلوا دیجیے گا اور میں بھی وہاں آگے آگے ہوں گا۔" یہ سُننا تھا کہ وہ حضرت تو سناٹے میں آگئے اور کہا کہ ذاکر صاحب آپ ناراض نہ ہوں۔ وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔

نقطۂ نظر نے ٹوٹی ہوئی ہمتوں میں کیسی زندگی پیدا کردی ہوگی، اس لیے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شدید تباہی اور یکسر مسماری کے بعد سرسید نے علی گڑھ میں جس مدرستہ العلوم کی بنا ڈالی تھی اور جو ترقی کرکے مسلمانانِ ہند کی حوصلہ مندیوں کی علامت یا بشارت بن گیا تھا، ۱۹۴۷ء کی سخت بربادی اور مکمل انتشار کے بعد ذاکر صاحب نے نہ صرف اُسے بچایا بلکہ ترقی کی نئی شاہراہ پر ڈال دیا، تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ "تقسیم ملک کے بعد علی گڑھ کی آبادکاری میں ذاکر صاحب کو جن دقتوں اور نزاکتوں کا سامنا رہا اور جن پر انھوں نے جتنے کم عرصے میں خاموشی اور خوبصورتی سے قابو پالیا وہ ایک ایسی داستان ہے جو شاید کبھی لکھی نہ جاسکے، لیکن عوامی گیتوں کی طرح ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قضا و قدر نے علی گڑھ کی نجات کے لیے ذاکر صاحب کا انتخاب کرلیا ہو۔"[1]

ذاکر صاحب نے جس دن سے علی گڑھ کی قیادت سنبھالی، اُسی وقت سے انھوں نے یونی ورسٹی کے لوگوں میں اعتماد اور بے خوفی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ میں ایک گروہ ایسا تھا جو انھیں ایک ایسا "گھس بیٹھیا" تصور کرتا تھا جسے حکومت نے علی گڑھ کی "شدھی" کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زوالوجی کے پروفیسر بابر مرزا جنھوں نے تقسیم ملک سے پہلے بڑی مستعدی سے مسلم لیگی نظریات کا پرچار کیا تھا، علی گڑھ کی وائس چانسلرشپ کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ ذاکر صاحب کو یہ سب کچھ معلوم تھا، لیکن وہ ایک شریف اور صاف دل انسان تھے۔ ان کے بارے میں یہ سوچا ہی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کسی سے بدلہ لیں گے یا لوگوں کے ذہن کی صفائی کا کوئی منصوبہ بنائیں گے، اور جلد ہی علی گڑھ والوں کو اُن کی شریف النفسی اور عام نیک خواہی کا اندازہ ہوگیا۔ اس سے لوگوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ذاکر صاحب کی فطری مروت و رواداری اور طرزِ فکر کی کشادگی سے شروع شروع میں علی گڑھ شہر اور یونیورسٹی کے اُن بہت تھوڑے سے نیشنلسٹ مسلمانوں کو کچھ غلط فہمی اور شکایت بھی ہوئی، جن کی

۱۔ رشید احمد صدیقی: آشفتہ بیانی میری، صفحہ ۴۵

نگاہ بلند نہ تھی اور جو اُس وقت لیگی خیالات رکھنے والوں سے کسی قسم کے سخنِ دلنواز کے روادار نہ تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں انھیں بھی محسوس ہوا کہ ذاکر صاحب میر کارواں ہیں، ایک ایسے کارواں کے امیر جو خستہ و برباد ہے، جس میں ہر خیال و طبیعت کے لوگ ہیں، اور سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔

لالے کی حنا بندی

ملک کی تقسیم سے یونی ورسٹی اسٹاف، خاص طور پر سینیر اسٹاف سے خالی ہوگئی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے آخر تک صورت یہ ہوگئی تھی کہ یونی ورسٹی میں تین پروفیسر رہ گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ایک طرف دوسری یونی ورسٹیوں سے نئے اور لائق اساتذہ کو علی گڑھ بلایا اور دوسری طرف یونی ورسٹی کے اندر ایم۔اے اور ایم' ایس سی کے ذہین اور ہونہار طلبہ پر نظر رکھی تاکہ انھیں ہندستان کے دوسرے اداروں یا ہندستان سے باہر مزید اعلا تعلیم کے لیے بھیجنے کی تدبیریں اور سہولتیں مہیا کی جائیں، اپنے اس منصوبے میں وہ کامیاب رہے، اِن، علی گڑھ ہی نہیں بلکہ ملک و ملت کے حق میں اس کے مفید نتائج اس وقت ظاہر ہوئے جب وہ یونی ورسٹی چھوڑ چکے تھے۔ ذاکر صاحب کے دور میں تعلیمی شعبوں کے سربراہوں کو کام اور اقدام کی پوری آزادی تھی، وہ خود شعبہ جاتی امور میں بہت کم مداخلت کرتے تھے۔ اور اس طریقۂ کار کے عام طور پر اچھے نتیجے نکلے، بس شعبۂ فزکس میں ڈاکٹر پیارا سنگھ گل غالباً تنہا استثنا تھے جن کے کام کا طریقہ ایسا تھا کہ اس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور ذاکر صاحب کو بڑی ناخوش گواریاں برداشت کرنی پڑیں۔

" کافی عرصے سے یونی ورسٹی میں علمی کام کی اہمیت اور وقعت بہت کم ہوگئی تھی۔ تقرریات اور ترقیوں کا انحصار بھی علمی کام کے مقابلے میں بعض دوسری باتوں پر زیادہ تھا۔ ذاکر صاحب نے اس فضا کو بدلنے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے تحقیقی کام کی اہمیت پر زور دیا اور اساتذہ کو محسوس کرایا کہ ان کی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ

علمی میدان میں کچھ کرکے نہ دکھائیں . . . جو لوگ واقعی سنجیدہ علمی کام میں مصروف تھے ذاکر صاحب اُن کی بہت عزت اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ان کے کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور ان کی راہ میں جو دشواریاں ہوتی تھیں انھیں دور کرنے میں معاون ہوتے تھے[1] . . . بڑی بات یہ تھی کہ جب تک ذاکر صاحب علی گڑھ میں رہے ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ یونی ورسٹی کا سربراہ ایک ایسا آدمی ہے جو خود بھی علمی ذوق رکھتا ہے اور دوسروں کے علمی کام کی قدر کرنا بھی جانتا ہے۔ یہ احساس بجائے خود علمی کام پر آمادہ کرنے میں بہت معاون تھا۔ ..[2]"

رشید صاحب نے اپنے مضمون "موجِ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال" میں اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں علی گڑھ میں جتنے بڑے کام ہوئے، انھیں مختصراً بیان کردیں۔ ان صفحات[3] کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باوجود اس کے کہ وہ قلب کے مریض تھے اور یونی ورسٹی کے کام کے علاوہ اُن کی دوسری مصروفیتیں بھی تھیں، کتنی سخت محنت کی ہوگی اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان میں کس غضب کی اور کیسی انتظامی صلاحیت تھی۔ ذاکر صاحب نے تعلیمی شعبوں کو مستحکم بنایا، ادارۂ علوم اسلامیہ قائم کیا، تحقیق کے ہر کام میں مدد دی، لائبریری کی نئی عمارت کی

۱۔ علی گڑھ میں ایک طریقہ یہ بن گیا تھا کہ وائس چانسلر کی "دربار داری" سے اکثر اساتذہ اپنا کام نکال لیا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب نے اس رسم کو اس طرح ختم کرنے کی کوشش کی کہ جو اساتذہ ان سے ملنے جاتے ان سے پوچھتے کہ آج کل وہ کیا کام کر رہے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہوتے جن کے کام سے وہ مطمئن ہوتے اور وہ بھی جن سے وہ کہتے کہ آپ نے پچھلی دفعہ بھی جب ہم ملے تھے یہی کہا تھا۔ ایسے لوگ یا تو کسی کام میں لگ جاتے یا پھر اُن سے ملنے سے کتراتے تھے۔

۲۔ ریاض الرحمٰن شروانی، حوالۂ سابق، صفحات ۱۹۸ - ۱۹۷۔ شروانی صاحب ایک معروضی اور متوازن ذہن رکھتے ہیں اور اپنے بیان میں مبالغے سے بچتے ہیں۔

۳۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحات ۵۵ - ۵۴

تعمیر کا انتظام ہوا، باہر سے ممتاز پروفیسر مدعو کیے گئے۔ ڈینٹس کالج کی مالیاتی بنیادوں کو مضبوط کیا، طبیہ کالج کی توسیع کا انتظام کیا اور میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت سے باقاعدہ منظوری اور امداد حاصل کی۔ انھوں نے یونی ورسٹی کے احاطے میں، جہاں پہلے 'حضرِ بے برگ و ساماں...' کا سماں رہتا تھا، وسیع پیمانے پر چمن بندی کرائی، باغات لگوائے اور اُفتادہ زمینوں میں کاشتکاری کا سلسلہ شروع کرایا۔ صحت مند اور خوبصورت ماحول ہو تو خیالات بھی صحت مند اور خوبصورت ہوتے ہیں، ذاکر صاحب کا ذوقِ جمال مثالی تھا۔ اسی کا ایک عکس یہ بھی تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں یونی ورسٹی سبزہ زار بن گئی، ہر طرف پھول، شاداب درخت، بہتے پانی کی نالیاں، غرض 'خیاباں خیاباں اِرم' کا ایک دلآویز منظر۔[1]

طالب علموں سے گہرا تعلق

ذاکر صاحب نے طلبہ کی اخلاقی و تہذیبی تربیت کی طرف بھی خاص توجہ کی۔ ۱۹۵۱ء میں ٹینس کے نامور کھلاڑی احد حسین صاحب کے تقرر سے اسپورٹس میں نئی جان پڑ گئی اور اس شعبے کو ترقی دینے کے لیے نئی نئی اسکیمیں تیار کی جانے لگیں۔[2] ذاکر صاحب جانتے تھے کہ "اسپورٹس بازاروں میں نہیں پنپتے" ان کی نشوونما اخلاق کے مانند، اچھی تعلیم گاہوں میں، اساتذہ کی نگرانی اور تہذیبی روایات کے سائے میں ہوتی ہے۔ (انھوں نے) ایک موقع پر علی گڑھ کے کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: 'عزیزو! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ کھیلوں کے میدان بالخصوص علی گڑھ میں تمھارے اچھے کھیلنے پر تمھارے ساتھی تمھاری تحسین کریں اور فریقِ مخالف کے اچھے کھیل پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری

۱۔ ذاکر صاحب کی حسین شخصیت اور ذوقِ جمال اور غالب کا یہ شعر:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

۲۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۲

یا کسی نارسائی پر اس کا مضحکہ اُڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب کے خلاف ہے۔ اگر تم دیکھو کہ ایسا ہو رہا ہے تو کھیل بند کر دو اور اس پر اصرار کرو کہ جب تک مقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے کھیل کی خاطر خواہ داد نہ دی جائے گی، تم کھیلنا ملتوی رکھو گے۔[۱] نجی اور جماعتی زندگی دونوں میں اگر اس طرح کی سچی "اسپورٹس مین شپ" پیدا ہو جائے تو اخلاقی اقدار کی نشو و نما میں اس سے مدد ملتی ہے اور زندگی میں حُسن پیدا ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اخلاق کا یہ حُسن اپنے طالب علموں میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اپنی مصروفیت اور کمزور صحت کے باوجود وہ طلبہ سے برابر ملتے تھے، اُن کے ہوسٹلوں میں جاتے تھے، ان کے کمروں کو دیکھتے تھے کہ وہ کیسے اور کن حالات میں رہتے ہیں، اُن کی پریشانیوں کو سنتے تھے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، اور ان کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتے تھے۔ یونین کے جلسوں میں طالب علموں کو خطاب کرتے اور انھیں صحیح طرزِ فکر اور معقول اور سنجیدہ اندازِ گفتگو کی تلقین کرتے، سخت بات بھی کہتے تو محبت اور ہمدردی سے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ اپنی تہذیب، آداب و اخلاق اور شریفانہ رکھ رکھاؤ سے دور سے پہچان لیے جائیں۔

ذاکر صاحب کو محنتی، ذہین اور اچھے طالب علموں سے خاص تعلق تھا، وہ ہر طرح ان کی ہمت افزائی کرتے، وہ غریب ہوتے تو ان کی اور ان کے سرپرستوں کی مشکلات دور کرنے کے جتن کرتے۔ علی گڑھ میں نہ معلوم کتنے نادار طالب علموں کی انھوں نے اپنی جیب سے مدد کی، تنخواہ کا بہت کم حصہ گھریلو اخراجات کے لیے ہوتا، بڑا حصہ دوسروں کی دستگیری پر صرف ہوتا اور خود تکلیف اُٹھاتے، اور اس طرح کہ جس کی مدد کرتے اس کی عزتِ نفس کا پورا خیال رکھتے۔ دوسروں کو سہارا دینے کی شریفانہ طبیعت ہی درحقیقت سچی درویشی ہے۔

طالب علموں سے محبت، تعلق اور حُسنِ سلوک کا اثر یہ تھا کہ وہ بھی ذاکر صاحب

۱۔ رشید احمد صدیقی، ہمارے ذاکر صاحب، صفحہ ۸۹

سے ایک خاص اور گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ۵۳-۱۹۵۲ء کا تعلیمی و مالی سال تھا۔ ذاکر صاحب اپریل کے وسط میں یورپ و امریکہ کے سفر پر گئے اور کوئی چار ماہ بعد جب ۱۱ر اگست کو علی گڑھ واپس تشریف لائے تو اساتذہ و طلبہ نے بڑے جوش و خروش سے ان کا استقبال کیا۔ ۲۴ر اگست ۱۹۵۲ء کو خلیل الرحمٰن اعظمی نے مسلم یونی ورسٹی گزٹ میں لکھا:

"صد شکر اپنا مردِ قلندر پھر آگیا
صحرا سے تازہ دولتِ عرفاں لیے ہوئے

چار ماہ کی جدائی کے بعد یورپ وامریکہ کا دورہ کر کے ذاکر صاحب اب علی گڑھ آئے ہیں تو یہاں کا ہر فرد ایک تازہ مسرت اور نئی اُمنگ محسوس کر رہا ہے۔ علی گڑھ سے ذاکر صاحب کا تعلق جسم اور روح کا ہے۔ وہ نہیں تھے تو اس کی فضا اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے باوجود بے جان تھی، اب ہمارے درمیان موجود ہیں تو ہم پھر زندگی محسوس کر رہے ہیں۔"

طالب علموں نے انھیں اپنے اپنے ہال میں مدعو کیا، استقبالیہ دیا اور محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اپنے بھرپور اشتراک و تعاون کا یقین دلایا۔ اور یہ سب اُس وقت تھا جب طلبہ میں فیس میں اضافے کے خلاف ایک ایجی ٹیشن کی سی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ انھوں نے ایک میمورنڈم بھی پیش کر رکھا تھا۔ ۱۹ر اگست کو ذاکر صاحب نے یونین ہال میں طلبہ کو خطاب کیا۔ صدر یونین نے طلبہ کی جو شکایات پیش کی تھیں، انھیں غور سے سُنا، اور زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر اور ناگواریوں و تلخیوں کو برداشت کرنے کی تلقین کرنے کے بعد انھیں امید دلائی کہ وہ فیس کے اضافے کے مسئلے کو ایگزیکٹیو کونسل کے سامنے رکھیں گے اور اس سلسلے میں جو بھی آسانیاں ممکن ہیں فراہم کی جائیں گی۔ لیکن طلبہ کی توجہ اپنی تربیت ذات اور تہذیب نفس کی طرف مبذول کرانے کا یہ موقع بھی ہاتھ

سے جانے نہ دیا اور مہران یونی ورسٹی سے متعلق اس سلسلے میں طالب علموں کا جو رویہ رہا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا؛

"کسی ملک کے سب سے زیادہ سمجھ دار ہونے کی حیثیت سے آپ ان تھوڑے لوگوں میں ہیں جو اپنی عمر کا خاصا حصّہ علم سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ آپ سے اچھے کردار کی امید کی جاتی ہے۔ یہ نہ سوچیے کہ دوسری یونی ورسٹیوں میں کیا ہوتا ہے، وہاں کے طلبہ کیا کرتے ہیں۔ ابھی ہمارے ملک میں اچھی یونی ورسٹیاں ہیں کہاں ؟ اگر کسی یونی ورسٹی کا نمونہ ایسا ہو جیسا اَن پڑھ اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کا ہوتا ہے تو کتنی افسوسناک بات ہے۔ ہم چیزوں پر غور نہیں کرتے۔ ہمارے اندر ضبط نہیں، ہم ہنستے ہیں تو ہنسی نہیں رکتی، ہم مٹی پھینکتے ہیں تو کسی کو نہیں دیکھتے۔ چودہ پندرہ برس تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے تو اس میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟ شراب پینا مذہب میں کیوں حرام ہے؟ اسی لیے ناکہ اس سے آدمی مدہوش ہو جاتا ہے، اسے اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا، وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ یہ انسانی شرف سے گری ہوئی بات ہے۔ بے راہ روی اور خود فراموشی ایسی بلا ہے جس سے ہر اچھی شخصیت کو بچنا چاہیے۔ ہم ایک خاص شرف کے حامل ہیں اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔ شخصیت کو بنانے کی ضرور کوشش کیجیے ورنہ آپ کا یہاں آنا اور تعلیم حاصل کرنا سب دھوکے ہیں[1]۔"

"ذاکر صاحب نے یونی ورسٹی میں آزادیِ خیال کی شمعیں فروزاں کیں۔ کسی تعلیمی ادارے میں فکر و نظر پر پابندیاں عائد کرنا یا پہرے بٹھانا ایسا معیوب فعل ہے جس سے ایک طرف اساتذہ کے ذہنوں پر زنگ لگ جاتا ہے اور دوسری طرف طلبہ کی شخصیت پوری طرح پنپنے اور اُبھرنے نہیں پاتی ہے۔ ذاکر صاحب اس راز سے بخوبی واقف تھے اور ہر نقطۂ نظر کو تعلیمی

۱۔ [illegible]

اداروں میں فروغ پانے اور پھیلنے کا بھرپور موقع دینے کے حق میں تھے۔ جن لوگوں[1] کی ذہنی تربیت ۱۹۴۷ء کے پہلے کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان میں سے اکثر کے لیے یہ طرزِ فکر بالکل نیا اور نامانوس تھا۔ اس لیے انھوں نے ذاکر صاحب سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو خود اپنے اصول و نظریات پر بھروسا نہیں معلوم ہوتا ہے، ورنہ آپ اس طرح کا احتجاج نہ کرتے۔ میں ہر شخص کو اپنے نقطۂ نظر کی تبلیغ کی آزادی دینا چاہتا ہوں، بشرطیکہ اس کا اثر یونی ورسٹی کی تعلیمی زندگی اور نظم و نسق پر ناخوش گوار نہ ہو۔ جو نظریہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اور جاندار ہوگا وہ باقی رہے گا۔ دوسرے سب نظریات خود بخود فنا ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ اپنا کام کیجیے اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دیجیے۔ جو لوگ نظریاتی اعتبار سے ذاکر صاحب کے ہم خیال تھے ان کی خواہش تھی کہ ذاکر صاحب ان نظریات کی ترویج میں ان کی اعانت کریں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس سے ہمیشہ پہلو تہی فرمائی اور کہا کہ اس طرح کا کام پھولوں کی سیج نہیں ہے، کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ جب آپ اس راہ پر چلے ہیں تو اس کے موانع کا خود اپنی ہمت سے مقابلہ کیجیے، دوسروں کا سہارا تلاش نہ کیجیے۔ شروع میں ان کے اس طرزِ عمل سے ایسے لوگوں کو کسی قدر شکایت پیدا ہوئی لیکن جب انھوں نے ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر سمجھ لیا تو نہ صرف ان کی شکایت رفع ہو گئی، بلکہ وہ اس کی خوبی کے قائل بھی ہو گئے۔"[2]

انجمن ترقی اُردو اور اُردو

۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کے سکریٹری مولوی عبدالحق مرحوم انجمن کا لُٹا ہوا دفتر اور کتب خانہ چھوڑ کر اس وقت کے سنگین حالات سے مجبور ہو کر کراچی چلے

۱۔ ایسے لوگوں میں سینیئر طلبہ بھی تھے۔

۲۔ ریاض الرحمٰن شروانی، حوالہ سابق، صفحہ ۱۹۷

گئے تھے۔ پھر وہ جنوری ۱۹۴۸ء اور جنوری ۱۹۴۹ء کی درمیانی مدت میں دو بار ہندستان آئے۔ مولوی عبدالحق چاہتے تھے کہ وہ ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ انجمن ترقی اُردو کا کام کریں، لیکن مولانا آزاد کا خیال تھا کہ دونوں جگہ الگ الگ انجمن بنائی جائے۔ ذاکر صاحب کی رائے بھی یہی تھی۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۸ء[1] میں مولوی صاحب کو لکھا:

> "میری رائے ہے کہ اُردو کی ترقی و ترویج کا کام ہندستان میں اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے، اس لیے اس کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیے، لیکن ساتھ ہی میری یہ رائے بھی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے کام کی جو نوعیت گزشتہ چند سال میں رہی ہے اس کے پیشِ نظر موجودہ کارکنوں کا یہاں کام کرنا بہت دُشوار ہوگا ۔۔۔ پاکستان اور ہند کے سیاسی تعلقات کی موجودہ حالت میں یہ غیر مناسب ہوگا کہ پاکستان اور ہندستان کے اس کام میں کوئی انتظامی اور شخصی تعلق رہے۔"[2]

بالآخر مولوی عبدالحق صاحب کی سمجھ میں بات آگئی اور وہ جنوری ۱۹۴۹ء کے اواخر میں پاکستان میں اُردو کی خدمت کا جذبہ لے کر کراچی چلے گئے۔

حالات جب کچھ سنبھلے تو مولانا آزاد کی رہنمائی میں یہاں کی انجمن کی از سرِ نو تنظیم کی

۱۔ مولوی عبدالحق اس وقت ہندستان آئے ہوئے تھے۔

۲۔ سید ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۵۳ء، صفحات ۲۱۶۔۲۱۵، (یہ اقتباس کتاب کے چھٹے باب سے ہے جسے مولوی عبدالحق نے خود لکھا تھا۔ یہ باب مولوی صاحب مرحوم کی خود پسندی اور طبیعت کے یک رُخے پن کا آئینہ دار ہے، اور اس بات کا غماز کہ انھوں نے لیگی سیاست سے اُردو کا مسئلہ جوڑ کر کیسی کم فہمی کا ثبوت دیا تھا۔ انجمن ترقی اُردو کے اس ماضی کی وجہ سے آزاد ہندستان میں اُردو کی بقا کا مسئلہ کیسا دشوار اور پیچیدہ ہو گیا ہے)

گئی۔ اور اس کا دفتر دہلی کے بجائے علی گڑھ میں قائم کیا گیا۔ قاضی عبدالغفار[1] اس کے ناظم مقرر ہوئے اور سر تیج بہادر سپرو کے بعد ذاکر صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ذاکر صاحب ہی کے زمانۂ صدارت میں انجمن نے اتر پردیش میں اُردو کے حق کو منوانے کے لیے دستخطی مہم چلائی تھی اور بیس اکیس لاکھ بالغوں کے دستخط اور انگوٹھوں کے نشان حاصل کیے گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ "دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے ماتحت ... صدر جمہوریہ کی خدمت میں ان دستخطوں کے ساتھ اس بات کی درخواست پیش کی جائے کہ وہ اُردو کو ریاست اتر پردیش کی ایک زبان تسلیم کریں تاکہ وہ سرکاری کاروبار میں اور تعلیم میں استعمال کی جائے[2]"۔ اس دستخطی مہم کے خلاف ہندی والوں نے غلط فہمیاں پھیلائیں اور فرقہ پرستوں نے جگہ جگہ

۱۔ قاضی عبدالغفار ادیب اور اچھے صحافی تھے۔ خلافت کے زمانے میں وہ تحریک کے ایک جوشیلے اور نمایاں کارکن تھے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ مولانا محمد علی کے ساتھ لندن گئے۔ مولانا آزاد ان کے ادب اور انشا سے متاثر تھے، سیاسی خیالات کے لحاظ سے وہ نیشنلسٹ تھے۔ لیکن مزاج میں شان ریاست کے ساتھ ایک طرح کی رئیسانہ لاپروائی بھی تھی۔ ذاکر صاحب غالباً ان سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ اُدھر قاضی صاحب نے کسی ترکیب سے مولانا آزاد کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، اور اسی بنا پر وہ آزاد ہندستان میں انجمن ترقی اُردو کے پہلے ناظم ہوئے۔ لیکن ان کی صحت بہت کمزور تھی، اور انجمن سے انھیں جو تنخواہ ملتی تھی وہ ایک لحاظ سے بڑھاپے کی پنشن ہی تھی۔ مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کی بایوگرافی (صفحہ ۱۶۴) میں لکھا ہے کہ ذاکر صاحب کو یہ بات ناگوار تھی کہ قاضی صاحب علاج کے لیے مسلسل دہلی کا سفر کریں اور سارا خرچ اس سفر اور دہلی کے قیام کا انجمن برداشت کرے۔ اس سلسلے میں ادائیگی کے لیے جو بل پیش کیے جاتے، وہ بھی ضابطے کے مطابق نہ ہوتے۔ ویسے بھی وہ انجمن کے سکریٹریٹ کی کارکردگی سے خوش نہ تھے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو انھوں نے شہاب الدین دسنوی صاحب کے نام ایک خط میں علی گڑھ سے لکھا تھا: "آپ کو انجمن کی طرف سے جو مایوسی ہے اس میں میں بھی شریک ہوں۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس سے کنارہ کش ہو جاؤں، مگر بزرگوں اور دوستوں نے ایسا نہ کرنے دیا۔"

۲۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۱۰ جولائی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۔ یہ اقتباس اس دعوت نامے کا ہے جسے صدر استقبالیہ کمیٹی اُردو کانفرنس منعقدہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء (لکھنؤ) پنڈت کشن پرشاد کول نے مدعوین کو بھیجا تھا۔

سخت تقریریں اور اشتعال انگیزیاں کیں، لیکن یہ مہم جس نے اس وقت ایک تحریک کی سی شکل اختیار کرلی تھی، بڑی خاموشی، سکون اور نظم و ضبط سے عدم تشدد کے اصولوں پر غیر فرقہ وارانہ انداز میں چلائی گئی تھی، اس لیے ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہی۔ ذاکر صاحب نے ۲۶ر جولائی ۱۹۵۳ء کی لکھنؤ اُردو کانفرنس میں اس تحریک میں کام کرنے والوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ: "یہ کام اس طرح ہوا جس طرح کہ ہوا (ہونا چاہیے تھا؟) اس لیے کہ کام کے انداز میں مجھے کام کی اصلی روح کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس اپنے مطالبے کی سچائی پر بھروسا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ہندستانی سماج کی معقولیت پر اعتماد دکھائی دیتا ہے، باوجود ظاہری اسباب مایوسی کے، اعتماد!

دلم بجوئے تو با صد ہزار نومیدی
بہ این خوش است کہ امید واری گذرد"[1]

۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء کو ذاکر صاحب کی سربراہی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) اور اترپردیش کی اُردو بولنے والی آبادی کی جانب سے ایک بڑا وقیع وفد صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں حاضر ہوا کہ بیس اکیس لاکھ بالغوں کے دستخطوں کے ساتھ صدرِ جمہوریہ سے فریاد کی جائے کہ اترپردیش میں اُردو کو اس کا دستوری حق دیا جائے۔ یہ فریاد صدا بصحرا ثابت ہوئی، اُردو کو اس کا حق نہیں ملا اور ذاکر صاحب کی دستوری جمہوریت کے کوچے میں یہ اُمیدواری رایگاں گئی۔ اترپردیش کی تنگ نظر کانگریسی حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی اور مرکزی حکومت اس کو مجبور نہیں کرسکتی تھی اور یہ بھی تھا کہ اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی کے مسئلے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ) کا اپنا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔

اترپردیش میں اُردو والوں پر انجمن کی اس "سعیِ رایگاں" کا اخلاقی اعتبار

۱۔ ذاکر حسین، "خطبۂ صدارت" (اُردو کانفرنس، لکھنؤ، ۲۶ر جولائی ۱۹۵۳ء)، اسلام اور عصر جدید، جنوری۔ اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۱۵۶۔ ذاکر صاحب کا یہ خطبہ اپنی معنویت، بلاغت اور خطابت کے لحاظ سے ان کی بعض نہایت اہم تقریروں میں شمار ہوتا ہے

سے بہت بُرا اثر پڑا۔ ان کی ہمتیں پست ہوگئیں، وہ اپنی ریاست میں اُردو کے مستقبل سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہوگئے۔ اس احساسِ محرومی و مایوسی کے اظہار کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ اس وقت معاشی و سیاسی اعتبار سے خستہ و درماندہ اُردو والوں نے اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کی طرف سے غفلت اور بے توجہی سے کام لیا۔ اُردو کے مخالفین کامیاب اور خوش تھے کہ اب اُردو والوں کے گھروں میں نئی نسل اُردو سے نابلد ہوگی۔ اب گویا اُردو کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگنے والی تھی۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ آخر تیرہ چودہ سال بعد جب ذاکر صاحب صدرِ جمہوریہ ہوئے تو انھوں نے اس فائل کو کیوں نہیں کھولا اور اُن صندوقوں کو کیوں نہیں تلاش کیا جن میں یہ بیس ایکس لاکھ بالغوں کے دستخط بند تھے، اور یہ بات وہی لوگ کہتے ہیں جو حکومت کے طریقۂ کار کو خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔ انجمن کے وفد نے جو محضر پیش کیا تھا اُسے اُس وقت کے صدرِ جمہوریہ نے بوجوہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہوگا، اور معاملہ داخلِ دفتر کر دیا گیا ہوگا۔ تیرہ چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ذاکر صاحب کے عہدِ صدارت میں انجمن نے کوئی دوسرا محضر پیش نہیں کیا، ۱۹۵۳ء میں جن لوگوں نے دستخط کیے تھے، ان کے بارے میں بڑی آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ ان میں سے نہ معلوم کتنے زندہ ہیں اور نہ معلوم کتنے پاکستان یا دوسرے کسی ملک میں چلے گئے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اترپردیش میں اُردو والے سپر نہ ڈال دیتے، جدوجہد جاری رکھتے اور ذاکر صاحب کے زمانۂ صدارت میں ایک اور دستخطی مہم چلاتے اور صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں ایک نیا محضر پیش کرتے۔ اترپردیش والوں نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے اور اُردو کی بے بسی و بیکسی کا ماتم کرتے رہے۔ وہ تو اگر قاضی عدیل عباسی نے بڑھاپے میں جوانمردی کا ثبوت نہ دیا ہوتا اور مکتبوں کے قیام کی تحریک کی بنیاد نہ ڈالی ہوتی اور دینی تعلیمی کونسل جیسی تنظیم وجود میں نہ آئی ہوتی تو نہ معلوم اترپردیش میں اُردو کا اور کیا حال بنتا۔

اس کے برخلاف بہار میں اُردو والوں نے عزم اور ہمت سے کام لیا، ہزار مایوسیوں اور حالات کی ناسازگاریوں کے باوجود اردو تحریک کا عَلَم بلند رکھا اور

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بہار میں اُردو کا حال اتر پردیش کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر ہے۔ آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کے اُن علاقوں میں بھی جہاں اُردو والے ہیں اُردو کا مستقبل روشن نظر آتا ہے، اور یہ سب اُردو والوں ہی کے شوق، محنت اور ہمّت کی وجہ سے ہے۔

۱۹۵۸ء میں ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے اور اس وقت اس ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان منوانے کی تحریک زوروں پر تھی۔ پٹنہ میں سائنس کالج کی بزم سخن کے سالانہ جلسے میں وہ مہمان خصوصی تھے۔ وہاں اُردو کے سلسلے میں بھی پُر زور تقریریں ہوئیں۔ آخر میں ایک شاعر وفاؔ ملکپوری نے ذاکر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے ایک نظم سنائی جس میں اُردو کی طرف سے شکوے شکایتیں تھیں، اور اُردو کے لیے حکومت کی توجہ، مدد اور پشت پناہی کا مطالبہ تھا۔ نظم کا اختتام کچھ اس نکتے اور محاورے پر تھا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مطلوب ہے۔[۱] آخر میں ذاکر صاحب کی تقریر ہوئی جس میں، اگر درج ذیل اقتباس کو غور سے پڑھا جائے تو محسوس ہوگا کہ، انھوں نے اُردو کے حق کے لیے ایک سعی پیہم، ایک مُسلسل جدو جہد کا ذکر کیا ہے جو حکومت کی امداد اور سرپرستی سے بے نیاز رہ کر خود اپنے عزم و ہمّت کے سہارے کی جاتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کیسی بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی جب انھوں نے کہا تھا:

"جو کوئی بیچ منجدھار ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکا تلاش کرنا شروع کرے اور کہیں تنکا دکھائی دیا تو اسے سہارا سمجھ کر اس پر لپکے تو اس کا کیا حشر ہوگا ظاہر ہے، ایسے کو ڈوبنے سے کون بچا سکتا ہے۔ ظالم موجوں اور طوفانوں سے لڑنے کے لیے مضبوط ہاتھ پیر چاہییں، تیرنا جاننا چاہیے، ہمّت چاہیے، عزم چاہیے، خود اعتمادی چاہیے۔ ورنہ پار اُترنے کے خواب، خواب ہی رہیں گے۔ ایسے

۱۔ سید علی عباس کا مضمون خدا بخش لائبریری جرنل میں، نمبر ۲۱۔۲۲۔۲۳ (۱۹۸۲ء) صفحہ ۲۶۶

کمزور اور بے ہاتھ پیر والوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ ساحل کی آسودگی میں پڑے سسکتے اور غزلیں گنگناتے رہیں۔[1]

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۱ء

۱۹۵۱ء میں یونی ورسٹیز کمیشن کی سفارشات اور جمہوریۂ ہند کے دستور کی رو سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ایکٹ اور بنارس ہندو یونی ورسٹی ایکٹ میں بعض تبدیلیاں ناگزیر تھیں اور وہ پارلیمنٹ میں بحث و مباحثے کے بعد ہوئیں۔ لیکن مسلمانوں میں، کچھ تو ان کے جذباتی و تقلیدی مزاج کی وجہ سے اور کچھ اقلیتی نفسیات کے سبب (اور آزادی کے فوراً بعد تو حالات بھی ایسے تھے کہ ان پر اور بھی شک و شبہ، خوف اور تذبذب غالب تھا) مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ان تبدیلیوں سے خاصی بے چینی تھی۔ اُردو کے بعض اخبارات نے ان کے شک و شبہے اور بے چینی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ان اخبارات نے خاص طور پر اِن دو دفعات سے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی تھی کہ (۱) یونی ورسٹی کے مسلمان طالب علموں کے لیے اب دینیات کی تعلیم لازمی نہ رہے گی اور (۲) یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر غیر مسلم بھی ہو سکیں گے۔ ان کے اڈیٹر صاحبان اور ان کے ہم خیال مسلمانوں نے جو یونی ورسٹی کے اندر بھی تھے اور باہر بھی، اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ یونی ورسٹی ایکٹ میں یہ ترمیمات کن تقاضوں کے ماتحت کی گئی ہیں اور کیا ان کے نافذ ہونے سے واقعی مسلم یونی ورسٹی کے تعلیمی و تہذیبی مقاصد وہ نہیں رہ جائیں گے جو پہلے تھے، اور بعض مفاد پرست عناصر نے جو یونی ورسٹی میں تھے، اس بات کا بڑا ماتم کیا کہ یہ علی گڑھ اب "نیا علی گڑھ" ہوگا۔ "وہ علی گڑھ نہیں ہوگا جو سرسید، محسن الملک، وقار الملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وغیرہ کا تھا۔"[2]

۱۔ ایضاً، صفحات ۲۶۴ - ۲۶۶

۲۔ سرسید کا زمانہ ہو یا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا، ہندستان کے مذہبی طبقے کے ایک بہت بڑے حلقے میں علی گڑھ کی "مذہبیت" ہمیشہ مشتبہ رہی، باوجود اس کے کہ ۱۹۵۱ء تک وہاں دینیات کی تعلیم لازمی رہی تھی۔

مسلم یونی ورسٹی ایکٹ میں مذکورہ ترمیمات کا ذمہ دار، اولڈ بوائز اور یونی ورسٹی کے اندر اساتذہ وطلبہ کا ایک طبقہ جس کے لیے نئے حالات سے سازگاری ایک امرِ دشوار تھی، براہِ راست مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کو سمجھتا تھا۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ حکومت نے ذاکر صاحب کو علی گڑھ اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی "شدھی" کر دی جائے، ورنہ پروفیسر بابر مرزا یا پروفیسر حبیب الرحمٰن مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء کو علی گڑھ اور بنارس کی یونی ورسٹیوں کے ایکٹ میں مجوزہ ترمیمات سے متعلق ذاکر صاحب نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی[۱] وہ بالکل واضح تھی، لیکن دیدہ و دانستہ بدگمانیوں کی کوئی منطق نہیں ہوتی۔ اس تقریر کے بنیادی نکتوں کی وضاحت انھوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت[۲] میں بزبانِ اُردو بھی کی[۳] اور کہا:

"دوستو! میں سمجھتا ہوں کہ یونی ورسٹیوں کے قانون میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے صحیح منشا کو جاننا اور اس کا اوروں کے علم میں لانا ہمارا ضروری کام ہے۔ علی گڑھ کو بدنام کر کے مسلمانوں کے دل میں اس کی محبت کو کم کرنا نہ علی گڑھ کے ساتھ نیک سلوک ہے نہ مسلمانوں کے ساتھ، نہ ہندستان کے ساتھ۔ میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے ... یہ اہم کام علی گڑھ ہی کے حصے میں آیا ہے اور علی گڑھ ہی اسے انجام دے سکے گا۔"[۴]

۱۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء، صفحات ۸-۵ (انگریزی کی پوری تقریر گزٹ میں چھپی تھی۔)

۲۔ ذاکر صاحب کو کانفرنس کی صدارت بھی سونپی گئی تھی۔ انھوں نے بہت چاہا کہ کانفرنس میں زندگی پیدا ہو جائے، اور وہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں میں اشاعتِ تعلیم کا کام کرے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

۳۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، صفحات ۲۶۵-۲۶۲

۴۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۶۶

مسلم یونی ورسٹی ایکٹ میں مذکورہ ترمیمات کے سلسلے میں ذاکر صاحب پر اندر اور باہر جو تنقیدیں ہوئیں ان سے یقیناً انھیں بڑی تکلیف پہنچی ہوگی' وہ سوچتے ہوں گے کہ میں تو ظاہری و باطنی اعتبار سے مسلمانوں کی اس یونی ورسٹی کو ملک میں ایک نمونے کی یونی ورسٹی بنادینے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں' لیکن کیسے ہیں یہ لوگ کہ مجھے بھی شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں! دل کی بیماری نے ان میں یہ احساس بھی پیدا کر دیا تھا کہ کیا خبر کب بلاوا آجائے' اس لیے کاموں میں تیز رفتاری چاہتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ اُن کا پوری طرح ساتھ دیں گے۔ لیکن ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کی ان کی بعض تقریروں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ مایوس ہو چلے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں اور طالب علموں کی تعریف کرتے تھے' ان کے اشتراک و تعاون کا شکریہ ادا کرتے تھے' پھر بھی ان کے اسلوب بیان کی اوٹ سے یک گونہ مایوسی جھانکتی سی محسوس ہوتی تھی۔

ذاکر صاحب کی مشکلات

۳ر نومبر ۱۹۵۳ء کو اسٹریچی ہال میں یونی ورسٹی کے چانسلر سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین کے اعزاز میں ذاکر صاحب نے جو خیر مقدمی تقریر کی تھی اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے بیان کیا تھا کہ کس طرح ایک پیر جواں ہمت (سرسیّد احمد خاں) نے، ایسے وقت میں جب "حوصلے پست تھے' ہمتیں شکستہ تھیں اور توانائیاں مضمحل تھیں... احیائے ملّت کا تہیّہ کیا اور اپنی کوششوں کا مرکز ایک تعلیمی ادارے کو بنایا۔" پھر یہ یاد دلایا تھا کہ کس طرح اس ادارے نے رفتہ رفتہ ترقی کی' اور سارے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی' اور جب اس درس گاہ کے کام میں سیاسی حالات اور برطانوی سامراج کی مصلحتوں نے رخنے ڈالے اور پیچیدگیاں پیدا کیں تو "اس کی سیاسی ڈگر ملک کی عام شاہراہ سے الگ ہوگئی' لیکن' بہرحال' یہ یونی ورسٹی ابتدائی دشواریوں اور انتشار کے بعد برابر بڑھتی گئی تا آنکہ آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے اسے ایک اور بحران کا سامنا کرنا پڑا جس کا اثر اس کے کام اور تعلیمی معیار پر بُرا پڑا' اور پھر تقسیم کے بعد جو نتائج ظاہر ہوئے " وہ ایسے

سمجھتے کہ لوگ اس دارالعلوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔ اس کے وجود کے قائم رہنے کو مشتبہ سمجھا جانے لگا تھا۔[1] اس کے بعد ذاکر صاحب نے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کی رفتار ترقی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح انھوں نے حکومت کی امداد اور ساتھیوں اور طلبہ کے اشتراک و تعاون سے حالات پر قابو حاصل کیا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ اساتذہ و طلبہ کی تعداد، ساز و سامان، شعبوں کی مالیات تو صرف اس یونی ورسٹی کا ڈھانچہ ہے۔ "اس کی اصل روح تو اس کے استاد اور طالب علم ہیں... میں نے انھیں خاصے دشوار زمانے میں کام کرتے دیکھا ہے، بے مائیگی کے زمانے میں، مایوسی کے زمانے میں، شبہہ اور بدگمانی کی فضا میں کام کرتے، سیر چشمی، خندہ پیشانی، صبر و ضبط کے ساتھ کام کرتے... یہ نہیں ہے کہ ان میں نقص نہیں ہیں، نقص، سیدِ محترم، کس میں نہیں ہوتے؟ مگر یہ انھیں دور کرنے کے لیے بے چین ہیں، اس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور ان کا سینہ اس یقین سے معمور ہے کہ ان کی کوشش بارآور ہوگی۔" طلبہ کی تعریف ایک اور انداز سے کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا کہ سیدنا المحترم! "ہاں، غلطیاں ان سے ہوتی ہیں، مگر کوئی انھیں سمجھائے تو سمجھتے ہیں، بتائے تو سیکھتے ہیں۔ ہمدردی کے سامنے یہ اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، کوئی ان کے دکھ درد میں شریک ہو جائے تو اس پر اپنی جان چھڑکتے ہیں، بڑے ہونہار ہیں یہ نوجوان... نوجوان دوستو! میں سیدنا کے سامنے کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ کچھ تھوڑا بہت غلط بھی ہو اور محبت تمھارے بعض عیب نہ دیکھنے دے رہی ہو تو بھی تم مجھے صحیح ثابت کر سکتے ہو اور اگر میں تمھیں کچھ بھی جانتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے صحیح ہی ثابت کروگے..."[2]

۱۔ یہاں ایک بار اور یاد کر لیجیے کہ سرسید نے کیسے مشکل وقت میں احیائے ملت کا دشوار کام شروع کیا تھا، اور ذاکر صاحب نے بھی کیسے انتشار اور مصیبت کے زمانے میں ملت کی حیاتِ نو کے لیے علی گڑھ کی قیادت کی ذمے داری سنبھالی تھی۔

۲۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۱۰، ۱۴ نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۹

ایسا لگتا ہے کہ اُس زمانے میں ذاکر صاحب خاص طور پر سرسیدؔ مرحوم کے حوالے سے اپنی بات کہنے لگے تھے۔ غالباً وہ ایسا اس لیے کرتے ہوں گے تاکہ وہ اپنے نکتہ چینوں کو یاد دلائیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملت اسلامیہ کو جس ذہنی جمود، سماجی انتشار، عام شکست و ریخت اور پیچیدہ سیاسی صورت حال کا سامنا تھا، کم و بیش اسی طرح کی ایک ابتر صورت حال ۱۹۴۷ء کے بعد ایک بار پھر ہندستان میں اسے درپیش تھی۔ اُن دشوار حالات میں سرسید اور ان کے بہت سے ساتھیوں نے باہم مل جُل کر کیسی ہمت، استقلال اور دور اندیشی سے کام کیا تھا اور اِس ملک میں مسلمانوں کی پوزیشن کو مستحکم کیا تھا۔ ذاکر صاحب بھی اپنے ساتھیوں سے اس وقت کے مشکل حالات میں اُسی طرح کے تعاون اور اُسی قسم کی سوجھ بوجھ اور دور بینی کے طالب تھے۔ بعض تنگ نظر اور فرقہ پرور عناصر یہ جو کہتے تھے کہ وہ کانگریسی حکمرانوں کے دوست اور معتمد علیہ ہیں، تو آخر سرسید بھی تو اپنے وقت کی حکومت اور وہ بھی بدیسی حکومت کے دوست و معتمد علیہ تھے! سرسید اور ان کے رفقا کام کرتے تھے، محنت کرتے تھے، ایثار کرتے تھے تاکہ قوم کو سرفرازی حاصل ہو، ذاکر صاحب اپنے بیشتر ساتھیوں میں ان خصوصیات کی کمی پاتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر اپنے خاص اسلوب میں اس طرف اشارہ بھی کر دیتے تھے، اس امید میں کہ شاید کچھ لوگوں میں خود احتسابی کا جذبہ اور عمل کا ذوق پیدا ہو جائے۔

ذاکر صاحب کی اسی قسم کی ایک تقریر کے اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یہ تقریر انھوں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یوم سرسید پر اسٹریچی ہال میں کی تھی۔ اس سال اس تقریب کی تیاریوں میں انھوں نے خاص دلچسپی لی تھی اور اُس دن کے انتظامات کی بڑی توجہ سے دیکھ بھال کی تھی، اور عام طور پر جو اہتمام یونی ورسٹی والے خود ان کے استقبال کے لیے کیا کرتے تھے، اس سے کہیں زیادہ اہتمام وہ اس دن جلسے میں شریک ہونے والے مہمانوں کے استقبال میں کرتے نظر آتے تھے۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ ۱۹۵۴ء میں سرسید ڈے کی اس تقریب کو وہ کیوں ایک خاص موقع بنا دینا چاہتے تھے؟ جو لوگ ذاکر صاحب کی افتادِ طبع، اندازِ گفتگو اور طریقۂ کار سے کچھ واقف ہیں وہ ہمارے اس خیال کی تائید کریں گے کہ

تقریباً چھ سال تک یونی ورسٹی کے کام میں جان کھپانے کے بعد، اور وہ بھی سخت ناموافق حالات میں، انھیں یہ جو کچھ احساس ہو چلا تھا کہ جیسا اور جتنا کچھ وہ چاہتے تھے وہ نہیں ہو پایا ہے، تو اس احساس کو ۱۷، اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اپنی نگرانی میں اہتمام سے ترتیب دی ہوئی اس تقریب میں سرسید کی یاد کے پردے میں صاف صاف بیان کر دینا چاہتے تھے۔ گویا یہ محض تقریر نہ تھی بلکہ سرسید کی راہ پر تنہا، بغیر کسی رفیق کے، چلنے والے ایک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک تھی! اس موقع پر ذاکر صاحب نے کہا تھا:

"یادگار انسان منایا کرتے ہیں۔ جانور کبھی کسی کی یادگار نہیں مناتے۔ سرسید کی یادگار منانے کا طریقہ یہ ہے کہ جن کاموں کو وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں ان کو پورا کیا جائے، جو کام وہ پورا کرنا چاہتے تھے ان کاموں کی تکمیل کی جائے۔ یہ انسانوں کا فرض ہے۔ جانور اور انسان میں فرق یہ ہے کہ انسان اجتہاد کرتا ہے، کچھ بناتا ہے کچھ بگاڑتا ہے۔ رات اندھیری ہوتی ہے تو وہ چراغ بنالیتا ہے۔ جنگلوں اور ویرانوں کو کانٹ چھانٹ کر سبزہ زار کر لیتا ہے۔ جانوروں کو جو زندگی ملتی ہے وہ اس زندگی کو بغیر تبدیلی کے اسی ایک حال میں گزار دیتے ہیں۔ جو اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا وہ جانور ہے۔ انسان تو ہر لمحہ تغیر چاہتا ہے۔ اس کا سینہ آرزوؤں کی آماجگاہ ہوتا ہے اور اس کی یہ آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، اور وہ آرزو ہی کیا جو پوری ہو جائے۔ سرسید احمد خاں کی آرزوئیں بہت تھیں ... سرسید احمد خاں کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ہی زندگی پر قانع نہ تھے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ مرکر بھی زندہ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی قوم ان کو مار ڈالنا چاہتی تھی۔ مرنے کے بعد آدمی اپنے کاموں کی وجہ سے ہی زندہ رہتا ہے۔ لوگ کاموں سے بچتے تھے، منہ موڑتے تھے۔

"سید احمد خاں آگے بڑھ کر کاموں کو اپنے ذمے لیتے تھے۔ انھوں نے اگریکلچر کی کتابیں لکھانی چاہیں، جب کوئی تیار نہیں ہوا تو وہ خود لکھنے بیٹھ گئے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے ماہرین بیٹھے ہیں، بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کی کتنی کتابیں لکھی ہیں۔ سید احمد خاں نے سائنٹیفک سوسائٹی کھول کر ترجمے کا کام شروع کیا، لوگوں نے

اسے بند کر دیا۔ وہ اُردو زبان کو مالا مال کرنا چاہتے تھے، لوگ مخالفتیں کرتے تھے ... وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے، لیکن اکیلا آدمی سب کچھ نہیں کر سکتا۔ لوگ ان کی ہمت، عزم اور ارادے کے متحمل نہ ہو سکے۔ وہ قوم کو اعلا معیار پہ لانا چاہتے تھے۔ کم ہمت ان کو نیچے گھسیٹنا چاہتے تھے۔ سرسید نے ان سے سمجھوتہ کر لیا جو آرام کی زندگی چاہتے تھے، اور ان کو ڈپٹی کلکٹری اور تحصیلداری دلا کر مطمئن کر دیا۔ جو کلرکی پر راضی ہوا وہ کلرک ہو گیا۔ جن میں ذرا بھی حوصلہ تھا انھوں نے سرسید کا ساتھ دیا..."[1]

ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڑھ میں مسلم اور غیر مسلم، ملکی اور غیر ملکی نہ معلوم کتنے معزز مہمان آئے۔ ان میں سلاطین بھی تھے اور اُمرا بھی، ماہرینِ تعلیم بھی تھے اور سیاست داں بھی، حکومت کے وزرا بھی تھے، گورنر اور جمہوریۂ ہند کے صدر اور وزیرِ اعظم بھی، اور جو بھی آیا علی گڑھ کے بارے میں بہت اچھا تاثر لے کر گیا۔ بقول رشید صاحب "ذاکر صاحب کے آتے ہی ... یہ ہوا کہ بڑے سے بڑے آدمی بھی دنیا کے کسی گوشے سے آئے، کسی فن کے امام ہوئے، سب سے پہلے انھوں نے 'رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد!' ذاکر صاحب کو نذرِ عقیدت پیش کی، ادارہ کی خدمات اور خوبیوں کا اعتراف کیا اور رخصت ہوئے تو کچھ اس طرح کا احساس لیے ہوئے جیسے وہ ایک بڑے شخص اور بڑے ادارے سے مسرور و مفتخر ہو کر جا رہے ہیں۔"[2]

یہ سب کچھ تو تھا لیکن، جیسا کہ اشارتاً ہم کہہ چکے ہیں، علی گڑھ میں پانچ چھ سال گزارنے کے بعد ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں اپنی تنہائی کا احساس ہو چلا تھا اور وہ دلگیر رہنے لگے تھے۔

۱۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۸ر نومبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۵، اقتباس میں اسلوبِ بیان کا تیکھاپن وہی ہے جو ایسے موقعوں پر ذاکر صاحب کا خاص اسلوب ہوا کرتا تھا، البتہ محسوس ہوتا ہے کہ رپورٹر نے تقریر کی رپورٹ لفظ بہ لفظ نہیں لکھی تھی۔

۲۔ رشید احمد صدیقی، "یادِ یارِ مہرباں آید ہمی"، مسلم یونی ورسٹی گزٹ (ذاکر نمبر)، ۲۴ر فروری ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۴

صحت ان کی کمزور تھی اور قلب کی تکلیف نے اس قابل نہ رکھا تھا کہ ذرا سی ٹھیس بھی برداشت ہوسکے، اور اب ٹھیس لگنے کی بہت سی صورتیں پیدا ہو چلی تھیں اور ان سب کا بنیادی سبب ہمارے نزدیک ذاکر صاحب کے وہ سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی افکار تھے جن پر ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات میں علی گڑھ کی تعمیرِ نو مقصود تھی۔ ان کے یہ افکار و خیالات کوئی عجوبہ نہ تھے۔ یہ وہی تھے جنھیں گذشتہ ابواب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن علی گڑھ میں بیشتر لوگوں کے لیے یہ یقیناً اجنبی اور ناقابلِ قبول تھے۔ علی گڑھ میں جو لوگ ان افکار و خیالات کے قدر داں تھے، ان کی تعداد بہت کم تھی، پروفیسروں میں تو شاید ایک حبیب صاحب کے علاوہ اور کوئی نہ تھا اور وہ بھی جلد ہی "لعبت چیں" کی سحر آفرینیوں کے شکار ہو گئے، باقی ایسے موقف میں نہ تھے کہ یونی ورسٹی کے طرزِ فکر پر کوئی اثر ڈال سکتے۔ اس کے برخلاف علی گڑھ کا ایک مخصوص طبقہ ذاکر صاحب سے ہمیشہ سے بدگمان رہا تھا اور کبھی کبھی تو یہ بدگمانی عناد کی حد تک پہنچ جاتی تھی، اس پر مستزاد تقسیم سے چند سال پہلے علی گڑھ پر مسلمانوں کی فرقہ واری سیاست کچھ اس طرح چھا گئی تھی کہ تقسیم کے فوراً بعد، جبکہ ہندو فرقہ واریت علی گڑھ سے اپنا سارا اگلا پچھلا حساب چکانے کے لیے بے چین تھی، ناممکن تھا کہ راتوں رات ان تنگ نظر عناصر کی قلب ماہیت ہو جاتی، یہ لوگ اپنے آپ کو مذہبی کہتے تھے اور یقیناً مذہبی رہے ہوں گے، لیکن مذہب سے متعلق ان کا نقطۂ نظر یقیناً نہایت محدود تھا۔

دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے تھے، مذہب سے بیگانہ تھے اور کمیونسٹ خیالات کے حامی تھے۔ ان میں بعض اساتذہ و طلبہ تو بہت پہلے سے کمیونسٹ مشہور چلے آرہے تھے اور ان میں سے بعض تھے بھی، اور جیسا کہ اوپر کہا گیا، "نیشنلسٹ" مسلمان یونی ورسٹی میں بہت کم تھے اور با اثر لوگوں میں تو یہ جنس کچھ مفقود ہی سی تھی[1]۔ باہر کی یونی ورسٹیوں میں بھی ایسے مسلم اساتذہ جو "نیشنلسٹ" خیالات رکھتے

۱۔ ذاکر صاحب کی مشکل یہ تھی کہ باہر کے بعض نیشنلسٹ مسلمان بھی، مثلاً مرحوم عبد المجید خواجہ اور مولانا حفظ الرحمن مرحوم آخری دنوں میں ذاکر صاحب کا پوری طرح ساتھ نہ دے سکے۔ علی گڑھ کی "مذہب" اور "اشتراکیت" کی نام نہاد داخلی آویزش میں انھوں نے بیچ کی راہ اختیار نہیں کی، بلکہ ان کا جھکاؤ "مذہبی" گروہ کی طرف رہا۔

ہوں، قریب قریب نا پید ہی سے تھے۔ ایسی صورت میں باہر سے جو چند اساتذہ لائے گئے اُن میں کئی اشتراکی نظریات رکھتے تھے۔ ذاکر صاحب تعلیمی میدان میں ہمیشہ سے سیاسی اور مذہبی عقیدے کو نظر انداز کرنے کے حامی تھے، جامعہ میں ان کا طریقۂ کار یہی تھا اور علی گڑھ میں بھی انھوں نے اِسے برتا۔ لیکن جامعہ کا معاملہ علی گڑھ سے یوں مختلف تھا کہ وہاں کے اساتذہ وکارکن، عموماً سب کے سب، ذاکر صاحب کے منتخب کیے اور لائے ہوئے تھے۔ یونی ورسٹی کی سطح پر طلبہ کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام رہتی تھی اور اُن میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن جیسی طالب علموں کی تنظیم کو اپنا اثر قائم کرنے کی کبھی کوئی گنجایش نہ تھی۔ علی گڑھ کے اساتذہ وکارکنوں میں ایسے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد پہلے سے موجود تھی جو اپنے سیاسی ومذہبی خیالات اور اپنی پختہ طبیعتوں کے سبب کسی تبدیلی کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ان میں جو لوگ مذہبی تھے انھیں ہر جگہ اور ہر وقت مذہب اور علی گڑھ کا مسلم کردار خطرے میں نظر آتا تھا، جو لوگ اشتراکی خیالات رکھتے تھے انھیں ہر جگہ اور ہر موقع پر یونی ورسٹی رجعت پرستی اور فرقہ واریت کی طرف جاتی نظر آتی تھی، حالانکہ یہی عناصر ابھی چند سال پہلے 'آزادی سے قبل' یونی ورسٹی کے احاطے میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کے پُرجوش مبلغ اور حامی رہ چکے تھے:

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

ذاکر صاحب کی سب سے بڑی مشکل جو ۵۵-۱۹۵۴ء سے پیچیدہ ہوتی گئی، ہمارے نزدیک یہی تھی کہ وہ اِن دونوں طبقوں کی بظاہر[1] نظریاتی کش کش میں رفتہ رفتہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگے۔ ذاکر صاحب ان دونوں گروہوں کی سرگرمیوں کو یونی ورسٹی

۱۔ بظاہر ہم نے اس لیے کہا ہے کہ علی گڑھ میں بنیادی طور پر یہ کش مکش دونوں طبقوں میں بعض اشخاص کی مفاد پرستیوں کے سبب سے پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طبقہ مذہب کی آڑ لے کر اپنا اقتدار جمانا چاہتا تھا اور دوسرا مذہب سے ڈرا کر اپنا مطلب نکالنا چاہتا تھا۔ اور غریب مذہب دونوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔

کے حق میں نہایت مضر اور تباہ کن تصور کرتے تھے، اور ان کو سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ وہ لوگ بھی جن پر انھیں اعتماد تھا اس "آویزش" میں اُن کا ساتھ چھوڑتے نظر آتے تھے[1]۔ یہ اور اس طرح کا تجربہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور شاید آخری بھی! —— ان دونوں گروہوں کے ہمنوا اور ہمت افزائی کرنے والے علی گڑھ سے باہر بھی تھے اور اخبارات یونی ورسٹی میں اس گروہی چپقلش کا حال اپنے انداز میں پیش کر کے یونی ورسٹی سے متعلق اور بھی غلط فہمیاں پھیلاتے تھے۔ اسی میں ایک شاخسانہ کلچرل سرگرمیوں کا بھی تھا۔ مسلم یونیورسٹی میں یہ ایک بالکل نئی چیز تھی۔ ایک جدید طرز کی قومی یونی ورسٹی میں خاص تعلیمی نقطۂ نظر سے، اور وہ بھی بدلے ہوئے حالات میں، یہ ممکن نہ تھا کہ ایسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی جائے، ہاں، اس سلسلے میں افراط و تفریط سے بچا جاسکتا تھا اور ذاکر صاحب کو اگر اس وقت ذہنی سکون و اطمینان نصیب ہوتا تو وہ انھیں مہذب اور تعلیمی لحاظ سے نتیجہ خیز بنانے کی کوئی

۱۔ راقم الحروف کو الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے جو اُس وقت یونی ورسٹی کے خازن (ٹریژرر) تھے، بتایا کہ ایک دن ذاکر صاحب اُن کے دفتر میں آئے، ہاتھ میں دو تین کاغذ تھے، چہرہ افسردہ اور اداس تھا اور کہا کہ "شروانی صاحب، یہ دو تین کام ہیں، آپ محمود صاحب سے کرادیجیے، میں نہیں کرا پایا ہوں"۔ محمود حسین یونی ورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ اس سے پہلے وہ شعبۂ انگریزی میں استاد اور بہت اچھے استاد تھے۔ بڑے ذہین اور طبعاً شریف انسان تھے۔ ذاکر صاحب نے بعض دوستوں کے مشورے سے انھیں رجسٹرار بنایا۔ انھوں نے بڑی شان اور طمطراق سے رجسٹراری کی اور یونی ورسٹی کے کام میں اپنے کو کھپا دیا، اس طرح کہ ایک آدمی نے دو آدمیوں کا کام کیا۔ ذاکر صاحب کو اُن پر پورا اعتماد تھا، لیکن جب یونی ورسٹی میں "مذہب اور اشتراکیت" کی آویزش" بڑھی تو محمود صاحب نے ذاکر صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور اُس گٹ کے ساتھ ہوگئے، جو کمیونسٹ کہا جاتا تھا۔ محمود صاحب خود بھی اشتراکی خیالات کے حامی تھے۔ ذاکر صاحب کو اس کا بڑا صدمہ تھا، لیکن اس سے بڑا صدمہ ان کو اس وقت پہنچا جب پروفیسر پیارا سنگھ گل کے "معاملات" میں پرووائس چانسلر پروفیسر نوراللہ اور محمود صاحب ایک اور ذاکر صاحب کے نقطۂ نظر کے مخالف ہوگئے، نوراللہ صاحب کو ذاکر صاحب بڑی امیدوں سے پرووائس چانسلر بنا کر لائے تھے۔

تدبیر ضرور نکال لیتے۔ لیکن یہ زمانہ "ترقی پسندی" اور "رجعت پرستی" کے مابین سخت آویزش کا زمانہ تھا، اور دونوں گروہوں نے اس سلسلے میں بھی انتہا پسندانہ موقف اختیار کر رکھا تھا۔ اس صورت حال نے ذاکر صاحب کو جس ذہنی کرب و اضطراب میں مبتلا کیا ہوگا، اس کا کچھ اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب یونی ورسٹی میں اس گٹ بندی کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور اس کی ریشہ دوانیوں کے سبب کیسی روحانی اذیت سے گزرتے ہوں گے، اسے ذیل کے خطوط میں محسوس کیجیے۔ یہ دونوں خط انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے کے بعد کرنل سید بشیر حسین زیدی اور عابد صاحب کو ان کے خطوط کے جواب میں لکھے تھے۔ زیدی صاحب کو انھوں نے بہار گورنرس کیمپ، راجگیر، سے ۶/جنوری ۱۹۶۰ء کو لکھا تھا:

"برادرم زیدی صاحب۔ تسلیم

"... عابد صاحب نے آپ کا 'پیام' پہنچا دیا تھا۔ میں آپ کے حکم سے کب باہر ہوں۔ آپ کو مدراس جانا نہ ہوتا تو امید تھی کہ دلی میں مفصل گفتگو ہو جائے گی۔ آنے کو نہ جانے کیوں جی نہیں چاہتا 'نہ جانے کیوں' کی تفصیل میں بس اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا وہاں ہونا کھینچتا ہے، لیکن اور بہت سی باتوں سے طبیعت میں کچھ ایسی گھن پیدا ہو گئی ہے کہ جی نہیں مانتا۔ آپ حکم دیں گے تو اس ڈر سے کہ کہیں آپ کوئی غلط وجہ نہ مان لیں، تعمیل کروں گا۔ لیکن کھنچا کھنچا بجھا بجھا آؤں گا جو میری افتادِ طبع کے منافی ہے۔ میں تو باتوں میں بھی اپنے کو بھول جانے والا آدمی ہوں۔ رفیقوں کے سامنے ہوں اور دل میں دوری ہو تو مجھے اپنے پر شرم آئے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک بیماری کی کیفیت ہے اور عمر نے وفا کی تو اور بیماریوں کی طرح اس میں بھی افاقہ ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت ضرور بیمار ہوں۔

"جن مسئلوں کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں اگر ذاتیات کا دخل نہ ہو

تو فیصلے مشکل نہ ہوں۔ مگر علی گڑھ میں تو، اور علی گڑھ کیا ہمارے ملک میں تو ہر مسئلہ ذاتیات کا مسئلہ ہے۔ پھر ذاتیں بھی موٹی ذاتیں ہیں کہ ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک دو باتیں نہیں، سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا کہ اس کے خیال میں اس کے اور اس کے دوستوں کے لیے پسندیدہ ہے۔ پھر اور کامیابی پر بھوک اور بڑھ جاتی ہے، اور قصہ ختم ہونے میں نہیں آتا تاآنکہ 'شکست' ہو، پیہم شکست، اور اس سے دوسروں کو 'کامیابی' کا گھمنڈ پیدا ہو اور سر پر چڑھے تاآنکہ انھیں 'شکست' ہو۔ ادارہ اسی 'کامیابی اور شکست' کے چکر میں خراب ہوتا ہے۔ کوئی کامیابی والا اگر کامیابی کے دور دورہ میں دوسرے کو بھی کامیاب ہونے دے تو اپنی 'شکست' کی نوبت بھی دیر میں آئے۔ لیکن یہ کون کرے اور کون بھائے، کیسے سمجھائے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کبھی کبھی مجھے خط لکھ دیا کریں تو مجھے شاید جلد افاقہ ہو جائے اور میں حاضر بھی ہو جاؤں۔۔۔"[1]

۲۰ر جون ۱۹۶۱ء کو ذاکر صاحب نے پٹنہ سے عابد صاحب کو لکھا:

"برادرم عابد صاحب، تسلیم

"خط کی رسید بھیجنے میں پھر دیر ہو گئی۔ عادی مجرم سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ آپ کا خیال صحیح نہیں ہے کہ مجھ کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ سب کچھ سوجھتا ہے مگر مزاج کچھ بدل گیا ہے۔ کوئی بیماری ہے یا کوئی ارتقائی منزل، یہ نہیں کہہ سکتا۔ بہت کچھ جو عمر بھر کیا کیا ہوں، وہ اب اچھا نہیں لگتا ہے اور یہ احساس

۱۔ ذاکر صاحب کے اس خط کی زیروکس کاپی مجھے کرنل سید بشیر حسین زیدی نے عنایت کی ہے۔ میں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

بہت قوی ہوتا جاتا ہے کہ عمر اکارت گنوائی۔ اس وجہ سے بہت سی ایسی چیزوں میں دلچسپی نہیں رہی ہے جن میں پہلے جی لگتا تھا۔ بہرحال پوری کوشش کروں گا کہ اب آپ کو مجھ سے دکھ نہ پہنچے ایک ضائع شدہ عمر کی ساری کمائی چند دوست ہی تو ہیں انھیں بھی کھو دوں گا تو بالکل خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔

"ہاں، اور یہ خیال تو دل سے بالکل نکال دیجیے کہ علی گڑھ سے مجھے کوئی کچھ لکھتا ہے، اس سے مجھ پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ علی گڑھ سے اول تو مجھے کوئی کچھ لکھتا نہیں، نہ یوسف، نہ زیدی صاحب، نہ کمیونسٹ نہ مسلمان[۱]! کبھی یوسف کا کوئی نجی خط آتا ہے تو گھریلو معاملات کے متعلق ... اور اگر کوئی لکھے بھی تو مجھ پر اس کا کیا اثر ہوگا اس لیے کہ میرے ذہن میں تو ایک نقشہ جم گیا ہے، وہ یہ کہ علی گڑھ دو ٹکریوں میں بٹ گیا ہے، اور دونوں ادارے کی تباہی کے درپے

۱۔ مرحوم حکیم عبداللطیف (پرنسپل طبیہ کالج، علی گڑھ) سے ذاکر صاحب کے بڑے مخلصانہ مراسم تھے۔ وہ کبھی کبھی علی گڑھ سے متعلق کچھ لکھ دیا کرتے تھے۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، کے متعلقہ فائل میں ان کے بعض خطوط کے جواب میں ذاکر صاحب کے چند خط موجود ہیں، جن سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔ ایک خط میں ذاکر صاحب یوسف صاحب سے متعلق لکھتے ہیں: "خدا انھیں کامیاب کرے اور ان کا دل چوٹوں سے محفوظ رہے۔ علی گڑھ میں دل دکھنے کے سامان بہت ہیں۔" (مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء، راج بھون، پٹنہ)۔ ایک اور خط مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۶۱ء میں لکھتے ہیں: "... بات سچ یہ ہے کہ علی گڑھ کے حالات سن سن کر بہت کڑھتا رہا۔ وہاں کسی کو خط لکھتا تو اس میں اپنی کیفیت ذہنی کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا۔ اس سے بچتا تھا، مدتوں زیدی صاحب اور یوسف سے خط و کتابت تقریباً بند رہی..." ایک دوسرے خط مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۶۱ء میں لکھتے ہیں: "... اچھا کیا آپ نے کچھ حالات لکھ دیے قفس میں "روداد چمن" سن لی۔ جہاں تک ہو سکا ہے دل سب چیزوں سے سوائے اس کے جو خود کرتا ہوں، ہٹا لیا ہے مگر پوری طرح ہٹتا نہیں۔ اس کی سزا پاتا ہوں، یعنی دکھ اٹھاتا ہوں..."

ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں کامیاب ہوں گے؟ ۔ کہیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے کسی نے قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ (وَ) قَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ[1] تو آپ نے فرمایا: 'صَدَقْنَا'۔ علی گڑھ کی ٹکڑیوں سے متعلق میرا بھی یہی خیال ہے۔ الف کہتا ہے کہ ب علی گڑھ کو تباہ کر دے گا' ب کہتا ہے کہ الف تباہ کر دے گا۔ میں کہتا ہوں آپ دونوں سچ فرماتے ہیں۔ جس کا یہ حال ہو اس کو وہاں کے کھنے والوں کے لکھنے سے کیا غلط فہمی ہوگی۔ خیر اس قصے کو ختم کیجیے اور مجھے وہی سمجھیے جو آپ ازراہ ذاکر نوازی ہمیشہ سمجھتے رہے ہیں۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے، نہ انشاء اللہ ہوگی...[2]

جنوبی ہند کی سیاحت

یونی ورسٹی کے حالات اور مصروفیتوں، دونوں نے مل کر جب ذاکر صاحب کے اعصاب پر زیادہ دباؤ ڈالا تو ۱۹۵۵ء میں ایک بار پھر ان کی طبیعت علیل ہوئی' اس سے صحت یاب ہوئے تو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ گرمیوں کا زمانہ جنوبی ہند میں گزاریں۔ دوست احباب کا بھی بہت زیادہ اصرار تھا کہ وہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے لیے علی گڑھ سے کہیں باہر چلے جائیں۔ چنانچہ زیدی صاحب نے اپنی معیت میں اُن کے جنوبی ہند کے سفر کا پروگرام بنایا۔ وہ بمبئی گئے، پھر پنج گنی میں چند دن گزار کر شیواجی کے دیش میں مہابلیشور، پرتاپ گڑھ، سنگڑھ، ستارہ اور پونا کی سیر کی' اور وہاں سے سیدھے بنگلور پہنچے' تین دن وہاں قیام کیا اور اس کے بعد میسور۔ پھر بنڈی پور اور اوٹی کی سیر کے بعد بذریعہ کار کورگ کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ مئی (۱۹۵۵ء) کے مہینے کا تیسرا ہفتہ تھا اور موسم نہایت خوشگوار تھا' ابر و باراں

۱۔ سورۃ البقرہ: ۱۱۳

۲۔ متعلقہ فائل خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

نے گویا "ہوا میں شراب کی تاثیر" پیدا کر رکھی تھی"۔ سڑک کے دونوں طرف کافی اور سُپاری کے لہلہاتے ہوئے درخت تھے۔ ایک مقام پر ... (ان) درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ برق و باد و ابرِ باراں کی زد میں بید لرزاں کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے کار رکوا دی اور دیر تک اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے اور کہا: 'یہ تو تاج محل سے زیادہ خوبصورت ہے'۔ باغبانی سے غیر معمولی دلچسپی تھی ... (اس) سفر کے دوران جہاں کہیں نیا پودا دیکھتے تو مجھ سے پوچھتے یہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ میں نے آپ کی پسند کے بہت سے پودے جمع کر کے علی گڑھ بھیجے تھے ... اس سلسلے میں ایک مرتبہ ارشاد ہوا تھا، 'میرا شغل درس و تدریس ہے اور باغبانی سے دلچسپی بھی۔ دونوں میں ایک مناسبت ہے۔ ایک معلم بچے کی بہترین صلاحیتوں کو ابھارتا ہے اور اسی طرح باغبان زمین کی بہترین صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ اگر نظریۂ تناسخ میں کوئی صداقت ہے تو مجھے ماننا پڑے گا کہ میں کسی پچھلی نسل میں مالی رہا تھا'۔[1]

کورگ سے وہ کالی کٹ گئے، اور پھر مغربی نیلگری کی سیاحت کو نکلے جس کے حسین مناظر نے انھیں حیرت میں ڈال دیا۔ پھر وہ کوچین، ایلپی گئے، وہ کوئیلن بھی گئے۔ وہاں سے وہ اور زیدی صاحب تریوینڈرم ہوتے ہوئے کنیا کماری گئے اور پھر وہاں سے مدراس آئے۔ ڈھائی سو پودے جو اس سفر کی یادگار تھے ان کے ساتھ تھے۔[2]

اس سفر سے واپسی کے بعد ذاکر صاحب نے ۱۷ر جون ۱۹۵۵ء کو عبدالقادر صاحب کو شکریے کے خط میں لکھا کہ "جنوب ہند کی سیاحت کے بعد ہم دونوں پرسوں دلی پہنچے۔ وہاں

۱۔ محمد عبدالقادر، خانۂ علی گڑھ، بنگلور، ۱۹۸۶ء، صفحات ۱۱-۱۰؛ عبدالقادر صاحب رشید صاحب کے شاگرد ہیں، میسور کے فلومینا کالج میں صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔ بنگلور، میسور اور کورگ کے سفر میں وہ ذاکر صاحب کے ساتھ رہے تھے۔

۲۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ اے بایوگرافی، صفحہ ۱۷۲۔ زیدی صاحب سے بھی راقم الحروف کو اس سفر کی تفصیلات معلوم ہوئیں

زیدی صاحب کو چھوڑ کر میں کل یہاں علی گڑھ آ گیا۔ کوئی چالیس دن باہر رہا۔ پورا ایک چلہ۔ خوشگوار تاثرات کا ایک خزانہ ہے جو اس سیاحت نے بخشا۔ اس میں سرعنوان آپ کی اور سہیل[1] صاحب کی برادرانہ محبت اور رفیقانہ ہمدمی کی یاد ہے ـــــ خوش باش کر وقت مانوش کر دی ـــــ شکریہ ادا کروں تو اس میں رسمیت کی بو آ جائے گی۔ لہٰذا اس مضمونِ رنگیں کو خاموشی ہی سے ادا کرنا ٹھیک سمجھتا ہوں ...[2]"

جنوبی ہند کی سیاحت سے واپسی کے بعد

ذاکر صاحب جنوبی ہند کے سفر سے ۱۶ر جون ۱۹۵۵ء کو علی گڑھ واپس آئے۔ اس کے بعد اتفاق سے یکے بعد دیگرے یونی ورسٹی میں کئی ملکی اور غیر ملکی مہمان آئے اور اس کی وجہ سے ذاکر صاحب کو معمول سے زیادہ مصروف رہنا پڑا۔ ان معزز مہمانوں میں سے یہاں ہم صرف تین کی تشریف آوری کا ذکر کریں گے، اور تاریخ وار ترتیب کو ذرا بدل کر کریں گے۔ یہ تین مہمان تھے سودی عرب کے شاہ سعود الاوّل، ایران کے شاہ محمد رضا شاہ پہلوی اور ہندستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو۔

شاہ سعود کا ورود مسعود

۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو شاہ سعود اوّل جب علی گڑھ پہنچے تو ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا، اور وہ یونی ورسٹی کی تزئین و صفائی اور طلبہ کے مسرور و مطمئن چہرے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یونی ورسٹی نے طے کیا تھا کہ وہ شاہ سعود کو اعزازی ڈگری دے گی، چنانچہ اس کے لیے ایک اسپیشل کانووکیشن پنڈال تیار اور آراستہ کیا گیا تھا جس میں معزز مہمان کو اعزازی ڈگری دینے کی تقریب سے پہلے ذاکر صاحب نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش

۱۔ عبد الغفور خاں سہیل جو اپنے ہفتہ وار اخبار نقاد کی وجہ سے مشہور تھے۔

۲۔ محمد عبد القادر، حوالۂ سابق، صفحہ ۱۴۴

کیا۔ سپاس نامے میں عرب و ہند کے صدیوں کے تجارتی تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے ان دونوں علاقوں کے روحانی اور علمی روابط کی داستان اپنے خاص اسلوب میں سُنائی، اور سارے عالم انسانی پر اسلام کے احسانات کے ساتھ ہندستان پر بھی بعثت نبویؐ کے احسان عظیم کا ذکر کیا، اور جلالتہ الملک کو یہ بھی یاد دلایا کہ "سروری در دین ما خدمت گری ست"۔

اس کے بعد ذاکر صاحب نے آزادی کے بعد سے یونی ورسٹی کے کاموں کے پھیلاؤ کی تفصیل بتائی اور چند زیر غور منصوبوں کا بھی ذکر کیا، خاص طور پر میڈیکل کالج کے منصوبے کا۔ اور پھر آخر میں کہا کہ اس مختصر بیان میں اس یونی ورسٹی کی اب تک کی ترقیوں اور آیندہ کے ترقیاتی منصوبوں کا ایک خاکہ "ذات ہمایونی کے سامنے آگیا ہوگا جس کی اعزازی سند قبول فرما کر اور جس میں تشریف فرما ہو کر آپ نے اسے معزز اور مفتخر فرمایا ہے۔ ہم محجوب ہیں آپ سے، یا صاحب الجلالۃ، کہ ہمارا کام اس سے وسیع تر اور اس سے بہتر نہیں جیسا کہ ہے ہم محجوب ہیں اس پر بھی کہ نہ حضرت جلالتہ الملک کے شایان شان استقبال کا سامان کر سکے نہ خود اپنے شوق و محبت کے بقدر۔۔۔"[1]

یونی ورسٹی میں طلبہ کی یونین میں شاہ سعود تشریف لے گئے، تو پچاس ہزار روپے کے عطیے کا اعلان فرمایا، اور یہ خبر بھی گرم ہوئی کہ یونی ورسٹی کو بھی وہ کچھ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا کچھ اظہار نہیں ہوا۔ بہرحال جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ مہمانِ محترم نے ذاکر صاحب کو مع چند دوستوں کے ریاض آنے کی دعوت دی ہے اور انھوں نے اس دعوت پر شکریے کے ساتھ اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا ہے۔ شاہ سعود کی واپسی کے بعد ذاکر صاحب نے اس کی اطلاع وزیر اعظم پنڈت نہرو کو دی اور انھوں نے لکھا کہ جب وہ یاد فرمائیں تو ضرور جائیے۔

شاہ ایران کی تشریف آوری

۱۹۵۶ء میں فروری کو شاہ ایران اور ان کی ملکہ ثریا کا علی گڑھ میں خیر مقدم کیا گیا۔

۱۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۱۰ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحات ۶-۵

اور اسپیشل کانووکیشن میں شاہ کو اعزازی ڈگری دی گئی۔ اس موقع پر بھی یونی ورسٹی بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھی اور اس کا حسن دوبالا ہوگیا تھا۔ شاہ ایران اور ان کی ملکہ دونوں بہت متاثر اور مسرور ہوئے۔ اس موقع پر شاہ کی خدمت میں ذاکر صاحب نے جو سپاس نامہ پیش کیا اُس کے کئی پیراگراف، بالکل اسی سپاس نامے کی طرح جو شاہ سعود کو پیش کیا گیا تھا، آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ایران کے "حسن خیال، حسن آرزو اور حسن عمل کی جنت" کا ذکر اور پھر ذاکر صاحب کا حسن بیان۔ اس سپاس نامے کو پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایران کا حسن طبیعت اُردو کے قالب میں ڈھل گیا ہے، جس انداز میں انھوں نے نئے ہندستان کی تمناؤں اور حوصلوں کا، اور جن الفاظ اور جس اسلوب میں انھوں نے سرسید کی جامع شخصیت اور جہد مسلسل کا ذکر کیا ہے، اس میں شعر و ادب، مصوری اور موسیقی، سب کا آہنگ ایک حسین تناسب کے ساتھ فردوس گوش بن گیا ہے۔ بلاشبہ یہ سپاس نامہ ذاکر صاحب کی خطابت اور ادبیت کے شاہکاروں میں ہے۔ جدید ہندستان کی تعمیر میں علی گڑھ کے رول کی طرف شاہ کی توجہ دلاتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا:

> "ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں کے سامنے سچے ہندستانی اور اچھے انسان پیدا کرنے کا عظیم الشان کام ہے اور ہمارا یقین ہے کہ ہندستانیت انسانیت میں معاون ہوتی ہے، مخل نہیں ہوتی۔ اس دانش گاہ کا مشن یہ ہے کہ ہندستانیت اور انسانیت کے اس امتزاج میں ہماری مشترک تہذیب کے وہ عناصر بھی شامل رہیں جن میں مسلمانوں کے سوز و ساز اور آرزو و جستجو کا سرمایہ ہے۔ علی گڑھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیام و عمل سے ہندستانی مسلمانوں کا کردار بنے گا اور وہ اپنے خون جگر کی کاوشوں سے جدید ہندستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھریں گے۔"

پنڈت جی کا خیر مقدم

۱۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کی دعوت پر علی گڑھ پہنچے۔ وہ زمانہ ان کے عروج کا تھا۔ وہ یوں تو مدعو کیے گئے تھے مولانا آزاد لائبریری اور سیفی ہوسٹل کی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے انھیں یونی ورسٹی میں اس لیے بلایا تھا کہ اپنے عہد وائس چانسلری کی شام کی شفق کو وہ حسین رنگ بخش دیں جس کی تصویر کشی اُن کے شاعر اقبال نے اس طرح کی تھی:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ۱۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کو وہ پنڈت جواہر لال نہرو کا یونی ورسٹی کی انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے بڑا پر جوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ اساتذہ وطلبہ کی بہت زیادہ تعریف کرتے اور مہمان محترم سے ان کی گہری وابستگی اور عقیدت کا ذکر کرتے ہیں، اور ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ علی گڑھ کی اس تعمیر نو میں ان کا بھی کوئی حصہ ہے، اور اگر کچھ ہو سکا ہے تو وہ صرف ان اساتذہ وطلبہ کی وجہ سے ہے جو بہت اچھے، محنتی اور شریف ہیں ــــ اور پھر چار مہینے کے بعد ہی، یعنی شاہ ایران کی تشریف آوری کے چند ہی روز بعد علی گڑھ میں یونی ورسٹی کی وائس چانسلری سے اُن کے مستعفی ہونے کی خبر پھیل جاتی ہے۔ کہانی کے کلائمکس کے بعد یکایک یہ اینٹی کلائمکس! آخر یہ کیا؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق لوگ دیتے رہیں گے۔ لیکن اس کا صحیح جواب صرف ذاکر صاحب ہی دے سکتے تھے۔

علی گڑھ میں پنڈت جی کی آمد پر ذاکر صاحب کی خیر مقدمی تقریر ان الفاظ سے شروع ہوئی تھی:

"کیسی خوش نصیبی ہے میری کہ اپنے محبوب اور محترم مہمان پنڈت

جواہرلال نہرو، وزیر اعظم ہند، کا اس یونی ورسٹی میں خیر مقدم کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ پر ہے یہ شرف خاصا کٹھن۔ رسمی خیر مقدم ہو تو جیسے تیسے لفظوں میں ادا ہو جائے۔ جب گرمی کی تپتی پیاسی زمین پر برسات کی گھنگھور گھٹا منڈلاتی ہے تو اس کا ذرہ ذرہ زندگی کی ایک چھپی ہوئی لہر سے دھڑکنے لگتا ہے، پر اس گھٹا کے خیرِ مقدم کے لیے وہ لفظوں سے کام نہیں لیتی۔ جب خزاں کی مُردنی کے بعد پودوں کی رگوں میں دوڑنے والا رس اور ٹہنیوں میں سے جھجک جھجک کر، ٹھٹک ٹھٹک کر، جھانکنے والی کلیاں بادِ بہاری کا خیر مقدم کرتی ہیں تو مارے خوشی کے کھِل پڑتی ہیں، مگر ان کا جوشِ نمو خیر مقدم کے لیے لفظ نہیں ڈھونڈ پاتا۔ جب بہار کے قافلے کی پہلی چڑیا چمن میں پہنچتی ہے تو سارا چمن فرطِ خوشی سے لہلہاتا ہے، مسکراتا ہے، پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آدمی نادان ایسے موقعوں پر بھی اس مشورے کو بھول کر کہ نگاہِ شوق اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے، لفظوں ہی میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور آخر کو اپنی بے بسی پر شرماتا ہے۔ میں بھی اپنی سادگی اور نادانی میں اس رنگین مطلب کو لفظوں میں ادا کرنے کھڑا ہو گیا ہوں، پر جانتا ہوں کہ یہ کہتے بنے گا نہیں۔ پھر بھی یقین ہے کہ پنڈت جی اسے سمجھ لیں گے۔"[1]

اور آخر میں یونی ورسٹی کے طالب علموں کی طرف سے پنڈت جی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا:

"اور پنڈت جی، سب سے زیادہ میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں آپ کی قوم کے ان ہونہار نوجوانوں کی طرف سے جن کی خاطر یونی ورسٹی کا یہ سارا کاروبار

۱۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۴ نومبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰

چل رہا ہے ... انھیں آپ کی ذات میں اپنی آرزوؤں، اپنے ولولوں، اپنے ارادوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے، اس لیے اگر کبھی آپ ان کے طبقے یعنی طالب علموں سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو ان کا دل ٹوٹ سا جاتا ہے، وہ سہم سے جاتے ہیں۔ ان سے ضرور غلطیاں ہوتی ہیں ـــ اور پنڈت جی، ہم بڑوں سے کیا کچھ کم غلطیاں ہوتی ہیں ـــ مگر میں، کہ ۳۵ برس سے انھیں کی خدمت میری زندگی ہے، شہادت دیتا ہوں کہ ہیں ہماری قوم کے نوجوان بڑے اچھے نوجوان ـــ ان کا دل سونے کا دل ہے، نہیں، اس سے بھی زیادہ گراں بہا ہے، اس لیے کہ اپنے وطن کی محبت، اپنی قوم کی سرفرازی کی آرزو اور اس کے مستقبل پر یقین اور نیکی، خوبی اور انصاف کی لگن ان کے ریشے ریشے میں بھری ہوئی ہے ...۱۰"

ذاکر صاحب کا استعفا

۱۶ر جون ۱۹۵۵ء سے لے کر ۲۵ر فروری ۱۹۵۶ء تک بظاہر یونی ورسٹی میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے ذاکر صاحب کی طبیعت مکدر اور منغض ہوتی، بلکہ اس دوران یونی ورسٹی میں مذکورہ معزز مہمانوں کی آمد کے موقع پر انھوں نے جو خیر مقدمی تقریریں کیں اُن میں نئے علی گڑھ کی تمام رعنائیاں اور بلند حوصلگیاں اُنڈیل کر رکھ دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب شعبوں اور کمیٹیوں کی میٹنگوں وغیرہ میں دونوں صف آرا گروہوں کا شدید اختلاف جس کا ذکر ہو چکا ہے، غیر شایستہ طور پر دیکھنے میں آتا اور اس سے ذاکر صاحب کو سخت بے چینی اور تکلیف ہوتی۔ شعبۂ فزکس اور ادارۂ علوم اسلامیہ کے معاملات اختلاف و تنازع کے ایسے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے کہ یونی ورسٹی کی ساری فضا خراب تھی اور اس

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۲

سے نوجوان طلبہ بھی متاثر ہو رہے تھے۔ اساتذہ کے دونوں گروہ جن میں "مذہبی" مسلمانوں کا ساتھ "مذہبی" ہندو بھی دے رہے تھے، ایک دوسرے کو یونی ورسٹی کی فضا خراب کرنے کا ذمے دار قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ رہے تو یونی ورسٹی برباد ہو جائے گی۔[1] اُدھر ملک میں فرقہ پرست عناصر اور اخبارات پوری یونی ورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگا رہے تھے۔

ذاکر صاحب پروفیسر گنگ کو یونی ورسٹی میں بڑے ارمانوں سے لائے تھے[2]، اس لیے جا و بے جا ان کی ناز برداری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ ذاکر صاحب ڈاکٹر عبدالعلیم کو بھی لائے تھے۔ وہ ان کے جامعہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ذاکر صاحب ان کا بھی

۱۔ مشہور ہے کہ ایک بار دونوں گروہوں نے الگ الگ ذاکر صاحب کے پاس خفیہ فہرستیں بھیجیں۔ ایک میں فرقہ پرست اسٹاف کے نام تھے اور دوسری طرف کمیونسٹ اسٹاف کے۔ دونوں میں یہ اصرار کیا گیا تھا کہ ان کو یونی ورسٹی سے نکال دیا جائے۔ ذاکر صاحب نے انھیں دیکھا اور کہا کہ اگر ان دونوں فہرستوں کے مطابق عمل کیا جائے تو ایک آدمی بھی یونی ورسٹی اسٹاف میں نہ رہ جائے گا۔

۲۔ اس سلسلے میں پروفیسر گنگ کا مضمون رادھے موہن کی مرتب کردہ کتاب (Dr. Zakir Hussain As I saw him) انڈین پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۷۰، ۱۹ء، صفحات ۹۵-۹۱) لائق مطالعہ ہے۔ اس مضمون سے پروفیسر گنگ کی شریف طبیعت، اچھے لوگوں سے اثر لینے کی فطری صلاحیت اور گہرے جذبۂ احسان مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون میں گنگ ریسرچ آبزرویٹری کے قیام کے منصوبے سے متعلق حکومت ہند کی گرانٹ کے لیے ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ بھٹناگر کے نام ذاکر صاحب کے ایک خط کے اقتباس بھی ہیں جو صداقت اور حق گوئی کے مظہر ہیں اور دفتری لوگوں کے طرز فکر اور طریقۂ کار پر سخت تنقید بھی۔ مذکورہ گنگ آبزرویٹری کی اسکیم پروفیسر گنگ ہی کی مرتب کی ہوئی تھی اور ان کی قابلیت، بین الاقوامی شہرت، اور ان کی رہنمائی میں اُن کے ساتھیوں کی ان تھک محنت نے اسے ایک خاص شکل دی تھی اور کام بھی خاصا چل نکلا تھا۔ (دیکھیے مسلم یونی ورسٹی گزٹ، ۸ر ۲۴ر جولائی ۱۹۵۱ء، صفحات ۱۱-۱۰) گنگ صاحب کے اس مضمون سے ذاکر صاحب سے ان کی عقیدت کا بھی پتا چلتا ہے۔ ذاکر صاحب کے صدر جمہوریہ ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد جب آپ سے پروفیسر گنگ نے چنڈی گڑھ کی ٹیکنولوجیکل لیبوریٹری کے افتتاح کے لیے درخواست کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ انھوں نے مشہور مصور مسٹر سانیال سے سی ایس آئی آر کے لیے ذاکر صاحب کی ایک تصویر بنوائی جو لیبوریٹری کی عمارت کے انٹرنس ہال کی زینت بنی اور عمارت کا نام "ذاکر ٹیکنولوجیکل لیبوریٹری" رکھا گیا۔ ذاکر صاحب نے اس لیبوریٹری کا افتتاح ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو کیا تھا۔

بہت خیال رکھتے تھے۔ پروفیسر گِل "مذہبی" گروپ میں تھے اور ڈاکٹر عبدالعلیم "اشتراکی" گروپ میں ــ اور ذاکر صاحب دونوں کے خیر خواہ، نتیجہ یہ ہوا، جیساکہ اکثر ایسی صورتوں میں ہوتا ہے، کہ دونوں گروپ اُن سے ناراض و ناخوش:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مُسلمان ہوں میں

ــ اور مارچ ۱۹۵۶ء میں ذاکر صاحب کے استعفے کی خبر عام ہونے سے پہلے کے دو تین مہینوں میں صورت حال اتنی خراب ہوئی کہ اُن کی مخالفت علانیہ اور تکلیف دہ انداز سے کی جانے لگی، یہاں تک کہ اکیڈمیک کونسل کی ایک "بدمزہ" میٹنگ کے بعد انھوں نے اپنے تلخ تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کیا: "انھیں تو بہرحال کچھ کہنا ہے، اور میرا یہ حال ہے کہ میں مرجاؤں گا۔[۱]"

چند اہم خطوط[۲]

ذاکر صاحب کے کاغذات میں ہمیں ذاکر صاحب، رشید احمد صدیقی، اور پروفیسر گِل کے چند خطوط ملے ہیں جن سے ایک حد تک مُسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری سے ذاکر صاحب کے مستعفی ہوجانے کے فیصلے کے سبب پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ان میں رشید صاحب کا ایک خط جو طویل ہے اور جس میں ذاکر صاحب سے اپنا فیصلہ بدل دینے کی پُرزور اپیل کی گئی ہے، نہایت اہم ہے اور نہ صرف مکتوب نگار کے سچّے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے، بلکہ معاملے کے کئی اہم پہلوؤں کی نشاندہی بھی اس سے ہوتی ہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ء

۱۔ محمد مجیب، "ڈاکٹر ذاکر حسین ــ اے بایوگرافی"، صفحہ ۱۸۰۔ زیدی صاحب نے بتایا کہ اسی زمانے کی ایگزیکیٹو کونسل کی ایک میٹنگ میں جس میں شعبۂ فزکس کے کچھ معاملات تھے ذاکر صاحب نے شرکت نہیں کی تھی اور مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ معاملات ضرور طے ہوجانے چاہییں۔ ۲۔ متعلقہ فائل، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

کو رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو ایک مختصر سا نوٹ بھیجا:

"۱۲ر مارچ ۱۹۵۶ء

ذاکر صاحب — میری عاجزانہ التجا قبول فرمائیے اور اپنے ارادے کو ملتوی فرما دیجیے۔ آپ جانتے ہیں میں نے اس طرح کی التجا آپ سے پہلے کبھی نہیں کی۔ اس وقت اتنا ہی عرض کرنے پر قادر ہوا۔

آپ کا

رشید صدیقی"

۱۷ر مارچ کو رشید صاحب نے درج ذیل طویل خط لکھا:

"علی گڑھ، ۱۷ر مارچ ۵۶ء

"ذاکر صاحب — ممکن ہے میرے اس دن کے خط لکھنے سے آپ منغض ہوئے ہوں یہ بھی خیال ہے کہ تفصیل سے گفتگو کرنے پر میں قادر نہ ہوں گا تو میرا نقطۂ نظر واضح نہ ہو پائے گا۔ اس طور پر کچھ اور غلط فہمی نہ راہ پا جائے اس لیے ان چند سطور کا سہارا پکڑتا ہوں۔ مشکل تو یہ ہے کہ زیادہ دیر تک جذبات کی ترجمانی کا عذر پر بھی نہیں کر پاتا۔ اتنا سا خط کئی نشستوں میں لکھ پاؤں گا۔

"مجھے اتنا تو بہت دنوں سے معلوم تھا کہ آپ یہاں سے بوجوہ بددل اور بیزار ہیں لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ آپ جلد سے جلد علاحدہ ہونے والے ہیں۔ اس بات کا پتا اُس دن چلا جب ایگزیکیٹو کونسل کی میٹنگ کے بعد آپ شام کے وقت زیدی صاحب سے ڈرائنگ روم میں گفتگو فرما رہے تھے اور میں، ڈاکٹر حفیظ، محمود صاحب وغیرہ موجود تھے۔ خیال آیا کہ کاش کوئی موقع ایسا ملتا کہ آپ سے گفتگو کرتا لیکن آپ کی طبیعت اس درجہ بدحظ رہنے لگی تھی کہ اُس طرح کی بات چھیڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ جو بات کرنا چاہتا

تھا آپ کی طبیعت کا انداز دیکھ کر اسے ملتوی کرنا پڑا. پھر آپ دہلی جانے لگے تو خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں کے بعض اکابر سے کچھ اس طرح کی باتیں طے کر آئیں جن پر نظرثانی کا موقع نہ رہ جائے. اس لیے میں نے وہ عریضہ لکھ بھیجا تھا۔

"میں جو کچھ عرض کروں گا وہ میرے اپنے خیالات وجذبات ہیں. میری طبیعت کی افتاد کچھ اس طرح کی ہے کہ میرے خیالات کے محرک بالعموم میرے جذبات ہوتے ہیں، بالخصوص ایسی حالت میں جب کسی بڑے عزیز یا محترم کا پیچ ہو جیسے آپ کا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو بہت زیادہ اہمیت نہ دیں۔ جذبات میرے لیے اہم ہو سکتے ہیں، دوسرے کے لیے نہیں. پھر یہ بھی ہے کہ میں آپ کی سوجھ بوجھ کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں اس لیے کہ آپ مجھ ہی سے نہیں بہت سے اچھے اچھے لوگوں سے بھی صائب رائے قائم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں. قصہ مختصر یہ کہ آپ مجھ سے بدرجہا زیادہ ایمان دار اور عقلمند ہیں اس لیے بالآخر آپ ہی کے فیصلے کو میں صائب سمجھوں گا۔

"بات یہ ہے کہ علی گڑھ ہمیشہ سے اس لیے بدنام ہے کہ یہاں کے بُرے لوگ اچھے لوگوں کو ٹکنے نہیں دیتے. تقسیم ملک سے پہلے اس بات سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا تھا جتنا اب پہنچنے کا اندیشہ ہے. علی گڑھ کے دشمن اب اس بات کو بہت زیادہ موثر طور پر اُچھالیں گے. اس سے علی گڑھ کو ایسا نقصان پہنچے گا جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا. آپ خود بتائیے کہ آپ ایسے آدمی کا علی گڑھ سے بیزار ہو کر علاحدہ ہو جانا علی گڑھ کے دشمنوں کے ہاتھ میں کیسا ہولناک حربہ دینا ہے! آپ کا بیزار ہونا سو فی صدی صحیح لیکن اس کا انجام علی گڑھ کے حق میں کیا ہوگا جس نے اس وقت (میرے نزدیک) ہندستان میں مسلمانوں کا بھرم قائم کر دیا ہے اور وہ عزت وعافیت سے زندگی بسر کرنے لگے ہیں. آپ کو علم ہوگا کہ آپ کے آنے سے پہلے ۴۸-۱۹۴۷ء میں علی گڑھ کے غیر مسلم انفار بھی علی الاعلان بازار میں اور یونیورسٹی کے احاطے میں علی گڑھ اور مسلمانوں کو گالیاں دیتے پھرتے تھے. آپ کے آنے پر صورت حال کس طرح بدلی وہ بھی آپ جانتے ہیں. آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اترپردیش کی حکومت جس میں علی گڑھ واقع ہے، علی گڑھ کو کس نظر سے دیکھتی ہے. ذرا بھی پانسہ پلٹے تو یہ

حکومت علی گڑھ کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ آپ کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی کے بعض بڑے لوگوں نے بُرا سلوک کیا اس پر آپ جس طرح آزردہ ہوں بجا ہے لیکن اس آزردگی کو ان حدود سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جن حدود سے شریف اولوالعزم سرداروں نے بڑھنے نہیں دیا ہے۔ اپنی آزردگی کو ہندستان کے مسلمانوں اور اس ادارے کی بے عزتی اور کس مپرسی کا سبب نہ بنائیے۔ آپ سر راس مسعود یا سر سلیمان کو نہ دیکھیے، سر سید کو دیکھیے۔ آپ کی حیثیت اس ادارے کے چلانے والے کی نہیں ہے۔ اس ادارے کو بچانے اور سرفراز کرنے والے کی ہے۔ آپ کہیں گے آپ اسے نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ ماننا نہ ماننا ساری قوم اور ساری قوم بھی نہیں بلکہ قوم کے سمجھ دار اور دردمند لوگوں کا اہم ہے۔ آپ یہاں اس ادارے کو سدھارنے اور اونچا درجہ دلانے کے لیے آئے ہیں۔ یہاں سے بیزار ہوکر بھاگنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ بھاگتے، بگڑی سنبھالتے یا روزی بچاتے ہیں ہم جیسے چھوٹی بساط والے۔ آپ جیسے لوگ تو بھاگنے والوں یا ناکاروں کو بہادر اور باکار بناتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ اس بات کو نہیں مانتے۔ میں پھر کہوں گا کہ آپ کے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں آتا۔

یہاں ایک بات اور عرض کروں گا اور یہ بھی حسب معمول جذباتی ہے، یعنی آپ کو سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ آپ مسلمانوں کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ ملک کی خدمت، علم کی خدمت، خلق اللہ کی خدمت سب بجا، لیکن مسلمانوں کی خدمت سب پر فوق ہے، اس لیے کہ دوسروں کی خدمت کرنے والے اور بہت سے لوگ ہیں، مسلمانوں کو سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ مسلمانوں کی خدمت کے وسیلے سے آپ سب کی خدمت کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے معنی مسلم لیگ کے پیروؤں کے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے معنی وہ مسلمان ہیں جن کو آپ اور میں دونوں جانتے پہچانتے ہیں۔ میں ہرگز ہرگز یہ نہیں کہتا کہ آپ کسی اور کی خدمت نہ کریں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہندستان کے مسلمان درماندہ اور کس مپرس ہیں۔ پاکستان نے اپنے ہی نہیں یہاں کے مسلمانوں کو بھی کچھ قابل فخر پوزیشن میں نہیں رکھا ہے۔ آپ سے توقع تھی اور آپ نے اس توقع کو پورا کر دکھایا کہ آپ مسلمانوں کو سہارا دیں گے۔

آپ ان کو منجدھار میں کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں وہ منجدھار میں نہیں ہیں؟ یا یوں کہہ لیجیے کہ ساحلِ مراد سے قریب لاکر آپ انھیں بھرے راہ اور بے مددگار چھوڑ رہے ہیں۔ تین چار مفسدوں کی وجہ سے تین چار کروڑ مسلمانوں کی صلاح و فلاح کو نظرانداز نہ فرمایئے۔

"قصہ مختصر یہ کہ اپنا ٹرم پورا کرلیجیے، پھر چھوڑ دیجیے۔ ایسا کیجیے گا، فتنہ دب جائے گا اور آپ کا کچھ نہ بگڑے گا۔ آپ بھی سب کی آنکھوں کا تارا بنے رہیں گے، اور یہ یونی ورسٹی اور یہاں کے مسلمان ہمیشہ آپ کے شکرگزار رہیں گے۔ ڈیڑھ دو سال کی کیا بات ہے۔ انتہائی ناگواری کے ساتھ بھی اتنی مختصر مدت کاٹ دی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف اس سے ہم سب تباہی سے بچ جائیں گے۔

"آپ اس عریضے کو پڑھ کر پھاڑ ڈالیے گا، فی الفور۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ گڑگڑ کر اپنے خیالات و جذبات آپ تک کسی نہ کسی طرح پہنچا دیے۔ آپ کی خوشی ہر حال میں میری خوشی رہے گی۔

آپ کا

رشید صدیقی"

پروفیسر نوراللہ، پرو وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، کو ذاکر صاحب نے ایک خط انگریزی میں لکھا۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے، لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ اپریل ۱۹۵۶ء کے پہلے ہفتے میں لکھا گیا ہوگا۔ اس میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر نوراللہ، اس خط کو دیکھ کر آپ کو سخت تعجب ہوگا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو اپنا یہ فیصلہ ضرور بتاؤں جسے میں نے ایک عرصے کے تکلیف دہ اور استخارے کی دعاؤں کے ساتھ غور و فکر کے بعد کیا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یونی ورسٹی سے اپنا تعلق ختم کردوں اور وائس چانسلر

کے عہدے سے استعفا دے دوں۔ اس فیصلے کی خاص وجہ میری صحت کی موجودہ حالت ہے' اور دوسرے تقریباً سبھی ملحوظات' اسی خرابیٔ صحت کا نتیجہ ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب یونی ورسٹی کی پالیسی کے رُخ کا تعین میرے ہاتھ میں نہیں رہا' اور مجھ میں اب توانائی و طاقت نہیں کہ اس صورت حال کو بدل دوں۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا کہ میں کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کر دوں جو اس عہدے کی ذمّے داریوں کو زیادہ موثر اور مناسب طور پر پورا کر سکے۔ میں نہیں چاہتا کہ اچانک اپنے اس فیصلے کا اعلان کر کے یونی ورسٹی کے لیے غیر ضروری اُلجھن پیدا کر دوں۔ میری خواہش ہے کہ شاہ سعود سے جتنی بھی امداد یونی ورسٹی کو مل سکتی ہو حاصل کر لوں۔ معمولاً تو یونی ورسٹی کا کوئی بھی نمایندہ اس کام کو کر سکتا ہے' لیکن چونکہ میں نے یونی ورسٹی کے چند ترقیاتی منصوبوں سے متعلق اُن سے تبادلۂ خیال کیا تھا اور شاہ نے مجھ سے بھی طور پر ریاض آنے کے لیے فرمایا تھا' مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں خود ریاض نہ گیا تو یہ بڑے بھدّے اخلاق کی بات ہوگی' اور ممکن ہے کہ یونی ورسٹی کے حق میں بھی کسی قدر یہ مفید نہ ہو۔ عرب جانے سے پہلے میں وزیر تعلیم اور وزیر اعظم کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دوں گا' اور ضابطے کی اطلاع اس وقت دوں گا جب میں اس سفر سے واپس آجاؤں۔ اس طرح آپ کو یہ طے کرنے کا وقت مل جائے گا کہ آپ دوسرے وائس چانسلر کے تقرر کے سلسلے میں ایگزیکٹو کونسل کی رہنمائی کس طرح کریں اور وزیر اعظم کو بھی پہلے سے اطلاع ہو جائے گی۔۔۔

مجھے یہ سوچ کر بڑا اطمینان ہے کہ آپ یونی ورسٹی کا کام دیکھنے کے لیے موجود ہیں' اور میں چاہتا ہوں کہ آیندہ آپ کام کریں یہ سمجھ کر کہ میں نہیں ہوں' اگرچہ رسمی طور پر ابھی کچھ دن اور میں اس عہدے پر رہوں گا۔ براہ کرم میرے اس فیصلے پر بہت زیادہ افسوس نہ کیجیے گا۔ آپ اور میں دونوں بخوبی جانتے ہیں کہ کسی ایک شخص کی موجودگی کہیں بھی

ناگزیر نہیں ہوتی' اور مہربانی کر کے مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کے لیے نہ کہیے
کیونکہ میں اس کے لیے تیار نہ ہوں گا۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا مخلص"

پروفیسر گل کو بھی غالباً انھوں نے اسی دن لکھا۔ غالباً اس لیے کہ اس پر بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ خط مکمل نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ ہے وہ نہایت اہم ہے۔ یہاں بھی شروع کے پیراگراف میں مضمون تقریباً وہی ہے جو پروفیسر نوراللہ کے نام کے خط میں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"(استعفا دینے کے) اس فیصلے کی خاص وجہ میری خرابیٔ صحت اور اس کے نتیجے میں میری اعصابی زود حسی ہے۔ یونیورسٹی کی صلاح و فلاح سے میں کچھ اس قدر جذباتی طور پر وابستہ ہوں کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی مجھے حد سے زیادہ بے چین اور بدحظ کر دیتی ہیں۔ مثلاً آپ کے شعبے کی موجودہ صورت حال اور اس میں ڈاکٹر شفیع کے وظیفے اور رخصت کے سلسلے میں جو صورتیں پیدا ہوئیں' ان کی وجہ سے میری نہ معلوم کتنی راتیں جاگتے گزری ہیں۔۔۔ ایک صحت مند آدمی ان باتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا اور سو جاتا۔ ان حالات میں' میرا احساس یہ ہے کہ میں اپنے عہدے کی ذمّے داریوں کا بار ۔ ۔ ۔ خوش اسلوبی سے نہیں اُٹھا سکتا۔ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے ۔ ۔ ۔

"میں اپنا یہ تاثر آپ سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ آپ نے مجھے اُلجھنوں کے دباؤ سے محفوظ رکھنے میں میری اتنی مدد نہیں کی جتنی آپ کر سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ کی طبیعت اور معاملات کو سمجھنے کا آپ کا انداز ایسا ہے کہ آپ کے لیے یہ آسان نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ چونکہ آپ کو بجا طور پر یہ یقین تھا کہ اپنے ہر موقف میں آپ کو میری تائید حاصل رہے گی' آپ نے ان مسائل کو جو اُٹھتے رہے ہیں' حل کرنے کی تدبیریں تلاش

کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ مجھے اس پر حیرت نہ ہوگی اگر آپ کے رفیقوں کے دل میں یہ حسد پیدا ہوا ہو کہ آپ کو میری تائید حاصل ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ بہرحال، اب جبکہ میں یہاں سے جا رہا ہوں، اپنے ایسے ساتھیوں کے مشورے سے جو آپ کو مجھتے ہوں، آپ خود حالات کو سدھارنے کی تدبیریں ڈھونڈیے، اور ان اختلافات اور جھگڑوں کو ختم کرکے جو بار بار اُٹھتے رہتے ہیں اور جن سے یونی ورسٹی کو کوئی فائدہ پہنچنے کے بجائے بے حساب نقصان پہنچ سکتا ہے، یونی ورسٹی کی مدد کرنے کی فکر کیجیے۔ خلوص کی تمام سچائیوں کے ساتھ میری آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں آپ ہر ممکن کوشش کریں۔ کسی بھی تعمیری کام میں انسانی تعلقات کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اگر ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے شعبے کو اچھا بنائے، اپنی یونی ورسٹی کو اچھا بنائے، غرض کوئی بھی قابل قدر تعمیری کام ہو جو وہ کرنا چاہتا ہے، تو اسے دوسروں کا تعاون اور ہمدردی حاصل کرنے کی نہ صرف کوشش بلکہ اسے حاصل کرنا ہوگا۔ اور یونی ورسٹی کی طرح کے ادارے میں تو یہ صرف صبر کے ساتھ رفتہ رفتہ لوگوں کو اس کے لیے آمادہ کرکے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، اور بنیادی طور پر یہ ضروری ہے ہر اس شخص کے لیے جو تعلیم کا مفید کام کرنا چاہتا ہے۔

"اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ اس وقت بھی جب میں یہاں نہ رہوں گا، مجھے آپ کے کام اور اس کی ترقی سے گہری دلچسپی رہے گی، اور میری دعا ہوگی کہ آپ باہمی تعاون، ہمدردی اور دوستی کے ماحول میں اپنا کام جاری رکھیں۔"

اس خط سے ایک شریف انسان کے دکھ درد کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے جو اُسے اُس کے ساتھیوں سے پہنچا ہے۔ اس سے ایک شریف انسان کے اس اعتماد کا بھی

اندازہ ہوتا ہے جو اُسے دوستی کی اخلاقی قدر پر ہے، اور ہزار گلے اور شکوے کے باوجود اُس شخص سے آخر تک عہدِ وفا نبھانے کی بلند حوصلگی کا بھی جسے اُس نے کیسے شوق سے اپنا ساتھی بنایا تھا۔[1]

۱۷ اپریل ۱۹۵۶ء کو پروفیسر گِل سے ذاکر صاحب کی گفتگو ہوئی اور غالباً مندرجہ بالا خط انھیں اسی دن بعد میں ملا۔ پروفیسر موصوف اپنے خط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۵۶ء میں لکھتے ہیں:

"ڈیر[2] ڈاکٹر ذاکر حسین، آج صبح آپ سے جو گفتگو ہوئی اور پھر اس کے بعد آپ کا جو خط موصول ہوا، اس سے یونی ورسٹی کی موجودہ فضا سے متعلق میں نے فکرمندی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ تو بہت بڑی بات ہوگی اگر میں یہ سمجھوں کہ آپ کی ذہنی پریشانیوں کا بڑی حد تک میں ذمّے دار ہوں۔ اگر مجھے اس صورت حال کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ مجھے امید ہے کہ اگر میرے کسی رویّے سے آپ کو ذہنی تکلیف پہنچی ہے تو آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

"میں شدّت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس مرحلے میں اور موجودہ ایڈمنسٹریشن کے تحت یونی ورسٹی کو چھوڑ کر آپ کے چلے جانے سے اس ادارے

۱۔ ذاکر صاحب کو عابد صاحب نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۵۵ء کو مطلع کیا تھا کہ "اس بار کونسل نے پروفیسر گِل کو سخت تنبیہہ کی۔ انھوں نے ضد اور عدم دل جمعی کر کے زیدی صاحب کو تنگ کر دیا تھا۔ بظاہر تنبیہہ کا اثر ان پر اچھا ہوا۔ دل کا حال خدا جانے۔ زیدی صاحب کو اور مجھے آپ کی ہدایت کا بہت خیال تھا کہ گِل کی دلجوئی کی جائے اور اس کی انتہائی کوشش کی گئی، مگر انھوں نے ایسا مجبور کر دیا کہ کونسل کو اظہارِ ناراضگی کرنا پڑا..." (متعلقہ فائل، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

۲۔ ذاکر صاحب نے اپنے خط میں پروفیسر گِل کو 'مائی ڈیر ڈاکٹر گِل' لکھا تھا۔

کو اعلا پایے کا ذہنی و فکری سرگرمیوں کا مرکز بنا دینے سے متعلق ہمارے سارے منصوبے اور حوصلے خاک میں مل جائیں گے۔ ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں، بیان نہیں کر سکتے کہ موجودہ حالات میں آپ کی قیادت کے بغیر یہ یونی ورسٹی کیا ہوگی!

"ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ میں 'پارٹی پالیٹکس' کا ساتھ نہیں دے سکوں گا، اور نتیجے میں ایڈمنسٹریشن سے ہر مرحلے میں کش مکش رہے گی۔ اس کش مکش سے ایک حد تک مجھے الگ رہنے میں، میری درخواست ہے کہ آپ میری اس طرح مدد کیجیے کہ سید نوراللہ مجھے ڈین کے فرائض سے سبکدوش کر دیں۔ میں ڈین شپ سے اپنا استعفا پرو وائس چانسلر کے پاس بھیج رہا ہوں۔ مجھ سے ہو سکا تو میں پوری کوشش کروں گا کہ شعبے میں اپنا کام کرتا رہوں اور مجھے امید ہے کہ میں یہ کر سکوں گا۔ میں ایک بار پھر آپ سے معافی کا خواستگار ہوں...

آپ کا مخلص

پی۔ ایس۔ بگل"

ذاکر صاحب نے پروفیسر بگل کے اس خط کے جواب میں ۷ را پریل ۱۹۵۶ء کو لکھا:

"مجھے اپنے ساتھیوں سے اس قدر محبت ملی ہے کہ یونی ورسٹی سے اپنا تعلق منقطع کر لینے کا ارادہ کچھ ناشکری سا محسوس ہوتا ہے، لیکن کیا کروں، مجبور ہوں۔ میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں، اب میں وہی نہیں رہ سکتا جو اپنی گذشتہ بیماری سے قبل تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے کام سے دلچسپی نہیں رہی۔ میں اب اس میں اپنا دماغ نہیں کھپا سکتا۔ میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں اب اس بوجھ کو اٹھا سکوں۔ بھاگنا بُرا ہے لیکن اس حالت میں ٹھہرے رہنا اور بھی بُرا ہوگا، اور پھر شاید مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جائے اور یہ صورت میرے اور میرے کام دونوں کے لیے مہلک ہوگی۔ اس لیے آپ سے اور دوسرے دوستوں سے بھی میری گذارش ہے کہ مجھے خاموشی سے یہاں سے چلا جانے دیں۔ مجھے اعتماد ہے

کہ یونی ورسٹی کی اجتماعی دانش مندی کسی صورت حال کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس اجتماعی دانش مندی میں آپ کا حصہ بھی ہوگا۔ ڈین شپ سے استعفا نہ دیجیے۔ صحت آپ کی ایسی نہیں ہے جیسی میری ہے۔ ہمت سے اپنا بوجھ اُٹھائیے، اور مجھ سے معافی مانگ کر مجھے اُلجھن میں نہ ڈالیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ مجھ سے مانگیں۔ ہاں، اپنے اس ساتھی کو ضرور معاف کر دیجیے جو ایسی حالت میں نہیں ہے کہ آگے بڑھ سکے۔ ساتھی تو تھک تھک کر راہ میں رہ جاتے ہیں لیکن قافلہ چلتا رہتا ہے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں ——— آپ کا مخلص"

ذاکر صاحب دیارِ حبیبؐ میں

مئی ۱۹۵۶ء کے شروع میں ذاکر صاحب سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ صورت یہ ہوئی کہ بعض وجوہ سے سعودی عرب جانے کی تاریخ ملتوی ہوتی گئی۔ ذاکر صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ یونی ورسٹی کے وفد[1] کو لے کر پہلے وہ سعودی عرب جائیں گے اور پھر سوئٹزرلینڈ جہاں جنیوا میں انھیں ایک میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ اس کے بعد وہ وہاں یا جرمنی میں اپنے علاج کے لیے کچھ عرصہ قیام کریں گے۔ لیکن اس پروگرام کے مطابق عمل نہ ہو سکا اور ذاکر صاحب کو پہلے جنیوا جانا پڑا اور یہ طے پایا کہ وہ وہیں سے سعودی عرب پہنچیں گے، اس طرح کہ ۲۱ مئی کو دہلی سے وفد کے اراکین روانہ ہوں گے اور جنیوا سے ذاکر صاحب اور سب ظہران میں ساتھ ہو جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۲۳ مئی کی صبح کو پورا وفد ریاض پہنچا اور دوپہر کے کھانے پر شاہ سعود کی خدمت میں اس کی باریابی ہوئی۔ ۲۵ مئی کو ریس کورس میں ایک تقریب تھی، وہیں ذاکر صاحب اور وفد سے شاہ نے فرمایا کہ "میں نے حکم دیا ہے کہ مسلم یونی ورسٹی

۱۔ ذاکر صاحب کے علاوہ اس وفد کے اراکین کے نام: پرو وائس چانسلر نواب احمد سعید خاں چھتاری، کرنل سید بشیر حسین زیدی، پرنس نجم الدین اور ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، (میڈیکل آفیسر یونی ورسٹی)

علی گڑھ کے میڈیکل کالج اور اسپتال کے لیے ایک ملین روپیا دے دیا جائے۔" ذاکر صاحب اور اراکین وفد نے شاہ سعود کا شکریہ ادا کیا۔ بحیثیت وائس چانسلر کے یہ یونی ورسٹی کی آخری خدمت تھی جو ذاکر صاحب نے انجام دی۔

ریاض سے یہ قافلہ جدہ ہوتا ہوا ۱۹ر مئی کی شب میں مکہ معظمہ میں اترا اور سب سے پہلے حرم شریف میں حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا۔ حرم شریف میں ذاکر صاحب کی یہ پہلی حاضری تھی۔ یہاں مولانا کرم علی ملیح آبادی جو اراکین وفد کو خانۂ کعبہ کے مختلف مقامات کی زیارت کرا رہے تھے، عربی میں دعائیں پڑھتے تھے اور پڑھاتے جاتے تھے۔ بالآخر ایک موقع پر ذاکر صاحب نے فرمایا: "مولانا! عربی میں تو بہت سی دعائیں مانگ لیں، اب مجھے کچھ اُردو میں مانگ لینے دیجیے۔" اس پر خود مولانا بھی ہنس پڑے۔ ۲۰ر مئی کو سہ پہر میں انھیں مولانا کرم علی اور دوسرے ہندستانی احباب کی جانب سے فندق مصری میں جہاں اراکین وفد کا قیام تھا، انھیں استقبالیہ دیا گیا اور ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا جس میں ارض مقدس میں مسلم یونی ورسٹی کی آمد پر اظہار تہنیت کے ساتھ ان امیدوں کا اظہار بھی تھا جو سعودی عرب میں رہنے والے ہندستانیوں نے مسلم یونی ورسٹی سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

ذاکر صاحب نے اس سپاس نامے کے جواب میں جو تقریر کی وہ مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ایک اشاعت خاص (۸ر اکتوبر ۱۹۵۶ء، صفحات ۲۰-۱۸) میں چھپ چکی ہے۔ اس تقریر کے کئی اجزا ایسے ہیں جن میں، ایک لحاظ سے، ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک پیام ہے، پیام ایک ایسے صاحب بصیرت اور درد مند انسان کی طرف سے ہے جو ملک و ملت دونوں کا خیر خواہ تھا۔ اس میں وہ ایک حقیقت ہے جو اس ملک میں ہمیشہ ہندستانی مسلمانوں کا وظیفہ بنیادی ہونا چاہیے، اگر وہ اسلام کے عالمگیر مشن کی سچائیوں کے واقعی قائل اور حامل ہیں، مکۂ معظمہ میں، حرم کعبہ کے سایے میں، ذاکر صاحب نے کہا تھا:

"حضرات، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں، کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی

کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیرِ اقتدار آزادی سے محروم، مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیرِ اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے، وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تہذیبی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندستانی زندگی میں ہے، جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے، اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیاتِ طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہم وطنوں کے دل میں ان کے دین کے لیے جگہ پیدا ہو۔ زندگی کی وہ اعلا قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور یہ کہ رحمت اللعالمینؐ کے نام لیوا ہیں اپنے وطن اور اہلِ وطن کے لیے مثال اور رحمت کا کام دیں...

"یہ ایک بڑا فریضہ ہے اور ایک عظیم الشان مشن، اور میں اس کا حق ادا کرنے کی دشواریوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ یہ ہے 'مقصدے از آسماں بالاترے'، لیکن آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر ہی سمندر کی تاریکیوں میں حوصلہ مند ملّاحوں کے بیڑے پار لگتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کا شرف یہ ہے کہ ان کے افکار سے ہندی زندگی بہرہ یاب ہو، ان کی انفرادی اور جماعتی زندگی کے معیاروں کو ہندی نظامِ اقدار میں جگہ ملے اور ہندی زندگی ان کے برکات سے مالامال ہو۔ اسلام کی حیات بخش اور روح پرور تعلیم کسی گروہ کا اجارۂ تجارتی نہ رہے بلکہ ساری ہندی قوم اس چشمۂ فیض سے اپنی تشنہ کامی دور کر سکے۔ یہ دیانت، خلوص، مروّت، خدمت و ایثار کی ایسی مثالیں قومی زندگی کو بخشیں کہ قوم احسان مندی سے انھیں اپنی سربلندی کا سرمایہ جانے اور ان کی یاد سے قوم کا سینہ مہر و وفا کا ایک گلزار بن جائے۔ ہے تو یہ بہت مشکل کام، مگر سچے مسلمان کا حوصلہ اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا..."

۳۰ مئی ہی کو رات میں ذاکر صاحب وغیرہ جدہ پہنچے، ۳۱ مئی کا دن وہاں ملاقاتوں میں گزرا، رات میں مدینہ طیبہ کے لیے روانگی ہوئی اور یکم جون کو فجر کی نماز بدر میں ادا کرکے اور پھر شہدائے بدر کے مزاروں پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھے، اور پھر آنکھوں میں آنسو اور لب پر درود و سلام لیے ہوئے مدینے کی گلیوں میں حاضر ہوئے۔ دو دن جو وہاں گزرے ہر وقت کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی گئی۔ ۳ جون کو صبح صبح ذاکر صاحب اور اراکین وفد ہوائی اڈے پہنچے تو معلوم ہوا کہ باوجود سارے انتظامات کے یہ لوگ تاخیر سے پہنچے تھے اور چند منٹ پہلے جہاز پرواز کر چکا تھا۔ نواب چھتاری صاحب کے علاوہ ذاکر صاحب اور دوسرے ساتھیوں کو بیروت جانا تھا جہاں سے ذاکر صاحب کا پروگرام سوئٹزرلینڈ جانے کا تھا۔ ۳ جون کو مدینہ طیبہ کے ہوائی اڈے پر جو صورت پیش آئی، اس سے میزبان تو بہت پشیمان تھے لیکن ذاکر صاحب بہت خوش تھے۔ "وہ معذرت کرتے تھے، یہ یقین دلاتے تھے کہ میری دعا قبول ہوئی۔ ایک دن تو اور یہاں زندگی کا مل جائے گا۔ جب مہتمم (میزبان) کو یقین آگیا کہ واقعی ذاکر صاحب خوش ہیں تو بولے آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ میرے اہتمام کے باوجود جہاز کا نکل جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ واقعی آپ کی دعا قبول ہوئی ہے..."[1]

جرمنی میں

۴ جون کو ذاکر صاحب وغیرہ بیروت پہنچے اور ۵ جون کی صبح کو ذاکر صاحب سوئٹزرلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے وہ جرمنی گئے، اور پھر چند روز بعد انھوں نے باڈناؤہائیم سے بیگم قدسیہ زیدی[2] کو ایک نہایت دلچسپ خط لکھا جو درج ذیل ہے:

۱۔ مسلم یونی ورسٹی گزٹ (اشاعت خاص) ۸ اکتوبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۱

۲۔ کرنل سید بشیر حسین زیدی کی اہلیہ محترمہ (م ۱۹۶۰ء) بڑی ذہین، خوش سلیقہ اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے ذاکر صاحب اور اہل جامعہ کا بہت ہاتھ بٹایا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ذاکر صاحب پر جب قلب کا پہلا دورہ پڑا تھا تو آرام کے لیے رام پور تشریف لے گئے تھے جہاں زیدی صاحب چیف منسٹر تھے۔ وہاں بیگم قدسیہ زیدی نے ذاکر صاحب کی بڑی خدمت کی، اور مہمان نوازی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

"بھابھی کی خدمت میں آداب . . . بیروت میں زیدی صاحب کو چھوڑ کر میں زیورش پہنچا ... وہاں سے جنیوا گیا۔ سامان وہاں چھوڑ گیا تھا، وہ لے کر فرانکفرٹ آیا۔ پروفیسر مایر[1] نے جن صاحب کو میرے متعلق لکھا تھا، ان سے ملا۔ نہایت ہی حسین اور خلیق بزرگ ہیں، مگر تحقیقات کا شوق ماشاءاللہ بہت ہے۔ چھ دن تک میرے متعلق تحقیقات کرتے رہے۔ ہم تو اپنے دل کا دُکھڑا لے کر آئے تھے، انھوں نے معدہ، جگر، گردے، آنتیں، آنکھ، ناک، کان، سب ہی ساتھ لپیٹ لیے اور وہ وہ کرم کیے کہ کیا بتاؤں۔ ایک تو یہ دُرگت بن رہی تھی اس کا غم، ایک یہ خیال کہ نہ جانے اس تحقیقات کی قیمت کہاں تک پہنچے، اس کا غم۔ بہرحال یہ چھ دن جیسے تیسے کٹے۔ ان کے حسین چہرے کو دیکھ کر کچھ تسکین سی ہو جاتی تھی اس لیے اور بھی کہ آس پاس، اگرچہ اسٹاف میں کوئی سات 'خواتین و حضرات' تھے لیکن ایک کی شکل بھی اچھی نہیں تھی۔ چلتے وقت جب ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا کہ کیا پیش کروں تو بولے 'کچھ نہیں۔ آپ تو ہماری علمی برادری کے آدمی ہیں، آپ کی خدمت تو میرا فرض ہے، اس کا معاوضہ کیسا'۔ بہت کہا لیکن وہ مسکراتے رہے اور انکار کرتے رہے اور آخر میں کچھ ایسے مسکرائے کہ میں چُپ ہو گیا۔ سفر ہے شرط مُسافر نواز بہتیرے!

"اب مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ایک اچھے ڈاکٹر کو ٹیلی فون سے سب بتا دیا ہے اور مفصل رپورٹ بھی بھیج دی ہے۔ اب یہاں ان کی نگرانی میں علاج ہوگا۔ تحقیقات کا خلاصہ میری سمجھ میں یہ ہے کہ جسم کا کچھ حصہ خراب ہے، کچھ ابھی ٹھیک ہے۔ جو خراب ہو چکا اسے کون دُرست کر سکتا ہے، جو اچھا ہے اُسے انشاءاللہ یہ خاکسار رفتہ رفتہ خراب کر ڈالے گا اور وہ ہوگا جو ہوتا

۱۔ ڈاکٹر ڈاے، ڈبلو، مایر جو اُس وقت ہندستان میں مغربی جرمنی کے سفیر تھے۔

ہی ہے، مگر ایسی بدیہی بات کے لیے نہ جانے یہ اہل علم اتنی تحقیقات کیوں کرتے ہیں۔

"زیدی صاحب پہنچ گئے ہوں گے۔ عرب کے سفر کی تفصیل ان سے معلوم ہو چکی ہوگی۔ اچھا رہا یہ سفر۔ غرض تو کچھ بہت اچھی نہ تھی سفر کی، مگر قسمت اچھی ہے۔ عمرہ بھی ہو گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ مدینہ میں حاضری کا شرف حاصل ہو گیا۔ بڑی ہی دلکشی ہے بھائی، اس اُجڑی ہوئی بستی میں، کاش پھر جانے کا موقع مل جاتا... بس، خدا حافظ،

ذاکر[1]

ذاکر صاحب جب جرمنی سے علی گڑھ واپس آئے تو لوگوں نے جن میں طلبہ بھی تھے اس بات کی کوشش کی کہ وہ اپنا استعفا واپس لے لیں۔ ۱۱ر اگست ۱۹۵۶ء کو یونین میں اس سلسلے میں جلسہ بھی ہوا، سینیر طلبہ کی ایک میٹنگ میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ذاکر صاحب کی کوٹھی پر بھوک ہڑتال کرکے انھیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ لیکن وہاں ایک صاحب نے بتایا کہ ذاکر صاحب کہتے ہیں کہ اگر لوگوں نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں ان پر پتھر پھینکوں گا تاکہ وہ مجھے پاگل سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں۔"[2]

اسی زمانے میں ملک کے بعض دوسرے مقامات کی طرح علی گڑھ میں بھی ودیا بھون بمبئی، کی چھاپی ہوئی کتاب ریلیجس لیڈرز کے خلاف سخت ہنگامہ ہوا۔ یونی ورسٹی کے شرپسند عناصر نے اسکول کے بچوں سے یہ ہنگامہ شروع کرایا اور پھر تو ساری یونی ورسٹی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ ۱۳ر اگست ۱۹۵۶ء کو طلبہ کے احتجاج نے غیر شریفانہ انداز اختیار کیا اور اس سے ذاکر صاحب کو سخت تکلیف ہوئی، اُدھر شہر میں فرقہ پرستوں اور سماج دشمن

۱۔ خط میں تاریخ درج نہیں ہے۔ اس خط کے لیے میں زیدی صاحب کا شکر گزار ہوں۔

۲۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، حوالۂ سابق، صفحات ۲۲۴ - ۲۲۳ (بحوالۂ علیگ، ۱۰ر فروری ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۱)

عناصر نے فساد کی صورت پیدا کر دی۔ اب ایک بار پھر اخبارات کو علی گڑھ کے خلاف غلط فہمی پھیلانے کا موقع ہاتھ آگیا' ان تمام باتوں سے ذاکر صاحب کا ٹوٹا ہوا دل اور ٹوٹ گیا۔

یونین ہال میں الوداعی تقریر

ستمبر کے پہلے ہفتے میں ذاکر صاحب کا استعفا منظور ہو گیا' اور پھر اس کے بعد یونین ہال میں طلبہ کی طرف سے انھیں الوداع کہنے کے لیے جلسہ ہوا جس میں ذاکر صاحب کی تقریر ہوئی۔ اپنی تقریر میں ذاکر صاحب نے طلبہ کے رویّے سے متعلق اپنے رنج و مایوسی کا اظہار کیا اور اُن سے کہا کہ آپ میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے اور کوئی بھی شخص آپ کو بہکا سکتا ہے' اور جوش دلا کر ذرا سی دیر میں جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ "آپ نے جو کچھ کیا' اس کے لیے یقیناً آپ کو افسوس ہوگا... میں یہ نہیں کہتا کہ سب کچھ آپ نے کیا۔ آپ نے بغلیں بجائیں' دوسرے ننگے ہو کر ناچے۔ آپ نے جنازہ نکالا' دوسروں نے قتل کر ڈالے، گویا ... کوئی بھی آپ کی سمجھ کو خرید سکتا ہے' آپ کے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ آپ جلوس نکالیں' جلوسوں میں گالیاں دیں' نعرے لگائیں۔ یہ سب آخر کیا ہے؟... آپ نے مسٹر منشی کا جنازہ نکالا۔ بعد میں آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آپ کے صدر بڑے احترام سے انھیں یہاں لائے تھے۔ انھیں یونین کا لائف ممبر بنایا تھا۔ اور آج جتنی تعریف میری کی ہے اس سے زیادہ ان کی تعریف کی تھی۔ میں آپ کی تعریف پر کیسے اعتبار کر لوں؟ — کون کہہ سکتا ہے کہ کل آپ میرا جنازہ نہ نکالیں گے! آپ کی بات میں وقار ہونا چاہیے..."

ریلیجس لیڈرز میں ایک مضمون تھا جس میں رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی کو ہرزہ سرائی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یقیناً یہ ایک نہایت ہی مذموم حرکت تھی۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا کہ "رسول اللہؐ پر کوئی اعتراض کرے تو اُسے مُردہ باد کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا' عقل اور سوجھ بوجھ سے اس کا جواب دینا چاہیے۔" انھوں نے سر ولیم میور کے اعتراضات کے جواب میں سر سید احمد خاں کی مساعی اور خطباتِ احمدیہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح اپنے

گھر کا سارا اثاثہ، یہاں تک کہ برتن بھانڈا بیچ کر اور بڑھاپے میں اِس عاشقِ رسولؐ نے لندن کا دور دراز سفر کر کے جہاں کی زبان سے بھی وہ واقف نہ تھا ایک معیاری کتاب لکھی جو رسول اللہ کے معترضین کے سامنے آج بھی پیش کی جا سکتی ہے۔" اعتراض کا جواب ایسے دیا جاتا ہے۔ اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا، نہ کسی کا جنازہ نکالا، نہ کسی کو مُردہ باد کہا... آپ کا جو طریقہ تھا اس سے رسول اللہؐ کو تکلیف پہنچنی چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ انھیں تکلیف ہوئی ہوگی۔"

ذاکر صاحب نے آخر میں کہا: "اس سلسلے میں پریس میں جو غلط بیانی ہوئی ہے تمھیں اس کا بُرا نہیں ماننا چاہیے۔ اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں۔ اس کا ذمے دار یہاں کا ماضی ہے، گزرے ہوئے زمانے کی کچھ روایات ہیں، ایک پوری تاریخ ہے۔ ان غلط بیانیوں پر مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمھیں صبر کرنا چاہیے۔ تم صبر کے لیے مجبور بھی ہو اور یہ تمھارا فخر بھی ہے... اب جو کچھ ہو چکا ہو چکا۔ آپ کو اس کا افسوس ہوگا، مجھے بھی ہے۔ میں بہرحال آپ کے ساتھ ہوں اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے... یہ آٹھ سال میں نے جس ولولے اور خوشگوار انداز سے گزارے ہیں اس میں آپ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن آخر میں آپ نے مجھے دودھ دیتے دیتے اس میں مکھی بھی ڈال دی۔ ... میری آرزو ہے کہ آپ ہندستان کے اچھے شہری بنیں... آپ کا عزم یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنی یونی ورسٹی کو ہندستان کی سب سے اچھی یونی ورسٹی بنانے سے پہلے چین نہ لیں گے۔ خدا حافظ۔"[1]

ذاکر صاحب کی اِس تقریر کو لے کر اخباروں نے علی گڑھ کے خلاف لکھنا شروع کیا اور ایسی ایسی باتیں لکھیں کہ انھیں ۲۲ ستمبر کو ایک وضاحتی بیان دینا پڑا۔ اپنے اس بیان

۱۔ خورشید مصطفیٰ رضوی (حوالہ سابق، صفحات ۲۲۰-۲۲۴) نے اپنی کتاب میں علیگ (۵ ستمبر ۱۹۵۷ء) سے لے کر یہ تقریر شامل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تقریر لفظاً بہ لفظاً نہیں ہے۔ رپورٹر نے تقریر کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، لیکن کہیں کہیں ذاکر صاحب کے فقرے اور جملے بھی ہو بہو موجود ہیں۔

میں انھوں نے کہا:

"میں نے یونی ورسٹی کے طلبہ کو جو ایڈریس کیا تھا اس کے اقتباسات کی خوب اشاعت ہوئی ... اخباروں نے میرے حوالے سے جو تبصرے ان پر شائع کیے ان میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو ملک دشمن اور غیر سماجی عناصر کا اڈا قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات دُرست ہے کہ چند طلبہ نے حال ہی میں جو مظاہرہ کیا تھا وہ تہذیب کے خلاف تھا۔ ان سے مجھے جس قسم کے اخلاق کی امید تھی اس میں مجھے ضرور مایوسی ہوئی اور اس کو میں اپنا فرض تصور کرتا تھا کہ ان کے اس رویّے پر مایوسی اور ناپسندیدگی کا اظہار کروں۔ اسی کے ساتھ میں اپنی ذاتی معلومات اور پوری ذمّے داری کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اس ہنگامہ آرائی میں حصّہ لینے والے چند طلبہ کے علاوہ عام طور پر طلبہ اخلاق و اطوار کے اچھے ہیں... علی گڑھ کے طلبہ ہندستان کے بہترین طلبہ میں سے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں ہندو مسلم سکھ طلبہ آپس میں بڑے میل جول اور اتحاد سے رہتے ہیں اور اس کتاب پر حالیہ مظاہرے میں وہ مسلمان طلبہ کے ساتھ تھے۔"[۱]

۱۔ خورشید مصطفےٰ رضوی، حوالۂ سابق، صفحات ۲۳۳-۲۳۲ (بحوالۂ الجمعیۃ، ۳۰ر ستمبر ۱۹۵۶ء)

گیارہواں باب

علی گڑھ کے بعد۔ پٹنہ سے پہلے

علی گڑھ کو 'خدا حافظ' کہہ کر ذاکر صاحب جامعہ آ گئے۔ ان کی دلی خواہش تو یہی تھی کہ اب وہ سکون سے لکھنے پڑھنے کا کام کریں گے اور اپنی پسند کی آزاد زندگی گزاریں گے۔ لیکن امتیاز و افتخار کی جس منزل پر اب وہ پہنچ گئے تھے، وہاں ان کا یہ ارمان پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انھوں نے انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسے میں جو تقریر کی تھی[1] اس کے بعد، ہمارا خیال ہے کہ، وہ آٹھ سال بعد پھر جامعہ کے شیخ الجامعہ بننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ غالباً یہی زمانہ ہے (یعنی علی گڑھ سے مستعفی ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد) جب انھوں نے دو اہم تقریریں کیں، ایک راجیہ سبھا میں اور دوسری حکومت ہند کے نمایندے کی حیثیت سے یونسکو کے اجلاس میں جو نومبر ۱۹۵۶ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔

راجیہ سبھا میں تقریر

ذاکر صاحب کے بڑے داماد خورشید عالم خاں صاحب اور ہمارے موجودہ امیر جامعہ

۱۔ اس تقریر کے چند اقتباسات کتاب کے نویں باب کے آخری صفحات میں دیے گئے ہیں۔

انھیں سے روایت کرتے ہیں کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے پر راجیہ سبھا والی تقریر سے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے ذاکر صاحب سے پوچھا تھا کہ آخر وہ راجیہ سبھا میں کچھ بولتے کیوں نہیں، یہ مسلسل خاموشی کیوں؟ ذاکر صاحب نے جواب میں کہا تھا کہ "میں کس موضوع پر بولوں؟ میں یا تو تعریف کر سکتا ہوں یا تنقید۔ تعریف کرنے والے آپ کی پارٹی میں بہت ہیں۔ اگر میں تنقید کروں تو ممکن ہے کہ اس سے ناگواری ہو"۔ لیکن پنڈت جی کے نزدیک پارلیمانی مباحثوں میں حصہ نہ لینے کی یہ کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے تقریر کی جس میں دوسرے پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں ایسے بنیادی سوال اٹھائے کہ اخباروں میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ خطوط چھپے کہ آخر کیوں حکومت کی طرف سے منصوبے سے متعلق ذاکر صاحب کے سوالوں کا جواب نہیں دیا گیا، اخباروں نے تبصرہ کیا کہ افسوس ہے کہ حکومت نے ذاکر صاحب کی تنقید کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ذاکر صاحب نے خاموشی کا رویہ نہ اختیار کیا ہوتا تو ان کی ذہانت، قابلیت، خطابت اور نکتہ رسی سے پارلیمانی مباحثوں میں اُن کا حصہ کتنا قابل قدر اور نتیجہ خیز ہوتا!

ذاکر صاحب کی یہ تقریر پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کیسی ناقص منصوبہ بندی کرتے آئے ہیں، ہمارے پاس اعداد و شمار صحیح نہیں ہوتے۔ ہم صحیح جانچ پڑتال نہیں کرتے، اکثر معاملات میں معلومات قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ ترجیحات کا سائنٹفک تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں بھی، یہ سب کوتاہیاں تھیں، دوسرے میں بھی اور یقین ہے کہ آخیر میں بھی ہوں گی۔ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں ان تمام کوتاہیوں کی نشاندہی کی تھی اور ان خطرات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جن سے منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔ آخر میں تعلیم سے متعلق بولتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ منصوبہ بندی ایک ذریعہ ہوتی ہے قومی مقاصد کے حصول کا، اور قومی مقاصد و مفاد کی جیسی واضح آئینہ داری ان بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے منصوبے میں ہوتی ہے جن کی عمریں ۶ سال سے ۱۴ سال تک ہوں، اور کہیں نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ ہم نے اس اہم معاملے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، حالانکہ دستور میں مذکورہ عمر کے بچوں اور بچیوں کی مفت اور لازمی تعلیم کے لیے کچھ صاف

ہدایات موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم تعلیم کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کر رہے ہیں[۱]۔

یونسکو کا اجلاس، دہلی

۱۹۵۶ء کے اواخر میں یونسکو کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں ہندستانی وفد کی رکنیت کی دعوت دی اور ذاکر صاحب نے اس کو قبول کر لیا[۲]۔ مولانا آزاد وفد کے سربراہ تھے، لیکن غالباً وہ پہلے ہی سشن میں شریک ہوسکے۔ اس کے بعد وفد کی قیادت کی ذمّے داری کا سارا بوجھ ذاکر صاحب ہی کے کاندھوں نے اُٹھایا۔ دوسرے ملکوں کے مندوبین ان سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں یونسکو کے ایگزیکٹیو بورڈ کا ممبر منتخب کیا گیا۔ یونسکو کے اس اجلاس میں ذاکر صاحب کی تقریر کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ انھوں نے کہا تھا:

"ہندستانی وفد چاہتا ہے کہ آیندہ دو سال کے لیے جو تین بڑے منصوبے تجویز کیے گئے ہیں، ان سے متعلق اپنی تائید کا اظہار کرے۔ اُسے یوں تو سبھی منصوبوں سے دلچسپی ہے، لیکن خاص طور پر وہ منصوبہ اس کے جی کو لگتا ہے جو مشرق و مغرب کی تہذیبی قدروں کے باہمی افہام و تفہیم سے متعلق ہے۔ اب تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ مشرق اور مغرب کوئی جغرافیائی اکائیاں نہیں ہیں... لیکن یہاں جغرافیائی حد بندیاں زیرِ بحث نہیں ہیں، بلکہ یہ خیال کہ دونوں کے کلچر اور کیرکٹر، سیاسی اور سماجی حالات، فرد اور سماج کے تصور اور ایک متمدن زندگی کے قیام کے طریقۂ کار کی نوعیت اور انتخاب میں فرق ہے۔ داخلی زندگی پر زور دیا جائے اور اس کے لیے

۱۔ راجیہ سبھا کے پارلیمانی مباحثے، جلد ۱۴ (ستمبر ۱۳-۱، ۱۹۵۶) کالم ۲۲-۳۵۳۲

۲۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس وقت تک دونوں شخصیتوں کے گھروں کے درمیان کا فاصلہ خاصا کم ہو چلا تھا۔

سماجی اخلاقیات کی راہ اختیار کی جائے، اور آگے کا راستہ اختیار کیا جائے اور عقلیت پسندانہ تکنیک عمل میں لائی جائیں۔

"مشرق کی عظمت اس کے نظام اخلاق کی وجہ سے ہے اور مغرب کی اس کی تکنیک کی وجہ سے ۔ یقیناً یہ بات قطعی طور پر صحیح نہیں کہی جا سکتی، اور ہماری دنیا میں جدید زندگی کی جو صورت ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ایسی باتیں کسی قدر صحیح بھی ہوں تو انھیں فوراً ختم کردینی چاہییے۔ جس نئی دنیا کی تشکیل ہو رہی ہے وہ ایک چیلنج ہے، اور ضرورت ہے کہ سادھو اور ہیرو، بدھ اور زیگ فریڈ، عقلیت پسندانہ تکنیک اور اخلاقی تقاضے، ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ انسانیت ایک ایسی زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں اخلاق بھی ہو اور عقلیت بھی۔ اس لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ آج کی جدید زندگی کے ارتقا میں یہ جو دو عناصر کار فرما ہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے سے سیکھیں۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے کہا کہ میں ۱۹۴۵ء میں اس لندن کانفرنس میں جس میں یونسکو کا دستور مرتب کیا گیا تھا، موجود تھا۔ دنیا ابھی ابھی ایک ہولناک تباہی سے گزری تھی۔ اُسے احساس تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت تھی اور تہیّہ کیے ہوئے تھی کہ بس، دوبارہ اب کبھی نہ ہو، اور یونسکو کی تنظیم اسی لیے انسانوں کے ذہنوں میں امن و سلامتی کے حفاظتی مورچوں کی تعمیر کے لیے وجود میں آئی تھی۔ لیکن آج مصر[1] اور ہنگری[2] میں برہنہ جارحیت نے ثابت کر دیا ہے کہ ہماری کوششیں ناکام رہی ہیں۔

"لیکن یونسکو ایک تعلیمی تنظیم ہے، اور دنیا میں دو ہی ہستیاں ایسی ہیں جو کبھی مایوس نہیں ہوتیں، ماں اپنے بچّے سے اور معلم اپنے شاگرد سے۔ ہم

۱۔ مصر میں انگلستان، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۶ء)

۲۔ ہنگری میں سوویٹ یونین کی فوجیں داخل ہوئیں۔ (۳۔۴ نومبر ۱۹۵۶ء)

مایوس نہیں ہوں گے، لیکن خوش فہمی میں بھی مبتلا نہ ہوں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ تنظیم ایک بین الحکومتی تنظیم ہے اور حکومتیں پھر بھی حکومتیں ہیں لیکن ... اپنی اپنی قوم کی طرف سے ہم نے یہ ذمے داری لی ہے کہ ہماری حکومتیں حد سے آگے نہ بڑھیں گی۔ اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ اس آرگنائزیشن میں ہم دنیا کے ضمیر کی نمائندگی کریں، تو ہمیں خود اپنے ضمیر سے وفاداری کا حق ادا کرنا ہوگا . . ."

ایک خیال یہ ہے کہ اگر یونسکو کی قیادت ایک خاص مدت تک مسلسل ذاکر صاحب کے یا ان جیسے کسی اور دردمند دانشور اور صاحب ضمیر عالمی شخصیت کے ہاتھ میں رہتی تو یونسکو اپنے تعلیمی، تہذیبی اور علمی مقاصد میں بہت کامیاب رہتی، اور کیا عجب، دنیا کے انسانوں کی ایک بھاری تعداد کے ذہنوں میں امن عالم کے دفاعی مورچے اتنے مضبوط ہو جاتے کہ ان کی حکومتیں ان کا اثر قبول کرتیں اور آج دنیا مکمل تباہی کے دہانے پر نہ کھڑی ہوتی!

مولانا ابوالکلام آزاد اور ذاکر صاحب

مولانا ابوالکلام آزاد کے نقاد آزادی کے فوراً بعد سے یہ کہنے لگے تھے کہ وہ دہلی میں کسی دوسری مسلم شخصیت کو اپنا ہمسر دیکھنا پسند نہیں کرتے، اور اسی بنا پر انھوں نے ذاکر صاحب کو پلیننگ کمیشن میں نہیں آنے دیا، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیرمین نہیں بنایا، اور ان کا گورنر بننا بھی انھیں پسند نہ تھا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ یہ صریح ناانصافی ہے۔ آخر دہلی میں آصف علی اور رفیع احمد قدوائی بھی تھے اور دونوں حکومت ہند کے ممتاز وزیر تھے۔ پلیننگ کمیشن کے لیے اس وقت شاید ذاکر صاحب خود بھی تیار نہ ہوتے کیونکہ مولانا نے انھیں علی گڑھ کی ذہنی آبادکاری کا اہم کام سونپ رکھا تھا جسے اس وقت کے کٹھن حالات میں وہی انجام دے سکتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے اور مستقبل کا منصف مزاج مورخ اسے خاص طور پر لکھے گا کہ آزادی کے بعد گاندھی جی، مولانا آزاد اور

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندستانی مسلمانوں کے اکھڑے قدم کو ارض ہند میں کس طرح جمایا اور ایک نے جان دے کر اور باقی دو نے اپنا جگر خون کر کے کیسے اس ملک میں مسلمانوں کے لیے باعزت زندگی کی راہیں تلاش کیں، اور یہ مہتم بالشان کام ان بزرگوں نے صرف مسلمانوں کا کام سمجھ کر ہی نہیں کیا، بلکہ اسے سچی حب الوطنی اور اقتدار عالیہ کی خدمت گزاری سمجھ کر کیا۔

جو امور اس وقت زیر بحث ہیں، اُن کے کئی پہلو خواجہ غلام السیدین کے نام ذاکر صاحب کے مندرجہ ذیل جوابی خط سے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ خط راج بھون (پٹنہ) سے لکھا گیا تھا اور اس پر ۱۳ر اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ درج ہے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"برادرم سیدین صاحب، خدا آپ کو خوش اور اچھا رکھے۔ آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ جواب میں دیر ہوگئی، معاف کر دیجیے۔ جواب طلب بات اس میں وہ تھی جو کرشنا چاری[1] جی کی گفتگو سے نکلتی تھی۔ ان کو جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یوں ہی تفنن طبع کے لیے کہا ہوگا۔ مجھ جیسے ازکار رفتہ لوگوں کا وہ کیا کریں گے۔ رہا یہ کہ اُس وقت مجھے ان کے کہنے پر دہلی نہیں بُلایا گیا اور پھر بہار گورنر بنا کر بھیج دیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے پنڈت جی نے دہلی اصرار کر کے بلایا تھا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ علی گڑھ میں کچھ کام اور کر دوں، اور کم سے کم میڈیکل کالج بنوا دوں۔ کچھ طبیعت کا جھکاؤ بھی یہی رہا ہے کہ کام کو آسانی سے بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ بہرحال میں نے انکار کیا، پنڈت جی نے کہا کہ کرشنا چاری سے میں نے وعدہ کیا تھا، تم جا کر انھیں صورت حال سمجھا دو، چنانچہ میں نے ان سے جا کر سب کچھ بتا دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ پھر صحت نے کچھ ایسا رنگ بدلا اور جی علی گڑھ سے کچھ ایسا اکھڑا کہ میں اپنے وقت سے پہلے وہاں سے بھاگ نکلا اور اس تہیّے کے ساتھ کہ اب عمر کے جو تھوڑے سے دن باقی ہیں وہ اوروں کی اصلاح میں بے کچھ کیے ہی گزار دوں۔ مگر یورپ جانا ہوا۔

۱۔ مسٹر وی۔ ٹی۔ کرشنا چاری اس وقت ڈپٹی چیرمین پلاننگ کمیشن تھے۔

صحت کچھ سنبھلی۔ ادھر سے یہ پیام ملا کہ بہار میں پانچ سال کے لیے جلاوطن کیا جانا قرار پایا ہے۔ میری طبیعت علی گڑھ سے واپسی کے بعد اس واقعہ کے باعث جو مولانا مرحوم سے پیش آیا تھا اور جسے آپ کچھ نہ کچھ جانتے ہی ہیں، دوسروں کے بتائے ہوئے کاموں سے بالکل اُچاٹ ہو چکی تھی۔ میں قطعی انکار کرنا چاہتا تھا مگر میرے پرانے دوست نمبیار صاحب جو اُس وقت جرمنی میں ہندستانی سفیر تھے، انھوں نے کچھ اس طرح سمجھایا کہ میں پھسل گیا۔ اب اسی میں، کام سمجھیے یا بیگاری، خوش ہوں اور کسی دوسرے کام کو (دوسروں کے بتائے ہوئے کام کو) کرنے پر جی آمادہ نہیں ہوتا۔

کعبے سے بتکدے کو نہ تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کر یاں جی بہل گیا

یہ سب کتھا نہ جانے کیوں لکھ گیا۔ مختصر یہ ہے کہ کرشنا چاری بھی مجھے بھول جائیں۔ مجھ جیسوں سے پلیننگ کرائیں گے تو جو درگت پلیننگ کی ہے اس سے بدتر ہو جائے گی!...

آپ کا ذاکر حسین[۱]"

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین کے عہدے کے لیے ذاکر صاحب نہ صرف یہ کہ نہایت موزوں تھے بلکہ ان کے چیرمین ہونے سے اس عہدے کی زینت اور بڑھ جاتی۔ وہ کمیشن کے سربراہ ہو گئے ہوتے تو ان کی رہنمائی میں اس کے کام کا رُخ اس طرح متعین ہوتا کہ کمیشن اپنے آپ کو علم کا خادم سمجھتا، معلم کی قدر کرتا اور ایک عرصے تک اس کے کام میں بیوروکریسی کا حوصلہ شکن مزاج دخیل نہ ہو پاتا۔ لیکن ایسا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کیوں؟ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

ذاکر صاحب نے غالباً شروع اپریل ۱۹۵۶ء میں مسلم یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر کو بحیثیت وائس چانسلر یونی ورسٹی سے اپنا تعلق ختم کر دینے کے فیصلے کی اطلاع دی تھی اور یہ

۱۔ اس خط کے لیے میں محترمہ ڈاکٹر صغرا مہدی (ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کا شکرگزار ہوں۔

بھی لکھا تھا کہ وہ سودی عرب جانے سے قبل وزیٹر اور وزیر تعلیم کو اپنے اس فیصلے سے مطلع کردیں گے[1]۔ خیال ہے کہ وہ وائس چانسلر شپ سے اپنے استعفے کے ارادے سے متعلق جب وزیر تعلیم یعنی مولانا آزاد سے ملے ہوں گے تو انھوں نے یو. جی. سی. کی چیرمینی کی پیش کش کی ہوگی[2] (اس عہدے پر اُس وقت تک کسی کا تقرر نہیں ہوا تھا) اور ذاکر صاحب اس کے لیے تیار ہو گئے ہوں گے کہ یہ قومی تعلیم کے میدان میں خدمت کا ایک اور نادر موقع ہوگا جس کے امکانات آزاد ہندستان میں نہایت وسیع اور دوررس ہیں۔ ذاکر صاحب نے اگر اسی وقت اپنے استعفا باضابطہ منظور کر لیے جانے پر اصرار کیا ہوتا تو استعفا منظور ہوجاتا اور پھر غالباً یو. جی. سی کے چیرمین کی حیثیت سے ان کے نام کا اعلان ہوجاتا۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے سودی عرب کے سفر کے بعد ہی ضابطے سے استعفا دینے کی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ریاستوں کی تنظیم کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں علاقائی زبانوں کی بنیاد پر ریاستوں کی از سرِ نو تنظیم ہونے والی تھی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء کی گرمیوں میں ریاست بمبئی کو مہاراشٹر اور گجرات کے نام سے دو ریاستوں میں تقسیم کرنے اور بمبئی کے میٹروپولیٹن شہر کو دونوں سے الگ رکھ کر UNION TERRITORY کی حیثیت کا درجہ دینے سے متعلق حکومت ہند پارلیمنٹ میں بل پیش کرنا چاہتی تھی۔ مہاراشٹر والے بشمول مہاراشٹر کانگریس بمبئی کو مہاراشٹر کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور اس کے مہاراشٹر میں رکھنے پر بضد تھے۔ مسٹر سی. ڈی. دیشمکھ جو اس وقت مرکزی کابینہ میں وزیر مالیات تھے اور اپنی قابلیت، انتظامی صلاحیت اور قد آور شخصیت کے سبب نہ صرف حکومت بلکہ ملک میں ایک ممتاز

---

۱. دیکھیے پچھلا باب، صفحہ ۴۲۹

۲. ہوسکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے لیے اس عہدے سے متعلق مولانا نے اُن سے محض اپنا خیال ظاہر کیا ہو اور کوئی باضابطہ پیش کش نہ کی ہو۔ لیکن چونکہ اس سلسلے میں کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے، اس لیے ہم قیاس آرائی ہی کرسکتے ہیں۔

مرتبہ رکھتے تھے، حکومت کے موقف سے متفق نہیں تھے۔ بالآخر انھوں نے اس مسئلے پر وزارت سے استعفا دے دیا۔ اب خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں مہاراشٹر کانگریس میں جو پہلے ہی سے مرکزی حکومت کی تجویز کے خلاف احتجاج کر رہی تھی، مزید بحران کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اُدھر جولائی (۱۹۵۶ء) کے مہینے میں دیشمکھ نے اپنے استعفے کے منظور کر لیے جانے پر اصرار کیا[1]۔

اسی دوران کہ ابھی دیشمکھ کا استعفا منظور نہیں ہوا تھا، اور ذاکر صاحب ملک سے باہر تھے، کسی دن مولانا آزاد نے پروفیسر ہمایوں کبیر کو بھیج کر جو اُس وقت وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے، یو۔جی۔سی کی چیرمینی کے سلسلے میں دیشمکھ سے اُن کا عندیہ معلوم کیا، اور آخر کار دُرگابائی دیشمکھ سے مشورے کے بعد وہ راضی ہو گئے[2]۔ ۲۴؍جولائی کو دیشمکھ کا استعفا منظور ہوا اور ۲۴؍اگست کو انھوں نے یو۔جی۔سی کے چیرمین کا عہدہ سنبھال لیا۔

قیاس کہتا ہے کہ مہاراشٹر کانگریس کو بحران و انتشار سے بچانے کے لیے دیشمکھ جیسے قابل، مستعد اور با اثر شخص کو اُس وقت فوری طور پر کسی امتیازی پوزیشن سے نوازنے کی صورت یہی نظر آئی ہوگی کہ انھیں یو۔جی۔سی کا چیرمین بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ مولانا نے پنڈت جی سے اِس تقرر کے بارے میں ضرور مشورہ کیا ہوگا۔ اُس وقت کے ممتاز لوگوں میں اب ایسے چند ہی لوگ موجود ہیں جن سے اس معاملے سے متعلق کچھ روشنی کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ پروفیسر امریک سنگھ[3] سے اس خیال کا ذکر آیا تو انھوں نے

۱۔ دیکھیے ایسٹرن اکونومسٹ (نئی دہلی، ۲۲؍جون ۱۹۵۶ء)۔ اس ہفتہ وار اخبار نے "مہاراشٹر میں کانگریس کی اُلجھنیں" اور "دیشمکھ کا استعفا" کے عنوان سے دو اداریتی نوٹ لکھے اور یہ بھی لکھا کہ "مہاراشٹر کانگریس میں بحران اور بے چینی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔"

۲۔ سی۔ڈی۔ دیشمکھ THE COURSE OF MY LIFE نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، صفحات ۲۳۰-۲۳۶

۳۔ پروفیسر امریک سنگھ جو اِس وقت ہندستان کے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی سرگزشت لکھ رہے ہیں، کوئی تیس سال سے اعلا تعلیم سے متعلق رہے ہیں۔ وہ پنجابی یونی ورسٹی، پٹیالہ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں اور ایسوسی ایشن آف انڈین یونی ورسٹیز سے بھی ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔

کہا کہ دیش مُکھ نے یہ بات اُن سے خود بتائی تھی کہ مولانا نے جب پنڈت جی سے مشورہ کیا تو انھوں نے مولانا کی اس تجویز پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔

مولانا آزاد کے نقاد یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے پنڈت جی کو یہ بات نہیں بتائی ہوگی کہ وہ یو۔جی۔سی کی چیرمینی کی پیش کش ذاکر صاحب کو کر چکے ہیں۔ اگر انھوں نے بتایا ہوتا تو وہ دیش مُکھ کے حق میں کبھی راضی نہ ہوتے۔ ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے ضرور بتایا ہوگا اور چونکہ ان دونوں بزرگوں کو ذاکر صاحب کی دوستی اور معاملہ فہمی پر پورا اعتماد تھا، انھوں نے وقت کے ایک بڑے فتنے سے بچنے کے لیے یہ اقدام کیا ہوگا۔ اور یہی بات تھی جسے مولانا آزاد ذاکر صاحب کو بتانے کے لیے، اس قدر بے چین تھے اور بار بار انھیں بلاتے تھے۔ لیکن چونکہ اُن پر اس واقعے کا بہت زیادہ اثر تھا اور مولانا کی طرف سے غلط فہمی بھی پیدا ہو چکی تھی، وہ مولانا سے کچھ دن تک نہیں ملے، اور شاید اسی دوران پنڈت جی سے بھی اُن کی کوئی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کو اس کا افسوس رہا ہوگا کہ عمر بھر کبھی خود انھوں نے کسی عہدے کی خواہش نہیں کی تھی، اور اب جب یو۔جی۔سی کی چیرمینی کی پیش کش کی گئی تو یہ خواہش پیدا ہوگئی۔ جو لوگ ذاکر صاحب کی شریف النفسی اور عالی ہمّتی سے واقف ہیں وہ ہمارے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ ذاکر صاحب کو اس صورت حال میں دوسروں کے مقابلے میں خود اپنے آپ پر زیادہ غصہ آیا ہوگا اور وہ اپنے آپ ہی سے زیادہ اُلجھے ہوں گے![1]

ایک بات اور غور طلب ہے، اور وہ یہ کہ جب فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کا انتقال ہوگیا تو آخر پھر وہ کون ذات شریف تھی جو پلیننگ کمیشن اور مرکزی کابینہ میں وزیرِ تعلیم

۱۔ اسی سلسلے میں یہ بات بہت مشہور ہوئی تھی کہ اُس زمانے میں ایک دن جب ذاکر صاحب دہلی میں تھے مولانا کا پیغام ملا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید مولانا دیش مُکھ کے اس تقرر کے سلسلے میں وضاحت کرنا چاہتے ہوں گے۔ پیغام بر کو ذاکر صاحب کا جواب یہ تھا: براہِ کرم مولانا آزاد سے کہہ دیجیے کہ ان کے مکان سے میرے مکان کا فاصلہ وہی ہے جو میرے مکان سے ان کے مکان کا ہے۔

کی حیثیت سے ذاکر صاحب کے آنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوگی؟ دہلی میں خبریں گشت کرنے لگی تھیں کہ کابینہ میں ذاکر صاحب مولانا آزاد کے جانشین ہوں گے۔ یہ خبر بھی ہوئی کہ ذاکر صاحب نے وزارت تعلیم کی پیش کش قبول نہیں کی ہے۔ مجیب صاحب ذاکر صاحب سے معلوم ہوا کہ ان دنوں جب وزیر اعظم ذاکر صاحب سے ملے تو انھوں ان سے یہ پوچھا بھی نہیں کہ کیا وہ وزیر تعلیم بننا پسند کریں گے[1] اور مزل منزل، علی گ کے نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی راوی ہیں کہ مولانا کی وفات کے کچھ عرصے بعد ذاکر صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور از راہ کرم مزل منزل بھی آئے تو میرے پوچھے کو سُنا ہے کہ آپ نے اپنی کمزور صحت کا عذر کر کے وزارت تعلیم کی ذمے داری سنبھا سے انکار کر دیا تھا، ذاکر صاحب مسکرائے اور ایک وزیر با تدبیر کا نام لے کر فرمایا: "میاں صاحب سلامت، مجھ غریب کو پوچھتا کون ہے؟" ایسا اندازہ ہے کہ nighty Hindi Lobby مولانا آزاد کے بعد مرکزی حکومت میں کسی ایسے نیشنلسٹ مسلمان کو دیکھنا پ نہیں کرتی تھی جو زبان اور تہذیب سے متعلق متوازن، قومی اور جمہوری نقطۂ نظر رکھت ذہانت، صلاحیت، وجاہت، دانشوری اور معاملہ فہمی میں وزیر اعظم کے ہم پلّہ قرار دیا جا س ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لابی درپردہ مرکز میں کسی سچے گاندھیائی کے آنے کی ش مخالف ہو۔

بہر حال، وجہ کچھ بھی رہی ہو یو۔جی۔سی کی چیرمینی کے واقعے کے سلسلے میں ذاکر ص مولانا آزاد سے کچھ خفا خفا سے رہے، اور اسی لیے جب مولانا نے تھوڑے ہی دن بع ان کے لیے گورنری کی تجویز رکھی، تو غالباً اس خیال سے کہ کہیں وہی پہلے والی صور پھر نہ پیدا ہو جائے انھوں نے منع کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ منع کر دینے کے مشور میں عابد صاحب بھی شریک تھے، کیونکہ عابد صاحب کے خط مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۷ میں جو پیرس بھیجا گیا تھا (ذاکر صاحب اس وقت یونسکو کے ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ

۱۔ محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین — اے بایوگرافی، صفحہ ۱۹۲

کے سلسلے میں وہیں تھے) یہ بات اس طرح لکھی ہوئی ملتی ہے:

"برادرم ذاکر صاحب، سلام شوق و محبت و عقیدت

"بہت دن سے آپ کے گورنر ہونے کی خبریں اخباروں میں آرہی تھیں اور بہت دن سے آپ نے ہم میں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ ان دونوں چیزوں میں باہم تعلق پیدا کرکے میں اپنے دل سے اس پریشانی کو دور کرتا تھا جو آپ کی خیریت نہ معلوم ہونے سے طبیعت کو لاحق ہوگئی تھی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ آپ سے گورنری کے بارے میں پوچھا گیا ہے (یہ تقریباً یقینی طور پر معلوم تھا) اور آپ نے رضامندی ظاہر کی ہے۔ اس لیے کچھ قدرتی حجاب کی وجہ سے اور کچھ پچھلے تجربوں کی بنا پر محتاط ہوجانے کی وجہ سے آپ کسی عزیز یا دوست کو خط نہیں لکھتے۔ 'وہ بات' لکھنا آپ مناسب نہیں سمجھتے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ 'سارے فسانے میں' 'اس بات' کا ذکر نہ ہو' چنانچہ میں نے بھی دم سادھ لیا اور یہ طے کرلیا کہ جب تک 'اس بات' کا باضابطہ اعلان نہ ہوجائے آپ کو خط نہیں لکھوں گا... آج خدا خدا کرکے اخباروں میں حکومت کی طرف سے باضابطہ اعلان ہوگیا کہ گیری صاحب یو پی کے، پٹاسکر صاحب مدھ پردیش کے اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار کے گورنر ہوگئے۔ فالحمد للہ۔ اب میں آپ کو خط لکھ سکتا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ کوئی کہے گا کہ بھلے آدمی تم نے پہلے ذاکر صاحب کو گورنری قبول کرنے سے روکا تھا اور اب جو گورنر ہوگئے تو کہتے ہو فالحمد للہ۔ میرا جواب صاف ہے لگی لپٹی آتی نہیں۔ ہر چیز کا موقع محل ہوتا ہے، اب سے چھ مہینے پہلے

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

کا محل تھا اور اب

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

آپ کا عابد"

عابد صاحب نے گورنری کے سلسلے میں مولانا آزاد کی پیش کش کو قبول نہ کرنے کے سلسلے میں اپنے مشورے کی تاویل 'نرخ بالاکن...' سے کی ہے، لیکن یہ تو محض سخن گسترانہ بات معلوم ہوتی ہے۔ اصل وجہ وہی ہے کہ یو.جی.سی والے معاملے پر ذاکر صاحب کو خاصا تکدر تھا، حالانکہ دیکھا جائے تو اُن کے اس تکدر میں کچھ اُس "دوست"[1] کا بھی اشارہ شامل رہا ہوگا جس کے متعلق عابد صاحب نے کہا ہے کہ اس سے جو کچھ بھی مل جائے بہتر ہی ہے۔ مولانا کی بڑائی اور شرافت تھی کہ انھوں نے کسی مرحلے میں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ دیش مکھ کے تقرر میں 'دوست' کا مشورہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے ملامت کے سب پتھر اپنے اوپر لے لیے اور "مینائے دوستی" کو محفوظ رکھا۔

اور اب "نرخ بالاکن..." وغیرہ جیسی سب باتیں بھول کر ذاکر صاحب کی عظمت اور شرافت ملاحظہ کیجیے کہ انھوں نے ۲۳ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں لاکھوں کے مجمع میں جو اُس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی سربراہی میں مولانا آزاد کا سوگ منانے جمع ہوا تھا، کیسے الفاظ میں اظہارِ حقیقت کیا۔ سچ یہ ہے کہ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب دونوں عظیم تھے[2]۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر کہا تھا:

"... میں ان سے دور دور رہتا تھا، اس لیے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا۔ کبھی کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو اُن سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ ابھی سال بھر سے کم عرصہ ہوا[3] کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان سے کچھ کھِچا۔ اس وقت

---

۱. یہاں "دوست" سے مراد پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔

۲. اکثر خیال آتا ہے کہ بیسویں صدی میں "مسلم ہندستان" میں تین ایسی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ عمرہا باید کہ پھر ایسے لوگ پیدا ہوں: ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔

۳. غالباً جلدی میں حساب ٹھیک نہیں لگ سکا۔ کہنا چاہتے ہوں گے "ابھی سال بھر سے کچھ زیادہ ہوا۔"

آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس
کھچاوٹ کو اُن پر ظاہر بھی کیا مگر اس کوہِ وقار نے، بجائے اس کے کہ
اسے میری گستاخی سمجھتے، مجھ پر محبت کی بھرمار کی اور جب میں ان کے
بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے
اُبلتے جاتے تھے، اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو
بھلا نہیں سکوں گا۔۔۔۔!

بہار کی گورنری

ذاکر صاحب جرمنی میں باڈ کیسنگن میں آنکھ کے آپریشن کے بعد آرام کر رہے تھے، جب انھیں گورنر بہار مقرر کرنے سے متعلق حکومت کے فیصلے کا اعلان ہوا۔ خیال ہے کہ اعلان سے پہلے حکومت ہند نے اِس عہدے کے قبول کرنے کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی منظوری حاصل کر لی ہوگی۔ اپنی صحت کی بحالی کے بعد جب وہ جرمنی سے واپس آئے تو انھوں نے بہار کی گورنری کا چارج لے لیا۔ یہ ۶ جولائی ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔

ذاکر صاحب کے دوستوں، عقیدت مندوں اور نکتہ چینوں میں ایک طبقہ وہ بھی تھا جس نے ان کے گورنر بننے پر کچھ زیادہ پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ کسی کا خیال تھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت میں وہ جو ایک "مجاہد" تھا، وہ شہید ہوگیا، کسی نے کہا کہ اب تک ہر مرحلے اور ہر معرکے میں اقدام ذاکر صاحب کی طرف سے ہوا کرتا تھا، اب گورنر ہونے کے بعد اُن کی یہ خصوصیت معدوم نہیں تو معطل ضرور ہو جائے گی۔ ایک ممتاز دانشور کا ردعمل یہ تھا کہ علی گڑھ سے آجانے کے بعد انھیں مضامین اور کتابیں لکھنے اور لیکچر دینے کا کام کرنا چاہیے تھا تاکہ اُن کی نورانی دانشوری سے نئے ہندستان میں اُردو والوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں دانشوری کی روایت مضبوط ہوتی اور صحیح خطوط پر آگے

۱۔ آج کل، دہلی (ابوالکلام آزاد نمبر)، اگست ۱۹۵۸ء

بڑھتی۔ ایک عقیدت مند کا خیال یہ تھا کہ "آندرے مالرو نے جب دی گال کی حکومت میں شمولیت کر لی تو سارتر نے کہا تھا کہ دانشور کو حکومت کا پرزہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسے باہر سے اچھے کاموں میں حکومت کی مدد کرنی چاہیے اور اگر حکومت غلطی کرے تو اسے ٹوکنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۵۷ء کے بعد ذاکر صاحب یہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حکومت کا ایک ممتاز حصہ تھے۔" ان کے ایک پرانے جامعی طالب علم نے ان سے براہِ راست خط لکھ کر پوچھا: "... میں اس الجھن میں ہوں کہ آپ کے لیے گورنری، قلندری سے کیسے افضل ہوگئی؟ اور آپ نے اسے کیسے پسند فرما لیا؟" اور عام مسلمانوں کی نظر صرف یہاں تک گئی کہ مولانا آزاد نے تو ہم لوگوں سے اپنے آپ کو الگ ہی کر لیا تھا، اب ذاکر صاحب بھی مسلمانوں کے کام کے نہ رہے۔

وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے اگر پوچھا جاتا کہ انھوں نے بہار کی گورنری کے لیے ذاکر صاحب کا انتخاب کیوں کیا؟ تو وہ اپنے دل کی بات بتانے کے بجائے جو غالباً یہ تھی کہ ذاکر صاحب کے لیے وہ اس وقت یہی کر سکتے تھے، یہ کہتے کہ بہار میں فرقہ وارانہ صورتِ حال اچھی نہیں ہے اور بہار کانگریس میں بڑے اختلافات ہیں اور انھیں سلجھانے کے لیے ذاکر صاحب جیسے مہذب اور غیر جانب دار شخص ہی کی ضرورت ہے۔ اور ذاکر صاحب نے گورنری کیوں قبول کی اس کی اصل وجہ تو ذاکر صاحب ہی بتا سکتے تھے، ورنہ وہ تو سوال پوچھنے والے کو دیکھتے اور پھر جیسی کیفیت میں وہ ہوتے اس کے مطابق جواب دے دیتے، جیسے ایک محتسب کا مزاج رکھنے والے ایک بزرگ کو انھوں نے لکھا تھا کہ "راج بھون میں فقیروں ہی کو رہنا چاہیے" اور جامعہ کے اپنے قدیم طالب علم کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا: "... پہلے تو عزیزِ من! میں قلندر کب تھا؟ لیکن سوال کو اپنی ذات سے الگ کر کے ایک اصولی سوال سمجھوں تو اس کا بہت اچھا جواب حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایک جگہ دیا ہے۔ عبارت نقل کیے دیتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا۔[۱]" عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے،

۱۔ حسنین سید کا مضمون خدا بخش لائبریری جرنل میں، نمبر ۲۱-۲۲-۲۳ (۱۹۸۲ء) صفحہ ۱۰۹۔ اس عبارت کے نقل کر دینے سے ذاکر صاحب یہ بتانا چاہتے تھے کہ خدا کی مرضی یہی تھی۔

"اُستاد ابوالقاسم قشیریؒ سے میں نے سُنا کہ اُنھوں نے فرمایا: فقیری اور تونگری کے سلسلے میں لوگوں نے باتیں کہیں ہیں اور اپنے لیے ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے' اور میں اُسے اختیار کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لیے پسند کرے اور اُس میں وہ میری مدد اور حفاظت فرمائے۔ اگر وہ مجھے تونگری کی حالت میں رکھے تو (اللہ سے) غافل نہ رہوں اور اگر دُرویشی کی حالت میں رکھے تو حریص اور ہاتھ پھیلانے والا نہ بنوں۔ پس' تونگری نعمت ہے اور اس میں غفلت ایک آفت ہے' اسی طرح فقر و درویشی بھی نعمت ہے اور اس حال میں حرص ایک مصیبت ہے:"

ہمارا اپنا خیال ہے کہ خدمت کے مختلف گوشے اور حالات ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ قومی یا ملّی خدمت کا فریضہ ہمیشہ منبر پر دھواں دھار تقریروں' تحریروں اور اخباری مضمونوں ہی کی صورت میں ادا کیا جائے' یا آزاد اداروں کی تعمیر کی کوشش کو ہی ہر حالت میں قومی خدمت قرار دیا جائے۔ کبھی ملک و ملّت کے بڑے کام حکومت کے خلاف عمومی احتجاج سے نہیں بلکہ حکومت کے اندر رہ کر اشتراک و تعاون سے اُس کے فکر و عمل کا صحیح رُخ متعین کرنے کی کوشش سے بھی انجام پاتے ہیں۔ ہم کہ قتیل جذباتیت ہیں' مختلف حالات میں تعمیری کام کے گوناگوں طریقوں کی باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتے' اور اپنی کم نگاہی سے خدمت کا ایک ہی معیار اور رُخ دیکھنے کے عادی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ذاکر صاحب اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ مسلمانوں نے اپنے محسنوں کی قدر بہت کم کی' اور اگر اُن کے احسان کو ماننے کی کبھی توفیق ہوئی تو کچھ تھوڑا بہت اعتراف اسکا ان کے مرنے کے بعد کیا۔ مسلمانوں نے نہ معلوم اپنے کتنے قائدین کو آسمان پر چڑھایا اور جب وہ اُن کی جذباتیت کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر انھیں قائدین کو ذلیل و رُسوا کیا' اس لیے' صلہ و ستایش کی کسی تمنا کے بغیر' مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نے تقسیم کے بعد ملک و ملّت کی تباہی و مسماری میں' کانگریس کے اندر اور باہر دونوں جگہ سیاسی لحاظ سے اپنے

ہمخیال و ہم مسلک ہم وطنوں سے مل کر ملک کو مضبوط بنانے اور مسلمانوں کے لیے ملک میں باوقار زندگی کے حالات پیدا کرنے اور وسائل فراہم کرنے کی شعوری کوشش کی —— ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس بازی کو پلٹ دیا جو مسلمان پوری طرح ہار چکے تھے !!

ذاکر صاحب عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے تھے. عملی سیاست کے تقاضے اور اخلاقی معیار کچھ اور ہوتے ہیں. بنیادی قومی تعلیم کے سلسلے میں انھیں سیاست اور تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک بھاری تعداد سے سابقہ پڑ چکا تھا. وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عملی سیاست میں تو انھیں اپنی پارٹی کے سیاسی مفاد پر نظر رکھنی ہوگی، اور اکثر اپنی معروضیت اور کبھی کبھی بڑی ہی سچائیوں کو قربان کرنا ہوگا. اُن کی طرح کے ایک ایسے آدرش وادی معلم کے لیے جس نے نوجوانی ہی میں افلاطون کے حُسن، خیر، صداقت اور عدل کے تصورات کا گہرا اثر قبول کر لیا تھا، اور جس نے بڑی حد تک اپنے فکر و عمل کو عمر بھر ان اقدار کے مطابق ڈھالنے کی شعوری کوشش کی تھی، اب یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنی اخلاقی شخصیت کی بلندی سے اتر کر روزمرّہ کی جماعتی سیاست کی پستی سے اپنے آپ کو ملوث کرے. کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاسی جھگڑوں سے الگ رہ کر، اپنی سیاسی حیثیت و اہمیت کو، اگر یہ حیثیت و اہمیت انھیں ملتی، دیانت کی ایک مثال قائم کر جانے کے لیے کام میں لا سکتے تھے. اس کے لیے اُن میں بصیرت بھی تھی اور فراست بھی. یہ صحیح ہے کہ جمہوریت کے لیے ہمیشہ اس کی ضرورت رہتی ہے کہ ایسی مثالیں قائم کرنے والے لوگ موجود رہیں. لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جمہوریت میں کوئی موثر اقدام ہم مسلک ساتھیوں کے بغیر ممکن نہیں. ۱۹۵۷ء میں ذاکر صاحب غالباً اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ آزاد ہندستان میں ایسے چند ساتھیوں کی کوئی ٹیم بھی وہ نہیں بنا سکیں گے. پھر بھی وہ کوشش کر سکتے تھے اور شاید وہ کرتے بھی، اگر اُن کی صحت اچھی ہوتی. لیکن اب ہر لحاظ سے ان کے پاس لے دے کے ایک ٹوٹا ہوا دل تھا، ذیابیطس کا مارا ہوا ایک کمزور جسم اور گلوکوما کی ستائی ہوئی آنکھیں. ایسی صورت میں اب وہ یہی کر سکتے تھے کہ گورنری قبول کر لیں اور سکون و اطمینان سے اپنے تعلیمی و

تہذیبی افکار کو ایک وسیع حلقے میں پھیلانے کی کوشش کریں کہ یہ بھی ملک و ملت کی خدمت کا ایک اہم گوشہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ اس طرح انھیں ہندستان جیسے ملک میں جو مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے، نمونے کے دستوری سربراہ ریاست کی ایک مثال قائم کرنے کا موقع ملے گا۔ ملک و ملت کی بالواسطہ، لیکن دور رس نتائج کی حامل، خدمت کی ایک صورت یہ بھی، ممکن ہے کہ ان کے ذہن میں رہی ہو۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ یقیناً ذاکر صاحب نے یہی سوچ کر گورنری قبول کی ہوگی، اور پھر راج بھون سے لے کر راشٹرپتی بھون تک کے وسعۂ حیات میں انھوں نے نمونے کے ایک سربراہ ریاست / مملکت کی مثال قائم بھی کردی۔ خدمت کے گوشے بدلتے رہے لیکن خدمت کا کام جاری رہا — خدمت گزاری بشرطِ استواری ذاکر صاحب کے نزدیک ایک بڑا انسانی شرف تھا، اور اسی لیے زندگی کو، جس رنگ میں بھی وہ اُن کے سامنے آئی، انھوں نے اسے خدا کی ایک نعمت تصور کیا کہ اسی میں خدا کی بندوں کی خدمت کی وہ راہ بھی تھی جو دراصل خدا تک پہنچنے کی راہ تھی۔

بارہواں باب

گورنر بہار

(۱۹۶۲—۱۹۵۷)

۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو دوپہر سے پہلے ذاکر صاحب نے بہار کی گورنری کا چارج لیا اور اسی دن شام کو انھوں نے بہار کے باسیوں کو بھائی اور بہن کہہ کر خطاب کیا اور نئی ذمّے داریوں کو انجام دینے کے کٹھن کام میں اُن کی دُعاؤں کے طالب ہوئے۔ انھوں نے اپنی تقریر بہار کے وزیر شری انوگرہ نرائن سنہا کے ذکر سے شروع کی جن کی وفات اُسی دن ہوئی تھی اور جن کے وزیر اعلا سے اختلافات کی وجہ سے ریاست کی سیاست میں مستقل ایک کشاکش پیدا تھی۔ انھوں نے شری انوگرہ کی طویل قومی خدمات کا ذکر کیا[۱] اور اُن کی وفات کو قومی زندگی کا ایک بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے بہار والوں کو پیغام دیا کہ ایک زندہ قوم اپنے اچھے اور بڑے لوگوں کو مرنے نہیں دیتی۔ جو کام یہ مرنے والے چھوڑ جاتے ہیں انھیں سنبھال لیتی اور آگے بڑھاتی ہے۔ انوگرہ بابو کی زندگی ہم سے کہتی ہے کہ ہم یہ تہیہ کرلیں کہ ہم اس ریاست کو ایک نمونے کی ریاست اور ہندستان کی آنکھ کی پتلی بنادیں گے۔

۱۔ شری سنہا جو انوگرہ بابو کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، قومی خدمت کے میدان میں اس وقت سے تھے جب گاندھی جی نے چمپارن میں اپنا کام شروع کیا تھا۔

اپنی اسی تقریر میں ذاکر صاحب نے یہ کہہ کر کہ میں بہار کی پڑوسی ریاست اترپردیش سے آیا ہوں، اور یہ یاد دلا کر کہ ۱۹۲۷ء میں وہ حکیم اجمل خاں کے ساتھ جامعہ ملیہ کے لیے چندہ کرنے یہاں آئے تھے اور یہاں کے لوگوں نے سب سے پہلے ہماری مدد کی تھی، اپنے آپ کو بہار والوں سے بہت قریب کر لیا۔ اور پھر تو وہ جب تک وہاں رہے، لوگوں نے انھیں مرکزی حکومت کا نمایندہ کبھی نہیں سمجھا، انھیں اپنا ہی سمجھا اور ان کے ساتھ پورا اشتراک و تعاون کیا۔ بہار والوں سے قربت اور گہرے تعلق کا پہلا تاثر جو ذاکر صاحب نے اپنی اس تقریر میں دیا، وہی اہل بہار کا آخری تاثر بھی تھا۔

ملاقاتیوں کا ہجوم

ذاکر صاحب کی طبیعت میں دوسروں کے لیے ہمدردی، خیر سگالی اور محبت کے جذبے کی کمی کبھی نہیں رہی، اور ایک بار جب لوگوں کو اس کا اندازہ ہو گیا تو پھر اُن سے ملنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ملنے والوں میں مختلف حیثیت، مختلف پیشے اور مختلف مذاق و طبیعت کے لوگ ہوتے تھے۔ ملنے کی راہ میں ضابطے کی جو رکاوٹیں تھیں، ایک بار اگر انھیں پار کر لیا گیا تو ذاکر صاحب کی خوبصورت مسکراہٹ ملاقاتیوں کی ساری تھکن اور کوفت دور کر دیتی تھی۔ جو لوگ اُن سے صرف اس لیے ملنے آتے کہ وہ گورنر تھے، وہ ان کے اخلاق، قابلیت اور ذہانت سے متاثر ہو کر واپس جاتے، اور جو کسی کام سے آتے وہ اُن کے اخلاق اور قابلیت سے متاثر ہونے کے ساتھ اس بات کے معترف ہو کر بھی جاتے کہ ہمارا یہ گورنر معاملہ فہم ہے، ہماری دلچسپی کے کام کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے، اور مزید جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس سے ان کے اپنے کام کی اہمیت ان کی نظر میں اور بڑھ جاتی۔ ذاکر صاحب اپنی ذہانت سے حالات اور ملنے والے کے ذہن کو فوراً سمجھ جاتے تھے، اور پھر وہ اس سے اس انداز سے گفتگو کرتے کہ معاملے اور صورت حال کو وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ سکتا، اور ان کے مشوروں کی افادیت کو محسوس کر لیتا تھا۔ یہ سب کام وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کرتے تھے، لیکن کم لوگوں کو اس کا اندازہ ہو پاتا تھا کہ یہ مصروفیت ان کو

کتنا تھکا دیتی تھی۔

گورنری ـــ خدمت کا ایک موقع

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ گورنر کی زندگی بڑے آرام کی زندگی ہوتی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ کبھی تھا' خاص طور پر اُن گورنروں کے لیے جو اس عہدے کی ذمّے داریوں کو ایک فرض سمجھ کر پورا کرتے تھے۔ آج کل تو گورنر ہمہ وقت جماعتی سیاست کی کشاکش کی زد میں اور اس کی وجہ سے ایک اعصابی کش مکش میں مبتلا رہتا ہے' لیکن جب ذاکر صاحب گورنر بنے تھے اس وقت گورنر کی دستوری حیثیت اور اس کے فرائض و اختیارات موضوع بحث شاذ ہی بنتے تھے۔ لیکن گورنر کی شخصیت' خیالات اور اس کی بدمذاقی یا خوش مذاقی کا اثر ریاست کی مجموعی زندگی پر پہلے بھی پڑتا تھا اور آج بھی پڑتا ہے۔ ذاکر صاحب کی نورانی شخصیت نے جو عبارت تھی اعلا اخلاقی اقدار کی خدمت گزاری اور ہر معاملے میں شایستگی اور خوش ذوقی سے' بہار کی تہذیبی و سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا' اور چونکہ ان میں صبر و ضبط کی بے پناہ قوت' جدا کرنے کے بجائے ملانے کی فطری صلاحیت اور معاملات میں معروضیت اور توازن برقرار رکھنے کی موثر قابلیت تھی' بالواسطہ بہار کی سیاست اور سیاست داں دونوں اُن کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔

بعض دوستوں اور عقیدت مندوں کے نام خطوط میں جن سے وہ اپنے دل کی بات کسی قدر کھُل کر کہہ سکتے تھے' ذاکر صاحب کے احساس و اضطراب کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں' اور اُن اشعار میں بھی جو عہد گورنری کے شروع کے دنوں میں اُن کے نوکِ قلم سے خطوط اور بیاض میں لکھے گئے۔ نواب رحمت اللہ خاں شروانی کے نام ذاکر صاحب نے لکھا تھا:

"معلوم نہیں آپ کو میرا حال معلوم ہے یا نہیں؟ دو مہینے سے یہاں بھیج دیا گیا ہوں۔ میں اور گورنری' ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ نہ اس کی

کوئی اہمیت تھی نہ ایسے کام کے لیے اپنے کو تیار کیا تھا۔ بہرحال خدمت کا ایک موقع جان کر اسے اپنے سر لے لیا ہے۔ خدا کرے کام کا حق ادا کر سکوں۔"

سکون وتنہائی کی وحشت

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ذاکر صاحب نے گورنری کا عہدہ بڑے غور وفکر کے بعد اس بنا پر قبول کیا ہوگا کہ اس شکل میں بھی ملک وملّت کی خدمت کا ایک اور موقع ملے گا، خواہ وہ کتنا ہی بالواسطہ کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ کہ جس کی اب تک کی زندگی کا بڑا حصہ عام انسانوں کو ساتھ لے کر بلا واسطہ اور راست جہد وعمل میں گزرا ہو، اور جس نے کبھی تکلفات اور رسمی ضابطوں کی پابندیوں کو گوارا نہ کیا ہو، اس نے کس طرح مکمل طور پر اس نئے عہدے کے ضابطوں کو قبول کیا ہوگا اور میدانِ عمل کے نوع بہ نوع ہنگاموں سے ہٹ کر اس عہدے کی یک رنگ اور اُکتا دینے والی "یکسوئی" کو پہلے برداشت کیا ہوگا اور پھر اسی میں اپنے لیے خدمت وقیادت کی راہ تلاش کی ہوگی؟ ذاکر صاحب جیسے مردِ کار کے سلسلے میں جس کی دلچسپیاں متنوع ہوں اور جو اپنی کمندیں ہر طرف پھینکنے کا عادی ہو، یہ سوال بہت اہم ہے!

۲۹ جولائی ۱۹۵۹ء کو عابد صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"برادرم عابد صاحب ... آپ نے یہ خوب لکھا کہ گمان تھا کہ قائم گنج کی کشش مجھے کھینچ لائے گی۔ جب جامعہ اور علی گڑھ میں میرے لیے کشش نہ رہی تو قائم گنج غریب کس گنتی میں ہے۔ پہلے اس بے تعلقی سے کچھ افسردہ افسردہ رہتا تھا۔ اب وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔

"جامعہ کی جو حالت آپ نے لکھی ہے وہ پہلے بھی لوگوں سے سُن چکا ہوں۔ لیکن یقین مانیے ایسا لگتا ہے جیسے کسی اجنبی جگہ کا ذکر ہو رہا ہو۔ نہ دل متوجہ ہوتا ہے نہ دماغ۔ شاید جو ہوتا ہے وہی ٹھیک ہوتا ہے۔ آپ میں خدا کے فضل سے زندگی ہے اس لیے چیزوں میں دلچسپی بھی ہے۔ میں تو موت سے پہلے مرچکا ہوں۔ مجھ سے کیا گفتگو کیجیے گا۔"[۱]

عابد صاحب کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"... میری 'بے تعلقی' کہیے یا 'بیزاری' اس کی وجہ کیوں تلاش کیجیے۔ انشاءاللہ جب تک آپ آیئے گا افاقہ ہوچکا ہوگا۔ آدمی آخر بیمار بھی تو ہوتا ہے اور اچھا بھی ہوجاتا ہے۔ مصداق بھابی سے کہیے کہ 'نفی کل' کا لہجہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیماری ہی کی علامت ہو۔ بیمار سے گھبرانا نہیں چاہیے، عیادت کرنی چاہیے۔"[۲] (۲۹ر اگست ۱۹۵۹ء)

حکیم عبداللطیف صاحب کے نام جو علی گڑھ میں طبیہ کالج کے پرنسپل تھے اپنی اس خاص ذہنی کیفیت کی طرف کئی خطوں میں اشارہ کیا[۳]:

"یہ شاید آپ کو معلوم ہے کہ ہم زندانیوں کو اپنے قفس سے باہر جانے کے لیے باضابطہ اجازت لینی ہوتی ہے..." (۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۸ء)

۱۔ متعلقہ فائل خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۲۔ ایضاً۔ اسی سال (۱۹۵۹ء) کے ایک خط میں انھوں نے عابد صاحب کو لکھا تھا "مجھے تو 'از میکدہ بیروں شو' کا حکم ہر طرف سے سُنائی دیتا ہے..." (پورا خط خدابخش لائبریری میں دیکھ سکتے ہیں)
۳۔ ان خطوں کے لیے دیکھیے متعلقہ فائل خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

"میں گھسیٹ رہا ہوں۔ کوئی خاص بات شکایت کی نہیں، مگر بس ایسا حال ہے جیسا مشینوں کا ہوتا ہوگا..." (۲۹ دسمبر ۵۸ ۱۹ء)

"اچھا کیا آپ نے کچھ حالات لکھ دیے۔ قفس میں 'رودادِ چمن' سُن لی..." (۲۷ فروری ۱۹۶۱ء)

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ راقم الحروف کو ذاکر صاحب کی فارسی اشعار کی بیاض کے مطالعے کا موقع ملا تھا۔ نگارِ معنی (انتخاب اشعارِ فارسی) اسی مطالعے کا نتیجہ ہے[1]۔ اس کی تقدیم میں جس کا عنوان "ذاکر صاحب اور فارسی شاعری" ہے اور جس میں صدیوں پر پھیلے فارسی شعر و ادب کے سیرت سازی کے رول کی وضاحت کرتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ ذاکر صاحب کے باطن کی توانائی کا ایک سرچشمہ فارسی شاعری بھی تھی اور ان کی شخصیت و سیرت کی تعمیر میں فارسی شعر و ادب کا بڑا نمایاں حصہ رہا تھا، اس کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ فارسی اشعار کی اس بیاض میں مومن خاں مومن کا کچھ اُردو کلام بھی ہے جس کے متعلق، داخلی شہادتوں کی بنا پر، معقول قیاس آرائی یہ کہتی ہے کہ وہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو یا اس کے چند روز بعد بیاض میں لکھا گیا ہوگا۔ یہاں ہم مومن کے اُن اشعار کو درج کرتے ہیں جن سے اُس زمانے میں ذاکر صاحب کے ایک خاص موڈ اور ذہنی کیفیت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ راج بھون کے سکون و تنہائی کے لمحات میں ذاکر صاحب کو اپنی مجاہدانہ سرگرمیاں یاد آتی ہوں گی، اور یہ بھی یاد آتا ہوگا کہ بہرحال کوہکن کی زندگی میں تیشہ و سنگ کی کچھ چنگاریاں ہی سہی، مگر ہیں تو۔ ماضی کی یہی یادیں ہوں گی، جن کا عکس مومن کے اِن دو شعروں میں انھیں نظر آیا ہوگا:

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی (مرتب و تقدیم نگار)، نگارِ معنی ۔ انتخاب اشعار فارسی (ڈاکٹر ذاکر حسین کی بیاض سے)، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے
اف رے گرمیِ محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

——اور پھر ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء کے بعد :

بیکاریِ اُمید سے فرصت ہے رات دن
وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا

ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہوتے سمجھ تو سمجھیں بات
یہ تو سمجھتے حضرت ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں
کُنج قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یادِ سیرِ موسم گل سے گاہے دل بہلاتے ہیں
شام سے اپنے سوئے ہے وہ تو اور ہم ان کے کوچے میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کیا کسی بُت کے دل میں جگر کی کوئی ٹھکانہ اور ملا
حضرت مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

علی گڑھ اور جامعہ — بے تعلقی میں تعلق کی علامت

فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت میں تعلیم کے وزیر ڈاکٹر کے. ایل. شریمالی صاحب ہوئے اور "تعلیم کے باغباں ہونے کے بجائے گلچیں" ثابت ہوئے. وہ ہندی لابی کے نمایندے اور اُنھیں "وزیر با تدبیر" کے آدمی تھے جو ذاکر صاحب کو مرکزی حکومت میں وزیرِ تعلیم بن کر آنے کی راہ میں آڑے آئے تھے. شریمالی صاحب

نہ معلوم کیوں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ناراض تھے اور جامعہ ملیہ سے بھی خوش نہ تھے۔ اُن کے زمانے میں وزارت تعلیم ان دونوں اداروں میں اساتذہ اور کارکنوں کی گُٹ بندی کی ہمت افزائی کر کے پورے طور پر مداخلت کرنا چاہتی تھی۔ علی گڑھ میں تو ایسی صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ وہاں کی ایگزیکیٹو کونسل کو یونی ورسٹی کے بعض معاملات میں تحقیقات کے لیے انکوائری کمیٹی مقرر کرنی پڑی[۱] جس کے چیرمین پروفیسر جی۔ سی۔ چٹرجی اور ممبر پروفیسر واڈیا، کرتار سنگھ ملہوترا اور مسٹر نائک (اُس وقت وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری) تھے۔ مسٹر نائک ممبر سکریٹری تھے، شریمالی صاحب کے خاص آدمی تھے اور درحقیقت وہی وہی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یونی ورسٹی کو بدنام اور ذلیل کرنے کے لیے نہایت ہوشیاری سے ایسی صورت حال پیدا کر دی گئی اور مسلم یونی ورسٹی کی ایگزیکیٹو سے ایسی انکوائری کمیٹی بنوائی گئی جس میں ایک مسلمان بھی بطور ممبر نہ تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے جانے کے بعد علی گڑھ کیسی دُشواریوں میں مبتلا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ انکوائری کمیٹی کے ذریعے بعض ایسے معاملات بھی سامنے لائے جائیں جن کا تعلق ذاکر صاحب کے عہد وائس چانسلری سے تھا، اور وہ اس انداز سے لائے جائیں کہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر بھی کچھ حرف آئے۔ غرض ساری کوشش اس بات کی تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا آزاد نے عام طور پر مسلمانوں میں اور ذاکر صاحب نے خاص طور پر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں Mental Rehabilitation کا جو کام جان کھپا کر کیا تھا اُس کا اثر زائل کر دیا جائے، اور ذاکر صاحب جیسی اہم شخصیت کو مجروح کر کے قومی تعلیم کے میدان میں چند نیشنلسٹ مسلمانوں کو جو امتیاز حاصل ہے اُسے بھی باقی نہ رہنے دیا جائے۔

چٹرجی انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں جو فائل مرتب ہوا وہ تو ایک تاریخی دستاویز

۱۔ انکوائری کمیٹی اگر ایگزیکیٹو کونسل اقدام کر کے خود نہ مقرر کرتی تو وزیر سے انکوائری کمیٹی مقرر کرائی جاتی اور اس کے معنی یہ ہوتے کہ گویا وہ وزارت تعلیم کی انکوائری کمیٹی ہوتی۔

بن ہی گیا ہے، لیکن اُس زمانے میں ذاکر صاحب کے نام مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کرنل سید بشیر حسین زیدی اور عابد صاحب کے خطوط بھی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں ذاکر صاحب کو ساری تفصیلات کا علم ہوتا رہتا تھا، لیکن یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس پر ان کا ردِعمل کیا ہوتا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اُس وقت مسلم یونی ورسٹی سے متعلق انھوں نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے کوئی بات کی ہو تو کی ہو، ڈاکٹر شریمالی سے انھوں نے کچھ بھی نہ کہا ہوگا کہ ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اگر انھیں کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہتے تھے، سب اپنے دل پر جھیلتے تھے اس خیال سے کہ اُن کی طرف سے اظہار ہوگا تو اُسے شرمندگی ہوگی، اور انھیں یہ کسی قیمت پر گوارا نہ تھا کہ ان کی وجہ سے کسی کو کوئی دُکھ پہنچے یا کسی کو ندامت کا بوجھ اٹھانا پڑے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انھیں تکلیف پہنچانے والا شخص اپنے قد کو اُن کے مقابلے میں ہمیشہ چھوٹا ہی سمجھتا تھا اور خود اُن میں وہ اخلاقی توانائی باقی رہتی تھی کہ اس سے ہر معاملے پر گفتگو کر سکتے تھے۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ جامعہ اور پھر علی گڑھ سے جانے کے بعد ذاکر صاحب کو ان دونوں اداروں سے مطلق بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن ایسا نہ تھا، اس کا اور اس اخلاقی توانائی کا ایک واضح ثبوت جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، ان کا ۱۷رمئی ۱۹۶۰ء کا وہ خط ہے جو انھوں نے وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی کو جامعہ ملیہ کو پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعے قومی اہمیت کا ادارہ بنا دینے سے متعلق لکھا تھا۔ اس خط کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں:

"پٹنہ، ۱۷رمئی ۱۹۶۰ء

"مائی ڈیر شریمالی،

"میں نے آپ سے جامعہ کے مستقبل کے بارے میں لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس میں تاخیر ہوگئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کو لکھنے سے پہلے پروفیسر مجیب سے مشورہ کرلوں، لیکن کچھ ایسا ہوا کہ میری اور ان کی ملاقات نہ ہوسکی۔ تین